AN ERA OF DARKNESS

THE BRITISH EMPIRE IN INDIA

عہدِ ظلمات

(برِ صغیر میں برطانوی سلطنت)

مترجم: عابد محمود   مصنف: ششی تھرور

مصنف

ششی تھرور نامور ہندوستانی سیاستدان اور ڈپلومیٹ ہیں۔طویل بین الاقوامی ڈپلومیٹک کریئر کے بعد آج کل ہندوستانی حکومت اور سیاست میں سرگرم ہیں۔فکشن اور نان فکشن دونوں طرح کی کتب کے مصنف کے طور پر عالمی سطح پر اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ششی تھرور لندن میں مقیم، کیرالہ، ہندوستان سے تعلق رکھنے والے ایک خاندان میں پیدا ہوئے، جو ان کی پیدائش کے بعد دوبارہ ہندوستان منتقل ہوگیا۔دہلی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد، ٹفٹس یونیورسٹی، میڈفورڈ سے قانون اور ڈپلومیسی میں ایم اے کیا اور 1977 میں بین الاقوامی تعلقات میں پی ایچ ڈی مکمل کی۔ ڈاکٹریٹ کے دوران ہی بہترین طالبعلم کے لیے رابرٹ بی سٹیورٹ ایوارڈ حاصل کیا۔22 سال کی عمر میں فلیچر سکول کی تاریخ میں وہ کم عمر ترین ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والی شخصیت تھے۔اقوام متحدہ کے مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے بعد 2009 میں کانگریس میں شمولیت اختیار کی اور کیرالہ سے ہی لوک سبھا (ہندوستانی پارلیمان کے ایوانِ زیریں) کے رکن منتخب ہونے کے بعد وزارتِ خارجہ سے وابستہ رہے۔ لیکن اپنے متنازعہ ٹویٹس کے باعث اس عہدے پر ایک سال سے بھی کم ہی ٹک پائے۔وزیراعظم منموہن سنگھ کے ساتھ بطور وزیر بھی رہے اور مختلف پارلیمانی کمیٹیوں کے ممبر بھی۔ٹوئیٹر اور سیاست دونوں میں ایک ہی طرح سرگرم نظر آنے والے ششی تھرور کا شمار سوشل میڈیا کو سیاسی آلے کے طور پر استعمال کرنے والے اولین لوگوں میں کیا جاتا ہے۔تھرور اپنی لسانی خطابت وفصاحت اور تحریری لطافت ہر دو حوالوں سے جانے جاتے ہیں۔ موجودہ کتاب ''عہد ظلمات، برصغیر میں برطانوی سلطنت'' کا محرک بھی آکسفورڈ میں منعقدہ ایک مکالمہ تھا۔

عہدِ ظلمات

(برصغیر میں برطانوی سلطنت)

مصنف

ششی تھرور

مترجم

عابد محمود

عکس

AKSPUBLICATIONS

کتاب: عہدِ ظلمات

مصنف: ششی تھرور

مترجم: عابد محمود

سنہ طباعت: 2021ء

تعداد: 500

قیمت: 1200

عکس

AKSPUBLICATIONS
Ground Floor Mian Chamber 3-Temple Road. Lahore
Ph 042-6294000. Cell # 0304-2224000, 0300-48275000
E mail publications.aks@gmail.com

Scanned with CamScanner

میرے بیٹوں، ایشان اور کانیشک

کے نام

جو میری طرح تاریخ سے محبت کرتے ہیں

لیکن اس کا علم مجھ سے زیادہ رکھتے ہیں

لیکن یہ عجیب بات ہے۔
اور اکثر اوقات، ہمیں ہمارے خسارے پر آمادہ کرنے کے لیے
تاریکی کے ہتھیار ہم پر سچائیاں منکشف کرتے ہیں۔۔۔۔۔
---ولیم شکسپیئر، میکبتھ، پہلا ایکٹ، تیسرا سین

William Shaekespeare, Macbeth, Act 1, Scene 3

عظیم نراجی، تمھارے ہاتھوں! چلو پردہ گرنے دو
اور آفاقی ظلمت سب کو ڈھانپ لیتی ہے۔
---الیگزنڈر پوپ، دی ڈنسیڈ

Alexander Pope, the Dunciad

ہم جھلملاہٹ میں زندگی بسر کرتے ہیں---شاید یہ تب تک جاری رہے جب تک پرانی زمین
گھومتی رہے! لیکن کل یہاں تاریکی تھی۔
---جوزف کونریڈ، ہارٹ آف ڈارکنس

Joseph Conrad, Heart of Darkness

ہندوستان--- سینکڑوں ہندوستان--- باہر سرگوشی کرتے تھے لاتعلق چاند کے نیچے،
لیکن اس وقت ہندوستان ایک اور اپنا ہی دکھائی دیتا تھا،
اور اس کے رخصتی ماتم کا سن کر انھوں نے اپنی گم گشتہ عظمت
دوبارہ حاصل کی۔۔۔۔۔
---ای۔ ایم۔ فوسٹر، اے پیسج ٹو انڈیا

E. M. Forster, A Passage to India

عرضِ مترجم

میں 2019 کے وسط میں کچھ تاریخی دستاویزات کے تراجم کے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا اور اس کی اشاعت کے سلسلے میں "عکس پبلیکیشنز" پر محمد فہد اور نوفل جیلانی سے ملاقاتوں کے دوران ششی تھرور کی زیر نظر کتاب An Era of Darkness: The British Empire in India کی اہمیت اور اردو قارئین کے لیے اس کے ترجمے کی ضرورت پر بھی بات چیت ہوئی۔ دونوں احباب کی رائے تھی کہ جلد از جلد اس کتاب کو اردو قارئین کی رسائی میں ہونا چاہیے۔ مذکورہ کتاب میری نظر سے گزر چکی تھی اور برصغیر میں برطانوی نوآبادیاتی طرزِ حکمرانی اور اس خطے کے لوگوں پر اس کے اثرات میرے پسندیدہ موضوعات تھے لہٰذا ذاتی دلچسپی کی بنا پر میں نے پہلے اس کتاب کا ترجمہ کرنے کی حامی بھر لی۔

نوآبادیت اور استعماریت کے موضوعات پر پاکستان میں اردو میں بہت ہی کم کام ہوا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ تھی کہ کانگریس کی جدوجہد استعمار مخالفت جبکہ مسلم لیگ کی ہندو مخالفت پر بنیاد رکھتی تھی۔ زیر نظر کتاب انتہائی مدلل اور جامع انداز میں ان موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ عام کتب کے برعکس یہ کتاب آکسفورڈ میں ہونے والی ایک تقریر اور مکالمے "برطانیہ کے ذمہ اپنی سابقہ نوآبادیات کا تاوان واجب الادا ہے" سے شروع ہوئی۔ اس مباحثے کے سوشل میڈیا پر وائرل ہونے کے بعد مصنف اور ناشر نے اس موضوع پر ایک مستند کتاب کی ضرورت محسوس کی۔ یوں تو پاکستان اور ہندوستان میں ایسے دانشور موجود ہیں جن کا خیال ہے کہ نوآبادیاتی نظام اور اس کے اثرات قصۂ پارینہ ہیں اور ان کے اثرات کا جائزہ محض اپنی کمی، کجی اور ناکامی پر پردہ

ڈالنے کی ایک کوشش کے سوا کچھ نہیں، دوسری جانب ایسے دانشور بھی موجود ہیں جو برصغیر میں موجود ہر برائی کے لیے نوآبادیاتی نظام کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ ان نقطہ ہائے نظر پر بحث ہمارا مقصود نہیں البتہ یہ کہنا بر محل ہو گا کہ نوآبادیاتی نظامِ حکومت کو سمجھے بغیر برصغیر کے بیشتر سیاسی، سماجی اور مذہبی مسائل کا تجزیہ ادھوری سچائی کو ہی سامنے لائے گا۔ مختصراً اگر کہا جائے تو برصغیر کی تقسیم بھی اسی نوآبادیاتی نظام کا شاخسانہ تھی۔ مسلم لیگ کی علیحدگی پسند، کانگریس کی قوم پرست سیاست اور ہندو، مسلم مذہبی جماعتوں کی سیاسی، سماجی سرگرمیاں، 'تقسیم کرو حکومت کرو' کی نوآبادیاتی پالیسی ہی کا ردِ عمل تھیں۔

1930 میں نامور مورخ اور فلسفی ول ڈیورانٹ نے لکھا کہ برطانیہ کا "دانستہ اور شعوری طور پر ہندوستان کا خون بہانا۔۔۔۔۔ تاریخ کا سب سے سنگین جرم تھا۔" رائل چارٹر سے 1600 میں تشکیل پانے والی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ ہی ہندوستان میں برطانوی سلطنت کا آغاز ہوتا ہے۔ اور دُنیا کے 23 فیصد جی ڈی پی والی مغل سلطنت (تمام یورپ کے مشترکہ جی ڈی پی کے برابر) برطانیہ کی یہاں سے روانگی کے وقت محض 3 فیصد سے کچھ زیادہ رہ جاتی ہے۔ دریائے سندھ اور گنگا جمنا کے زرخیز پانیوں سے پیدا ہونے والی دولت کا نکاس دریائے ٹیمز میں کیا گیا جس سے اس کے کناروں پر بلند و بالا عمارتیں تعمیر کی گئیں اور صنعتی انقلاب کی راہ ہموار ہوئی۔ یہی آگہی تھی جس نے ہمیں اس کتاب کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کی ترغیب دی۔

ہندوستان میں ہونے والی استعماری لوٹ مار کے مختلف طریقوں جیسا کہ ہندوستان کے قومی وسائل کا برطانیہ کی جانب نکاس، جواہرات کی لوٹ مار، ہندوستانی ٹیکسٹائل، دھات سازی اور جہاز سازی کی صنعت کی بربادی، زراعت کی نئی منفی شکل کی ترویج اور استعماری مقاصد کے حصول کے لیے تعلیمی پالیسی کی تشکیل وغیرہ کا تجزیہ کرتے ہوئے ششی تھرور نے زیرِ نظر کتاب میں مدلل طریقے سے برطانوی راج کے مغربی اور ہندوستانی عذر خواہوں کے برطانوی حکومت کے مفروضہ فوائد بشمول جمہوریت، قانون کی حکمرانی، ہندوستان کی سیاسی وحدت اور ریلوے کا پول کھولا ہے۔ اسی کے ساتھ انگریزی زبان، چائے، کرکٹ اور کارپوریٹ بزنس جیسے نوآبادیت کے چند ناقابلِ تردید فوائد پر بھی روشنی ڈالی ہے جو کہ بہر حال استعمار زدہ کی بجائے استعمار کار کے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے متعارف کروائے گئے۔ "عہدِ ظلمات" حقائق و حوالہ جات کی روشنی میں ایسے مدلل انداز میں تحریر کی گئی ہے جو برصغیر کی تاریخ کے زیرِ بحث دور کے بارے میں بہت سے مروجہ فکری مغالطوں کی تصحیح کا باعث ہو گی۔ مصنف کی سیاسی وابستگی کے باعث، کتاب میں انڈین نیشنل کانگریس کا نقطہ نظر غالب نظر

آتا ہے لیکن جناح صاحب پر تنقید کے ساتھ جواہر لعل نہرو اور گاندھی جی کی سیاسی غلطیوں اور فکری نظریات پر بھی تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

مصنف کے دیے گئے فٹ نوٹس ترجمہ کر دیے گئے ہیں اور جہاں مزید ضرورت محسوس کی گئی ہے وہاں مترجم کی طرف سے بھی فٹ نوٹس کا اضافہ مترجم کے حوالے کے ساتھ کر دیا گیا ہے تاکہ مصنف و مترجم کے فٹ نوٹس میں امتیاز کیا جا سکے۔ کتاب کے آخر میں حوالہ جات اور کتابیات اصل کتاب کے مطابق انگریزی میں ہی دیے گئے ہیں۔

اس کتاب کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ احساس ہوا کہ ایک مکمل کتاب کا ترجمہ مضامین کی نسبت زیادہ محنت اور مستقل مزاجی کا متقاضی ہے اور اگر محمد فہد مستقلاً اس ترجمہ کی تکمیل کے لیے میرے ساتھ رابطے میں نہ رہتے تو زیر نظر ترجمہ شاید پایہ تکمیل کو نہ پہنچ پاتا۔

ترجمہ کرنے کے دوران میں کئی طرح کے مسائل درپیش تھے، مصنف کے اندازِ تحریر میں رموز او قاف کے ساتھ طویل فقروں کا بکثرت استعمال تھا جن کو اردو متن میں ڈھالتے ہوئے بامحاورہ ترجمہ کرنا خاصا دقت طلب کام تھا۔ دونوں زبانوں کی حساسیت کے اختلاف کے باعث دوسرا مسئلہ تاثرات کی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی کا تھا جو دونوں زبانوں کا مزاج مختلف ہونے سے اور سنگین ہو جاتا ہے۔ اصطلاحات اور تکنیکی الفاظ کو اردو کا قالب دینا ایک اور مشکل مرحلہ تھا۔ بامحاورہ ترجمہ کرتے وقت اصل متن کی معنویت، حساسیت اور تاثر کو قائم رکھنے کی حتی الوسع کوشش کی گئی ہے، اور اس کوشش میں مجھے کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی یہ تو قارئین کی آراء ہی طے کریں گی البتہ اس کتاب کے ترجمہ میں موجود کسی بھی قسم کی اغلاط یا خامیوں کے لیے فقط میں ذمہ دار ہوں۔

ترجمہ میں معاونت، مفید مشوروں اور پروف ریڈنگ کیلئے میں اپنے دوستوں خالد محمود اور توصیف خاں کا بے حد ممنون ہوں۔ اپنی شریک حیات اور بچوں محب امر اور راویل عابد نے میرے لیے جس طرح اپنے وقت کی قربانی دی اس کا میں قرض ادا نہیں کر سکتا۔ اس کتاب کے ترجمہ کی کاوش میں اپنے والد چوہدری محمد رمضان مرحوم کے نام معنون کرتا ہوں جن کی دیانتدارانہ سیاسی جدوجہد، روشن خیالی اور جمہوریت پسندانہ و انسان دوست اقدار کی پاسداری نے مجھے اس قابل بنایا کہ آج سماج کے فکری ابہام کو دور کرنے کے لیے کسی علمی کاوش میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکوں۔

فہرست

کتاب میں مذکور واقعات کی تقویم

1600: برطانوی شاہی فرمان کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کی تشکیل، اُس عمل کی شروعات جو ہندوستان کو برطانوی حکمرانی کے تسلط کی طرف لے جائے گا۔

1613-14: برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ولیم ہاکنز کے زیرانتظام مسولی پٹنم میں فیکٹری اور سورت میں تجارتی پوسٹ قائم کی۔ سر تھامس رو، نے بادشاہ جیمز اول کے سفیر کے طور پر اپنی اسناد شہنشاہ جہانگیر کو پیش کیں۔

1615-18: مغلوں نے برطانیہ کو تجارت اور فیکٹریاں قائم کرنے کا حق تفویض کیا۔

1700: مغل شہنشاہ اورنگزیب کے زیرانتظام، ہندوستان دنیا کی معیشت کا 27 فیصد شمار کیا جاتا ہے۔

1702: مدراس کا گورنر تھامس پٹ، پٹ ہیرا حاصل کرتا ہے، جسے بعد میں فرانس کے تاجدار ڈک ڈی ارلینز کو 135000 پونڈز میں فروخت کر دیتا ہے۔

1739: ایران کے نادر شاہ کا دہلی کو تاراج کرنا اور اس کے خزائن کی لوٹ مار۔

1751: چھبیس سالہ رابرٹ کلائیو (1725-74) موجودہ تامل ناڈو میں ارکوٹ پر غلبہ پاتا ہے جبکہ فرانسیسی اور انگریز جنوبی ہند پر قبضے کے لیے لڑتے ہیں۔

1757: ہندوستان کے دولت مند صوبے، بنگال کا حکمران بننے کے لیے انگریز، کلائیو کے زیر کمان، نواب سراج الدولہ کو شکست دیتے ہیں۔

1765: کمزور مغل شہنشاہ شاہ عالم دوم دیوانی جاری کرتا ہے جو بنگال، بہار اور اوڑیسہ میں اس کے اپنے محکمہ مال کے افسران کی جگہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران کو تعینات کرتی ہے۔

1767: پہلی اینگلو میسور جنگ شروع ہوتی ہے، جس میں میسور کا حیدر علی ایسٹ انڈیا کمپنی، مراٹھوں اور حیدرآباد کے نظام کی مشترکہ افواج کو شکست دیتا ہے۔

1771: مراٹھے دہلی پر دوبارہ قابض ہوتے ہیں۔

1772: رام موہن رائے کی پیدائش (وفات 1833)۔ برطانوی کلکتہ میں اپنادارالحکومت قائم کرتے ہیں۔

1773: برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی، نے بنگال میں افیون کی پیداوار اور فروخت پر اجارہ داری حاصل کی۔ پارلیمنٹ میں لارڈ نارتھ کا ریگولیٹنگ قانون پاس ہوا۔ وارن ہیسٹنگز کی ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل کے طور پر تعیناتی ہوئی۔

1781: حیدر علی کا بیٹا ٹیپو سلطان برطانوی افواج کو شکست دیتا ہے۔

1784: پٹ خورد، ایسٹ انڈیا کمپنی کو پارلیمنٹ کے ماتحت لانے کے لیے انڈیا ایکٹ پاس کرواتا ہے۔ جج اور ماہر زبان ولیم جونز کلکتہ کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد رکھتا ہے۔

1787-95: برطانوی پارلیمنٹ، بنگال کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز (1774-85) کا بدمعاملگی کے باعث مواخذہ کرتا ہے۔

1793: انگریز، لارڈ کارنوالس کے زیر انتظام، مالگزاری نظام میں 'دوامی بندوبست' متعارف کرواتے ہیں۔

1799: ٹیپو سلطان، پانچ ہزار برطانوی فوجیوں کے خلاف جنگ میں مارا جاتا ہے جو اس کے پایہ سلطنت میں غدر مچاتے اور اسے پائمال کر ڈالتے ہیں۔

1803: دوسری اینگلو مراٹھہ جنگ دہلی پر برطانوی قبضے اور ہندوستان کے وسیع علاقوں پر تسلط پر منتج ہوتی ہے۔

1806: ویلور بغاوت بے رحمی سے کچل دی گئی۔

1825: ہندوستانی مزدوروں کی مدراس سے ری یونین اور ماریشئس کی طرف پہلی بڑی ہجرت۔

1828: رام موہن رائے کلکتہ میں سماجی، مذہبی اصلاحات شروع کرنے کی پہلی تحریک آدی برہمو سماج کی بنیاد رکھتا ہے۔ اسلام اور عیسائیت سے متاثر، وہ کثرت پرستی، اصنام پرستی و دیگر کو ملامت کرتا

ہے۔

1835: میکالے کی یادداشت ہندوستان میں مغربی تعلیم کو آگے بڑھاتی ہے۔ انگریزی کو سرکاری اور عدالتی زبان قرار دیا جاتا ہے۔

1835: ہندوستان سے 19000 معاہداتی مزدور تارکین وطن ماریشئس پہنچتے ہیں۔ 1922 تک مزدوروں کا جہازوں کے ذریعے ماریشئس بھیجنا جاری رہا۔

1837: کالی کی پوجا کرنے والے ٹھگوں کو انگریزوں نے کچل ڈالا۔

1839: مبلغ ولیم ہووٹ ہندوستان میں برطانوی حکمرانی پر معترض ہوتا ہے۔

1843: برطانوی سندھ کی سرزمین کو فتح کرتے ہیں (موجودہ پاکستان)۔ برطانوی (Doctrine of Lapse) 'ڈاکٹرائن آف لیپس' کا اجراء جس کے تحت اگر کسی ریاست کا حکمران بغیر وارث کے مر جائے تو اس ریاست پر برطانوی قبضہ کر لیں گے۔

1853: بمبئی اور تھانے کے درمیان پہلی ریلوے کا قیام۔

1857: پہلی اہم ہندوستانی بغاوت، جسے برطانویوں نے سپاہی بغاوت کا نام دیا، جو دہلی اور لکھنو کے ہتھیار ڈالتے ہی چند مہینوں میں ختم ہو گئی۔

1858: ملکہ وکٹوریہ کا اعلامیہ، تاج کے نام پر ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہندوستان کی حکومت کو تحویل میں لینا۔ ہندوستان میں ہندوستانیوں کے لیے سول سروس کی نوکریاں کھلنا۔

1858: ہندوستان ریل کی پٹڑی کے پہلے 200 میل مکمل کرتا ہے۔

1860: گنے کی کاشت پر کام کرنے کے لیے پہلے معاہداتی ملازمین (مدراس اور کلکتہ سے) ایس ایس ٹرورو اور ایس ایس بلویدرے، ڈربن جنوبی افریقہ میں لنگر انداز ہوتے ہیں۔

1861: رابندرناتھ ٹیگور کی پیدائش (وفات 1941)۔

1863: سوامی وویکانند کی پیدائش (وفات 1902)۔

1866: اوڑیسہ قحط سالی میں کم از کم پندرہ لاکھ ہندوستانیوں کی موت۔

1869-1948: ہندوستانی قوم پرست اور ہندو سیاسی سرگرم رکن، موہن داس کرم چند گاندھی کا عرصہ حیات، جنھوں نے عدمِ تشدد نافرمانی کی حکمت عملی وضع کی جس نے عیسائی برطانیہ کو ہندوستان کو

آزادی (1947) دینے پر مجبور کیا۔

1872: ہندوستان میں پہلی برطانوی مردم شماری کا اہتمام کیا گیا۔

1876: ملکہ وکٹوریہ (1819-1901) ہندوستان کی ملکہ کی منادی کی گئی (1876-1901)۔ وائسرائے لارڈ لٹن کی 1876-77 کے بڑے قحطوں کی بد انتظامی۔

1879: فجی کی طرف تارکین وطن کا پہلا جہاز، لیونیدا اس برطانوی سلطنت کی دوسری نوآبادیات میں پہلے سے کام کرنے والے تقریباً 340000 ہندوستانی معاہداتی مزدوروں میں 498 کا مزید اضافہ کرتا ہے۔

1885: ہندوستان میں درمیانے طبقے کے دانشوروں کا ایک گروہ، جن میں سے چند ایک برطانوی ہیں، برطانوی حکومت کے روبرو ہندوستانی رائے عامہ کی آواز بننے کے لیے انڈین نیشنل کانگریس قائم کرتے ہیں۔

1889: جواہر لعل نہرو کی پیدائش (وفات 1964)

1891: بی آر ایمبیڈکر کی پیدائش (وفات 1956)

1893: سوامی وویکانند عالمی مذاہب کی شکاگو پارلیمنٹ میں ہندوستان کی نمائندگی کرتے ہیں، اوراپنی پرجوش تقریروں سے عظیم کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

1896: ہندوستانی قوم پرستی کی مدح کے لیے قوم پرست قائد اور مراٹھی سکالر بال گنگادھر تلک، گنیش وسرجن اور شیواجی تیوہاروں کا آغاز کرتے ہیں۔ برطانیہ سے 'پورنا سوراج' یا مکمل آزادی کا مطالبہ کرنے والے وہ پہلے (شخص) تھے۔

1897: برطانوی ہند کے ایک اور قحط کے دوران ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی (۷۵ سالہ) جشن بھی منایا گیا۔

1900: برطانیہ کو برآمد ہونے والی ہندوستانی چائے 137000000 پونڈ (کرنسی) تک جا پہنچی۔

1901: ہربرٹ رسلئے نے ہندوستان کی پہلی نسلی جغرافیائی مردم شماری کا انعقاد کیا۔

1903: لارڈ کرزن کے عظیم الشان دربار کا انعقاد۔

1905: بنگال کی تقسیم نے شدید مخالفت کو ابھارا۔ سوادیشی تحریک اور برطانوی اشیاء کے بائیکاٹ کا آغاز ہوا۔ ہندوستان کے نامور برطانوی وائسرائے لارڈ کرزن نے استعفیٰ دیا۔

1906: برطانیہ کے اکسانے پر ہندوستان میں سیاسی جماعت مسلم لیگ کی تشکیل ہوئی۔

1909: منٹو-مارلے اصلاحات کا اعلان کیا گیا۔

1911: دہلی میں آخری شاہی دربار؛ ہندوستان کا دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل۔ بنگال کی تقسیم کی تنسیخ۔

1913: رابندرناتھ ٹیگور نے ادب کا نوبل انعام جیت لیا۔

1914: جنگ عظیم اول میں برسرپیکار ہونے کے لیے ہندوستانی فوجیوں کی عجلت میں فرانس اور میسوپوٹیمیا روانگی۔

1915: مہاتما گاندھی کی جنوبی افریقہ سے ہندوستان واپسی۔

1916: کاماگاٹامارو کا واقعہ: کینیڈین حکومت نے ہندوستانی شہریوں کو امیگریشن سے نکال باہر کیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین معاہدہ لکھنؤ۔

1917: آخری معاہداتی مزدوروں کو فجی اور ٹرینیڈاڈ کی برطانوی نوآبادیات میں لایا گیا۔

1918: سپین کی انفلوئنزا وبا ہندوستان میں ایک کروڑ پچیس لاکھ اور دنیا بھر میں دو کروڑ سولہ لاکھ لوگوں کو مار دیتی ہے۔

1918: پہلی جنگ عظیم کا اختتام۔

1919: جلیانوالہ باغ قتلام۔ امرتسر میں جنرل ڈائیر گورکھا فوجیوں کو غیر مسلح مظاہرین پر گولی چلانے کا حکم دیتے ہوئے 379 لوگوں کو قتل کرتا ہے۔ قتلام نے گاندھی کو قائل کر دیا کہ ہندوستان کو جابرانہ برطانوی حکمرانی سے مکمل آزادی کا مطالبہ کرنا ہوگا۔ مونٹیگیو-چیمسفورڈ اصلاحات کا اعلان کیا گیا۔ رولٹ ایکٹ پاس ہو گیا۔

1920: گاندھی نے عدم تعاون اور اہنسا کی ستیا گرہ حکمت عملی وضع کی۔ خلافت تحریک شروع ہوئی۔

1922: چوری چورا فساد کے بعد مہاتما گاندھی نے تحریک عدم تعاون منسوخ کر دی۔

1927، 1934: ہندوستانیوں کو عدالتی مجسٹریٹ اور جیوری کے رکن کے طور پر بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔

1930: جواہر لعل نہرو کانگریس پارٹی کے صدر بنے۔ لاہور میں پورنا سوراج قرارداد پاس ہوئی۔ ول ڈیورانٹ ہندوستان پہنچتا ہے اور برطانوی حکمرانی کے متعلق جو کچھ اس پر منکشف ہوتا ہے اس پر وہ ششدر رہ جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی نمک مارچ کی رہنمائی کرتے ہیں۔

1935: قانونِ ہند (گورنمنٹ آف ایکٹ)

1937: گیارہ صوبوں میں صوبائی الیکشن۔ گانگریس آٹھ میں جیت گئی۔

1939: دوسری عالمی جنگ کی شروعات۔ ہندوستان کی طرف سے اعلان جنگ سے پہلے وائسرائے کے مشاورت نہ کرنے کے خلاف احتجاجاً کانگریس وزارتوں کا استعفیٰ۔

1940: مسلم لیگ کا قرارداد لاہور میں پاکستان کے قیام کا مطالبہ۔

1942: کرپس مشن۔ ہندوستان چھوڑدو تحریک۔ کانگریس قائدین کو جیل کی سزا۔ سبھاش چندر بوس کا برطانویوں سے جنگ کے لیے انڈین نیشنل آرمی (آزاد ہند فوج) کا قیام۔

1945: کانگریس قائدین کی رہائی۔ لارڈ ویول کے زیرِ نگرانی شملہ کانفرنس۔

1946: رائل انڈین نیوی میں بغاوت۔ قومی سطح پر الیکشن؛ مسلم لیگ، مسلم نشستوں کی اکثریت جیت جاتی ہے۔ کیبنٹ مشن۔ جواہر لعل نہرو کی سرکردگی میں عبوری حکومت کا قیام۔ جناح کا راست اقدام کا اعلان۔ کلکتہ میں فسادات کا بھڑکنا۔

1947: ہندوستان 15 اگست کو آزادی حاصل کرتا ہے۔ عوام الناس کے قتل عام اور بے سروسامانی کے دوران ملک کا بٹوارہ۔ برطانیہ کی ہندوستان سے روانگی۔

دیباچہ

آکسفورڈ کی تقریر ــــ ہندوستانی ردعمل ــــ تنقید پر غور و فکر ــــ تاریخ نہ عذر خواہی کے لیے نہ ہی انتقام کے لیے

یہ کتاب، خلاف معمول کسی حد تک، ایک تقریر سے شروع ہوئی۔ مئی 2015 کے آخر میں، 'برطانیہ کے ذمہ اپنی سابقہ نو آبادیات کا تاوان واجب الادا ہے' کے قضیہ پر اظہارِ خیال کے لیے مجھے آکسفورڈ یونین نے دعوت دی۔ چونکہ اس کے ایک ہفتے بعد ویلز کے ہئے ادبی میلے میں اظہار خیال کے لیے میرا وقت پہلے سے ہی طے تھا، تو میں نے یہ سوچا شاید راستے میں آکسفورڈ میں رکنا اور وہاں دوبارہ مکالمہ خوشگوار ہو (جیسا کہ، ایک دہائی پہلے اقوام متحدہ کی جانب سے، میں ایک مرتبہ پہلے کر چکا تھا)۔ صدیوں پرانے چوبی پینل کی متاثر کن یونین کا عمارتی احاطہ، ایک کامیابی کا حصول تھا، اور کارروائی پر از سر نو غور کیے بغیر میں نے انتہائی آسودگی محسوس کی۔

تاہم جولائی کے شروع میں، یونین نے مکالمہ ویب پر پوسٹ کر دیا، اور مجھے میری تقریر کی ایک ویڈیو کاپی بھجوا دی۔ میں نے فوراً اس کا لنک ٹویٹ کر دیا ــــ اور تحیر سے دیکھا کہ یہ وائرل ہو گیا۔ چند گھنٹوں کے دوران اسے ڈاؤنلوڈ کیا گیا اور سینکڑوں سائٹس پر نقش ثانی بنایا گیا (کاپی کیا گیا)، وٹس ایپ پر بھیجا گیا اور ای میل سے آگے بڑھایا گیا۔ ایک سائٹ پر بڑی تیزی سے تیس لاکھ ویوز سے زائد ہو گئے؛ دوسروں نے اعداد و شمار نہیں رکھے، لیکن کامیاب اعداد کے ریکارڈ کی خبر دی۔ میرے دائیں بازو کے نقادوں نے میری تقریر کی داد دینے کے لیے سوشل میڈیا پر اپنی جانب سے میری ''ٹرالنگ'' موقوف کر دی۔ ایک دعوت میں لوک سبھا کی سپیکر

میری ستائش کے لیے باہر نکل آئیں، جس میں وزیر اعظم موجود تھے، جنھوں نے پھر اپنے تبصرے میں 'صحیح بات صحیح جگہ کرنے' پر مجھے مبارکباد دی۔ سکولوں اور کالجوں نے اپنے طلباء کے لیے تقریر چلائی؛ ایک یونیورسٹی، سنٹرل یونیورسٹی آف جموں، نے پورے دن کا ایک سیمینار منعقد کیا جس میں نامور محققین نے ان مخصوص نقاط پر اظہارِ خیال کیا جو میں نے اٹھائے تھے۔ جو میں نے کہا اس کی حمایت اور مخالفت میں سینکڑوں مضامین لکھے گئے۔ کئی ماہ تک، میں اجنبیوں سے ملتا رہا، جو عوامی مقامات پر میری 'آکسفورڈ کی تقریر' کی ستائش کے لیے میرے پاس آتے رہے۔

میں خوشگوار طور پر حیران بھی تھا لیکن کسی درجہ مضطرب بھی۔ ایک تو یہ تھا کہ بہر حال سامعین کی دو تہائی اکثریت سے مباحثہ جیتنے کے لیے میں نے اپنی طرف سے کافی اچھی گفتگو کی تھی، میں جانتا تھا میں بہتر تقریریں کر چکا ہوں، جن کے پرستار اس کا دسواں حصہ بھی نہیں تھے۔ دوسرا یہ کہ، ایمانداری سے میرا خیال تھا کہ میں نے کچھ بہت ہی نیا نہیں کہا تھا۔ برطانوی استعماریت کی ناانصافیوں پر میرے تجزیے کی بنیاد اسی پر تھی جو کچھ میں نے بچپن سے پڑھا اور مطالعہ کیا تھا، اور میرا خیال تھا کہ جو میرے پیش کردہ دلائل اتنے بنیادی تھے کہ وہ وہی تشکیل دیتے تھے جسے امریکی 'انڈین نیشنلزم 101' پکاریں گے ___ ضروری، بنیادی دلائل جو آزادی کی ہندوستانی جدوجہد کا جواز پیش کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں ملتی جلتی باتیں رومیش چندر دت اور دادا بھائی نوروجی جیسے، اور بیسویں صدی میں جواہر لال نہرو اور بہت سے دوسرے کہتے رہے تھے۔

یہ حقیقت کہ میری تقریر نے اتنے زیادہ سامعین کی تاروں کو چھیڑا تھا فی الواقع اس بات کی غماز تھی کہ جسے میں بنیادی سمجھتا تھا بہت سے لوگ اس سے انجان تھے، شاید اکثر تعلیم یافتہ ہندوستانی۔ جو کچھ وہ پہلے سے جانتے تھے اسے محض دہرانے کی بجائے، ان کا ردعمل ایسا تھا جیسے میں نے ان کی آنکھیں کھول دی ہوں۔

یہ وہ آگہی تھی کہ جس نے میرے دوست اور ناشر ڈیوڈ ڈاویڈار کو اصرار کرنے پر آمادہ کیا کہ میں اپنی تقریر کو ایک مختصر کتاب میں تبدیل کروں ___ کچھ ایسا جسے عام آدمی پڑھ اور ہضم کر سکے لیکن برطانوی نوآبادیت کے ساتھ ہندوستان کے تجربے کے متعلق بنیادی حقائق کے متلاشی طالبعلموں اور دوسروں کے لیے گراں قدر حوالہ جاتی ماخذ بھی ہو۔ آج کل کے ہندوستانیوں کے لیے تشریح کا اخلاقی تقاضا ___ اور انگریزوں کے لیے ___ دہشت ناک بن کر سامنے آنے والی استعماریت سے کیوں صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

بعض فیصلہ کن حوالوں سے کتاب تقریر سے مختلف ہے۔ یہ کسی ایک چیز کی تلافی سے متعلق نہیں ہے۔

میری تقریر اس دلیل کی طرف لے گئی تھی کیونکہ یہی موضوع آکسفورڈ یونین نے مشتہر کیا تھا، نہ کہ اس وجہ سے کہ میں ذاتی طور پر تلافی کے معاملے کے ساتھ جڑ گیا تھا۔ برطانوی سلطنت نے نوآبادیاتی رعایا کے ساتھ جو ظلم روا رکھا، اس کا میں قائل تھا، لیکن اپنی تقریر کے آخر میں میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ، ہندوستان کو، سلطنت کے دو سو سالہ دورِ حکومت کے کفارے کے طور پر دو سو سال تک ادا کیے جانے والے، سالانہ ایک پونڈ کی علامتی تلافی پر قناعت کرنی چاہیے۔ میرا خیال تھا کہ کیش کی بجائے کفارہ مطمع نظر ہے ___ محض ایک 'معذرت' بھی یہ کر سکتی تھی۔ درحقیقت، ایک ہندوستانی مبصر منہاز مرچنٹ کی حساب لگانے کی کوشش کہ تلافی کے لیے ایک مناسب رقم کتنی ہو گی، آسمان کو چھونے والے ہندسے تک جا پہنچی ___ آج کی رقم میں تیس کھرب ڈالر ___ کہ معقول طور پر کوئی بھی اس کی واپسی کی توقع نہیں کر سکتا۔ (یہ رقم برطانیہ کے 2015 کے کل جی ڈی پی سے بڑی ہو گی)۔

یہ کتاب مکمل طور پر برطانوی نوآبادیت کے بارے میں بھی نہیں ہے بلکہ اس بارے ہندوستان کے تجربے سے متعلقہ ہے۔ جزوی طور پر یہ اس لیے ہے کیونکہ برطانوی نوآبادیت کی مکمل تاریخ پر گفتگو کرنے سے، جیسا کہ آکسفورڈ یونین میں مقررین نے کیا، ایک ضخیم اور بوجھل کتاب بن جاتی، بلکہ ایسا اس لیے بھی ہے کہ میں اس بارے زیادہ نہیں جانتا، جبکہ ہندوستان کی تاریخ ایک ایسا میدان ہے جس کی کھوج، میں زمانہ طالب علمی سے کرتا رہا ہوں۔ میرا مطلب افریقہ کو برطانوی نوآبادیات بنانے کی ہولناکی یا غلاموں کی وحشت ناک تجارت پر کوئی رعایت دینا نہیں، جس کے لیے شاید کفارہ بہتر جواز ہو (یہ حیرت انگیز ہے کہ جب غلامی کالعدم کی گئی، تو برطانوی حکومت نے، نہ صرف غلامی کے شکنجے میں جکڑے مردوں اور عورتوں کو، بلکہ ان کے سابقہ مالکان کو بھی ان کی 'املاک کے نقصان پر' تاوان ادا کیا!)۔ ایسے بھی تھے جو ان مسائل کے ساتھ انصاف کر سکتے تھے؛ میں امید کرتا ہوں کہ میں نے اس کتاب میں ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خصوصی معاملے کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ ☆

ایک تیسرا پہلو بھی ہے جس میں یہ کتاب میری تقریر سے مختلف ہو جاتی ہے۔ آکسفورڈ میں مباحثے کے ایک جانب کے دلائل، میں پیش کر رہا تھا، وہاں مخالف دلائل کے بارے میں لطیف معنوی امتیاز یا اعتراف کے

☆ جب میں یہ آخری فقرہ ٹائپ کر رہا تھا، تو کسی قدر جلدی میں، میرے کمپیوٹر کے سپیلنگ چیک نے ہندوستان میں 'برٹش' کے لیے ایک قابلِ قبول متبادل کے طور پر 'بروٹش' پیش کیا۔

لیے بہت ہی کم گنجائش تھی۔ تاہم، سلطنت کی ناانصافیوں کو پوری طرح پیش کرنے والی کتاب میں، میں اپنا فرض سمجھتا تھا کہ برطانوی راج کے حق میں دلائل کو بھی مد نظر رکھوں۔ یہ میں نے ہر باب میں کیا ہے، خصوصاً باب نمبر 2 میں، اور باب نمبر 3 اور 7 میں، جن میں میں نے ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی حمایت میں باقی کے اکثر گھسے پٹے دلائل پر غورو فکر کیا اور انھیں رد کیا ہے۔ میں نے نوآبادیاتی عہد کی تحریروں اور ہندوستان میں برطانیہ کی موجودگی پر حالیہ علمی تالیفات دونوں کی وسیع تر تحقیق کے ساتھ اپنے مطالعہ کے سالوں کی کمی کو پورا کیا ہے، آخر کے حاشیوں میں تمام حوالہ جات باضابطہ طور پر دیے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میرے دلائل کو ماہرین کی مناسب تائید حاصل ہو گی، چنانچہ، مجھ سے اختلاف کرنے والے بھی شاید اس پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔

آخر میں، یہ کتاب ایک دلیل پیش کرتی ہے؛ کوئی کہانی نہیں سناتی۔ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے عروج و زوال کے تاریخ وار بیانیہ احوال کے متلاشی قارئین کو یہ یہاں نہیں ملے گا؛ اس دیباچے سے پہلے واقعات کی ترتیب کا صرف ایک تقویمی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس تصنیف کا مقصد راج کے ورثے کا جائزہ لینا ہے، اس کے مبینہ فوائد کے متعلق کیے گئے دعووں کا تنقیدی مطالعہ کرنا ہے، اور ان کے خلاف شہادت اور دلائل پیش کرنا ہے۔

یقیناً، میری تقریر نے ہمہ گیر قبولیت پیدا نہیں کی۔ تقریر کے سیاق و سباق میں، ایک بات ہے، میں شاذ ہی تسلیم کر سکتا تھا کہ اچھے یا برے کی عمومیت جو مناسب انصاف دے سکتی، کے مقابلے میں، سلطنت کے بہت سے پہلو نوعیت کے اعتبار سے انتہائی پیچیدہ یا تاثر میں مبہم تھے۔ اس کتاب کی بنیاد اسی مقدمے پر ہے کہ تقریری مباحثے میں جو ممکن ہے اس کی نسبت متعلقہ مسائل میں سے اکثر، زیادہ پیچیدہ برتاؤ یا ثبوت کا تقاضا کرتے ہیں، مزید برآں، میری تقریر کے رد عمل میں بہت سے دلائل پیش کیے گئے، جنھیں یہاں قبول کرنا چاہیے، حالانکہ وہ میرے ابواب کے موضوعات کے ساتھ براہ راست مناسبت نہیں رکھتے۔

ان اعتراضات میں سے سب سے عمومی یہ ہے کہ ہندوستان کی مابعد نوآبادیاتی ناکامیاں برطانیہ کے نوآبادیاتی مظالم پر میرے اعتراضات کو باطل کر دیتی ہیں۔ 'تھرور شاید مباحثہ جیت چکا ہوتا ___ لیکن اخلاقی فتح ہندوستان سے دامن بچا گئی' شیکھا دلمیا نے ٹائم میں یہ دلیل پیش کرتے ہوئے لکھا کہ آزادی کے بعد ہندوستانی حکومت کی کارکردگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ ہندوستان کو ادا کیا گیا کوئی بھی

تاوان بہتر طریقے سے خرچ ہو گا، یا مطلوب وصول کنندہ تک پہنچ جائے گا۔ ایک بلاگر نے، اچھے اقدام کے لیے اضافہ کیا، کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد کے اربابِ اختیار کا شرمناک رویہ اس ایک ارب ٹن اناج سے عیاں ہوتا ہے جو 2010ء میں ہندوستان کی فوڈ کارپوریشن کے گوداموں میں ضائع شدہ حالت میں پایا گیا، گویا آزادی کے بعد کی نااہلی، اس سے پہلے ہونے والے قحطوں کا جواز ہو۔

انڈین نیشنل کانگریس پارٹی، جس نے اس کی آزادی کے اڑسٹھ سالوں میں سے باون سال ہندوستان پر حکومت کی، کی طرف سے پارلیمنٹ کے رکن کے طور پر میری حیثیت (اس وقت جب میں نے اپنی آکسفورڈ کی تقریر کی)، ایک دوسرے حملے کی زد میں آ گئی۔ جوناتھن فورمین نے اسے زیادہ آڑے ہاتھوں لیا: اس نے غیر معتدل انداز میں جذباتی تقریر کی، 'کانگریس پارٹی نے چھ دہائیوں سے زائد ہندوستان پر بد نظم حکومت کی، جو بتدریج زیادہ سے زیادہ متکبر اور کرپٹ ہوتی گئی، اور عام ہندوستانیوں سے تقریباً اتنی ہی الگ تھلگ نظر آتی رہی جتنی کہ اس کی پیش رو برطانوی حکومت رہی تھی'۔ کانگریس کے ہندوستانی قائدین ہندوستان کی المناک 'ہندو شرحِ نمو' کے لیے ذمہ دار تھے اور 'بنیادی تعلیم اور خواندگی سے حکمران اشرافیہ کی لاپرواہی، سوشلسٹ پلاننگ کے ساتھ ان کے خبط، 'لائسنس راج' کے فروغ، اور مٹھی بھر اجارہ دار کاروباری خاندانوں کے ساتھ ان کی کرپٹ معاملگی کے باعث، جنوبی کوریا اور حتیٰ کہ میکسیکو بھی 1950 سے 1980 کے دوران فی کس جی ڈی پی میں ہندوستان سے سبقت لے گئے'۔

ان میں سے چند اعتراضات جائز ہیں ___ درحقیقت، اپنی کتابوں میں، مَیں نے بذات خود انھی میں سے متغیرات پیش کیے ہیں، البتہ یوں انتہاء پسندیا کاٹ دار انداز میں نہیں ___ لیکن ناکامیوں کا ایک مجموعہ دوسرے کو کالعدم نہیں کر دیتا۔ نہ ہی نو آبادیاتی جبر کی بیس دہائیوں کو چھ میں ختم کیا جا سکتا ہے؛ ہندوستانی، درحقیقت کانگریس حکومتوں کا ریکارڈ اکثر پہلوؤں سے ہندوستان میں ان کے برطانوی نو آبادیاتی پیش رووں سے بدرجہا بہتر ہے، خاص طور پر جی ڈی پی کی نمو، خواندگی، غربت کے خاتمے، متوقع عمر اور خشک سالیوں وزرعی پیداوار میں کمی پر غالب آنے جیسے اشاریوں کے حوالے سے۔ کسی بھی حوالے سے، تاریخ کو مختلف ادوار میں، خطاکاریوں کے موازنے کے کسی قسم کے کھیل تک محدود نہیں کیا جا سکتا؛ ہر دور کا جائزہ علیحدہ اور اس کی اپنی کامیابیوں اور زیادتیوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔

اس حقیقت، کہ میرے آکسفورڈ کے مباحثے کا مرکزی نقطہ تلافی تھا نے میرے نقادوں کے لیے جلتی پر

تیل کا کام کیا۔ ایک ہندوستانی مبصر نے دلیل پیش کی کہ تلافی کا دعویٰ ہندوستان کے عدم تحفظ اور کمزور عزت نفس کو ظاہر کرتا تھا؛ یہ دلیل دینے والے ہندوستانی، بعد کی ہندوستانی حکمرانی کی ناکامیوں کی ذمہ داری انگریزوں پر ڈال دیتے تھے۔ دوسروں نے رائے زنی کی کہ نوآبادیاتی استحصال کے لیے جو واقعتاً تاوان وصول کرنے کے حق دار ہیں، ان مستحقین کی شناخت ناممکن ہوگی۔

بہرصورت، کچھ وثوق سے کہتے تھے، برطانیہ نے گزشتہ برسوں میں عملی طور پر امداد کی شکل میں ہندوستان کو تاوان ادا کیا ہے ___ کسی بھی طرح، جرم کی قبولیت کے طور پر، نہیں، بلکہ برطانوی فیاضی کے نتیجے میں، اپنی سابقہ نوآبادیاتی رعایا کے لیے۔ آزادی کے بعد برطانیہ سے ہندوستان کو یک طرفہ طور پر کافی کچھ منتقل کیا گیا، اور محض امداد کے طور پر نہیں؛ آکسفورڈ میں میرے ایک مخالف، مؤرخ جان میکنزی کے بقول، 'برطانوی کمپنیوں بارے کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے آؤٹ سورسنگ میں وسعت کے چند پہلوؤں کی حوصلہ افزائی کی، ہندوستان نے جس سے سیکھا، جسے تلافی کی ایک شکل سمجھا جا سکتا ہے'۔ آکسفورڈ کی تحریک کے خلاف ایک اور مناظر، ایم پی سر رچرڈ اوٹاوے نے دلیل پیش کی کہ امیر ممالک کی جانب سے غریب ملکوں کو دی گئی رضاکارانہ امداد، 'کا مزید مطالبہ، پرانے احساس کمتری کو قائم رکھنے کے لیے ہے'۔

یقیناً، مجھے شاذونادر ہی یہ کہنے کی ضرورت پڑتی ہے، کہ میں نے زیادہ مطالبہ نہیں کیا؛ میں نے کم مطالبہ کیا___ محض علامتی طور پر ایک پونڈ سالانہ۔ لیکن یہ بھی اس امر سے الگ ہے۔ میں نے آکسفورڈ کی تلافی کی تحریک کو مالیاتی نہیں، بلکہ برطانیہ کے اس اخلاقی قرض کے مسئلہ کو اٹھانے کے لیے برتا تھا جو اس کا سابقہ نوآبادیات کی طرف واجب الادا تھا۔ اور امداد کے بارے میں، برطانوی امداد کا حجم ہندوستان کے جی ڈی پی کے 0.02 فیصد سے بھی کم ہے، اور اس سے بھی کسی قدر کم ہے جو ہندوستانی حکومت کھاد کی سبسڈی پر خرچ کرتی ہے___ امداد کی دلیل کے لیے شاید یہ ایک مناسب استعارہ ہو۔

بہت سے لوگوں نے نشاندہی کی ہے کہ اپنے آباواجداد کی زیادتیوں کے لیے آج کے برطانیہ پر ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اور ان سے یہ توقع نہیں کی جانی چاہیے کہ وہ ان گناہوں کی تلافی کا بوجھ اٹھائیں جن میں ان کا کوئی کردار نہیں تھا۔ نہ ہی آج کے ہندوستانی اس معاملے میں، اپنے اسلاف کی تکالیف کا ہرجانہ وصول کرنے کے مستحق ہیں۔ ہرجانہ بھینٹ چڑھنے والوں کو ملنا چاہیے نہ کہ ان کے پوتے پوتیوں کو، اور خطاکاروں کی جانب سے نہ کہ ان کے پوتے پوتیوں کی طرف سے۔

دلنشیں ہے، لیکن یہ قومی تشخص و مواخذہ کی معنویت کو منہدم کر دیتا ہے جو اکثر ممالک کے ساتھ موسوم ہیں۔ جب ولی برانڈت جرمنی کے چانسلر تھے، تو 1970 میں وہ پولینڈ کے یہودیوں سے ہولوکاسٹ کی معافی مانگنے کے لیے وارسا گھیٹو میں گھٹنوں کے بل جھک گئے۔ بمشکل ہی پولینڈ میں کوئی یہودی رہ گئے تھے، اور برانڈت جسے نازیوں نے بطور سوشلسٹ ظلم کا نشانہ بنایا تھا، وہ ان جرائم سے مکمل طور پر پاک تھا جن کے لیے وہ معذرت کر رہا تھا۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے ___ وارسا میں اس کے تاریخی گھٹنے ٹیکنے کے عمل کے ساتھ، وہ جرمن عوام کی اخلاقی ذمہ داری کا اقرار کر رہا تھا، جن کی چانسلر کے طور پر اس نے رہنمائی کی تھی۔ مختصر طور پر یہی وجہ ہے کہ میں نے مالی امداد کی بجائے کفارہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا۔

یقیناً، ہر کوئی اتفاق نہیں کرتا کہ کفارہ بھی واجب الادا ہے۔ تاریخ دان جان کیسی نے اسے بہترین انداز میں پیش کیا: 'انفرادی طور پر، ریاستوں کے طرزِ عمل کا اندازہ صرف ان کی مدت حیات کے معیار سے لگایا جا سکتا ہے، نہ کہ آج کی مقدمہ بازی کی کسوٹی سے۔ بصورت دیگر، عیسائیوں کو شیروں کا لقمہ بنانے پر، ہم سب اٹلی کی حکومت پر چڑھ دوڑیں گے۔' دلچسپ لیکن ناقابل دفاع۔ برطانوی راج زیادہ ماضی قدیم کی بات نہیں۔ یہ ان لوگوں کی یادداشت کا حصہ ہے جو آج بھی زندہ ہیں۔ یو این پاپولیشن ڈویژن کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق اسی سال سے زیادہ عمر کے ہندوستانیوں کی تعداد ساٹھ لاکھ ہے: برطانوی حکمرانی ان کے بچپن کا ایک ناقابلِ مفر حصہ تھا۔ اگر آپ ان کی تعداد میں ان کی پہلی نسل کے اخلاف کو شامل کر لیں، پچاس اور ساٹھ کے پیٹے کے ہندوستانیوں کو، جن کے والدین نے راج کے ساتھ اپنے تجربات کے متعلق انھیں کہانیاں سنائی ہوں گی، تو اس دور کا براہ راست علم رکھنے والوں کی تعداد دس کروڑ ہندوستانیوں سے تجاوز کر جائے گی۔

کفارے کے لیے دیر ہو رہی ہے، لیکن ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی: مجھے ایک قوی امید ہے کہ، کوئی برطانوی وزیر اعظم 2019 میں جلیانوالہ باغ میں اپنے گھٹنوں پر جھکنے کی ہمت و حوصلہ پالے گا / گی اور ایک صدی قبل اسی جگہ پر ارتکاب کیے گئے ناقابلِ معافی قتلِ عام کے لیے اپنی عوام کے نام پر ہندوستانیوں سے معافی کا خواستگار ہو گا / گی۔ ڈیوڈ کیمرون کا 2013 میں قتلِ عام کا ایک 'انتہائی شرمناک واقعہ' کے طور پر قدرے مجہول بیان، میری نظر میں معافی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی ملکہ الزبتھ اور ڈیوک آف ایڈنبرگ کا 1997 میں اس جگہ کا رسمی دورہ کیا جا سکتا ہے، جنھوں نے مواخذے کے ایک جملے کے بغیر، وزیٹر بک میں محض اپنے دستخط کیے۔ اس بھیانک جرم کی صد سالہ تقریب پر جو بھی وزیر اعظم ہو گا، وہ اس وقت جیوت نہیں رہا ہو گا جب اس

ظلم کا ارتکاب کیا گیا، اور یقیناً 2019 کی کسی بھی برطانوی حکومت پر اس الیے کی ذرہ بھر ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، لیکن قوم کی علامت کے طور پر جس نے کبھی ایسا ہونے دیا تھا، وزیر اعظم اپنی قوم کے گزشتہ گناہوں کے لیے کفارہ ادا کر سکتے ہیں۔ یہی کچھ وزیر اعظم جسٹن ٹراڈو نے 1916 میں کیا، جب، ایک صدی قبل کاماگاٹامارو پر سوار ہندوستانی تارکینِ وطن کو وینکوور میں اترنے کی اجازت دینے سے انکار کے باعث موت کے منہ میں دھکیلنے پر، اس نے کینیڈا کی جانب سے، اپنے ملک کے حکام کے عمل پر معافی مانگی۔ ٹراڈو کی ولی برانڈت ساعت اپنی برطانوی بازگشت حاصل کرنا چاہتی ہے۔

درحقیقت، جیسا کہ لیبر لیڈر جرمی کاربائن نے تجویز پیش کی تھی، انگریزوں کی جانب سے تلافی کی شاید سب سے بہترین شکل یہ ہو سکتی ہے کہ برطانوی سکولوں میں غیر رومانی نو آبادیاتی تاریخ پڑھانا شروع کر دیں۔ برطانوی عوام، برطانوی سلطنت اور ان کے اس کی رعایا کے لیے کیا معانی تھے، کے حقائق سے قابلِ رحم حد تک لاعلم ہے۔ ان دنوں انگلینڈ میں راج کی آرزو کی مراجعت نظر آتی ہے: دی فار پویلینز اور دی جیول ان دی کراؤن جیسی سابقہ اینگلو ناسٹیلجیائی پروڈکشنز پر مبنی، ٹیلیویژن سیریز انڈین سمر کی کامیابی، وہ امید دلاتی ہے، جسے برطانوی ڈومیسائل رکھنے والا ولندیزی مصنف آئین بوروما انگریزوں کو 'معاصر انگلستان خورد کی آزردہ خستہ حالی میں، انتہائی عظیم الشان، بے حد تکلیف دہ، انتہائی تلخ، انگریزیت کے ان کے اجتماعی خوابوں' کی یاددہانی کی کوشش کے طور پر دیکھتا ہے۔ اگر برطانوی سکولوں کے بچے یہ سیکھ جائیں کہ انگریزوں کے وہ خواب ان کی رعایا کے لیے ڈراؤنے خوابوں میں کیسے بدلے، تو حقیقی کفارہ ___ خالص اخلاقی قسم کا، جس میں محض اقبال جرم کی بجائے تاریخی جوابدہی کا سنجیدہ احساس شامل ہو ___ شاید حاصل کیا جا سکے۔

یقیناً، بوروما اسی کی بازگشت تھا، جو کہ ہندوستانی نژاد برطانوی مصنف سلمان رشدی نے چند سال پہلے کہا تھا: 'مسلسل زوال، بڑھتی ہوئی غربت اور اکثر برطانوی تھیچرازم کے حامیوں کی روح کی کمینگی سے بہت سے برطانویوں کو یہ حوصلہ ملتا ہے کہ نوسٹلجیائی انداز میں اپنی فضیلت کی گم گشتہ ساعت کی طرف دیکھیں۔ استعماری آئیڈیالوجی کا دوبارہ زور پکڑنا اور افسانوی راج کی مقبولیت ذہن میں ایک کٹے ہوئے عضو کی خیالی اینٹھن پیدا کرتی ہے..... ان دنوں، تاج کا نگینہ، ایک جعلی ہیرے سے بنایا گیا ہے۔

گو کہ 'برگزٹ' کے نتیجے میں، برطانیہ اب مزید 'تھیچری (تھیچرائیٹ)' نہیں رہا، بلکہ شاید اس سے بھی بدتر ہے۔ برطانوی استعماری نوسٹیلجیا کو مابعد نو آبادیاتی جوابدہی کے ذریعے اعتدال پر لانے کی ضرورت کبھی آج سے

ظلم کا ارتکاب کیا گیا، اور یقیناً 2019 کی کسی بھی برطانوی حکومت پر اس الیے کی ذرہ بھر ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، لیکن قوم کی علامت کے طور پر جس نے کبھی ایسا ہونے دیا تھا، وزیر اعظم اپنی قوم کے گزشتہ گناہوں کے لیے کفارہ ادا کر سکتے ہیں۔ یہی کچھ وزیر اعظم جسٹن ٹراڈو نے 1916 میں کیا، جب، ایک صدی قبل کاما گاٹا مارو پر سوار ہندوستانی تارکین وطن کو وینکوور میں اترنے کی اجازت دینے سے انکار کے باعث موت کے منہ میں دھکیلنے پر، اس نے کینیڈا کی جانب سے، اپنے ملک کے حکام کے عمل پر معافی مانگی۔ ٹراڈو کی ولی برانڈت ساعت اپنی برطانوی بازگشت حاصل کرنا چاہتی ہے۔

در حقیقت، جیسا کہ لیبر لیڈر جرمی کاربائن نے تجویز پیش کی تھی، انگریزوں کی جانب سے تلافی کی شاید سب سے بہترین شکل یہ ہو سکتی ہے کہ برطانوی سکولوں میں غیر رومانی نو آبادیاتی تاریخ پڑھانا شروع کر دیں۔ برطانوی عوام، برطانوی سلطنت اور ان کے اس کی رعایا کے لیے کیا معانی تھے، کے حقائق سے قابلِ رحم حد تک لاعلم ہے۔ ان دنوں انگلینڈ میں راج کی آرزو کی مراجعت نظر آتی ہے: دی فار پویلینز اور دی جیول ان دی کراؤن جیسی سابقہ اینگلو ناسٹیلجیائی پروڈکشنز پر مبنی، ٹیلیویژن سیریز انڈین سمر کی کامیابی، وہ امید دلاتی ہے، جسے برطانوی ڈومیسائل رکھنے والا ولندیزی مصنف آئین بوروما انگریزوں کو 'معاصر انگلستان خورد کی آزردہ خستہ حالی میں، انتہائی عظیم الشان، بے حد تکلیف دہ، انتہائی تلخ، انگریزیت کے ان کے اجتماعی خوابوں' کی یاددہانی کی کوشش کے طور پر دیکھتا ہے۔ اگر برطانوی سکولوں کے بچے یہ سیکھ جائیں کہ انگریزوں کے وہ خواب ان کی رعایا کے لیے ڈراؤنے خوابوں میں کیسے بدلے، تو حقیقی کفارہ ___ خالص اخلاقی قسم کا، جس میں محض اقبال جرم کی بجائے تاریخی جوابدہی کا سنجیدہ احساس شامل ہو ___ شاید حاصل کیا جا سکے۔

یقیناً، بوروما اسی کی بازگشت تھا، جو کہ ہندوستانی نژاد برطانوی مصنف سلمان رشدی نے چند سال پہلے کہا تھا: 'مسلسل زوال، بڑھتی ہوئی غربت اور اکثر برطانوی تھیچرازم کے حامیوں کی روح کی کمینگی سے بہت سے برطانویوں کو یہ حوصلہ ملتا ہے کہ نوسٹلجیائی انداز میں اپنی فضیلت کی گم گشتہ ساعت کی طرف دیکھیں۔ استعماری آئیڈیالوجی کا دوبارہ زور پکڑنا اور افسانوی راج کی مقبولیت ذہن میں ایک کٹے ہوئے عضو کی خیالی اینٹھن پیدا کرتی ہے..... ان دنوں، تاج کا نگینہ، ایک جعلی ہیرے سے بنایا گیا ہے۔

گو کہ 'برگزٹ' کے نتیجے میں، برطانیہ اب مزید 'تھیچری (تھیچرائیٹ)' نہیں رہا، بلکہ شاید اس سے بھی بدتر ہے۔ برطانوی استعماری نوسٹیلجیا کو مابعد نو آبادیاتی جوابدہی کے ذریعے اعتدال پر لانے کی ضرورت کبھی آج سے

زیادہ نہیں ہو سکتی۔

اور پھر برطانوی حکمرانی میں ہندوستانی ملی بھگت کا معاملہ ہے۔ ہندوستانی کالم نگار آکار پٹیل کی رائے تھی کہ ہم اس بات سے اتفاق نہیں کر سکتے کہ برطانوی 'قبضہ ہندوستانیوں کی سہولت کاری اور حوصلہ افزائی کے ذریعے ہوا'۔ در حقیقت، جیسا کہ میں اس کتاب میں صراحت سے بیان کروں گا، ہندوستانی اگر سب میں نہیں تو اکثر بد اعمالیوں میں شریک جرم تھے۔ ہندوستانی راجاؤں کے حوالے سے یہ خاص طور پر درست ہے، جنھوں نے، جب ایک مرتبہ برطانوی حکومت پوری طرح قائم ہو گئی، تو برطانویوں کے پاس اپنی راست بازی رہن رکھنے کے بدلے اپنی دولت اور عیش و آرام کے تحفظ کے لیے روح بیچنے کا سودا (فاؤسٹین بار گین) قبول کیا۔ یہ معمولی حکمران تاج برطانیہ کے ساتھ وفاداری ثابت کرنے کے لیے اپنی آخری حد تک گئے ___ چنانچہ کر کٹر کنور رنجیت سنہجی، نے پہلی جنگ عظیم کے دوران، محتاج کر دینے والی ایک خشک سالی میں اپنے کسانوں کو پابند کیا کہ برطانوی چندے کے ڈبے میں حصہ ڈالیں؛ اور جبکہ اس کی ریاست قحط کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی، اس نے، ایک دورے پر آنے والے وائسرائے کے لیے، آتشبازی کے مظاہرے پر واقعتاً ایک مہینے کے محاصل برباد کر دیے۔ اس طرح کے واقعات نو آبادیاتی پراجیکٹ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے والی ہندوستانی اشرافیہ کی جانب سے، عیاں ہونے والی ملی بھگت میں کسی بھی طرح اچنبھے والی بات نہیں تھے۔

کئی اور معروف ہندوستانی بھی سلطنت کے حامی تھے، خاص طور پر بنگالی دانشور اور بے شرم انگریزیت زدہ، نیراد. سی. چوہدری، جس نے کتابوں کی ایک سیریز میں برطانوی سلطنت کی خوبیوں کو سراہا اور اس کے خاتمے پر افسوس کا اظہار کیا۔ (ہم اس کتاب میں مخصوص مثالوں پر بعد میں بات کریں گے۔) بہت سے عام ہندوستانیوں نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا، اکثر کبھی یہ سمجھے ہی نہیں کہ اس معاملے میں ان کے پاس کوئی متبادل صورت موجود ہے۔ لیکن جب ایک لٹیرا آپ کے گھر کو تباہ کرتا ہے اور آپ کا زرِ نقد اور زیورات چھین لیتا ہے تو اس کے اعمال کے لیے اس کی جواب دہی کہیں زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت اس ملازم کے جس نے اس کے لیے دروازہ کھولا، چاہے خوف، طمع یا محض اس وجہ سے کہ وہ اس سے بہتر سے آشنا نہیں تھا۔

برطانویوں نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا، اسے بیان کرتے اور اس کا سامنا کرتے ہوئے، کیا آج جس صورتحال سے ہم دوچار ہیں اس کے لیے ہم اپنی ذمہ داری کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں؟ کیا اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہمارے ساتھ جو کچھ بھی غلط ہوا اس کے لیے صرف برطانوی ذمہ دار ہیں؟ یقیناً نہیں۔ کچھ

مصنفین نے توضیح کی ہے کہ شرح نمو اور ترقی کے لیے مضبوط اداروں کی تشکیل اور دانشمندانہ میکرو معاشی پالیسیاں درکار ہوتی ہیں، نہ کہ ماضی کی ناانصافیوں کی تکرار۔ میں اس پر زور دینا چاہتا ہوں کہ میں اس سے متفق ہوں۔ میں تاریخ کو اس نظر نہیں دیکھتا کہ آج چیزوں کو درست کرنے کی ضرورت کے حوالے سے اپنے ملک کو بری الذمہ قرار دے سکوں۔ بلکہ میں ماضی کی کوتاہیوں کو سمجھنا چاہتا ہوں، کیا چیز ہمیں ہماری موجودہ حالت تک لے آئی، اس کی تفہیم اور دوسرا فی نفسہٖ ماضی کو سمجھنے کے لیے۔ ضروری نہیں کہ ماضی مستقبل کار ہنما ہو، لیکن یہ کسی حد تک حال کی وضاحت کرنے میں مدد کرتا ہے۔ جیسا کہ میں کہیں اور لکھ چکا ہوں، کوئی بھی تاریخ سے انتقام نہیں لے سکتا؛ تاریخ خود اپنا انتقام لیتی ہے۔

اس کتاب کے بارے میں ایک آخری تنبیہ۔ میں نے اس حقیقت کے پورے ادراک کے ساتھ، ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کے بارے میں لکھا ہے کہ 'ہندوستان' جس کا حوالہ میں دے رہا ہوں وہ اب وجود نہیں رکھتا بلکہ اب تین علیحدہ ممالک میں ڈھل چکا ہے۔ بہت کچھ جو مجھے کہنا پڑا اس کا اطلاق آج کے بنگلہ دیش اور پاکستان کے خود مختار ممالک پر بھی ہوتا ہے۔ یہ غیر آمادہ غیر ملکیوں کو اپنے دلائل کے ساتھ وابستہ کرنے کے لیے نہیں، بلکہ یہ تسلیم کرنے کے لیے ہے کہ میرا کیس ان کا بھی ہے، اگر وہ اسے اپنانا چاہیں تو۔ آج بھی، کم و بیش دو صدیوں پرانے ہندوستان کے بارے، میں 2016 کے ہندوستانی کے طور پر لکھتا ہوں، (میں) اخلاقی اور جغرافیائی طور پر اس سرزمین سے تعلق رکھنے کے احساس کے ذریعہ تحریک پاتا ہوں، جس پر راج نے کبھی انتہائی اذیت ناک مظالم ڈھائے تھے۔ ہندوستان میرا وطن ہے، اور اس لحاظ سے میرا غم و غصہ ذاتی ہے۔ لیکن میں تاریخ سے کسی چیز کا طلبگار نہیں ___ ماسوائے اس کی اپنی سرگزشت کے۔

اس کتاب کے اغلاط سے پاک ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں، جو کہ صرف علم کل کے لیے ہے۔ ایسے حقائق بالکل ہو سکتے ہیں جن کے بارے میں میں لاعلم ہوں، جو میرے دلائل میں سے چند ایک کو برباد یا ان کا اعتبار ختم کر دیں۔ پھر بھی، آپ کے سامنے جو نسخہ ہے وہ اس معنویت کا ابلاغ کرتا ہے جو اپنے ملک کے ماضی قریب کے متعلق میرا فہم ہے۔ جیسا کہ برطانوی سلطنت سے ہندوستان کی آزادی کی سترہویں سالگرہ قریب آرہی ہے، ہمارے لیے یہ تجزیہ کرنا کارآمد ہے کہ وہ کونسی چیز تھی جو 1947 میں ہمیں ہمارے نئے مقام روانگی تک لے آئی اور اس میراث کا جس نے اس ہندوستان کی صورت گری میں مدد کی جس کی تعمیر نو کا ہم عزم کرتے رہے ہیں۔ میرے نزدیک اس کتاب کے وجود کی بنیادی وجہ یہی ہے۔

ہندوستانی ناول نگار امیتاو گھوش کے "پوست کا سمندر (سی آف پوپیز)" میں ایک برطانوی بحری کپتان کہتا ہے، 'جب ہم لوگوں کو قتل کرتے ہیں، تو ہم یہ دکھاوا کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں کہ یہ کسی اعلیٰ مقصد کے لیے ہے۔ میں آپ کو زبان دیتا ہوں، فضیلت کا یہی دکھاوا ہے، جسے تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی'۔ میں تاریخ کی جانب سے لکھنے کی جسارت نہیں کر سکتا، لیکن ایک ہندوستانی کے طور پر، بھول جانے کی نسبت معاف کرنا میں زیادہ آسان سمجھتا ہوں۔

باب اوّل

ہندوستان کا مالِ غنیمت

باب اوّل

ہندوستان کا مالِ غنیمت

ڈیورانٹ کی برہمی-ایسٹ انڈیا کمپنی-ایک کارپوریشن کی ہندستان کی فتح-ہندستان کی صنعت کا قلع قمع-ہندوستانی پارچہ بافی (ٹیکسٹائل) کی بربادی-(سرمایہ کا) نکاس، محصولات و جواہرات-کلائیو اور پلاسی-نابز-کرپشن-مالیات کی وصولی اور وسائل کا اخراج-دائمی بندوبست-ہندوستان کی (برطانوی) سلطنت کے لیے عسکری شرکت-نوروجی پر فرد جرم-جہاز رانی اور جہاز سازی کی تباہی-ہندوستانی دھات سازی کا سرقہ-ہندستان نے صنعتی انقلاب کا موقع کیسے کھویا-اسکاٹ لینڈ والوں کا مفاد۔

ایک نوجوان امریکی مورخ اور فلاسفر، ول ڈیورانٹ نے 1930 میں پہلی مرتبہ ہندوستان کے ساحلوں پر قدم رکھا۔ وہ دنیا کے سفر پر روانہ ہوا تھا کچھ ایسا تالیف کرنے کے لیے، جو بعد میں "تہذیب کی کہانی" کی عظیم الشان گیارہ جلدیں بن گیا۔ لیکن اس کے اپنے الفاظ میں، جو کچھ اس نے برطانوی شعور اور ہندوستان کی عمداً خوں ریزی (بلیڈنگ) کے حوالے سے دیکھا اور پڑھا، اس نے اسے اتنا متحیر اور طیش زدہ کر دیا، کہ اسنے آج تک کی تاریخ میں ہونے والے اس فاش ترین جرم کی پرجوش مذمت کو احاطہ تحریر میں لانے کے لیے اپنی سابقہ تحقیق پس پشت ڈال دی۔ اس کی مختصر کتاب "ہندوستان کا مقدمہ" آج بھی مستند ہے، کراہت اور جذبہ سے بھرپور گہری ہم گداز تالیف جس نے برطانیہ کی ہندوستان میں لوٹ مار کے طویل اور شرمناک ریکارڈ کی خود پرستانہ توجیہات کی دھجیاں بکھیر دیں۔ جیسا کہ ڈیورانٹ نے لکھا:

> ہندوستان پر برطانوی قبضہ، قطعاً کسی بھی جواز یا اصول کے بغیر، ایک تجارتی کمپنی (برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی) کی ایک اعلیٰ تہذیب پر یلغار اور تباہی تھی، فن سے بے نیاز اور غلے کی حریص، عارضی طور پر منتشر و بے یار و مددگار مملکت کو آگ اور تلوار سے تاراج کرنا، رشوت دینا اور قتل کرنا، الحاق کرنا اور لوٹ لینا، اور قانونی و غیر قانونی لوٹ مار کے اس پیشہ کا آغاز، جو 173 سالوں سے اب تک (1930) بے رحمی سے جاری و ساری ہے۔

ہندوستان پر کارپوریشن کی فتح

اٹھارھویں صدی کے دوران ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے بکھرنے اور اقتدار کے لیے متحارب متعدد جنگجو ریاستوں کے ابھرنے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، برطانیہ نے اپنے توپ خانے کی طاقت اور اپنے اخلاقی دیوالیہ پن کی کلبیت کے ذریعے وسیع خطے کو محکوم بنالیا۔ انھوں نے نوابوں اور مہاراجوں کو کسی بھی قیمت کے لیے برطرف کیا، خزانوں کو جیسے دل چاہا خالی کیا، ان کی ریاستوں پر مختلف حیلوں سے قبضہ کیا (بشمول، 1940 سے، "ڈاکٹرائن آف لیپس" انسان دشمن لاوارث کے اصول کہ جب بھی کوئی حکمران وارث کے بغیر مر جائے)، اور کسانوں سے ان زمینوں کی ملکیت ہتھیالی جن پر وہ نسلوں سے کاشت کاری کرتے آرہے تھے۔ کمپنی عہدیدار جان سلیوان (اوٹاکامنڈ یا اوٹھی، آجکل ادھگامنڈلم کے نام سے منسوب پہاڑی سیر گاہ کی بنیاد رکھنے کے طور پر زیادہ مشہور) 1940 میں بیان کرتا ہے کہ، ہر دیسی ریاست کے انضمام کے ساتھ، چھوٹے دربار ناپید ہو رہے ہیں—تجارت مضمحل ہو رہی ہے—سرمایہ روبہ زوال ہے—عوام کنگال ہو چکی ہے—انگریز ترقی کر رہے ہیں، اور اسفنج کی طرح عمل کرتے ہیں، گنگا کے کناروں سے دولت چوس لیتے ہیں، اور تھیمز کے کناروں پر نچوڑ دیتے ہیں۔

ہندوستان جسے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے فتح کیا وہ کوئی غیر متمدن یا بنجر سرزمین نہ تھا، بلکہ قرونِ وسطیٰ کا چمکتا ہوا نگینہ تھا۔ اس کے کارنامے اور خوشحالی۔ وسیع اور مختلف النوع صنعتوں کی پیدا کردہ دولت کے متعلق—یارکشائر کے پیدائشی ایک امریکی موحد وزیر، جے۔ ٹی۔ سندرلینڈ نے اختصار سے بیان کیا ہے:

> تقریباً ہر قسم کی دستکاری یا مصنوعات جن سے مہذب دنیا واقف تھی۔ قریباً ہر قسم کی انسانی ذہن و ہاتھ کی تخلیق، جو کسی بھی خطہ میں پائی جاتی ہو، اور اپنے استعمال یا حسن کی وجہ سے جس کی قدر ہو، ہندوستان میں عرصہ دراز سے اس کی پیداوار کی جاتی تھی۔ ہندوستان، یورپ کی یا ایشیا کی کسی بھی قوم کی نسبت زیادہ عظیم صنعتی و پیداواری قوم تھی۔ اس کے پارچہ جات۔ اس کی کھڈی کی عمدہ مصنوعات، سوت، پشم، لیلن اور ریشم پوری مہذب دنیا میں مشہور تھیں؛ اسی طرح اس کے عمدہ زیورات اور اس کے خوبصورت شکلوں میں تراشے ہوئے قیمتی پتھر؛ ایسے ہی اس کی کوزہ گری، چینی مٹی کی ظروف سازی اور ہر طرح کی سرامکس، معیار، رنگ اور خوبصورت بناوٹ؛ ایسے ہی اس کی دھات، لوہے، سٹیل، سلور اور سونے پر نفیس کشیدہ کاری۔

اس کے پاس عظیم الشان فن تعمیر ہے۔ حسن میں دنیا کے کسی بھی ملک کے برابر۔ اس کے پاس انجنیئرنگ کی عظیم تعمیرات ہیں۔ وہاں اعلیٰ پائے کے سوداگر، تاجر، بینکار اور سرمایہ کار ہیں۔ نہ صرف وہ جہاز سازی میں عظیم قوم ہے بلکہ زمینی و سمندری تجارت اور بیوپار میں بھی عظیم ہے، جس کا دائرہ تمام معلوم مہذب دنیا تک وسیع ہے۔ یہ تھا وہ ہندوستان جو برطانیہ کو ملا جب وہ یہاں آئے۔

اٹھارھویں صدی کے اوائل میں، جیسا کہ برطانوی معاشی تاریخ دان انگس میڈیسن واضح کرتا ہے، عالمی معیشت میں ہندوستان کا حصہ 23 فیصد تھا، اتنا بڑا جتنا کہ تمام یورپ کا مشترکہ۔ (1700ء میں جب مغل شہنشاہ اورنگزیب کے خزانہ میں صرف محصولات کی آمدن 10 کروڑ پونڈ تک پہنچ چکی تھی تو یہ 27 فیصد تھا)۔ جب برطانیہ ہندوستان سے نکلا تو یہ محض 3 فیصد سے کچھ اوپر تک رہ گیا تھا۔ وجہ عام فہم تھی؛ ہندوستان پر برطانوی مفادات کے لیے حکومت کی گئی۔ برطانیہ کے 200 سالہ عروج کو اس کی ہندوستانی لوٹ کھسوٹ سے پروان چڑھایا گیا۔

اس سب کی شروعات ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ ہوئی، جس کی تشکیل 1600ء میں عزت مآب ملکہ ایلزبتھ اول نے ریشم، مصالحہ جات اور دوسری منافع بخش ہندوستانی مصنوعات کی تجارت کے لیے شاہی فرمان کے ذریعے کی۔ کمپنی نے اپنی تجارت کو تقویت دینے کے لیے ہندوستانی ساحلوں، خاص طور پر کلکتہ، مدراس اور بمبئی کے ساتھ فوجی چوکیاں یا فیکٹریاں تعمیر کیں؛ بتدریج ان میں اپنی حدود، عملہ اور تجارت کا عسکری ذرائع سے دفاع، بشمول اس سرزمین پر بڑھتی ہوئی فسادزدگی میں فوجی بھرتی، کی ضروریات شامل ہونے لگیں (اس کے منشور نے اسے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے جنگ چھیڑنے کا جواز فراہم کیا)۔ ایک تجارتی کاروبار بہت جلد تسخیر کا بیوپار بن گیا، تجارتی چوکیوں کو قلعہ جات سے کمک بہم پہنچائی گئی، سوداگروں کو فوجوں سے بدل دیا گیا۔

برطانیہ کا پہلا 'گماشتہ' ولیم ہاکنز، اپنے ساتھ ہوئے سلوک کو ناکافی تکریم خیال کرتا ہے، اس کے بادشاہ کا تمسخر اڑایا جاتا ہے اور اس کے اثاثہ جات کی تحقیر۔ جب پہلا برطانوی سفیر، سر تھامس روَ، 1615 میں مغل شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں اپنی سرکاری اسناد (Credentials) پیش کرتا ہے، تو انگریز دنیا کے طاقتور ترین اور سب سے متمول شہنشاہ کے قدموں میں عرض گزارتا ہے۔ سلطنت مغلیہ کابل سے بنگال کے مشرقی کناروں تک، اور شمال میں کشمیر سے جنوب میں کرناٹک تک پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن ڈیڑھ صدی سے بھی کم عرصے،

1739 میں ایرانی نادر شاہ کے ہاتھوں دہلی کی عبرت ناک غارت گری اور اس کے خزانوں کی لوٹ مار کے بعد یہی مغلیہ سلطنت بکھرنے کی حالت میں تھی۔ مغل دارالحکومت آٹھ ہفتوں تک لٹتا اور جلتا رہا؛ 50 کروڑ روپے مالیت کے سونے، چاندی، جواہرات اور سامان زیبائش کے ساتھ ساتھ شاہی خزانے کا تمام مال اور شہنشاہ کا داستانوی تخت طاؤس قبضہ میں لے لیا گیا، ہاتھی اور گھوڑے فوجی خدمات کے لیے ہتھیا لیے گئے؛ اور پچاس ہزار لاشیں گلیوں میں بکھری رہنے دیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب نادر شاہ اور اس کی فوجیں واپس لوٹیں، تو وہ ہندوستان سے اتنا لوٹ چکی تھیں کہ ایران میں اگلے تین سال کے لیے محصولات ختم کر دیئے گئے۔

اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی طوائف الملوکی کے درمیان، صوبائی حکمرانوں نے اپنے اپنے علاقوں میں اقتدار سنبھال لیا، اقتدار کے حریفوں (خاص طور پر مراٹھوں) نے مرکزی حکومت کے عوض اپنے اقتدار کا دعویٰ کر دیا، بہت سے تو دہلی میں مغل بادشاہ کے ساتھ معمولی وفاداری کے طفیل خود کو نواب اور مہاراجہ کہلوانے لگے۔ 1757 میں رابرٹ، بعد میں لارڈ کلائیو کے زیر کمان، کمپنی نے بنگال کے حکمران نواب سراج الدولہ کے خلاف، برتر توپخانے اور مزید برتر چال بازی کے اختلاط کے ذریعے، نواب کے ایک قریبی امیر میر جعفر، جسے کمپنی نے بنگال کے حقیقی اقتدار کے عوض تخت پر بیٹھایا، کی غداری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، پلاسی میں مشہور فتح حاصل کی۔ کلائیو جلد ہی اس قابل ہو گیا کہ 25 لاکھ پونڈ کی شاہانہ رقم (آج کے دور میں 25 کروڑ پونڈ، نواب کے خزانے کا تمام مال) بطور مال غنیمت، انگلینڈ میں کمپنی کے خزانے میں منتقل کر سکے۔

اگست 1765 میں، نوجوان و نحیف مغل بادشاہ، شاہ عالم دوم کو ایک دیوانی کے اجراء کے لیے دھمکایا گیا، جس نے صوبہ بنگال، بہار اور اوڑیسہ میں اس کے اپنے محکمہ مال کے افسران کو کمپنی افسران کے ساتھ بدل دیا۔ ایک بین الاقوامی کارپوریشن اپنی نجی فوج اور اسے تعظیم پیش کرتے شہزادگان کے ساتھ، اب باضابطہ طور پر محصولات وصول کرنے والی ایک انٹرپرائز بن گئی۔ ہندستان اب دوبارہ پہلے جیسا کبھی نہیں ہو سکے گا۔

انیسویں صدی کی ابتداء پر، پلاسی کے بعد سو سال میں، ایسٹ انڈیا کمپنی نے دو لاکھ ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ اور برطانوی حکومت اور پارلیمنٹ (جس کے بہت سے ممبران اس انٹرپرائز میں حصہ دار تھے) کی معاونت سے اپنا تسلط ہندوستان کے زیادہ تر حصے پر قائم کر لیا تھا۔ اس وقت تک کمپنی بہت سی آزاد اور خود مختار ریاستوں کو فتح اور ضم کر چکی تھی، لندن سے طبقہ اشرافیہ کے گورنر جنرل کے تقرر کے ایک سلسلے کے ذریعے انتظامیہ کی حاکیت کا نفاذ کیا گیا، ملکی تجارت کے قواعد مرتب کیے، محصولات جمع کیے اور ہندوستانی زندگی کے ہر

پہلو پر اپنے فرامین نافذ کیے۔ 1803 میں، شاہی شامیانہ کے نیچے خوف سے دبکے بوڑھے مغل شہنشاہ کی تلاش میں کمپنی کی افواج نے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ لارڈ ڈلہوزی نے 1847 میں کمپنی کے گورنر جنرل کے طور پر اقتدار سنبھالنے کے آٹھ سال کے اندر ہندوستانی حکمرانوں کا ڈھائی لاکھ میل علاقہ ہتھیالیا۔

ان کے خلاف 1857 میں اعلانیہ انقلاب، جو آنے والے سالوں میں تاج (برطانیہ) کو برطانوی علاقوں کی حکومتیں سنبھالنے کی جانب لے گیا کے برپا ہونے تک، ایسٹ انڈیا کمپنی 20 کروڑ سے زیادہ لوگوں کی تقدیر پر حکمرانی کرتی رہی، ان کی معاشی، سماجی اور سیاسی زندگیوں کے فیصلے کرتی رہی، سماج اور تعلیم کی نئی شکل گھڑتی رہی، ریلوے کو متعارف کروایااور برطانیہ میں صنعتی انقلاب کے آغاز پر سرمایہ کاری کرتی رہی۔

یہ بعد کے ادوار میں، اسی کی چونکا دینے والی اور عدیم النظیر مثال تھی، جس کی 1970 کے عشرے میں مارکسسٹوں نے دنیا کے لیے خوفناک پیشگوئی کی تھی: ملٹی نیشنل کمپنی کی حکمرانی، اپنی خاطر اور اپنے ہی ذریعے۔

اگرچہ مغل شہنشاہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹران کے نام فرامین میں (انھیں) یوں مخاطب کرتا: "عظیم و عالی مقام، بلند مرتبت، عالی انصاب میں شریف تر، نامور دلاوروں کے سرخیل، ہمارے وفادار خادم اور مخلص خیر اندیش، ہماری شاہی عنایات کے لائق، انگلش کمپنی"، اس کے باوجود ایک نقطہ دار لکیر پر دستخط کرنے کے علاوہ کسی قسم کی شاہی عنایات کی ضرورت نہ تھی۔ شاہ عالم دوم اور اس کے جانشین کمپنی کی مرہونِ منت زندگی گزار رہے تھے، نام کے سوا وہ قیدی اور پنشنرز تھے۔ "کیا عزت رہ گئی ہے ہماری؟" مورخ ولیم ڈلریمپل، 1765 کے بعد نارائن سنگھ نام کے ایک مغل افسر کی اس بات کا حوالہ دیتا ہے، "کیا اب ہم نے ان مٹھی بھر تاجروں سے ہی احکامات لینے ہیں جنھوں نے ابھی صحیح طرح اپنا پچھواڑہ دھونا بھی نہیں سیکھا؟" لیکن عزت اس کے شہنشاہ کے وفادار خدام اور مخلص خیر خواہان کے لیے غیر متعلقہ کار تھا۔ کمپنی ہندوستان کو چلا رہی تھی، اور دوسری تمام کمپنیوں کی طرح، اس کا بھی بنیادی سروکار ایک ہی تھا، لندن میں اس کے سرمایہ دار عہدیداران کی طرف سے تفویض کیا گیا: حرف آخر۔

ہندوستان میں صنعتی تباہی (Deindustrialisation):

ٹیکس، کرپشن اور نابین

برطانوی حکومت نے، کمپنی کے عروج کو فوجی اور بحری ذرائع کی اعانت دی، قانون سازی کا اختیار دیا،

(پارلیمنٹ میں، کمپنی کے سٹیک ہولڈرز، کو کئی مواقع پر تیار کیا)، بینک آف انگلینڈ سے قرضہ جات اور ایک معاون خارجہ پالیسی جس کا مقصد مقامی مزاحمت پر غلبہ پانا اور فرانسیسی اور ولندیزیوں جیسے بدیسی حریفوں کا مقابلہ کرنا تھا، لیکن جیسا کہ کمپنی کا بنیادی محرک اقتصادی تھا، ویسے ہی اس کی حکومت کے، ہندوستان اور خود برطانیہ دونوں کے لیے زیادہ تر ثمرات بھی اقتصادی تھے۔

برطانیہ کا صنعتی انقلاب ہندوستان کی پھلتی پھولتی مصنوعات سازی / دستکاری کی صنعت کی تباہی پر تعمیر ہوا۔ اس معاملہ میں پارچہ بافی ایک نمائندہ کیس ہے: ہندوستان کی پارچہ بافی کو انگلینڈ میں تیار ہونے والی برطانوی پارچہ بافی کے عوض، برطانیہ نے بہت منظم انداز میں، ہندوستان کی پارچہ بافی کی صنعت اور برآمدات کو برباد کرنے کا آغاز کیا۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو، برطانیہ خام مال ہندوستان کا استعمال کرتا، اور تیار مصنوعات واپس ہندوستان اور باقی دنیا کو برآمد کرتا۔ زخموں پر صنعتی برابری کا نمک چھڑکتا۔

ہندوستان کے ساتھ پارچہ بافی میں کاروباری مسابقت کی لائی ہوئی برطانوی بربادی، جدید دنیا کی پہلی سب سے بڑی صنعتی تباہی پر منتج ہوئی۔ انگلینڈ میں ہندوستانی کھڈی کے بنے کپڑے کی مانگ بہت زیادہ تھی؛ یہ کوئی اتفاق نہیں تھا کہ کمپنی نے 1613 میں اپنی پہلی فیکٹری، قلمکاری پارچہ جات کے لیے مشہور، مسولیپٹنم کی جنوبی بندرگاہ کے شہر میں لگائی۔ صدیوں سے بنگال کی کھڈیوں پر کام کرنے والے جولاہے، دنیا کا سب سے عمدہ کپڑا تیار کر رہے تھے، خاص طور پر نفیس ململ، "بُنی ہوئی ہوا" کی طرح لطیف، کہ یورپی درزی جس کے حریص تھے۔ اٹھارویں صدی کے وَسط تک بھی، بنگال کے پارچہ جات منتظم طور پر قائم شدہ تجارتی راستوں کے ذِریعے، مغرب میں مصر، ترکی اور ایران کو، مشرق میں جاوا، چین اور جاپان کو اور اس کے ساتھ ساتھ یورپ کو بھی بَرآمد کیے جاتے تھے۔ اکیلے بنگال کے پارچہ جات کی برآمداتی مالیت کا تخمینہ 1750 کی دہائی میں تقریباً ایک کروڑ ساٹھ لاکھ روپے سالانہ تھا، جس میں سے پچاس سے ساٹھ لاکھ روپے مالیت کی بَرآمدات، ہندوستان میں یورپی تاجر کرتے تھے۔ (ان دنوں شرح مبادلہ میں، یہ کل رقم تقریباً بیس لاکھ پونڈ بنتی تھی، اس دور میں ایک کثیر رقم تھی، جب ایک پونڈ فی ہفتہ کمانے والا امیر آدمی سمجھا جاتا تھا۔) مزید یہ کہ، بنگال سے ریشم کی برآمدات کی مالیت، 1753 تک پینسٹھ لاکھ روپے سالانہ اس کے علاوہ تھی، جو اس کے بعد قریباً پچاس لاکھ روپے تک گر گئی۔ اس صدی کے دوران 1757 تک، جب برطانوی حکمران نہیں بلکہ صرف تاجر تھے، تو ان کی مانگ نے، بنگال کے پارچہ جات اور ریشم کی پیداوار میں تقریباً 33 فیصد اضافہ کیا۔ ہندوستانی پارچہ بافی کی صنعت مزید تخلیق،

اختراعی اور پیداواری ہوئی؛ برآمدات بڑھ گئیں. لیکن جب برطانوی تاجروں کو اقتدار مل گیا، تو سب کچھ بدل گیا۔

برطانوی جب اقتدار میں آئے، تو ایک لفظ میں، وہ بے رحم تھے۔ انھوں نے پارچہ جات اور ریشم کی ادائیگی برطانیہ سے لائے گئے پونڈز میں بند کر دی، اور بنگال سے وصول کردہ محاصل سے ادائیگی کرنے کو ترجیح دینے لگے، اور اس کے ساتھ قیمتیں کم رکھنے کے لیے بھی زور لگانے لگے۔ انھوں نے دوسرے غیر ملکی خریداروں کو نکال باہر کیا اور کمپنی کی اجارہ داری قائم کرنی شروع کر دی۔ انھوں نے خود انحصار، دیرینہ تجارتی تعلقات میں مداخلت کر کے، ہندوستانی پارچہ جات کے لیے بیرونی منڈیاں بند کر دیں۔ جیسے جیسے برطانوی صنعت ترقی کرتی گئی، وہ یہ حد بھی پار کر گئے۔ ہندوستانی پارچہ جات غیر معمولی طور پر سستے تھے—اس حد تک کہ برطانوی کپڑے کے صنعت کار اس کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ تھے، لہٰذا چاہتے تھے کہ انھیں ختم کر دیا جائے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہی منظم طریقے سے بنگالی جولاہوں کی کھڈیوں کو برباد کرنے پر معمور تھے، اور کم از کم ایک معاصر بیان کے مطابق (اس کے ساتھ ساتھ چاہے ناقابلِ تصدیق ہی سہی، عام مروج اعتقاد کے مطابق) ان کے انگوٹھے توڑنا تاکہ وہ اپنی صناعی کو بروئے کار نہ لا سکیں۔

بے ڈھنگی تباہی، تاہم محض یہی نہیں تھی۔ اس سے زیادہ شاطرانہ جدید تکنیک۔ بچے کھچے جو بھی ہندوستانی پارچہ جات تھے پر 70 سے 80 فیصد محصولات وچنگی کے نفاذ کی شکل میں موجود تھی، جو ان کی برطانیہ کو برآمد ناقابلِ عمل بنا دیتی۔ لہٰذا ہندوستانی کپڑا اب مزید سستا نہیں رہ گیا تھا۔ اسی دوران، برطانیہ کی نئی سٹیم ملوں سے لا کر، سستے برطانوی کپڑے کے انبار سے، ہندوستان کی منڈی بھر دی گئی، جو کہ کم محنتانہ لینے والے بنگالی کے تیار کردہ کپڑے سے بھی سستا تھا۔ ہندوستانی بدلے میں برطانوی مصنوعات پر محصولات نہیں لگا سکتے تھے۔ چونکہ برطانیہ کا حکومت اور بندرگاہوں دونوں پر تسلط تھا، اور تجارتی ضوابط وہ اپنے ہی مفاد کے لیے طے کرتا تھا۔

ہندوستان اٹھارویں صدی کے اوائل میں کپڑے کی عالمی تجارت کے 25 فیصد حصے سے استفادہ کرتا تھا۔ لیکن اسے برباد کر دیا گیا؛ کمپنی کا اپنا جاں نثار ناظم لارڈ ولیم بینٹنک رقمطراز ہے کہ 'سوت بننے والوں کی ہڈیاں ہندوستان کے میدانوں کو سفید کیے جا رہی تھیں۔'

ہندوستان آج بھی کپاس اگاتا ہے، لیکن زیادہ تر برطانیہ بھجوانے کے لیے۔ اس کا زیادہ تر حصہ نہ تو اب یہ

ملک مزید کاتتا ہے اور نہ ہی بنتا ہے۔ استاد کاریگر بھکاری بن گئے۔ اس سے جو تباہی ہوئی اس کی ایک واضح تصویر ڈھاکہ میں دیکھی جاسکتی ہے، جو کہ کبھی ململ کی پیداوار کا عظیم مرکز رہا تھا، جس کی 1760 میں کئی لاکھ کی آبادی 1820 تک، گر کر پچاس ہزار کے قریب رہ گئی۔ (ڈھاکہ، موجودہ بنگلہ دیش کا دارالخلافہ، مناسب طور پر، ایک بار پھر کپڑے اور ملبوسات کی پیداوار کا ابھرتا ہوا مرکز ہے۔)

برطانیہ کی ہندوستان کو کپڑے کی برآمدات یقیناً بڑھی تھیں۔ 1830 تک یہ سوتی مصنوعات چھ کروڑ گز سالانہ تک پہنچ چکی تھیں؛ 1858 میں یہ 96 کروڑ 80 لاکھ گز تک پہنچ چکی تھیں؛ 1870 میں یہ ایک ارب سے زائد ہو گئیں ـــــ ہر ایک ہندوستانی مرد، عورت اور بچے کے لیے تین گز سے بھی زیادہ۔

نوآبادیاتی تجارتی حکمت عملی کے باعث دستکارانہ صنعتوں کی تباہی نے محض دستکاروں کو ہی متاثر نہیں کیا۔ بلکہ صنعتی پیداوار پر برطانوی اجارہ داری، ہندوستانیوں کو، زمین کی استعداد کی حد سے بھی زیادہ زراعت کی جانب لے گئی۔ موجودہ محروم لوگ، جو کہ سابقہ دستکار تھے، کی آمد کے باعث کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں کو بھی نتائج بھگتنے پڑے، کیونکہ اس سے دیہی اجرت میں کمی آگئی۔ بہت سے دیہی خاندانوں میں، عورتیں گھروں میں کاتتی اور بنتی تھیں جبکہ ان کے مرد کھیتوں میں کاشت کاری کرتے تھے؛ اچانک دونوں ہی متاثر ہو گئے، اور اگر موسم و خشک سالی کی وجہ سے ان کا زرعی کام کم ہو جاتا تو ان کے پاس کپڑے سے متبادل ذریعہ آمدن بھی نہیں بچا تھا۔ برطانوی کارروائیوں کا براہ راست نتیجہ دیہی غربت تھا۔

سلطنت کے عذرخواہوں کی رائے ہے کہ برطانوی سوچی سمجھی حکمت عملی کی بجائے، ہندوستانی پارچہ بافی کی صنعت کو برطانوی صنعتی انقلاب کی مشینوں نے اسی طرح ختم کر دیا تھا، جس طرح روایتی ہاتھ سے بنے پارچہ جات کو یورپ اور باقی دنیا میں ختم کر دیا تھا: جبکہ اس مطالعہ میں، اگر وہ برطانوی طاقت کے آگے ڈھیر نہ ہو جاتے تو پچاس سالوں کے اندر، جدید مشنری کا استعمال کرتے ہوئے، جولاہے ہندوستانی ٹیکسٹائل ملوں میں تبدیل ہو چکے ہوتے۔ یوں ہندوستانی جولاہے محض صنعتی علم کے فرسودہ ہو جانے کا شکار ہوتے۔

یہ قرین قیاس ہے کہ، وقت کے ساتھ ساتھ، کھڈیوں کے لیے، مشینی کپڑے کی کثیر پیداوار کا مقابلہ کرنا مشکل ہو جاتا، لیکن وہ ایک چھوٹی سی مخصوص مارکیٹ لازماً برقرار رکھنے کے قابل رہتیں، جیسا کہ وہ آج تک ہندوستان میں رکھتی ہیں۔ کم از کم ایک آزاد ہندوستان میں یہ عمل قدرتی طور پر اور بتدریج رونما ہوتا، برطانوی آمرانہ احکامات کے ظالمانہ نفاذ کی بجائے، مشینی کپڑے کی برطانوی درآمدات پر مفید حفاظتی محصولات

(پروٹکٹیو ٹیریف) لگا کر شاید اسے مزید طول دیا جا سکتا۔ اور بہت سے ہندوستانی صنعتکار، اپنے کپڑے کے صنعتی یونٹ کو جدید بنانے کے موقع کے حصول کے لیے یقیناً خود بھی ٹیکنالوجی درآمد کرتے؛ تجارتی مقابلے کے میدان میں، ہندوستانی مزدور کی کم اجرت نے، انھیں یورپی کاروباری حریفوں پر ہمیشہ ایک تقابلی سبقت فراہم کی ہوتی۔ نو آبادیاتی نظام کے تحت، یقیناً تجارتی میدان ہموار نہیں تھا، اور انیسویں صدی نے ہندوستانی پارچہ بافی کی صنعت کے خاتمے اور اس کی جگہ برطانوی صنعت کے قیام کی افسوس ناک کہانی بیان کی۔

اس کے باوجود، ناگزیر طور پر، ہندوستانی کاروباری شخصیات نے، 1850 کے بعد ایسی جدید ٹیکسٹائل ملیں لگانا شروع کر دیں، جن کی کپڑے کی پیداوار برطانوی برآمدات سے مقابلہ کر سکے۔ امریکی خانہ جنگی نے نئی دنیا سے سوت کی سپلائی کا سلسلہ منقطع کر دیا، جس نے ہندوستانی سوت کی تجارت میں وقتی تلاطم برپا کیا، لیکن جب امریکی سپلائی 1865 میں بحال ہو گئی تو ہندوستان کو دوبارہ نقصان اٹھانا پڑا۔

ہندستانی ملیں 1896 تک، انڈیا میں استعمال ہونے والے مجموعی کپڑے کا صرف 8 فیصد پیدا کرتی تھیں۔ 1913 تک یہ بڑھ کر 20 فیصد ہو گیا، اور برطانیہ کو جنگ عظیم اول کے انتشار کے باعث درپیش مسائل نے ہندوستانی صنعتکاروں کو راستہ فراہم کیا کہ وہ ملکی مارکیٹ پر دوبارہ قبضہ کر سکیں۔ 1936 میں انڈیا میں فروخت ہونے والا 62 فیصد کپڑا ہندوستانیوں کا بنایا ہوا تھا؛ اور جب برطانوی ملک چھوڑ کر جانے لگے (1945 میں)، تو 76 فیصد تھا۔

لیکن نو آبادیاتی دور کے زیادہ تر حصے میں، ہندوستانی صنعت کی کہانی محرومی، معزولی اور شکست کی ہے۔ ہندوستانی ٹیکسٹائل کے ساتھ جو کچھ ہوا، بعینہ سب کے ساتھ دہرایا گیا۔ ایک عظیم دستکار قوم سے، جیسا کہ سندرلینڈ بیان کرتا ہے، ہندوستان محض خام مال، اشیائے خوردنی، خام سوت، کے ساتھ ساتھ پٹ سن، ریشم، کوئلہ، افیون، چاول، مسالہ جات اور چائے، درآمد کرنے والا ملک بن کر رہ گیا۔ صنعت کی تباہی اور برآمدات کی فہرست سے اس کی صنعتی مصنوعات کے خاتمے کے ساتھ ہی، برطانوی راج کے زیر اثر، ہندوستان کا دنیا کی صنعتی برآمدات کا حجم، 27 فیصد سے گر کر 2 فیصد رہ گیا۔ برطانیہ کی ہندوستان کو برآمدات میں یقیناً ترقی ہوئی، کیونکہ ہندوستان کا تجارتی توازن الٹ گیا اور دنیا کی ایک اہم برآمدات کرنے والی قوم برطانوی مال کی درآمد کنندہ بن گئی، ہندوستانی مارکیٹ پر ڈیوٹی فری کا قانون بجبر نافذ کیا گیا، جبکہ برطانوی قوانین و ضوابط نے ہندوستانی مصنوعات کا گلا ایسا گھونٹا کہ وہ دام اور معیار میں برابری کی بنیاد پر مقابلہ نہ کر سکیں۔

ہندوستان کی صنعتی تباہی کا آغاز اٹھارویں صدی کے آخر میں، تکمیل انیسویں صدی میں اور کچھ تھوڑا سا احیاء بیسویں صدی میں ہوا۔ برطانیہ کے زیر انتظام، ہندوستان کے جی ڈی پی میں صنعت کا حجم 1913 میں محض 8.3 فیصد تھا، جبکہ اس کے عروج پہ، جب برطانوی 1947 میں ہندوستان سے نکلے تو یہ 5.7 فیصد تک پہنچ چکا تھا۔ اسی طرح ہندوستانی برآمدات میں صنعتی مصنوعات کا حجم بتدریج بڑھتا ہوا 1947 میں 30 فیصد ہوا۔ اور برطانوی راج کے خاتمے پر، ہندوستان کی 35 کروڑ کی آبادی میں سے محض 25 لاکھ ہی جدید صنعت میں برسر روزگار تھے۔

دولت کا نکاس، محصولات و جواہرات

لیکن برطانوی راج کے برے اثرات محض یہیں تک محدود نہ تھے۔ محاصل (اور مال مسروقہ کو ٹیکس کا نام دینا) برطانوی استحصال کا پسندیدہ طریقہ بن چکے تھے۔ ہندوستان کے ساتھ دودھ دینے والی گائے کا سلوک کیا گیا، محاصل جو لندن کے خزانے میں جمع کروائے گئے، ارل آف چیتھم انھیں یوں بیان کرتا ہے، "ایک قوم کا تاوان......... بہشت سے ایک قسم کا تحفہ۔" 1765 اور 1815 کے درمیان، برطانیہ نے ہر سال تقریباً ایک کروڑ اسی لاکھ پونڈ ہندوستان سے نکالے۔ لندن میں فرانسیسی سفیر کومت ڈی چیٹلیٹ لکھتا ہے، یورپ میں چند بادشاہ ہی ہوں گے جو انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹران سے زیادہ مالدار ہوں گے۔

کمپنی عام طور پر آمدن کا 50 فیصد ٹیکس لیتی ____ یہ اس قدر جابرانہ تھا کہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں برطانیہ کی محکوم آبادی کا دو تہائی حصہ اپنی زمینیں چھوڑ گیا۔ ڈیورانٹ لکھتا ہے کہ، "ٹیکس نادہندگان کو پنجروں میں قید کیا جاتا، اور تپتی دھوپ میں کھڑا کیا جاتا؛ بڑھتی قیمتوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے، باپ اپنے بچوں کو بیچ دیتے۔" غیر اداشدہ ٹیکس کا مطلب تھا ادائیگی کے لیے تشدد سہنا، اور خستہ حال مظلوم کی زمین، برطانوی قرق کر لیتے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ، روایتی ذرائع رزق سے محروم کر کے، بے زمین کاشتکار پیدا کیے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ، ہندوستان کے حکمران ماضی میں اپنی حکومتوں کو جو سرمایہ فراہم کرتے وہ کاشتکاروں پر لگان سے نہیں بلکہ علاقائی و عالمی تجارت کے نیٹ ورک سے حاصل کیا جاتا۔ کمپنی کی لوٹ مار اس رائج اصول

کے بالکل برعکس تھی۔

ایسا نہیں کہ ہندوستان میں کرپشن نہیں تھی لیکن برطانیہ کے زیراثر یہ مزید گہری ہوتی چلی گئی، خاص طور پر اس لیے کہ کمپنی نے ہندوستانیوں سے اس سے زیادہ رقوم وصول کیں جتنا کہ ان کی گنجائش تھی، اور باقی رشوت، ڈکیتی اور حتیٰ کہ قتل کے ذریعے حاصل کیا گیا۔ جیسا کہ آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا کے 1923 کے ایڈیشن میں لکھا ہے کہ ہر شخص اور ہر چیز بکاؤ تھی۔

نوآبادیاتی نظام کا حامی اور قطعی طور پر ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کا آغاز سمجھی جانے والی 1757 کی اختراعی جنگ پلاسی کا فاتح رابرٹ کلائیو، بھی اپنی طمع اور کرپشن پر شرمندہ نہ تھا۔ پہلی دفعہ وطن واپسی پر، کلائیو ہندوستانی لوٹ کھسوٹ سے حاصل کردہ دو لاکھ چونتیس ہزار پونڈ انگلینڈ لے کر گیا۔ (آج کے حساب سے دو کروڑ تیس لاکھ روپے، یورپ کے امیر ترین افراد میں سے ایک)۔ وہ اور اس کے پیروکار اپنی بوسیدہ تعلقہ داری کے ساتھ ہندوستانی لوٹ کے حاصلات لے کر انگلینڈ پہنچے، (''لوٹ'' کا ہندوستانی لفظ انھوں نے نہ صرف اپنی لغات بلکہ عادات میں بھی شامل کر لیا)، جبکہ جتنا انھون نے حاصل کر لیا اس سے زائد چوری نہ کرنے پر ذاتی ضبط پر اعلانیہ تعجب کرتے۔

کلائیو 1765 میں دوبارہ ہندوستان آیا اور دو سال بعد تقریباً چار لاکھ پونڈ مالیت کا مال و زر لے کر انگلینڈ لوٹا۔ (آج کے حساب سے چار کروڑ پونڈ)۔ تحائف میں لاکھوں روپے قبول کرنے، سالانہ خراج وصول کرنے اور مفتوحین کے بیت المال سے جو بھی جواہرات اسے لبھائیں انھیں خود کو عطا کرنے کے بعد، ان اشیاء کو ہندوستان سے پانچ گنا قیمت پر انگلینڈ میں فروخت کر کے، کلائیو اعلان کرتا ہے: ''کہ ایک دولتمند شہر میرے رحم کرم پر ہے؛ میں ان خزانوں کا رخ کرتا ہوں جن میں ہر طرف سونے اور جواہرات کے انبار لگے ہیں تو وہ فقط میرے لیے کھول دیے جاتے ہیں... جب میں اس ملک کی شاندار امارت بارے سوچتا ہوں اور مقابلتاً جو تھوڑا بہت میں نے حاصل کیا، تو میں اپنی کفائیت شعاری پر حیران ہوتا ہوں''۔ اور برطانویوں کا بغض کہ اسے 'کلائیو آف انڈیا' بلاتے، جیسا کہ وہ اسی ملک سے تعلق رکھتا ہو، جبکہ حقیقتاً اس نے یہ اطمینان کر لیا کہ اس ملک کا ایک اچھا خاصا حصہ اس کے زیر تسلط ہو۔

ہندوستان میں برطانوی لوٹ مار کس درجے اور پیمانے کی تھی، اسے ہندوستان سے حاصل شدہ دولت کے انگلینڈ پر مرتب ہونے والے اثرات سے جانچا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی کا سیاستدان اور مورخ لارڈ تھامس

بابنگٹن میکالے، کلائیو پر اپنے سوانحی مضمون میں کلائیو کی زندگی کی تفصیلات سے آگے بڑھ جاتا ہے تاکہ ان بڑی قوتوں میں سے چند ایک پر الزام عائد کر سکے جنھیں اس کی کامیابی حرکت میں لے آئی۔ (اس کا یہ مطلب نہیں کہ میکالے سلطنت کا مخالف تھا۔ اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے مختلف عہدوں پر خدمات انجام دیں، اور اسے 'دنیا کی عظیم ترین کارپوریشن کہا'۔) اس کی تضحیک کا نشانہ 'نبابز' تھے، یہ اصطلاح ایسٹ انڈیا کمپنی کے ان ملازمین کے لیے وضع ہوئی جو ہندوستان میں مال بنانے کے بعد انگلینڈ لوٹتے تھے۔ ایڈمنڈ برک نے کمپنی کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز، کی شدید مذمت کی، جس کی حد سے زیادہ کرپشن اور طاقت کے ناجائز استعمال کی وجہ سے، 1788 میں، پارلیمنٹ مواخذہ کر چکا تھا. میکالے جانتا تھا کہ لفظ "نباب" ایک اعلیٰ ہندوستانی خطاب نواب یا شہزادہ، جو کہ اشرافیہ اور اقتدار سے وابستہ ہیں، کا غلط تلفظی ترجمہ ہے، اور میکالے کے لیے یہ ناقابل فہم تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ نبابز، گمنامی سے اٹھے... انھوں نے بے بہا دولت اکٹھی کی... بے شرمی سے اس کی نمائش کی... عیش و عشرت پر بے تحاشا خرچ کیا... اور نودولتیے کے تفاخر اور بھونڈے پن کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے اپنے قرب و جوار میں ہر چیز کی قیمت بڑھادی، تازہ انڈوں سے لے کر تعفن زدہ قصبات کی... ان کے طرزِ زندگی کے آگے جاگیردار (ڈیوک) بھی ماند پڑ گئے... ان کی بگھیاں لارڈ میئر کی بگھیوں سے بہتر تھیں... ان کے بڑے اور بگڑے خاندان کی مثالوں نے ملک کے نصف ملازمین کو کرپٹ کر دیا... لیکن گھوڑوں کے اصطبل اور ملازمین کی فوج، طشتریوں اور ڈریسڈن چائینا، ہرن کے گوشت اور برگنڈی شراب کے باوجود، وہ ابھی تک رذیل آدمی تھے۔

ہندوستان میں آپ اگر برطانوی ہیں تو آپ کو دولت بنانے میں زیادہ عرصہ نہیں لگتا۔ کمپنی کا عہدیدار رچرڈ بارول اپنے والد کے سامنے شیخی بگھارتا ہے کہ 'ہندوستان (خوشحالی) کی طرف ایک یقینی راستہ ہے۔ آپ کا احمق نہ ہونا اور تھوڑی سی توجہ، دولت سمیٹنے کے لیے بہت زیادہ قابلیت ہے'۔ نبابز عام طور پر کمپنی عہدیدار ہوتے جو کمپنی کی ملازمت میں رہتے ہوئے اپنے طور پر ذاتی کاروبار بھی کرتے۔ یہ غیر معمولی منافع بخش تھا، جو کمپنی کی اپنے علاقوں میں اجارہ داری قائم کرتا: 25 فیصد منافع اوسط درجے کے آدمی کی نشانی تھا، اور اس سے کہیں زیادہ منافع عام طور پر مروج تھا۔

کلائیو کے والد نے یہ سمجھتے ہوئے کہ خاندان کی تقدیر ہندوستان کی لوٹ مار پر منحصر ہے، اپنے بیٹے کے ہندوستان میں کیریئر پر دھیان دیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو 1752 میں لکھا: 'جیسا کہ تمھارا طرزِ عمل اور بہادری قوم میں عوامی موضوع بن چکا ہے تو یہی وقت ہے کہ اپنی دولت میں اضافہ کرو، ملک چھوڑنے سے پہلے موجودہ موقع

سے بھرپور فائدہ اٹھاؤ'۔ اور اس نے کیا، اپنے اور اپنے باپ کے لیے پارلیمنٹ میں نشستیں خرید کر، اور امیری کا رتبہ حاصل کر کے (یہ فقط آئیرلینڈ میں تھا، چنانچہ اس نے اپنی مضافاتی جاگیر کلئیر کا نام بدل کر 'پلاسی' رکھ دیا۔) وگ سیاستدان اور مصنف حورث والپول لکھتا ہے: 'یہ رہا لارڈ کلائیو کا ہیروں کا گھر، یہ لیڈن ہال سٹریٹ ہے، اور یہ تاجروں کی کمپنی جو بنگال کی مقتدرہ تھی کے محل کا شکستہ ستون ہے! انھوں نے ہندوستان میں لوٹ مار کی اجارہ داری سے لاکھوں کو بھوکا مار دیا، اور اپنے ملک مین دولت کی فراوانی سے پیدا شدہ تعیشات سے قحط پیدا کر دیا، اور دولت کی اِس فراوانی نے ہر چیز کی قیمت بڑھادی، حتیٰ کہ غریب روٹی خریدنے کے بھی قابل نہ رہا!'

کوکرل برادران، جان اور چارلس، اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں دونوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کی، کوسٹ ولڈز کے وسط میں ایک حیرت انگیز محل تعمیر کیا، سبز پیاز کی شکل کا مکمل گنبد، چھاتا نما چھتریاں اور لٹکتے چھجے، مغلیہ باغات، بل کھاتے فوارے، سوریا مندر، شیولنگم ---اور جاگیر کی حفاظت پر مامور نندی سانڈ۔ سیز نکوٹ منزل کا نقشہ ایک تیسرے کوکرل بھائی، ماہر تعمیرات سیموئل پیپز نے تیار کیا (جو بھائیوں کے بر عکس کبھی ہندوستان نہیں گیا تھا)۔ نبابز کی لوٹ مار کی دولت کی یہ بے ڈھنگی یادگار آج بھی موجود ہے۔

لیکن یہ ہندوستانی جواہرات تھے، جو نبابز اپنے ساتھ برطانیہ لے کر آئے، اور جنھوں نے برطانوی عوام کے لیے سلطنت کو حقیقت کا روپ دیا۔ جو کہ نئے دھن کی علامت تھی، اور دلالت تھی کہ برطانیہ ایک سامراجی طاقت بن رہا ہے، ملک کی کایا پلٹ رہی ہے۔ لیکن پرانا دھن، نئے کے لیے حقارت آمیز تھا؛ اسٹیبلشمنٹ میں بہت سے لوگ جواہرات نہیں چاہتے تھے تاکہ اچھے انگریزوں کے ہاتھ آلودہ نہ ہوں۔ جیسا کہ 1790 میں حورث والپول حقارت سے کہتا ہے: 'انگلینڈ آج کیا ہے؟ ہندوستانی دولت کا ایک گڑھا، والپول امید کرتا ہے کہ اس کی قوم، بنگال کے جواہرات وطن لانے والے نبابز کی نسبت زیادہ دیانتداری سے عمل کرنے کی سعی کرے گی۔ وہ لکھتا ہے کہ 'لارڈ کلائیو کے جواہرات کے لیے، وہ نبابز جیسا رویہ اختیار نہیں کرے گی۔

اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں نبابز کے ہیروں کا برطانوی تاج شاہی یا شاہی انعام و اکرام کے جواہرات کی مانند خیر مقدم نہیں کیا گیا، جیسا کہ بعد میں مشہور کوہ نور ہیرے کا کیا گیا۔ بلکہ دونوں بطور ایک ایسی درآمدی چیز کے حسد اور عیب جوئی کا نشانہ بنے، جو مقامی برطانوی باشندوں کی جیب کاٹ لیتے ہیں، ----اور برطانوی سیاسیات کی اساس کو تبدیلی کے خطرے سے دوچار کرتے ہیں۔

ہندوستانی ہیروں کو شاہ سرخیوں میں لانے والا پہلا کمپنی ملازم شاید مدراس کا گورنر تھامس پٹ تھا (اور

اس طرح ہندوستانی ہیروں کو شاہی استعارے کے طور پر استعمال کیا)۔ 1702 میں پٹ کے پاس ایک ہیرا تھا جسے دنیا کا عمدہ ترین نگینہ قرار دیا گیا تھا (چوبیس ہزار پونڈ کا، اتنی خطیر رقم، جو کہا جاتا ہے کہ 99 فیصد انگریزوں کی پہنچ سے دور تھی) پٹ نے ایک 400 قیراط کا نگینہ، اپنے خطوط میں اس کا حوالہ بطور 'اپناکل' اور 'سب سے بڑا سروکار' قرار دیتے ہوئے، برطانیہ بھجوایا۔ ہیرے کے برطانیہ پہنچنے کے بعد جلد ہی، اس نے گورنری چھوڑ دی، ایک بڑی سی جاگیر خریدی اور پارلیمنٹ میں ایک سیٹ کے لیے اچھی خاصی رقم ادا کی۔ برطانوی مؤرخ جان کیئی ہمیں بتاتا ہے کہ پٹ کے ہیرے کے متعلق 'انوکھی افواہیں' گردش میں تھیں، کوئی کہتا کہ 'یہ کسی ہندو دیوتا کی مورتی کے خانہ چشم سے چرایا گیا تھا یا پھر ہیرے کی کان سے ایک غلام کے ذریعے سمگل کیا گیا تھا، جس نے اسے اپنی ران میں اپنے ہی لگائے گئے گھاؤ میں چھپایا تھا۔' 1868 میں وِکی کولنز کے ناول بعنوان 'مون سٹون' کے چوری شدہ ہیرے کی طرح، پٹ کا ہیرا ابھی ایک مشہور افسانہ بن گیا۔ خاص طور پر اگر آپ برطانوی تھے تو ـــــ یہ ہندوستان میں دولت کی فراوانی کا، اس دولت کو نکالنے کی برطانوی طاقت، اور ہندوستان میں اس طاقت سے وابستہ عیش وعشرت ـــــ کی علامت بن گیا۔

دولت سے متعلقہ روایتی برطانوی نقطہ نظر کی بنیاد زمین کی ملکیت پر ہے، جو کہ اپنے ٹھوس پن کی وجہ سے، زمینی استحکام کا مفہوم رکھتی ہے، چونکہ زمین لمبے عرصے سے قبضے میں رہی ہے، لہٰذا اس کے ساتھ وراثت اور دوام کے احساس کا مفہوم مترشح ہوتا ہے۔ یہ کسی حد تک بدل چکا ہے، تاجر طبقے کے ظہور کا شکرگزار ہونا پڑے گا، لیکن پٹ کا ہیرا ایک ڈرامائی مختلف ماڈل کی نمائندگی کرتا ہے، جس کی بنیاد بہت زیادہ مہم جوئی پر ہے ـــ اگر استحصال نہیں بھی تو نو آبادیاتی لوٹ کھسوٹ۔ ان ہیروں کے مالکان روایتی وراثت کی بجائے کچھ ایسا جسے نو آبادیاتی مہم جوئی سے حاصل کیا جا سکتا تھا کے ذریعے دولت کے روایتی ذرائع سے آزاد ہو گئے۔ پندرہ سال بعد وہ ہیرا انڈیا سے لے آیا، تھامس پٹ نے اسے تاجدار فرانس، ڈک ڈی اور لینس کے ہاتھوں 135000 پونڈ کی شاہانہ رقم کے عوض بیچ دیا، زرِ خرید سے تقریباً چھ گنا زیادہ۔ اس کثیر رقم (آج کے حساب سے کئی لاکھ کی مالیت) نے پٹ کے خاندان کو انگلش معاشرے میں ایک نیا مقام عطا کیا۔ چنانچہ ایک ہندوستانی ہیرے نے ایک برطانوی شاہی خاندان کو وہ مالیاتی جست لگوائی، کہ اس نے بہت ہی کم وقت میں دو وزرائے اعظم پیدا کیے ـــ ایک اس کا پوتا ولیم پٹ، پہلا ارل آف چیتھم، اور دوسرا چیتھم کا اپنا بیٹا، ولیم پٹ دوم۔

دوسرے لفظوں میں، نبابز اور ان کی دولت اٹھارویں صدی کے اواخر میں ہونے والی برطانوی ہندوستانی

سلطنت کی توسیع کے دوران برطانوی سیاست کو تبدیل کر رہی تھی۔ جیسا کہ 1786 میں 'دی جنٹلمین میگزین' میں ایک مضمون میں بتایا گیا، 'کمپنی خوش قسمتی سے ہر سال خاصی تعداد میں نئی قبیل کے نئے رسوم، اطوار اور اصولوں کے حامل شرفاء کو وطن لاتی ہے، جو کہ پرانے ملکی شرفاء کے دفاتر کی آسامیاں پر کرتے ہیں۔'

خدشہ یہ ہے کہ یہ نئے لوگ برطانیہ کو از سر نو تشکیل دیں گے: 'یہ واضح ہے کہ ہمارا آئین، اگر بدلے گا نہیں، تو بھی خاصی حد تک تبدیل ہو جائے گا'۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اب محض ایک تجارتی معاملہ نہ تھی بلکہ اپنے حقیقی منشور کے ضوابط سے بہت آگے نکل چکی تھی۔ برطانیہ میں کچھ لوگ فکر مند اور چوکنے تھے: انھوں نے کلائیو کو ہندوستان میں اس کے اعمال اور وہاں سے سمیٹی گئی دولت کی توضیح کے لیے پارلیمنٹ کے سامنے طلب کیا۔ ہیسٹنگز کے مواخذہ پر، برک واضح تنقید کرتا ہے: آج عظیم برطانیہ کا ایوان زیریں ہندوستان کے مجرموں پر مقدمہ چلاتا ہے۔ کل برطانیہ اعظمی کا ایوان زیریں شاید ہندوستان کے انھیں مجرموں پر مشتمل ہو۔

ارل آف چیتھم کی حکومت، پٹ کی آل اولاد، 1766 میں کمپنی پر پارلیمنٹ کی بالادستی قائم کرنا چاہتی تھی، لیکن بھلا ہو اس کی خرابی صحت کا اور چونکہ بہت سے ایم پیز بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے حصص کے مالک تھے، لہٰذا یہ کوشش کچھ زیادہ بار آور ثابت نہ ہو سکی۔ در حقیقت، لارڈ نارتھ کے 1773 کے ریگولیٹنگ ایکٹ کی قانون سازی تک ایسا نہ ہو سکا کہ پارلیمنٹ، ہندوستان میں کمپنی کی کارروائیوں پر کسی قسم کا اختیار حاصل کر سکا ہو۔ لیکن اس کے باوجود، ایم پیز کی اکثریت کمپنی کی کامیابیوں سے فوائد حاصل کرنے کے لیے ڈٹی رہی، اور انھوں نے امتناعی قوانین کی بجائے اختیارات دینے والی قانون سازی کی۔ ولیم پٹ دوم نے آخر کار 1784 میں انڈیا ایکٹ پاس کیا، جس میں کمپنی کو احکامات دینے اور منظور کرانے کے اختیار کے ساتھ ایک بورڈ آف کنٹرول قائم کیا، تاکہ ایسی سرگرمیاں، جن سے ان کے اجداد مالا مال ہوئے، کو ایک ضابطے کا پابند کیا جا سکے۔ تاہم، اصلاحات کی گفتگو کے باوجود، 1784 میں لندن کرونیکل نے ہندوستان کے ساتھ براہ راست سمبندھ رکھنے والے انتیس ممبران پارلیمنٹ کے ناموں کی فہرست جاری کی؛ اور جو کمپنی کے حصص کے مالکان تھے وہ ان سے بھی زیادہ تھے۔

ڈرامہ نویس رچرڈ شیریڈن کمپنی کو ملامت کرتے ہوئے صلواتیں سناتا ہے، جس کے اعمال 'میں ایک پھیری والے کی کمینگی، ایک قزاق کی حرام کاری کے ساتھ یکجا ہو گئی.... یوں انھوں نے ایک خوں ریز عصائے سلطانی کے شاہانہ تمسخر کو ایک تاجر کے منشی خانہ کی تھوڑی سی تجارت کے ساتھ یکجا کر دیا، ایک ہاتھ سے عصائے

اقتدار قابو کرنا، اور دوسرے سے جیب کاٹنا'۔

کمپنی عہدیدار اپنے اعمال کے اثرات سے لاعلم نہ تھے۔ بیرن ٹائن ماؤتھ، جس نے جان شور کے نام سے 1793 سے 1797 تک ہندوستان کے گورنر جنرل کے طور پر خدمات سرانجام دیں، نے 1789 میں ایک یاداشت میں بیان کیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں تاجر اور مقتدر دونوں ہی ہے: 'اپنی پہلی حیثیت میں وہ تجارت میں پوری طرح منہمک ہے اور دوسری حیثیت میں محاصل پر قابض'۔ ٹائن ماؤتھ لوٹ مار کی حکمت عملی کی ناانصافی پر تبصرہ کرتا ہے، ملک سے سرمائے اور وسائل کا یورپ کی طرف نکاس، اور نتیجتاً ہندوستان کی اندرونی تجارت کا دھڑن تختہ، جو کمپنی کی غارت گری سے پہلے ترقی کی راہ پر گامزن تھی۔

بدعہدی، فریب کاری اور لالچ کی کئی کہانیاں ہیں، جن میں کمپنی نے مقامی شہزادوں سے دولت چھینی، انھیں بے دخل کر کے ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیا؛ اٹھارویں صدی کے اواخر میں ایسی کہانیاں جو گردش میں تھیں انھیں دوبارہ یہاں نقل کرنا، آج تھکا دینے والا عمل ہو گا، جب برطانوی پارلیمنٹ نے وارن ہیسٹنگز، جسے کہا جاسکتا ہے کہ کمپنی کے بہت سے زر پرست گورنر جنرلز میں سے سب سے زیادہ غارت گر تھا، کا ناکامیاب مواخذہ کیا۔ لیکن جو نقطہ میں اٹھا رہا ہوں، چند ایک مثالیں اسے واضح کرنے کے لیے پیش خدمت ہیں۔ ہیسٹنگز نے ذاتی طور پر خاصی موٹی رشوتیں وصول کیں اور پھر رشوت دینے والے کے ساتھ جنگ چھیڑ دی (لوگ حیران ہوتے ہیں کہ اس کی طمع پر تاسف کا اظہار کریں یا اس کارگزاری پر اس کی توصیف کریں کہ رقم وصولی کے باوجود اس نے بکاؤ ہونے سے انکار کر دیا)۔ ایسے معاملات میں اس کی بے شرمی اس کی تعریف پر مجبور کرتی ہے: جب اس نے تشدد کیا اور اودھ کی بیوہ بیگمات کے اثاثہ جات میں سے دولت کا آخری اونس بھی چھین لیا، ہیسٹنگز نے باقاعدہ طور پر کونسل کو مطلع کیا کہ اس نے مالِ غنیمت میں سے دس لاکھ روپے کا تحفہ قبول کیا ہے (ان دنوں ایک لاکھ پونڈ، ایک خطیر رقم) اور اسے اپنے تصرف میں رکھنے کے لیے ان کی باقاعدہ منظوری کی درخواست کی۔ کونسل نے بلاشبہ اتنی خطیر رقم کے بارے میں جانتے ہوئے جو کہ کمپنی کی بیلنس شیٹ میں جاسکتی تھی، بخوشی اسے قبول کر لیا۔

برک نے، ہیسٹنگز کے مواخذہ کی اپنی افتتاحی تقریر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی 'ناشنیدہ مظالم کا اور تقریباً بے نام تباہی کا' موردِ الزام ٹھہرایا ہے.... 'جرائم کی شرح، انسانوں کے لوبھ، لالچ، تکبر، سنگدلی، بغض، گھمنڈ اور گستاخی کی شرانگیز خصلتوں کی شکل میں بڑھ گئی'۔ اس نے برطانیہ کے مقرر کردہ ٹیکس کلکٹرز کی جانب

سے بنگالی عورتوں پر دست درازی کی تکلیف دہ تفصیلات، کو بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا ہے ـــــ 'انھیں گھروں سے باہر گھسیٹا گیا، لوگوں کے سامنے کپڑے اتارے اور برہنہ کیا گیا، اور لوگوں کے سامنے کوڑے مارے گئے.... انھوں نے عورتوں کے سر پستان، چرے ہوئے بانسوں کے تیز دھار کناروں میں رکھ کر، ان کے جسموں سے نوچ ڈالے' ـــــ جس کے باعث شر ائیڈن کی بیوی پارلیمنٹ میں دہشت سے غش کھا گئی، جس سے آگے اسے بڑے کرب میں مکمل کرنا پڑا۔ مزید الزامات شر ائیڈن اور چارلس جیمز فوکس کی شیریں اور گونج دار آوازوں میں سامنے آتے ہیں، لیکن آخر میں ہیسٹنگز بری ہو جاتا ہے، برطانوی عوام کی نظروں میں سلطنت کا تصور بحال کرنے اور مزید ڈیڑھ صدی تک متواتر لوٹ مار کو جائز قرار دینے کے لیے۔

لیکن مسئلہ ہیسٹنگز سے بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ مبلغ ولیم ہووٹ 1839 میں کہہ رہا تھا، جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی ابھی اقتدار میں تھی، استحصال، غارتگری اور لوٹ مار کے مناظر، جن کا شکار ہندوستان ہمارے ہاتھوں ہوا، افسوس ناک تھے، اور جو آبادی کے جملہ افراد کے ساتھ ہوا، انسانی تاریخ کے سب سے ذلت آمیز حصے میں سے ایک کی تشکیل کرتا ہے.... وہاں جانے کا صرف اور صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہاں ہوتے ہوئے محض ایک ہی مفاد۔ یہ ایسی سرزمین تھی، جسے چند مراعات یافتہ کی بلا شرکت غیرے لوٹ مار کے لیے مقدس یا اس کے برعکس بدبخت قرار دیا گیا۔ حکومت میں اعلیٰ ترین عہدیداروں کے پاس کرپشن کرنے کا مضبوط ترین محرک تھا، لہٰذا اپنے سے نیچے والوں کی ویسی ہی کرپشن کو چیک کرنے کی کسی کوشش کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا تھا.... ہر شخص، ہر محکمہ میں، چاہے سول، فوجی یا تجارتی ہو، شاندار تحائف سے فیض یاب ہو رہا تھا۔

حتیٰ کہ لارڈ میکالے (جو، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، کمپنی کو بہت بلند مقام پر رکھتا ہے، اور کئی سال تک اس کا ملازم بھی رہا) کو بھی لکھنا پڑا: 'انگریز کی حکومتی بدانتظامی اس حد تک پہنچ گئی کہ سماج کے وجود کے لیے ناموافق ہو گئی... کمپنی کے ملازمین مقامی لوگوں کو مجبور کرتے کہ مہنگا خریدیں اور سستا بیچیں.... یوں بے شمار دولت کلکتہ میں بڑی سرعت سے اکٹھا کی گئی، جبکہ تین کروڑ انسانوں کو افلاس کے آخری درجہ تک گرا دیا گیا۔ انھیں اس طرح کے استبداد کے زیر اثر کبھی نہیں (زندگی گزارنا پڑی) رہنا پڑا'... میکالے مزید کہتا ہے کہ یوں تو پسے ہوئے عوام ظالم حکومتوں کو الٹ دیتے ہیں، لیکن انگریزوں کو ہٹانا اتنا آسان نہیں ہو گا۔ اس طرح کا الزام ایک روشن خیال انگریز اور سلطنت کے معمار کی طرف سے ہے، جس کے ساتھ دوسرے شکوے ہم بعد کے لیے اٹھائے رکھتے ہیں، جنھیں جھٹلانا ناممکن ہے۔

محاصل وصولی اور وسائل کا نکاس

اس کے دونوں پہلو دیکھنا سبق آموز ہے، دارالعوام میں ہندوستان سے متعلقہ مباحث میں ہندوستان سے حاصل ہونے والے محاصل کے اعداد و شمار کا غلبہ تھا، جو بہت سے لوگوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدیداران کے خود غرضانہ برتاؤ کی توجیہہ کے لیے سوجھتے تھے، اور اسی وقت یہ پہلو بھی، جس میں معاصر مبصرین اپنے وطن کے نام پر ہونے والی زیادتیوں پر لرزہ براندام تھے۔

لاٹ پادری بشپ ہیبر (جس کی اصنام پرستی کی تحقیر، نے اسے مشہور تحریر لکھنے پر مائل کیا، 'جہاں ہر نظارہ مسرور کرتا ہے / اور محض انسان قابل نفرت ہے') نے 1826 میں لکھا کہ 'کمپنی کے صوبہ جات میں کسان، مجموعی طور پر مقامی شہزادوں کی ریاستوں کی نسبت زیادہ بدحال، غریب اور ناامید ہیں'۔ بنگال میں ایک برطانوی منتظم، ایف۔جے۔شور نے ایک غیر معمولی اعتراف میں، 1857 میں دارالعوام کے سامنے گواہی دی کہ: 'انگریزوں کا بنیادی اصول، ہر ممکن طریقے سے، اپنی منفعت اور مفادات کے لیے، تمام ہندوستانی قوم کو مطیع بنانا رہا ہے۔ ان پر آخری حد تک ٹیکس لگائے گئے؛ ہر دوسرا صوبہ، جونہی وہ ہمارے قبضے میں آیا، اسے زیادہ محصولات کے حصول کا میدان عمل بنا دیا گیا؛ اور یہ ہمیشہ ہمارا غرور رہا ہے کہ، مقامی حکمران جتنا لوٹ سکتے تھے، ہم نے محاصل اس سے کہیں زیادہ بڑھا لیے ہیں۔'

ان 'مقامی حکمرانوں' میں سے اکثر شاید بجا طور پر، آج کے دور کے یو این گڈ گورننس ایوارڈ کے مستحق نہ ہوں، لیکن جیسا کہ شور تسلیم کرتا ہے، کمپنی صریحاً بدتر تھی۔ جہاں برطانیہ نے اپنے لیے براہ راست حکمرانی اختیار نہیں کی، ان راجواڑوں میں انھوں نے حکمران مسلط کیے، جو کہ ہر لحاظ سے ان کے مقصد کے حلیف تھے۔ ان حکمرانوں سے، انھیں تخت پر متمکن کرنے اور دشمن ریاستوں سے حفاظت کے لیے بھاری معاوضہ وصول کیا جاتا __ بھتے کی رقم کی سامراجی تعبیر کا شور و غوغا، تب سے ہے جب سے مافیا نے اسے استعمال کیا۔ (برطانوی عمومی طور پر اسے اعانتی الحاق کی پالیسی کہتے تھے۔) راجے، کمپنی کے ساتھ الحاق کرتے اور اپنی مملکت میں اپنی حفاظت پر مامور، برطانوی فوجی دستوں کو فراخدلی سے معاوضہ ادا کرتے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے، تو یہ فوجی دستے انھیں کے خلاف ہو سکتے تھے۔

مثال کے طور پر، انیسویں صدی کے اوائل کے حیدرآباد میں، حکمران نظام کو، کمپنی کی منتخب کردہ خاصی

بڑی قیمت کے عوض برطانوی تحفظ کا معاہدہ کرنے پر مجبور کیا گیا۔ (مثال کے طور پر، کمانداروں پانچ ہزار پونڈ ماہانہ کا بے پایاں معاوضہ وصول کرتا)۔ برطانیہ کو ہونے والی تمام ادائیگیاں اس کے خزانے میں جمع کر دی جاتیں، جو کہ پھر، گورنر جنرل کے ایک رفیق کے 1814 میں قائم شدہ بینک کے ذریعے 24 فیصد سود پر قرض (Made to borrow) قرار دے دی جاتیں۔ قبل اس کے کہ اسے اس کا پتہ چلتا، نظام بینک کا لاکھوں کا مقروض ہو چکا تھا اور تاسف آمیز آوازوں نے یہ فقرہ گھڑا، 'غریب نظمی سب کی ادائیگی کرتا ہے'۔ مزید جنوب کی طرف ارکٹ کے نواب کو اسی طرح کے ایک بندوبست نے اپاہج بنا ڈالا، جس کا کمپنی کا قرض اس کی ادائیگی کی اہلیت سے اتنا بڑھ گیا کہ اسے ادائیگی کے بدلے اپنے زیادہ تر علاقے برطانیہ کے حوالے کرنے پڑے۔

کمپنی کی حکمرانی کی ابتداء میں ہی، محاصل کی وصولی کے اختیارات حاصل کر کے، برطانیہ نے ہندوستانی کسان کو نچوڑ کر خشک کرنے کا آغاز کیا۔ ایک طرف تو ان کے پاس بہت ہی کم عہدیدار تھے جنھیں مضافات میں محاصل وصول کرنے کے لیے تعینات کیا گیا۔ دوسری طرف وہ، ان کارندوں پر مکمل اعتماد نہیں کر سکتے تھے، اور بتدریج محاصل کی وصولی، تحریری قوانین کے ایک ضابطے کی عملداری میں آ گئی۔ جہاں مقامی عمائدین کبھی مقامی حالات کو سمجھتے تھے، قحط سالی، پیداوار میں کمی اور حتیٰ کہ خاندانی حالات کو درست کرنے، اور ایسے ہی موت اور شادی کی اہم ضروریات کے لیے مناسب وظائف مہیا کرتے تھے، اب برطانوی محکمہ مال کے افسران ایک قانونی کتاب کے ذریعے حکمرانی کرتے جو کہ کسی بھی وقت مقامی مسائل کو سمجھنے اور ان پر گفت و شنید کے لیے سانس لینے کی جگہ بھی نہ چھوڑتی۔ 'نئے نظام کا مقصد، بغیر مقامی ہندوستانی اشرافیہ کے ساتھ معاملہ کیے، کمپنی کے محاصل کی وصولی کو محفوظ بنانا تھا۔ نظریہ یہ تھا کہ روبرو گفت و شنید کو لکھے ہوئے قواعد سے بدل دیا جائے۔ یہ ضابطے، مالکان اراضی سے تقاضا کرتے کہ وہ ہر ماہ طے شدہ رقم نہایت باقاعدگی سے ادا کریں، اور امن عامہ میں خلل پیدا نہ کریں۔ ... یہ بندوبست گفت و شنید اور روبرو بات چیت کو ختم کرتا، جو کہ اٹھارویں صدی کے ہندوستان کی سیاست کا جزو لاینفک رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں یہ، کبھی امیر رہے ملک کی دولت کے لیے محرومی اور بربادی لایا۔'

برطانوی، مالگزاری کے تین اہم نظام چلاتے تھے: زمینداری، زیادہ تر مشرقی ہند اور ایک تہائی مدراس پریزیڈینسی میں؛ رعیت واری یا رو عیت واری، زیادہ تر جنوب میں اور شمال کے کچھ حصوں میں؛ اور محل واری مغربی ہند میں۔ برطانیہ نے 1793 میں زمینداری نظام کے جزو کے طور پر محاصل زمین کا دائمی بندوبست

متعارف کروایا۔ اس سکیم کے تحت، ہندوستانی کاشتکاروں سے روایتی بنیادوں پر فصل کی پیداوار سے حصہ وصول نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ان کی زمین پر ایک مخصوص شرح کے حساب سے لگان لیا جاتا تھا۔ اس نظام کا مطلب تھا اگر کسان کی پیداوار کم ہوئی ہے تو بھی اسے لگان کی ادائیگی میں کوئی معافی نہیں۔ بعض اوقات، برطانویوں کی طرف سے لگان کا جو مطالبہ کیا جاتا، وہ زمین کی حقیقی قدر کی بجائے امکانی اہلیت کی بنیاد پر کیا جاتا، جو اس کے کل لگان سے تجاوز کر جاتا۔ روعیت واری اور محل واری علاقوں میں لگان کا سوال مستقل حل نہیں ہوا تھا، بلکہ باوجود سخت نتائج کے، موقع بہ موقع، اس پر نظرِ ثانی اور اضافہ کیا جاتا رہا تھا۔ معاملات مزید پیچیدہ ہو جاتے، کہ نوآبادیاتی ریاست کو، ہر جگہ لگان جنس کی بجائے زرِ نقد میں ادا کرنا پڑتا (چاہے کسانوں کی طرف سے براہ راست یا زمینداری عاملین کے ذریعے) اور 1880 تک ہر جگہ محصول یا لگان کی خلاف ورزی تھی، جس کے بعد 1880 سے 1930 کے دوران قرض کے طریقہ کار کے ذریعے کسانوں سے مزید بڑی رقوم نکلوائی گئیں۔ ولیم ڈگبئی نے تخمینہ لگایا کہ 'دائمی بندوبست سے باہر کے اضلاع میں رعیت کو ایک سال میں اس سے آدھا کھانے کو ملتا جتنا کہ ان کے دادا کو ملتا تھا، اور اس کا ایک تہائی جتنا کہ ان کے پردادا کو ملتا تھا۔ ان تمام حقائق کے باوجود، ابھی بھی زمین کا لگان انتہائی سختی کے ساتھ اینٹھ لیا جاتا ہے اور فصل کو گودام میں رکھنے سے پہلے حکومت کو لازماً سکہ رائج الوقت میں ادا کرنا پڑتا ہے!'

بشپ ہیبر 1826 میں یہ تسلیم کرتا ہے 'کوئی بھی مقامی فرمانروا اتنے لگان کا مطالبہ نہیں کرتا جتنا کہ ہم'۔ معاشی نیشنلزم کی ابتدائی ہندوستانی آواز، انگریزی تعلیم یافتہ رومیش چندر دت، یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ چند ابتدائی مسلمان حکمرانوں نے بھی تازیانے بننے والے محصولات لگائے، تبصرہ کرتا ہے کہ 'فرق یہ تھا کہ، مسلمان حکمرانوں نے جو بھی مانگ کی وہ مکمل طور پر پوری نہیں ہو سکی؛ جو برطانوی حکمرانوں نے مانگ کی، پوری قوت سے حاصل کی'۔ ہندوستان میں نافذ ہونے والے زمینی محصول کی اوسط، ٹھیکے کی 80 سے 90 فیصد تھی۔ تیس سال کے دوران، صرف بنگال سے جمع ہونے والا زمینی محصول 817553 سے 2680000 تک پہنچ گیا۔ لوٹ مار کو شاید کسی حد تک معاف کیا جا سکتا، اگر محصولات کاشتکاروں کو عوامی بہبود اور خدمات کی شکل میں واپس مل جاتے، لیکن محصولات تو لندن میں برطانوی حکومت کو بھیج دیے جاتے تھے۔ دائمی بندوبست ہندوستانی معیشت اور سب کے لیے جابرانہ ثابت ہوا، بلکہ زراعت کو تباہ کر دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت محصولات اور زندگی کے عمومی حالات اتنے خراب اور مشکل تھے کہ، جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، کمپنی کی عملداری سے

دور علاقوں میں، اپنے روایتی گھر بار چھوڑ کر جتنے بھی فرار ہو سکتے تھے ہو گئے، جبکہ ہندوستانی کسانوں کی مقامی ریاستوں سے برطانوی ہند کو ہجرت پوری انیسویں صدی میں سننے میں نہیں آئی۔

کمپنی کو ہندوستانیوں کی ایک دوجے کے ساتھ برتی جانے والی توہمات، سماجی نظام اور نفرت سے تب تک کوئی سروکار نہیں تھا، جب تک کہ وہ کمپنی کو ٹیکس ادا کر رہے تھے۔ ٹیکس سرکاری طور پر، شہروں کی حالت بہتر بنانے، پل اور نہروں کی تعمیر، ذخیرہ آب اور فصیل شہر کے واضح مقاصد کے لیے وصول کیے جاتے، لیکن (جیسا کہ برک نے پارلیمنٹ میں بیان کیا) کام جلد ہی بھلا دیا جاتا اور ٹیکسوں کی وصولی جاری رہتی۔ دارالعوام کی ایک کمیٹی نے اعلان کیا، کہ محصولات کا تمام نظام فی نفسہٖ، سرکاری افسران کے لیے معمول کی لوٹ کھسوٹ اور ناانصافی کا عزم پیدا کرتا تھا، جبکہ رعیت (کسان) کے لیے جو بچتا، وہ اس سے کچھ ہی زیادہ ہوتا جو وہ حیلہ سازی اور پردہ داری سے حاصل کرنے کے قابل ہوتا۔

رعیت واری اور محل واری نظام محاصل کی اضافی خصوصیت، تمام نجی املاک کا خاتمہ تھی، جو کہ امیر و غریب دونوں کاشتکار طبقات کی ملکیت تھیں، اور یوں صدیوں پرانی روایات اور تعلقات جو لوگوں کو زمین سے جوڑتے تھے، ان کی تنسیخ کر دی گئی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، پٹ کا انڈیا ایکٹ 1784 میں پاس ہوا، اور ہندوستان میں محاصل وصولی کے برطانوی اختیار کو باضابطہ بنایا۔ بنگال میں، برطانویوں نے زمینداروں کے موروثی حقوق کو نظر انداز کیا اور کمپنی کی آمدن بڑھانے کے لیے ان کی جاگیریں نیلام کر دیں۔

جب تک ایسٹ انڈیا کمپنی صاحب اختیار رہی، اس کا منافع آسمان کو چھو رہا تھا اس کے ڈیویڈنڈ کی ادائیگی افسانوی تھی، جو اس کے بڑھتے ہوئے سٹاک کو برطانوی سرمایہ کاروں میں سب سے مرغوب بنا رہی تھی۔ جب اس کی بدانتظامی اور جبر 1857 کے انقلاب پر انجام پذیر ہوئے، جسے بہت سے ہندوستانی مورخین نے آزادی کی پہلی جنگ قرار دیا جبکہ برطانویوں نے 'سپاہیوں کی بغاوت' کے طور پر اس کی اہمیت کو کم کیا، تو تاج (برطانیہ) نے، برطانوی ملکہ کی وسیع سلطنت کے 'تاج میں جڑے اس ہیرے' کا انتظام سنبھال لیا۔ لیکن اس نے، استحقاق کے عوض کمپنی کو ادائیگی کی، ہندوستان کے سرکاری قرض میں کثیر قیمت خرید کا اضافہ کرتے ہوئے، جو کہ مظلوم، ہندوستانی عوام پر ٹیکس لگا کر واپس وصول کیا جائے گا (اصل زر اور بھاری سود دونوں)۔

اور مقصد وہی رہا —— برطانیہ کا اعلیٰ تر مفاد۔ ہندوستان سے وسائل کا نکاس اسی طرح برطانوی پالیسی کا واضح حصہ رہا۔ مارکیز آف سلیسبری نے، 1860 اور 1870 کی دہائی میں ہندوستان کے سیکرٹری آف سٹیٹ کے

طور پر، ایک شاندار استعارہ استعمال کرتے ہوئے کہا: 'جبکہ ہندوستان کا لہو بہنا ہی ہے، تو نشتر کو ان حصوں کی طرف لے جانا چاہیے جہاں خون جمع ہے... (نہ کہ) ان حصوں پر جو پہلے ہی اس کی کمی کی وجہ سے ناتواں ہیں'۔ 'خون' یقیناً سرمایہ تھا، اور اس کا 'مجتمع' ہونا کمزور علاقوں کی نسبت محاصل کے بڑے ذرائع کو ہدف بنانا تھا (سیلسبری وزیراعظم بننے کے لیے آگے بڑھا)۔

سیسل رہوڈس نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ انگلینڈ کے بے روزگار مزدور طبقے کے مابین روزی روٹی کے لیے بلبلاہٹ کا، ایک ناگزیر حل، سامراج تھا، چونکہ نوآبادیاتی سیاستدانوں کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ زائد آبادی کی آبادکاری کے لیے زمینیں حاصل کریں اور برطانوی کارخانوں کی اشیاء کے لیے منڈیاں پیدا کریں: ہندوستانی عالم، مصلح اور فلسفی سوامی وویکانند، برطانویوں کو ویش جیسی ایک ذات کے طور پر دیکھتا ہے، جنھوں نے تجارت کی منطق اور خالص مالی معاوضہ کے ذریعے حکومت کی، جو ہندوستان میں ہاتھ لگی ہر چیز کی قیمت تو جانتے تھے لیکن قدر نہیں۔ بنگالی ناول نگار، بنکم چندر چترجی نے انگریزوں کے متعلق لکھا، وہ جو اپنی طمع پر قابو نہیں پاسکتے اور جن کی لغت سے 'اخلاقیات کا لفظ ناپید ہو چکا تھا۔'

❖

انیسویں صدی کے آخر تک، ہندوستان برطانوی محاصل کا سب سے بڑا ذریعہ تھا، برطانوی برآمدات کا دنیا میں سب سے بڑا خریدار اور ہندوستان کے اپنے خرچ پر، برطانوی سول سرونٹ اور فوجیوں کا خاصی بڑی اجرت پر ملازمت کا ذریعہ۔ فی الحقیقت ہم نے اپنی محکومی کے لیے ادائیگی کی۔

ٹیکس ابھی بھی جابرانہ تھا۔ زرعی ٹیکس کم از کم کل پیداوار کے نصف تک پہنچ جاتا اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ، کاشت کار کے پاس اناج اس سے بھی کم بچتا جو کہ اسے اپنی اور اپنے خاندان کی کفالت کے لیے چاہیے ہوتا؛ برطانوی تخمینہ جات تسلیم کرتے ہیں کہ محاصل دو یا تین گنا زیادہ تھے بہ نسبت ان کے جو کبھی بھی غیر برطانوی دور حکمرانی میں رائج رہے، اور مسلمہ طور پر دنیا کے دوسرے کسی بھی ملک سے زیادہ تھے۔ ہر برطانوی پریزیڈینسی جمع کی ہوئی کثیر رقوم انگلینڈ بھجواتی، جیسا کہ یقیناً ہندوستان میں کام کرنے والے انگریز سرکاری ملازمین، تاجر اور سپاہی کرتے۔ (محض چوبیس سالہ ملازمت کے بعد، جس میں وقفے وقفے سے چار سال کی گھریلو چھٹیاں اور وطن واپسی کی رخصت شامل تھیں، برطانوی سرکاری ملازم ہندوستان کے ٹیکس دہندگان کی رقوم سے اچھی خاصی پنشن پر گھر پلٹنے (ریٹائرمنٹ) کا حقدار تھا: رامسی میکڈونلڈ نے 1920 کے اواخر میں تخمینہ

لگایا کہ لگ بھگ 7500 انگریز ہندوستان سے تقریباً دو کروڑ پونڈ سالانہ پنشن وصول کرتے ہیں۔)

جب برطانوی محصولات بڑھ رہے تھے، تو ہندوستان کے سرکاری قرض میں بھی واضح اضافہ ہو رہا تھا۔ ہندوستان کے نصف محاصل ہندوستان سے باہر، خاص طور پر انگلینڈ چلے جاتے۔ ہندوستانی ٹیکس نہ صرف ہندوستان میں برطانوی ہند فوج کے لیے، جو کہ بظاہر ہندوستان میں امن قائم کرنے کے لیے تھی، بلکہ برطانوی سلطنت کی عظمت جلیلہ میں اضافہ کے لیے برما سے لے کر میسوپوٹامیا تک، مختلف النوع غیر ملکی نوآبادیاتی مہم جوئیوں کے لیے بھی ادا کیے جاتے۔ مثال کے طور پر 1922 میں حکومت ہند کے کل محاصل کا 64 فیصد غیر ممالک کو بھیجے گئے برطانوی ہند فوجی دستوں کی ادائیگی کے لیے وقف تھا۔ جیسا کہ ڈیورانٹ نے اس وقت مشاہدہ کیا کہ، دنیا میں کوئی اور فوج سرکاری محاصل کا اتنا بڑا حصہ استعمال نہیں کرتی۔

یہ حیرت انگیز ہے، کتنی بے شرمی سے سرمایہ ہندوستان سے منتقل کیا گیا۔ حتیٰ کہ اکاؤنٹنگ ٹیبل بھی نکاس سرمایہ کی پردہ پوشی کے لیے مکمل طور پر بے ضرر اندراجات کے زیر اثر تھے: لہٰذا جہاں تجارتی شماریے خاصا زیادہ منافع دیکھاتے، 'داخلہ اخراجات' اور 'دوسرے پوشیدہ' (اخراجات) کے عنوانات کے تحت کثیر رقوم کو منہا کرنے سے ہندوستان کو خاصا بڑا حقیقی خسارہ ہی ملتا۔ پاؤل بارن نے تخمینہ لگایا کہ ہندوستان کے جی این پی کا 8 فیصد سالانہ برطانیہ منتقل ہوتا تھا☆۔ تعجب کی بات نہیں کہ انیسویں صدی کے ہندوستانی قوم پرست دادا بھائی نوروجی، دولت کے نکاس کی اپنی 'ڈرین تھیوری' مرتب کرنے اور نوآبادیت پسندوں کو ہندوستان میں ایسی غربت پیدا کرنے، جسے وہ بطور حکمت عملی، ان کے 'غیر برطانوی' اعمال قرار دیتے ہیں، کے لیے موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے، برطانوی سلطنت کے شائع کردہ بہی کھاتوں سے بھی ثبوت تلاش کر لیتے ہیں۔ نوروجی نے دلیل پیش کی کہ ہندوستان نے اوسطاً 13,000,000 پونڈ مالیت کی اشیاء 1835 سے 1872 تک ہر سال بغیر کسی متعلقہ رقوم کی واپسی کے، برطانیہ کو برآمد کیں؛ درحقیقت، برطانیہ میں رہائش پذیر لوگوں کو ادائیگی، چاہے کمپنی کے شئیر ہولڈرز کا منافع ہو، ریلوے سرمایہ کاروں کے ڈیویڈنڈز ہوں یا ریٹائرڈ عہدیداروں کی پنشن ہو، تین کروڑ سالانہ کا خسارہ پیدا کرتے۔ برطانیہ سے جو تھوڑی بہت سرمایہ کاری ہوتی وہ محض سامراجی مفادات کی

☆ افواجِ پاکستان اب اس مشتبہ وصف کی وارث بن چکی ہے، جو آج دنیا کی کسی بھی فوج کی نسبت قومی وسائل کا سب سے بڑا حصہ استعمال کرتی ہے۔ شاید کچھ پاکستانی اس کا الزام برطانوی میراث کو دیں۔

نگہبانی کرتی۔ وسائل کے اس نکاس سے، ہندوستان 'کھوکھلا'، 'کسل مند' اور 'زخمی' ہو گیا، جس نے اسے قحط، غربت اور مصیبت کے سامنے ناتواں بناڈالا۔ برطانوی مصنف، ولیم ڈگبئی کا جامع اور مفصل تخمینہ، ہندوستانی عوام کی ختم ہوتی ہوئی خوشحالی اور برطانیہ کی ہندوستانی دولت کی منظم ضبطی کی طرف اشارہ کرتا ہے__ بشمول اس تکلیف دہ حقیقت کے کہ 1901 میں ہندوستانی سیکرٹری آف سٹیٹ کی تنخواہ، نوے ہزار ہندوستانیوں کی اوسط آمدن کے برابر تھی، جو ہندوستانی ٹیکسوں سے ادا کی جاتی تھی۔

اینگس میڈیسن نے واضح نتیجہ اخذ کیا: 'اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ (سرمائے کا) خاصا زیادہ نکاس تھا، جو 190 سال تک جاری رہا۔ اگر یہی فنڈز ہندوستان میں لگائے جاتے تو یہ آمدن کی حد بڑھانے میں اہم کردار ادا کر سکتے تھے'۔ برطانیہ کو، سرکاری منتقلی اور ہندوستانی کمائی سے نجی ترسیل زر، برطانوی عہدیداران کی حد سے متجاوز تنخواہوں کے ساتھ مخلوط ہو گئیں۔ اس سے کام نہیں بنا، یقیناً برطانوی راج ترک وطن کرنے والوں کا طرز حکومت تھا، جن کے معاشی مفادات انگلینڈ میں تھے۔ ماضی میں جب کبھی ہندوستانی انتظامیہ سریر آرائے سلطنت رہی، حکومتی ملازمت سے آمدن مقامی طور پر پس انداز اور خرچ کی جاتی رہی؛ بجائے اس کے کہ یہ ساری غیر ملکیوں کے پاس چلی جائے، جو اسے سلسلہ وار پردیس بھیجتے رہیں جہاں ان کے حقیقی مفادات ہوں۔ زیادہ تر معاشروں میں حکمرانوں کی آمدن معاشی ترقی کا اہم ذریعہ ہوتی ہے، کیونکہ یہ قوت خرید عوام کے ہاتھ میں دیتی ہے جو اسے مقامی اشیاء کے لیے خرچ کر سکتے ہیں اور بالواسطہ مقامی صنعت کو تقویت بہم پہنچاتے ہیں۔ لیکن ہندوستانی حکومت کی بڑی بڑی تنخواہیں اور الاؤنسز ان لوگوں کو ادا کی جاتیں، جن کی وابستگی انگلینڈ میں تھی اور بدیشی اشیاء کا شوق ہندوستان میں۔ اس سے برطانوی صارفی اشیاء کی درآمدات میں اضافہ اور مقامی صنعت کو خاصا زیادہ نقصان ہوا، جو کہ ماضی میں ہندوستانی اشرافیہ کی ضروریات کا سامان کرتی تھی__ سامان تعیش بنانے والے، دستکار، عمدہ ریشم اور ململ بننے والے، جنھیں بورا صاحبان (اور خاص طور پر ان کی نازک دماغ انگریز میم صاحب) کی نذر نیاز میں دلچسپی نہ تھی یا بہت ہی کم تھی۔

1901 میں، ولیم ڈگبی نے انیسویں صدی میں معاشی نکاس سے نکالی گئی کل رقم کا خوب صراحت سے (اور ناگزیر طور پر، تلخی سے جواب دیا) تخمینہ لگایا، جو کہ 4،187،922،732 پونڈ تھا۔ جو کہ آج کے دور کی رقم میں، منہاز مرچنٹ کے تخمینے کا تقریباً نوواں حصہ بنے گا، یہ حساب صرف انیسویں صدی کا لگایا گیا تھا۔ بیسویں صدی میں اس سے زیادہ خرابی آنے والی تھی۔

یہاں ایک مختصر جملہ معترضہ سہی۔ کہ ہندوستان نے کتنا زرِ کثیر برطانوی سامراجی توسیع پسندی کے لیے مہیا کیا، اسے ان جنگوں کے لیے بار بار سمندر پار بھیجے گئے فوجی دستوں سے جانچا جا سکتا ہے، جن کا ہندوستان سے کچھ لینا دینا نہیں تھا اور سب کچھ برطانوی مفادات کے تحفظ اور وسعت کے لیے تھا۔ اور یہ تمام ہندوستانی فنڈز سے پایہ تکمیل تک پہنچا، خاص طور پر مصیبت زدہ کسان طبقے کے محنت کشوں سے چھینے گئے زرعی محاصل سے یا مختلف رجواڑوں کے ساتھ امدادی میثاق کے ذریعے وصول کیا گیا۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں برطانیہ کی طرف سے ہندوستانی فوج کی سمندر پار صف بندی کی فہرست خاصی معلومات فراہم کرتی ہے: چین (1860، 1900 - 01)، ایتھوپیا (1867-1868) ملایا (1875)، مالٹا (1878)، مصر (1882)، سوڈان (1885-86، 1896)، برما (1885)، مشرقی افریقہ (1896، 1897، 1898)، صومالی لینڈ (1890، 1903-04)، جنوبی افریقہ (1899، لیکن صرف سفید فام دستے)، اور تبت (1903). چند اہم نمبروں کا ذکر قابل قدر ہو گا، بشمول: 5787 ہندوستانی فوجیوں نے چین کی 1856-57 کی جنگ میں حصہ لیا، جو کہ میثاق ٹائنٹسن (1857) اور کینٹن کے قبضہ پر منتج ہوئی؛ 11000 فوجی 1860 میں چین بھیجے، جن کی مہم جوئی پیکنگ کے قبضے اور تسلط پر ختم ہوئی؛ 12000 فوجی برطانوی قیدیوں کو چھڑانے کے لیے حبشہ (ایتھوپیا) بھیجے؛ 9444 فوجی اور 1479000 سے زائد روپے 1882 اور 1896 میں مصر کی بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے مختص کیے گئے؛ 1219 فوجی مشرقی افریقہ میں بغاوت کچلنے کے لیے بھیجے گئے؛ برطانیہ نے برطانوی ہند فوج کو برصغیر ہند کی فتح کی تکمیل کے لیے 1818 میں سائیکلون (سری لنکا) میں کینڈیان کی جنگ میں استعمال کیا؛ اور برما کی جنگ، 1824 اور 1826؛ جس میں برطانوی ہند فوج کے ہر سات میں سے چھ فوجی بیماری یا جنگ کی وجہ سے مارے گئے۔ کچھ ہی عرصہ پہلے دوسری جنگ عظیم میں، چند گنے چنے، جنھوں نے برطانوی جنگ میں جرمن حملے کے خلاف انگلینڈ کا بہادری سے دفاع کیا، وہ ہندوستانی لڑاکا پائیلٹ تھے، بشمول ایک نڈر سکھ کے جس نے اپنے ہری کین فائیٹر کو امر تسر کا نام دیا۔

انیسویں صدی کے آخر میں برطانیہ کے پاس 325000 جوانوں کی مستقل فوج تھی، جس میں سے دو تہائی کی ادائیگی ہندوستانی ٹیکسوں سے کی جاتی تھی۔ ہندوستان میں تعینات ہونے والے ہر برطانوی فوجی کو ادائیگی کرنا پڑتی، مسلح کرنا پڑتا اور خوراک مہیا کرنا پڑتی، اور آخر کار برطانیہ کی طرف سے نہیں حکومت ہند کی طرف سے پنشن۔ ہندوستانی اور یورپی فوجیوں کے درمیان عہدے، تنخواہ، ترقی، پنشن، سہولیات اور راشن کا تفاوت۔

بہت زیادہ تھا۔ ہندوستانی پیداوار سے حاصل ہونے والے بسکٹ، چاول، آٹا، کشمش، وائن، سؤر اور بڑے گوشت پر یورپی فوجیوں کا ادھیکار تھا۔

فوجیوں کے ساتھ ساتھ، ہندوستان کے مزدوروں اور تجارتی (کمرشل) ہنرمندی نے بہت سی غیر ملکی برطانوی نوآبادیات میں برطانوی سامراجی حکمرانی کو مضبوط کرنے میں مدد دی۔ ہندوستانی مزدور کو ملایا، جنوب مشرقی افریقہ اور پیسیفک میں زرعی شجرکاری کی بڑھوتری، یوگنڈا میں ریلوے کی تعمیر، اور برما کو جنوبی ایشیا کا چاول کٹورا بنانے کے لیے استعمال کیا گیا۔ ہندوستانی پرچون فروش اور تاجروں نے اپنے یورپی مقابل کی نسبت کم لاگت میں تجارتی ڈھانچہ بنایا۔ ہندوستانیوں نے، چین اور افریقہ میں، یقیناً جونیئر عہدوں پر، نظم و نسق سنبھالا۔ جیسا کہ ہم پانچویں باب میں دیکھیں گے، انیسویں صدی میں، ان میں سے خاصی تعداد کو بطور مجرم یا معاہداتی مزدور، دور دراز کی برطانوی نوآبادیات میں ہجرت پر مجبور کیا گیا۔

لیکن ہندوستان کو استعماریت کے کسی بھی انعام یا فائدے سے محروم رکھا گیا۔ ہندوستانی فوجی دستوں نے برطانوی مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے جو قربانیاں دیں، جن کے ثمرات آج بھی جاری ہیں، نہ تو انھیں اور نہ ہی ان کے پیچھے رہ جانے والے خاندانوں کو عوضانہ دے کر تسلیم کیا گیا، اور نہ ہی ہندوستان کی بہبود میں کوئی خاص اضافہ ہوا۔ (اور یہاں تک کہ یہ تو ہندوستان اور ہندوستانی فوجیوں کے دونوں عظیم جنگوں میں کردار کو بھی شمار نہیں کرتا، جس پر میں بعد میں گفتگو کروں گا)۔

❖

کمپنی کی حکمرانی کے دور میں، انگریز معاہدات اور باضابطہ عہد کی پاسداری نہ کرتے، حتیٰ کہ امن کے بدلے طلب کی جانے والی رقم کی ادائیگی، افسانہ بن گئی: حیدر علی، ایک جنگجو شہزادہ، جس پر انھوں نے بغیر کسی اشتعال کے حملہ کیا، انھیں 'نوعِ انسانی میں سب سے زیادہ بدعہد اور غاصب' سمجھتا تھا۔ ولیم ہووٹ تاسف کا اظہار کرتا ہے 'آج کے دن تک بھی، انسانی زندگی اور انسانی بہبود کتنی حقیر ہے، جب اسے تسلط اور طمع کے مقابل میزان میں تولا جائے'۔ ہم نے اس دہشت اور تشدد کے متعلق کچھ نہیں سنا، جس کا ارتکاب ہم نے کیا، بنگال پر پہلی یورش سے لے کر نیپال اور برما تک؛ ہمارے پاس صرف سلطنت کے کارِ نمایاں کے قصائد ہیں: "دیکھو ہم نے کیا عظیم الشان سلطنت حاصل کی ہے"۔☆

☆ جنگِ عظیم اول میں ہندوستان کی فراخدلانہ شرکت کی تفصیلات باب دوم میں بیان کی گئی ہیں۔ جنگِ عظیم دوم کے اعداد و شمار بھی

تاج (برطانیہ) کی ذمہ داری کا مفروضہ، نوآبادیاتی جواز کی ایک نئی زبان کے آغاز کا بھی شاہد تھا ___ یہ مکر کہ برطانیہ ہندوستانی عوام کی بہبود کے لیے حکومت کرے گا۔ جارج برنارڈ شاہ نے بیان کیا کہ، جب ایک انگریز کوئی چیز پانا چاہتا ہے، تو وہ اعلانیہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ اسے اس کی خواہش ہے؛ بلکہ اس کی خواہش کا اظہار یوں ہوگا 'ایک سلگتا یقین کامل کہ یہ اس کا اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے کہ انھیں فتح کرے جن کے پاس وہ چیز ہے جس کی اسے خواہش ہے'۔ ڈیورانٹ اس حیلہ سازی کے متعلق خاصی درشت تنقید کرتا ہے: 'حیوانیت کے ساتھ منافقت شامل کی گئی، جبکہ لوٹ مار ویسے ہی جاری رہی'۔

اور یہ ہونا جاری رہا۔ انگریز ذاتی تحقیر گھٹا کر، مذاق کرنا پسند کرتے، (جیسا) کہ وہ خلا میں ٹھوکر کھا بیٹھے اور ہندوستان میں سلطنت حاصل کرلی، کیمبرج کے شاہانہ تاریخ دان جان سیلے کے اکثر حوالہ جاتی الفاظ میں، 'غیر حاضر دماغی کا دورہ پڑنے پر'۔ (سیلے نے، انگلینڈ کی توسیع میں، بڑی چالاکی سے دعویٰ کیا ہے کہ 'ہندوستان کی فتح حقیقی معنوں میں کوئی فتح تھی ہی نہیں'۔) بلکہ حقیقت اس سے زیادہ درشت اور ناخوشگوار تھی۔ وسیع پیمانے پر معاشی استحصال نہ صرف دیدہ و دانستہ تھا؛ (بلکہ) یہ فقط موثر سیاسی و معاشی تسلط کے زیر سایہ ممکن تھا۔ کمپنی کی توسیع کا تحرک شاید بجا طور پر، کسی بڑے سامراجی منصوبے کی بجائے، واقعات کے ردعمل میں کیے گئے جوڑ توڑ کے سلسلے، اور کمپنی عہدیداران کی چمکدار آنکھوں کے سامنے آنے والے ان مواقع کو گرفت میں لینے کی خواہش سے ہوا۔ انھوں نے ایک کٹھور استدلال کی پیروی کی؛ جیسا کہ کلائیو نے ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی توسیع کا جواز دیتے ہوئے کہا، 'رکنا خطرناک تھا اور پیچھے ہٹنا بربادی'۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ایک کے بعد ایک ریاست کا الحاق کیا گیا، ان کے حکمرانوں کو جنگ میں فنا ہونے اور محکومی میں ایک آسودہ زندگی کے درمیان انتخاب کی پیشکش کی سادہ تدبیر اختیار کرکے۔ جب جنگ چھیڑی جاتی، تو اس کے مصارف کی ادائیگی ہندوستانیوں سے ٹیکس اور خراج وصول کرکے کی جاتی۔ دوسرے الفاظ میں، ہندوستانیوں نے، برطانیہ کے فتح کرنے کے استحقاق کی ادائیگی کی۔

بقیہ: کارآمد ہیں۔ ہندوستان اور سمندر پار دونوں جگہوں پر فرائض انجام دیتے ہوئے، جنگ کے آغاز میں (1939 میں) ہندوستانی فوج کی تعداد 194373 جوان تھی؛ جو 1945 تک بڑھ کر 2065554 ہوگئی۔ فضائیہ نے مزید 29201 فوجی بھرتی کیے اور رائل انڈین نیوی کے پاس 30478 تھے۔ (بھاٹیہ، 1977، ص، 234-235۔) ہندوستانی فوج کی جنگ میں اموات کافی زیادہ تھیں، جو کیم ستمبر 1939 اور 28 فروری 1945 کے درمیان 149225 تک پہنچ گئیں۔ مادی امداد بھی بہت زیادہ تھی۔ ایک مضحکہ خیز تفصیل، برطانیہ کا ہندوستانی فولاد کی صنعت کا گلا گھونٹنا تھا: برطانوی اسٹیل کی شپمنٹ کے سمندر میں کھو جانے کے بعد، ہندوستان نے سات ہزار ٹن اسٹیل انگلینڈ کو بھجوایا۔

ولیم ہووٹ نے 1839 میں برہمی سے تحریر کیا: 'جس طریقہ کار کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کا قبضہ حاصل کیا، وہ انتہائی مکروہ اور عیسائیت کے قوانین کے (اتنا) خلاف تھا، جتنا کہ تصور کیا جا سکتا ہے..... 'نظام، جو ایک صدی سے زائد عرصہ سے، مقامی راجاؤں سے ان کے راجواڑے چھیننے کے لیے، باقاعدہ طور پر کام کر رہا تھا، اور یہ سب کچھ بھی حق اور مصلحت کی مقدس عذرخواہی کے تحت ہو رہا تھا، (یہ) تشدد کا نظام تھا جو آج سے پہلے دریافت ہونے والے کسی بھی شاہی وروحانی ظلم کی نسبت زیادہ لطیف تھا۔

لیکن جیسا کہ فرڈینینڈ مونٹ __ کمپنی کے ایک مشہور جنرل کی اولاد نے خود __ حال ہی میں واضح کیا ہے کہ، یہ سب سرمایہ دارانہ نظام کی سادہ منطق تھی: ہندوستان میں برطانوی سلطنت تاجروں کی تخلیق تھی، اور بھیتر میں یہ ابھی تک ایک تجارتی انٹرپرائز ہی تھی، جسے منافع کے زیر اثر کام کرنا تھا اور منڈی کے اتار چڑھاؤ پر رد عمل دینا تھا۔ شانوں پر سجے فیتوں، گھوڑوں کی زین کی چھن چھن، دربار شاہی اور سرکاری دفاتر میں گلوب کے پیچھے، لندن شہر کے بے رحم اعداد و شمار تھے۔

دادا بھائی نوروجی، جو 1892 میں برطانوی دارالعوام کے لیے منتخب ہونے والے پہلے ہندوستانی تھے، نے 'پارلیمنٹس کی ماں' میں ہندوستان کے مقدمہ کے لیے دلائل دیے (اور آئیر لینڈ کی داخلی خودمختاری کے لیے بھی)، انگریزوں کی اچھی فطرت سے لاحاصل التجا کرتے ہوئے __ اپنی کتاب 'ہندوستان میں غربت اور غیر برطانوی حکمرانی' میں __ مکمل طور پر برطانویوں کے اپنے الفاظ پر انحصار کرتے ہوئے درجہ ذیل الزام عائد کیا:

> جناب منٹگمری مارٹن نے بنگال اور بہار کے بعض صوبہ جات کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد __ 1835 میں اپنی کتاب 'مشرقی ہندوستان' میں کہا: یہ ناممکن ہے کہ دو حقائق جو بالخصوص حیرت انگیز ہیں پر رائے زنی سے بچا جا سکے، پہلا سروے کیے گئے ملک کی امارت، اور دوسرا اس کے باشندوں کی غربت.... برطانوی ہند سے 30 لاکھ پونڈ کا سالانہ نکاس، جو تیس سال میں سود در سود ہوتے ہوئے 723900000 پونڈ کی بے انت رقم تک پہنچ گیا۔ اتنا مستقل اور مجموعی نکاس، اگر انگلینڈ میں بھی ہوتا، تو اسے بھی جلد ہی محتاج کر دیتا۔ تو ہندوستان پر اس کے اثرات کتنے شدید ہوئے ہوں گے، جب کہ مزدور کی ایک دن کی مزدوری دو سے تین پینس ہے---
>
> مل کی 'تاریخ ہند' (جلد ششم، ص 671؛ اصلاحات ہندوستان کا رسالہ، دوم، ص 3) بیان کرتا ہے: 'یہ ملکی وسائل خالی کر دینے والا نکاس تھا، اس مسئلہ کو کسی متبادل سے تبدیل نہیں کیا گیا؛ یہ قومی

صنعت کی شریانوں سے زندگی کا ست نچوڑنا تھا، جس کی بحالی کے لیے غذائیت کا کوئی مابعد انتظام متعارف نہیں کروایا گیا'۔

سر جارج ونگیٹ نے (1859) میں کہا: 'ٹیکس اسی ملک میں خرچ کرنا جس ملک سے اکٹھے کیے گئے ہیں اپنے نتائج میں مکمل طور پر اس سے مختلف ہے کہ ٹیکس ایک ملک سے اکٹھے کیے جائیں اور دوسرے میں خرچ۔ پہلے کیس میں عوام سے وصول کردہ ٹیکس.... دوبارہ صنعتی طبقے کو لوٹا دیے گئے.... لیکن معاملہ مکمل طور پر مختلف ہوتا ہے جب ٹیکس اس ملک میں خرچ نہ کیے جائیں جس ملک سے اکٹھے کیے گئے تھے.... یہ ٹیکس دینے والے ملک سے حاصل کردہ تمام رقم کا مکمل خسارہ اور بربادی ظاہر کرتا ہے...یوں جیسے (روپیہ) سمندر برد کر دیں۔ کچھ ایسی ہی صورتحال اس خراج کی تھی جو ہم کافی عرصے سے ہندوستان سے طلب کر رہے تھے'۔

لارڈ لارنس، لارڈ کرومر، سر آکلینڈ کولون، سر ڈیوڈ باربور اور دوسروں نے ہندوستان کی حد درجہ غربت کو آشکار کیا۔-----جناب ایف جے شور کی رائے ہے: 'ہندوستان کے سکون کے دن پورے ہو چکے؛ اس دولت کا خاصا بڑا حصہ اس سے نکال لیا گیا، جو کبھی اس کی ملکیت تھی، اور اس کی قوتوں کو بد نظمی کے ایک غلیظ نظام نے محدود کر دیا، جس میں چند لوگوں کے فائدے کے لیے لاکھوں کے مفادات قربان کیے جاتے رہے.... برطانوی حکومت کے قائم کردہ نظام حکمرانی کے تحت، ملک اور عوام کے بتدریج افلاس نے ان کے زوال کو تیز کر دیا'۔

جہاز رانی و جہاز سازی کی تباہی

یہ اس قدر فاسد تھا، چونکہ لوٹ مار اتنی نمایاں تھی، حتیٰ کہ اس دور کے انگریزوں کو بھی اسے تسلیم کرنا پڑا۔ اس سے بھی بدتر، کہ ہندوستانی صنعت تباہ کر دی گئی، جیسا کہ ہندوستانی تجارت، جہاز رانی اور جہاز سازی۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے آنے سے پہلے بنگال، مسولی پٹنم، سورت اور مالابار کی کالیکٹ اور کویلون کی بندرگاہوں پر ایک ابھرتی ہوئی جہاز سازی کی صنعت تھی اور ہندوستانی جہاز بحیرہ عرب اور خلیج بنگال میں مصروف کار تھے۔ حتیٰ کہ مراٹھے، سولہویں صدی میں خاصا بڑا بحری بیڑا چلاتے تھے، شیوا جی بھونسلے کی بحری فوج نے پرتگیزی حملے کے خلاف مغربی ساحل کا دفاع کیا تھا۔ مزید جنوب کی طرف، مسلمان کنجالی مار یکرز کے بہادر جہاز رانوں نے کالیکٹ کے زمورین کو سولہویں صدی کے وسط میں یہ فرمان جاری کرنے پر آمادہ کیا کہ

اس کی مملکت کا ہر ماہی گیر خاندان ایک بیٹے کی پرورش بطور مسلمان کے کرے گا، تاکہ اس کی مکمل مسلمان بحریہ میں بھرتی ہو سکے۔ سترہویں صدی کے آغاز میں بنگال کا بحری بیڑا چار سو سے پانچ سو ٹن فی کس کے چار سے پانچ ہزار جہازوں پر مشتمل تھا، جو بنگال میں تعمیر کیے گئے اور وہیں متعین تھے؛ ڈھوئی جانے والی اشیاء اور مصنوعات کو بہت زیادہ مقبولیت عطا کرتے ہوئے، یہ تعداد اٹھارویں صدی کے وسط تک مزید بڑھ چکی تھی۔ برطانویوں نے ابھرتی ہوئی جہاز رانی و جہاز سازی کی پیداوار کو سختی سے کچل ڈالا۔

1757 کے بعد کاروباری مسابقت کم کرنے کے لیے، کمپنی اور برطانوی جہازوں کے جو معاہدے ہوئے اس سے تجارتی راستوں، بشمول ان کے جو اس سے پہلے ہندوستانی تاجروں کے استعمال میں تھے، پر (ان کی) اجارہ داری قائم ہو گئی۔ محض غیر ممالک کے ہی نہیں، بلکہ ہندوستانی بندر گاہوں کو آنے اور جانے والے ہندوستانی تجارتی جہازوں پر بھی ڈیوٹی عائد کی گئی۔ اس نے ماسوائے مقامی صارف کو سستی دیسی اشیاء کی کچھ تھوڑی بہت ساحلی ترسیل کے، مقامی جہازی صنعت کو ہر چیز سے لاتعلقی کی حد تک کچل ڈالا۔

برطانوی شپنگ پالیسی کی ذاتی مفادات کی تسکین کی فطرت نپولین جنگوں کے دوران عیاں ہونے لگی۔ جو برطانوی تجارتی جہازوں کی شدید قلت کا باعث بنی۔ (1803 کی جنگ میں برطانوی شپنگ کے 173000 ٹن تباہ ہوئے، جس نے لندن میں حکومت کو مجبور کیا کہ وہ برطانوی تجارت جاری رکھنے کے لیے 112890 ٹن غیر ملکی جہازوں کی خدمات حاصل کرے۔) مصلحتاً، اب ہندوستانی جہاز رانی کو برطانوی تصور کیا گیا اور ہندوستانی جہاز رانوں کی دوبارہ درجہ بندی برطانوی جہاز راں کے طور پر کی گئی، نیویگیشن ایکٹ کے تحت انھیں برطانوی تجارتی رستوں تک رسائی کی اجازت دی گئی۔ لیکن جونہی نپولین جنگیں ختم ہوئیں، ہندوستانی جہاز رانی کو خارج کرنے کے لیے، نیویگیشن ایکٹس میں دوبارہ ترمیم کی گئی، اور یہ صنعت دوبارہ زوال پذیر ہو گئی۔

یہ کہانی بیسویں صدی کے اوائل میں دوہرائی گئی، جب مدراس میں وی. او. چدم برم پیلائی کو جنگ عظیم اول میں فراہمی کے لیے شپنگ کمپنی لگانے کی اجازت دی گئی۔ اس کی کامیابی نے خطرے کی گھنٹی بجا دی، بہرکیف، جب محض قوانین اس کے کاروبار کو تباہ نہ کر سکے تو اس کی ہمت اور کاروبار کی کمر توڑنے کے لیے، اس کے نیشنلسٹ نقطہ نظر کی وجہ سے جلد ہی اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ ہندوستانی جہاز رانی کے ابھرتے ہوئے پنچے کو کاروبار سے بیدخل کر دیا گیا۔ ہندوستانی جہاز رانی کا تجربہ تصدیق کرتا ہے کہ برطانوی عہدیداروں نے ضرورت پڑنے پر، دانستہ اور بدگمانی سے، ہندوستانی صنعتوں سے استفادہ کیا اور بصورتِ دیگر کچل ڈالا۔

ہندوستانی جہاز سازی (جو اتنی لمبی ساحلی پٹی والی سرزمین پر کافی عرصہ سے فروغ پا چکی تھی) ایک زیادہ پیچیدہ اور سبق آموز داستان پیش کرتی ہے۔ شروع کے جمود اور زوال کے دور کے بعد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار سنبھالنے کے بعد، اٹھارویں صدی کے آخری ربع میں، ہندوستانی جہاز سازی کا بنگال میں احیاء ہوا۔ برطانوی تاجروں کو سلام، جنھوں نے ہندوستانی مزدوروں کو بروئے کار لاتے ہوئے، کلکتہ میں اپنے جہازوں کی تعمیر کے فوائد کا احساس کیا۔ گورنر جنرل ویلزلے نے رپورٹ کیا کہ، سن 1800 تک برطانوی ہند کی بندرگاہ کلکتہ میں، ہندوستان میں تیار کردہ، 10000 ٹن کارگو شپنگ تھی۔ 1801 سے 1839 کے دوران، برطانویوں کی ملکیت کے مزید 327 جہاز بنگال میں تیار کیے گئے۔

ہندوستان میں برطانوی قیادت میں اس تجارتی سرگرمی کی منطق خالصتاً پیشہ ورانہ تھی اور اس کی بنیاد معقول معاشی اعدادوشمار پر تھی۔ ہندوستانی کاریگری اور ملک کی جہاز سازی کی لمبی روایت کی برطانوی جہاز سازوں نے انتہائی قدر کی، جنھوں نے اپنے جہازوں کی تعمیر کے لیے ہندوستانی بحری فن تعمیر کی متعدد تکنیکیں خود اختیار کیں۔ ایک ہم عصر برطانوی مبصر نے لکھا، ہندوستانی جہازوں میں، 'نفاست اور افادیت یکجا ہو گئے اور وہ پائیداری اور عمدہ کاریگری کے نمونے تھے'۔ ہندوستانی کاریگر ہر طرح کے جہاز سازی کے میٹریل کے ماہر سمجھے جاتے __ لکڑی، لوہا اور پیتل (اعلیٰ لچکدار پیتل لکڑی کے جہاز بنانے کے لیے ناگزیر تھا، چونکہ یہ جہازوں کی فٹنگ کے لیے استعمال ہوتا تھا، سورس واٹر پمپ، شافٹ لائینز اور کیل)۔ اور ان کا کام غیر معمولی طور پر پائیدار ثابت ہوتا: بنگال کے بنے جہاز کی اوسط عمر بیس سال سے زیادہ ہوتی، جبکہ انگریزوں کے بنے گیارہ یا بارہ سال سے زیادہ نہ نکال پاتے، اور اکثر اوقات ہندوستانی بندرگاہوں پر از سرنو بنانے یا مرمت کرنے پڑتے۔ (ایسا ہونے کی کسی حد تک وجہ شاید سخت لکڑی کے معیار میں تھی، جو ہندوستانی جہاز سازی کے لیے استعمال کرتے تھے، برطانویوں کے چیڑ اور بلوط کے برعکس زیادہ تر ساگوان اور سال کی لکڑی)۔

اس کا مطلب تھا کہ برطانیہ کی نسبت ہندوستان میں بننے والے جہازوں پر نہ صرف لاگت کم آتی، بلکہ ان کی قدر کم ہونے میں بھی زیادہ وقت لگتا، یوں برطانوی تاجروں کے لیے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا۔ کم لاگت کے نتیجے میں، وہ اس قابل ہو گئے کہ، ان کمپنیوں کی نسبت، جو انگلینڈ کے بنے جہاز استعمال کرتی تھیں، جہاز کا کرایہ کم رکھ سکیں۔ ہندوستان میں جہاز تیار کرنا برطانوی تاجروں کے لیے خاصا پرکشش تھا، کیونکہ انیسویں صدی کے دوسرے عشرے تک برطانیہ میں جہاز سازی کی صنعت میں بے روزگاری کافی بڑھ چکی تھی

___ جہاز ساز، جہازوں کی درز بندی کرنے والے، لکڑی چیرنے والے اور جوڑ لگانے والے سینکڑوں کی تعداد میں لندن میں بے روزگاروں کی فہرست میں اندراج کروانے لگے۔

برطانوی بنیاد رکھنے والا کاروبار بالکل بھی مقابلہ نہ کر سکا، لہذا انھوں نے ہندوستانی جہاز سازی پر پابندی کے لیے پارلیمنٹ میں دعویٰ دائر کر دیا۔ ان کی حمایت میں پہلا قانون ساز ضابطہ 1813 میں ایک شق کے ساتھ آیا جو 350 ٹن سے کم کے جہازوں پر ہندوستانی نو آبادیات اور انگلینڈ کے درمیان سفر پر پابندی عائد کرتا تھا۔ اس سے بنگال کے تیار کردہ قریباً 40 فیصد جہاز ہندوستان و برطانیہ کی نفع بخش تجارت سے باہر ہو گئے۔ 1814 کا ایک اور ضابطہ، ہندوستانی تیار کردہ جہازوں کا امریکہ اور براعظم یورپ کے ساتھ تجارت میں 'برطانوی رجسٹرڈ جہاز' باور کیے جانے کے استحقاق کا انکار کرتا ہے۔ حالانکہ نظری طور پر، وہ ابھی بھی چین کے ساتھ تجارت کر سکتے تھے، یہ سیکٹر غیر منافع بخش ہو چکا تھا، کیونکہ ماضی میں معمول یہ تھا کہ کلکتہ سے ہندوستانی اشیاء کے ساتھ چین کا بحری سفر کیا جاتا، وہاں سے لندن کے لیے چائے لادی جاتی، اور پھر برطانوی اجناس کے ساتھ کلکتہ واپسی ہوتی؛ ان کے لیے برطانوی سیکٹر پر پابندی کے بعد، یہ جہاز صرف کلکتہ سے چین اور وہاں سے واپسی کا بحری سفر ہی کر سکتے تھے، لیکن چینی اشیاء کے لیے ہندوستان میں کوئی مارکیٹ نہیں تھی (ہندوستانی ابھی چائے کے شوقین نہیں ہوئے تھے) اور لندن تک رسائی سے جہازوں کو، عموماً خالی پلٹنا پڑتا۔

بنا بریں، اسی دوران، ہندوستانی جہاز رانوں کو غیر برطانوی قیاس کیا گیا اور انگلینڈ کے بحری سفر کے لیے انھیں بھرتی کرنے کے حوالے سے کمپنیوں کی حوصلہ شکنی کی گئی جہاں غالباً وہ مقامیوں کے اخلاق باختہ کردار کا نشانہ بن سکتے تھے، جو کہ 'انھیں اس عزت و احترام سے محروم کر دیتا، کہ ہندوستان میں جس یورپی کردار کے لیے وہ دل میں جگہ رکھتے تھے'۔ (اخلاق اور نسل پرستی کو ہمیشہ ننگے کاروباری مقاصد کو خوش نما بنانے کے لیے استعمال کیا گیا۔) اگرچہ، ہندوستانی بندرگاہوں پر ممکن الحصول برطانوی ملاحوں کی کمی کو مدنظر رکھتے ہوئے، ان جہاز رانوں کو گورنر جنرل کی طرف سے ایک سرٹیفکیٹ جاری کر کے، کہ کوئی برطانوی متبادل دستیاب نہیں، بڑے جہازوں پر بھرتی کی اجازت دی جا سکتی تھی، قانون جہاز مالکان سے تقاضا کرتا تھا کہ انگلینڈ سے واپسی کے سفر میں جہاز ران بھرتی کیے جائیں، (جس کی وجہ سے) سفر کی لاگت خاصی حد تک بڑھ جاتی ___ دونوں طرح، کیونکہ حقیقت میں، اسے دو جہازی عملوں کو ادائیگی کرنا پڑتی اور اس لیے کہ برطانوی جہاز راں زیادہ اجرت وصول کرتے۔

دوسرے الفاظ میں، برطانوی کمپنیوں کو ہندوستان میں جہاز بنانے اور وہاں سے چلانے کے فوائد، امتیازی قانونی پالیسیوں کے نتیجے میں ختم ہونے لگے۔ کچھ عرصہ پہلے تک، ترقی پذیر ہندوستانی جہاز سازی کی صنعت تباہ ہو گئی، اور در حقیقت 1850 تک نابود ہو گئی۔ جیسا کہ کچھ لوگ خیال کرتے ہیں، اس کا ٹیکنالوجی کی تبدیلی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا، جس کا کہ مبینہ طور پر ہندوستان ساتھ نہ دے سکا: یہ تباہی، دخانی جہازوں کے بادبانی جہازوں پر غلبہ حاصل کرنے سے کافی پہلے شروع ہوئی، اور اس صورت میں بھی بنگال نے خود کو دخانی جہاز تیار کرنے کا اہل ثابت کیا، نئے قوانین سے پہلے اور نتیجتاً مارکیٹ میں مواقع کی کمی نے اس سرگرمی کو غیر منافع بخش بنا دیا۔ جیسا کہ وکٹورین مبصر، ولیم ڈگبی کو کہنا پڑا، مغربی دنیا کے سمندروں کی رانی نے مشرقی سمندروں کی رانی کا قتل کر دیا۔

دوسرے کاروباری پیشے بھی اس امتیازی سلوک سے مستثنا نہیں تھے۔ نو آبادیاتی امتیاز کی ایک شکل جو کہ ہر جگہ موجود اور انتہائی مؤثر تھی، وہ برطانوی اور ہندوستانی کاروبار کو علیحدہ رکھنے کے لیے کرنسی کا استعمال اور ہر ایک کے لیے مواقع کو ضوابط میں لانا تھا۔ کاروبار کی سٹرلنگ (کمپنیاں جو لندن سے باہر کاروبار کرتیں) اور روپے (کمپنیاں جو ہندوستان سے باہر کاروبار کرتیں) میں تقسیم نے ایک ایسی خلیج پیدا کر دی جسے آسانی سے عبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صرف برطانوی ہی سٹرلنگ کمپنیوں میں سرمایہ کاری کر سکتے تھے جبکہ روپے والی کمپنیاں برطانوی اور ہندوستانی دونوں کی سرمایہ کاری کے لیے کھلی ہوئی تھیں۔ سٹرلنگ کمپنیاں، یوٹیلیٹیز، چائے اور پٹ سن پر توجہ مرکوز کرنے پر مائل تھیں؛ اس کا مطلب تھا کہ، جو برطانویوں نے اپنے لیے مخصوص کر رکھی تھیں، ان مارکیٹوں میں داخل ہونے کے لیے ہندوستانیوں کے آگے خاصی رکاوٹیں تھیں۔ مزید بر آں، سٹرلنگ کمپنیوں کو برطانوی انتظامی نمائندہ درکار تھا جو کہ لندن میں رہنے والے سرمایہ کاروں کے سرمایہ مہیا کرنے سے پہلے ان کی نگرانی کرے۔ ہندوستانی سرمایہ کاروں کو بالکل ہی محروم رکھا گیا۔ لہٰذا ہندوستان میں 1914 تک چائے کی صنعت میں 385 جائنٹ سٹاک کمپنیوں میں سے 374 کی بنیاد کلکتہ میں تھی، اور یہ تمام برطانویوں کی ملکیت میں تھیں۔ محققین نے یہ ثابت کیا ہے کہ 1915 میں ہندوستان کی پٹ سن کی 100 فیصد ملیں برطانویوں کے ہاتھ میں تھیں؛ 1929 تک یہ کم ہو کر 78 فیصد رہ گئیں، ابھی بھی برطانوی غلبہ چھایا ہوا تھا۔

برطانوی ہند، سامراجی تجارت اور ادائیگیوں کے نظام میں ایک بے مثال مقام رکھتا تھا۔ 1910 سے 1947 تک ہندوستانی معیشت نے مالیاتی اور شرح مبادلہ کے تجربات کے ایک سلسلے کو جھیلا۔ دوسرے

(معاملات) کے ساتھ اس میں تبدیلی زر کے معیار کی، سونے کے سکوں سے سٹرلنگ میں تبدیلی شامل تھی؛ روپے کی قدر میں دانستہ کمی سے نپٹنے کے لیے طے شدہ شرح مبادلہ کا نظام؛ مروجہ بنکنگ سسٹم کی ناتواں کار گزاری میں بتدریج بہتری؛ اور آخر کار ریزرو بنک آف انڈیا کا محدود اختیار کے ساتھ قیام (1934-1935)۔ طلب اور رسد کی عالمی و سامراجی قوتوں کے مقابل، ہندوستان کو قریباً 20 سے 30 فیصد سالانہ قیمت کے شدید اتار چڑھاو کا سامنا کرنا پڑتا۔ انگریز طے شدہ شرحِ مبادلہ کا وہ ڈھنگ اختیار کرتے جو ان کے لیے موزوں ہوتا، بنیادی طور پر برطانوی کرنٹ اکاؤنٹ خسارہ اور دوسری ملکی ہنگامی ضروریات پورا کرنے کے لیے، ہندوستانی رعایا کا خیال کم ہی کیا جاتا۔ ایسی پالیسیوں نے ہندوستان کے مالی بحران کی شدت میں اضافہ کر دیا، اور ان مصیبتوں کو بڑھا دیا، جو ہندوستانی، برطانوی راج کے ماتحت برداشت کر رہے تھے۔

کرنسی میں ہیر پھیر، سارے نوآبادیاتی کاروبار کی ایک خصوصیت رہی، جو کہ 1929 —1930 کے گریٹ ڈپریشن کے دوران اپنی بدترین حالت کو پہنچ گئی، جب ہندوستانی کسان (شمالی امریکہ کے مرغزاروں کی طرح) اپنا غلہ اگاتے لیکن پتہ چلتا کہ اسے خریدنے کی طاقت کوئی نہیں رکھتا۔ زرعی قیمتیں گر گئیں، لیکن برطانوی ٹیکس نہیں؛ اور سفاکیت کے ساتھ، برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان کے زرمبادلہ کے ذخائر روک دیے جائیں، اس خوف سے کہ ہندوستانی کرنسی کی قدر میں کمی، ہندوستان میں ان کے اثاثہ جات کی سٹرلنگ قدر میں ویسی ہی کمی، سے برطانیہ کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ لہٰذا برطانیہ نے اصرار کیا کہ ہندوستانی روپے کو ایک شلنگ اور چھ پنس پر قائم رکھا جائے، اور ہندوستانی حکومت کو پابند کیا جائے کہ شرح مبادلہ زیادہ رکھنے کے لیے، نوٹ اور سکے گردش سے باہر نکالے۔ ہندوستانی معیشت کا گردش میں کل نقد سرمایہ 1929 میں پانچ ارب روپے سے گر کر 1930 میں چار ارب رہ گیا، اور 1938 میں تین ارب تک گر گیا۔ ہندوستانی بھوکے مر گئے لیکن ان کی کرنسی اوپر ہی رہی، اور یوں ہندوستان میں برطانوی اثاثہ جات محفوظ رہے۔

دوسرے ادوار میں، روپے کی قدر میں بتدریج کمی برطانوی پالیسی کا سوچا سمجھا حصہ تھا تاکہ پونڈ کی قوت خرید کو مستحکم اور جو محض مقامی کرنسی میں کماتے ہیں ان کے معاشی اہداف کو کمزور کیا جائے۔ ایک کرنسی جو سترہویں صدی میں کبھی دنیا کی مضبوط ترین میں سے ایک تھی، کو انیسویں صدی کے آخر تک، اس کی پہلی قدر کے کسرِ عشاریہ تک گرا دیا گیا حتیٰ کہ آسکر وائلڈ کے ڈرامے 'دی امپورٹنس آف بیئنگ ارنسٹ' میں مس پرزم ولایت میں اپنی حساس سسلی کو ہدایات دیتے ہوئے، یہ نوٹ کرنے میں ناکام نہیں ہو سکتی۔ اپنی سیاسی معیشت کو

میری غیر موجودگی میں پڑھنا۔ روپے کی گراوٹ پر جو باب ہے اسے شاید تم نظر انداز کر دو۔ یہ کچھ زیادہ ہی سنسنی خیز ہو گا یہاں تک کہ ان دم گھونٹنے والے مسائل کا بھی جذباتی ناٹک والا پہلو ہو گا۔

ہندوستانی فولاد کی چوری

ہندوستانی فولادی صنعت کی کہانی وضاحت کرتی ہے کہ کیسے استحصال نوآبادیاتی دور کے آخر میں بھی جاری رہا، جسے سلطنت کے عذر خواہوں نے، بعض اوقات نوآبادیاتی حکومت کے زیادہ روشن خیال دور کے طور پر پیش کیا تھا۔ استبداد اور امتیاز تھوڑے سے مزید شائستہ ہو گئے۔

برطانیہ نے ہندوستانی فولاد کی صنعتی ترقی کی جم کر مخالفت کی۔ ہندوستان یقیناً فولاد کی اختراع کرنے والا رہ چکا تھا؛ ابتدائی طور پر، چھٹی صدی میں لوہے کی بھٹی کا بنا ہوا فولاد جو 'ووٹز' کے نام سے جانا گیا (کناڈا لفظ 'اوکو' کی بگڑی ہوئی شکل، جو کہ انگریزی میں غلطی سے 'ووک' لکھا گیا اور 'ووٹز' کی شکل میں غلط العام ہو گیا) فولاد ملک میں بنایا جاتا تھا اور پوری دنیا میں ہندوستانی فولاد عمدہ ترین کی شہرت رکھتا تھا۔ (بارہویں صدی میں، ہندوستانی تجربے کی بنیاد پر، عربوں کی لگائی گئی فولاد کی صنعت نے دنیا کو مشہور دمشقی فولاد دیا۔) ہندوستان کی بنی تلواریں افسانوی تھیں۔ فی الحقیقت، ہندوستان میں برطانوی نوآبادیاتی توسیع کے شروع کے دنوں میں، ہندوستانی تلواریں یورپی تلواروں سے اتنی برتر تھیں کہ انگریز گھڑ سوار جنگ میں اکثر گھوڑوں سے اتر کر اپنی تلواریں مغلوب دشمن کے سامان کے ساتھ ادل بدل لیتے۔ انگریزوں نے ٹیکنالوجی سے جتنا سیکھ سکتے تھے سیکھا اور پھر اٹھارویں صدی کے آخر تک ہندوستان میں دھات سازی کی صنعتیں بند کر دیں۔ اس کے احیاء کی کوششوں کو (پہلے) مزاحمت اور پھر نسل پرستانہ تضحیک کا سامنا کرنا پڑا۔

جب جمشید جی ٹاٹا نے صدی کے پھیر پر شدید برطانوی مخالفت کے ہوتے ہوئے، ہندوستان کی پہلی جدید سٹیل مل لگانے کی کوشش کی (اس نے 1883 میں برطانیہ کو منظوری کے لیے درخواست دینا اور ہندوستانی سرمایہ کاروں سے روپیہ اکٹھا کرنا شروع کیا؛ متعدد دفعہ انکار اور تاخیری (حربوں) کے بعد آخر کار اس نے 1912 میں اپنے بیٹے دراب جی کی زیر نگرانی پیداوار شروع کی)۔ سلطنت کا ایک عہدیدار حقارت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ سٹیل کا ہر اونس، جو ہندوستانی پیدا کرنے کے قابل ہیں، ذاتی طور پر ہڑپ جائے گا۔ حیف ہے کہ جو برطانوی فولاد بچ گیا تھا، وہ جمشید جی ٹاٹا کی اولاد کو، 2006 میں 'کورس' کے انتقال ملکیت کے ذریعے، اسے تحویل

میں لیتے ہوئے دیکھنے کے لیے زندہ نہ تھا: یہ اس کے لیے شاید بد ہضمی کا ایک بگڑا ہوا کیس ہوتا۔ (ٹاٹا سٹیل کے برطانیہ سے دوری کے مابعد فیصلے، اور برطانوی حکومت کے اپنی کھنڈر ہوتی سٹیل کی صنعت کے بچاؤ کے لیے، اضطراب میں تیزی سے حرکت میں آنے پر، شاید کچھ ہندوستانیوں کو خفیف سی مسرت کی تحریک ملی ہو۔)

بہرحال جب ٹاٹاز دوسرے ہندوستانیوں کو متاثر کرتے ہوئے سبقت لے گئے، تو برطانویوں نے ان کی ترقی کے لیے موثر طریقے وضع کیے۔ ہندوستان میں سٹیل کے دونوں بڑے صارف، حکومت اور ریلوے، (دونوں کو برطانوی کنٹرول کرتے) سٹیل کے برطانوی معیاری نمونے (برٹش سٹینڈرڈ سپیسی فیکیشن سٹیل، بی ایس ایس) پر اصرار کرتے، جو کہ نان برٹش سٹینڈرڈ سپیسی فیکیشن سٹیل (این بی ایس ایس ایس)، جو زیادہ تر باقی دنیا استعمال کرتی تھی، کی نسبت زیادہ اعلیٰ معیار کا تھا۔ بی ایس ایس کی شرائط بنیادی طور پر براعظمی فولاد کو نوآبادیاتی ہندوستانی مارکیٹ سے باہر کرنے کے لیے تیار کی گئیں لیکن اس نے ہندوستانی فولاد تیار کرنے والوں کا راستہ روکنے میں بھی کردار ادا کیا۔ ہندوستان میں فولاد کے مقامی پیداکاروں، جیسا کہ ٹاٹا، کو مجبور کیا گیا کہ وہ اس اعلیٰ معیار پر پورا اتریں یا حکومت اور ریلوے کے معاہدے سے خارج ہو جائیں۔

قانون کے مطالبے کے مطابق، بی ایس ایس بنانے پر توجہ مرکوز کرنے کی وجہ سے، ہندوستانی فرمیں بیک وقت سستا این بی ایس ایس نہیں بنا سکتی تھیں، جو کہ غیر برطانوی دنیا کے زیادہ تر حصے میں استعمال ہوتا تھا۔ بی ایس ایس بنانے کے نتیجے میں ہندوستان کی مقامی پیداوار کی زیادہ لاگت نے ہندوستانی فولاد کو، گریٹ ڈیپریشن اور 1930 کے عشرے کے آخر کی بحالی، دونوں کے دوران، وسیع عالمی مُنڈی میں غیر مسابقتی بنا ڈالا۔ دوسرے ترقی پذیر ممالک نے، 1930 کے عشرے کے ہندوستان سے ملتے جلتے حالات میں، بغیر بڑے مسائل کے، این بی ایس ایس کے استعمال سے اپنی فولاد کی صنعتیں تیار کر لیں۔

یقیناً، وہ برطانیہ کو بی ایس ایس سٹیل برآمد کر سکتے تھے، جس کا برطانوی فولاد کی صنعت خیر مقدم نہ کرتی۔ لہٰذا برطانیہ نے ہندوستانی فولاد کی درآمد پر پابندیاں لگا دیں۔ برطانویوں نے بڑی ذہانت کا مظاہرہ کیا، کہ سٹیل کیک بھی اپنا ہی رکھا اور کھایا بھی خود۔ دوسرے الفاظ میں، ہندوستان کو مجبور کیا گیا کہ فولاد بنائے اور استعمال کرے، جو کہ اس کی ضروریات سے زائد تھا، اپنے لیے سمندر پار منڈیاں ڈھونڈنے کی اہلیت پر پابندیاں عائد کی گئیں، اور توسیع کی ہر کوشش کو کچلا گیا۔ لہٰذا ہندوستانی کمپنیوں، مثلاً ٹاٹا سٹیل کے پاس برطانوی معاشی ایکو سسٹم کے اندر ترقی کے مواقع بہت ہی کم تھے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، برطانوی حکمرانی کے چند عذر خواہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہندوستانی صنعت اور معاشی ترقی کی بربادی کے لیے برطانیہ کی مذمت ناجائز ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان کی صنعت کا خاتمہ نہیں کیا۔ ہندوستان کا عالمی جی ڈی پی میں حصہ اس لیے کم ہوا کیونکہ ہندوستان کی صنعتی ترقی کی 'بس چھوٹ گئی' اور ٹیکنالوجیکل اختراع جس نے مغرب کی کایا پلٹ دی، سے فائدہ اٹھانے میں ناکام رہا۔ جب زیادہ تر دنیا زراعت سے منسلک تھی تو ہندوستان کا عالمی جی ڈی پی میں خاصا بڑا حصہ تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ جوں جوں دنیا تبدیل ہوتی گئی، سائنسی اور صنعتی ترقی جو کہ ہندوستان کرنے کے قابل نہیں تھا، کی وجہ سے دوسرے ممالک ہندوستان سے آگے نکل گئے۔

یہ ایک انتہائی متنازعہ قضیہ ہے جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں صنعت کا خاتمہ (ڈی انڈسٹریلائزیشن) کوئی حادثہ نہیں تھا، بلکہ برطانیہ کی سوچی سمجھی پالیسی تھی۔ برطانوی صنعت نے ترقی کی جبکہ ہندوستانی صنعت نے نہیں کیونکہ منظم تباہی کی اعانت، محصولات اور انتظامی اقدامات کے ذریعے کی گئی، جس نے دھوکہ دہی سے، تاش کی گڈی کے پتے ہندوستانی منڈی پر چھا جانے والی برطانوی صنعت کے حق میں ترتیب دیے، نا کہ اس کے برعکس۔ ہندوستان کا معاشی استحصال نوآبادیاتی مہم جوئی کا لازمی حصہ تھا۔ اور ہندوستانی محاصل کی کثیر رقوم اور لوٹ انگلینڈ کو جا رہی تھی، چاہے یہ ڈگبی کے اربوں پونڈ کے تخمینے سے کم ہی ہو، اس نے برطانوی صنعت کو سرمایہ مہیا کیا اور صنعتی انقلاب کے لیے زر کی فراہمی ممکن بنائی۔

چلیں چھوڑیں، موجودہ ہندوستانی صنعت میں جدت کیوں نہیں آ سکی، جیسا کہ دوسرے غیر نوآبادیاتی ممالک کی صنعت میں آئی۔ ہندوستان کی ٹیکنالوجیکل اختراع سے محرومی پر تنقید کرنے والوں میں سے کوئی بھی وضاحت نہیں کر سکتا کہ کیوں ایک ملک جو کبھی دوسرے ادوار میں اختراع اور صنعتی ترقی کا ہراول تھا اچانک اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اختراع کی صلاحیت کھو بیٹھا۔ میں نے ہندوستانی جہاز سازوں اور فولاد بنانے والوں کی مہارت کا تھوڑا سا تذکرہ کیا ہے، لیکن دوسرے حکمرانوں اور نظام حکومت کے تحت تخلیقی صلاحیتوں میں اضافہ ہوا، ہندوستانیوں نے ریاضی، طبیعیات، طب، کان کنی، دھات سازی اور حتیٰ کہ راکٹ سازی (ٹیپو سلطان اور حیدر علی کے تحت) میں مہارت حاصل کی۔

سچ ہے، سائنسی اور ٹیکنالوجیکل اختراعات صرف تب ہی ہو سکتی تھیں اگر ایک مستقبل بین حکمران نے ملک کے لیے تعلیمی اور سائنسی ادارے وقف کیے ہوتے جہاں ایسی تحقیق عمل میں آتی۔ تاہم برطانوی ایسے

ادارے بنانے میں ناکام رہے؛ برطانوی سلطنت کے تحت، پہلا نمایاں ہندوستانی تحقیقاتی ادارہ، انڈین انسٹیٹیوٹ آف سائنس، کسی برطانوی سخی نے نہیں بلکہ معروف جمشید جی ٹاٹا نے وقف کیا، نوآبادیاتی حکومت تو احتراز کرتی رہی۔ اگر صنعت پذیر یورپ سے مقابلہ ایک چنوتی تھی، تو کیوں ایک آزاد ہندوستان اپنے مفاد کے لیے برابری کا میدان استعمال نہیں کر سکتا تھا، جب تحفظ چاہیے ہوتا تو اپنے محاصل خود وصول کرتا، سبسڈی خود دیتا، اور اپنی موجودہ منڈیوں کو خود بڑھاتا؟

یہ تجویز کرنا بعید از قیاس ہے کہ ہندوستان کے صنعتی نہ بن پانے (انڈسٹریلائز ہونے) کی نااہلیت، جبکہ مغربی دنیا کا ایسا کر لینا ہندوستان کی ناکامی تھی، یہ کسی قسم کی مقامی خامی کا نتیجہ تھا، نہ کہ ہندوستان پر حکومت کرنے والے انگریزوں کی سوچی سمجھی، منظم، طے شدہ پالیسیوں کا نتیجہ۔ اگر ہندوستان کا جی ڈی پی اس لیے گرا کہ ہندوستان کی 'انڈسٹریلائزیشن کی بس' چھوٹ گئی، تو یہ اس لیے کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو پہیوں کے نیچے دے ڈالا۔

برطانیہ کے ہندوستان کے معاشی استحصال کے معاملے پر یہاں ایک فٹ نوٹ ہے، اسکاٹش نیشنلزم کے ان دنوں میں اور یونین کے مستقبل کے بارے میں ایک گرم قیاس آرائی ہے۔ یہ عام طور پر بھلا دیا جاتا ہے کہ کیا ہے جس نے پہلے پہل یونین کو اکٹھا کیا: یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی نوآبادیاتی لوٹ مار میں شمولیت کی وجہ سے اسکاٹس کو دستیاب ہونے والی روٹی اور مچھلی تھی۔ انگلینڈ کے ساتھ الحاق سے پہلے سکاٹ لینڈ نے نوآبادیات حاصل کرنے کی، خاص طور پر وسطی امریکہ اور جزائر غرب الہند میں کوشش کی تھی، لیکن اکیلے، جس میں وہ ناکام رہا۔ ایک بار جب یونین بن گئی، تو ہندوستان اس کے ساتھ آ گیا، بشمول لاتعداد مواقع کے۔ اسکاٹس کی ایک بے تناسب تعداد نوآبادیاتی مہم جوئی میں بطور فوجی، جہاز راں، تاجر، ایجنٹس اور ملازم بھرتی ہوئی۔ حالانکہ اسکاٹس برطانوی عوام کا محض 9 فیصد بنتے تھے، لیکن ہندوستان میں برطانیہ نے جو ملازمتیں دیں اس کا یہ 25 فیصد تھے۔ ہندوستان میں ان کی کمائی نے سکاٹ لینڈ کو غربت سے نکالا اور خوشحال ہونے میں مدد دی۔ ڈنڈی کی شور مچاتی فیکٹریاں، ابھرتی ہوئے جہاز سازی کے کارخانے، اور ہندوستان میں کام کرنے والے سکاٹس کی وطن کو رقوم کی ترسیل، تمام منافع بخش روابط کے شاہد ہیں۔ سر والٹر سکاٹ، ہندوستان کے متعلق رقم طراز ہیں، 'سکاٹ لینڈ کے لیے مکئی کے سٹے جیسا۔' ہندوستان کے چلے جانے سے، انگلینڈ کے ساتھ ڈھیلے ہوتے ہوئے سکاٹش بندھنوں پر کوئی حیرت نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دوم

کیا برطانیہ نے ہندوستان کو سیاسی وحدت عطا کی؟

دوم

کیا برطانیہ نے ہندوستان کو سیاسی وحدت عطا کی؟

ہندوستانی وحدت کی تشکیل کا برطانوی دعویٰ - قدیم 'ہندوستان کا تصور' اور مرکزیت کی تحریک - تاریخی حقائق کے منافی - سیاسی اداروں کی تباہی - مقامی راجاؤں کی بے دخلی - گاؤں کی خود مختاری کو کمزور کرنا - ہندوستانی سماجی ڈھانچے کی برطانویوں سے ناواقفیت - بڑھتا ہوا برطانوی کنٹرول - حکمرانی کے ادارے کا خاتمہ - مقامی حکمران کمپنی سے بدتر نہیں تھے - تاج برطانیہ کا اپنے نگینے پر قبضہ - سامراجی شان و شوکت اور زیوراتی نمائش - کرزن اور برطانوی عزت نفس - غیر ہندوستانی نوکر شاہی - امیر اور بدنام کا طرز زندگی - ہندوستانی قابلیت کو کچلنا و بے دخل کرنا - چیتی، ٹیگور، بینرجی اور گھوش - سامراجی نسل پرستی: نرالا علیحدہ پن - برطانوی حکمرانی، سوادیشی مووومنٹ اور مہاتما گاندھی کی آمد - مونٹیگیو کیمسفورڈ اصلاحات - عالمی جنگ اور گہرا فریب

انگریز، بریت کی ذاتی توجیہہ کے لمحات کی نشاندہی کرنا پسند کرتے کہ وہ ہندوستان کی سیاسی وحدت کے اعزاز کے حقدار ہیں — کہ ہندوستان کا مختلف برسرپیکار صوبوں اور ریاستوں کی بجائے بطور واحد ہستی کے تصور (اب تین، لیکن برطانوی راج کے دوران ایک)، برطانوی سامراجی حکومت کی ناجھٹلائی جانے والی کوشش ہے۔

ایک قابل ثبوت مفروضے کے بغیر اس قضیے سے انکار کرنا مشکل ہے: کہ برصغیر کی تمام تر تاریخ میں، وحدت کی ایک تحریک رہی ہے۔ یہ ہندوستان کی تمام تر تاریخ میں متعدد مملکتوں میں اپنا اظہار کرتی رہی ہے جو پورے برصغیر میں اپنی دسترس بڑھانا چاہتی تھیں: موریا (322-185 قبل مسیح) گپت (اپنے عروج پر، 320-550 عیسوی) اور مغل (1526-1857 عیسوی) سلطنتیں، اور کسی حد تک، دکن میں وجے نگر کی سلطنت (اپنے عروج پر، 1136-1565 عیسوی) اور مراٹھا اتحاد (1674-1818 عیسوی)۔ ہندوستان کی تمام تر تاریخ میں ہر بدنظمی کے دور کے بعد مرکزیت کی ایک تحریک رہی اور کیا برطانوی پہلے نہیں تھے، جنھوں نے برتر ہتھیاروں کی مدد سے ہندوستان کی بدنظمی کا فائدہ اٹھایا۔ یہ مکمل طور پر ممکن ہے کہ ایک ہندوستانی حکمران

وہی کرتا جو برطانویوں نے کیا، اور زیادہ تر برصغیر پر اپنی حکمرانی کو مربوط کرتا۔

یہی تحریک ہندوستانیوں کے اپنی قوم کے خواب میں بھی اظہار پاتی ہے، جیسا کہ قدیم رزمیہ مہابھارت اور رامائن میں ہندوستان کا تصور منعکس ہوتا ہے، جو کہ بیسویں صدی کے نیشنلسٹوں نے شناخت کیا۔ رزمیہ میں ہندوستانی ثقافت کے مضبوط لیکن لطیف دھاگوں، نے قبائل، زبان اور لوگوں کو پورے برصغیر میں اکٹھا بن دیا، ان کے یہی 'زندگی سے وسیع' ہیروز اور ہیروئینز کے جشن انھیں آپس میں متحد کرتے، جن کی کہانیاں درجنوں تراجم اور اختلافات کے ساتھ سنائی جاتیں، لیکن ہمیشہ اسی جذبے اور معنی کے ساتھ۔ ارضی منظر جو پانڈووں نے مہابھارت میں دیکھا (قریباً 400 قبل مسیح سے 400 عیسوی کے ادوار میں ترتیب دیا گیا) وہ ایک متحدہ ہندوستانی ارضی منظر تھا، مثال کے طور پر، جیسا کہ اس میں ان کے سفر ظاہر کرتے تھے، اور ان کی کہانی کے توسط سے، ہندوستانی رزمیہ میں لکھے تمام مقامات پر بولی جانے والی سینکڑوں زبانیں اور ہزاروں لہجے، ایک تہذیبی اتحاد سے استفادہ کرتے۔ مہاراج رام کا ہندوستان میں سفر اور ان کی لنکا کے شیطان بادشاہ کے خلاف رزمیہ جنگ ایسا ہی قومی تصور پیش کرتے ہیں۔

بہرحال ہندوستان نے تمام ادوار میں، کم از کم ماضی میں تیسری صدی قبل مسیح میں شہنشاہ اشوک سے لے کر، ثقافتی وجغرافیائی وحدت کا لطف اٹھایا۔ ہندوستانی وحدت کے خیال کی مادی تجسیم ہندو گیانی آدی شنکر نے کی، جنھوں نے انتہائی جنوب میں کیرالہ سے انتہائی شمال میں کشمیر تک اور انتہائی مغرب میں دوارکا سے انتہائی مشرق میں پُری تک، ساتویں صدی عیسوی میں، سفر کیا، اور ان میں سے ہر مقام پر مندر بنائے جو آج تک قائم ہیں۔ ڈیانا عق، کی ہندوستان کے مقدس جغرافیہ پر تحریریں، تقدیس کے تصور کے توسط سے، سیاسی وحدت کے خواب کا بڑا جامع خاکہ کھینچتی ہیں۔ جیسا کہ عق وضاحت کرتی ہے؛ 'اس کی طویل تاریخ کو ذہن میں لائیں، تو چاہے چند گھنٹوں کے لیے ہی سہی، ہندوستان میں سیاسی وانتظامی وحدت موجود تھی۔ تاہم بطور قوم کے اس کی وحدت، اس کے مقدس جغرافیہ جو سب کے لیے مشترک و محترم تھا، کے ساتھ مضبوطی سے تشکیل پاتی تھی: اس کے پہاڑ، جنگل، دریا اور پہاڑی چوٹیوں پر مزارات..... یاترا کے راستوں کے ذریعے جڑے ہوئے تھے'۔

یہ وحدت کوئی خالص 'ہندو' تصور نہیں تھا۔ باقی دنیا بھی ہندوستان کو ایک اکائی کے طور پر دیکھتی تھی: مثال کے طور پر عرب سارے برصغیر کو 'الہند' اور تمام ہندوستانیوں کو 'ہندی' قیاس کرتے تھے، چاہے وہ پنجاب، بنگال یا کیرالہ سے آئے ہوں۔ عظیم نیشنلسٹ مولانا آزاد نے ایک دفعہ بیان کیا، کہ حج کے موقع پر

ہندوستانیوں کو ایک ہی سرزمین کے (باشندے) قیاس کیا جاتا تھا، اور خود وہ بھی ایسا ہی سمجھتے تھے۔ ماضی کے ان ادوار میں، یقیناً یہ تڑپ سلاطین و عارفین نے پیدا کی، کیا جدید ٹرانسپورٹ، مواصلات کے ساتھ دوراندیش قائدین خود کو سیاسی وحدت میں ضم کر سکتے ہیں۔

انھیں ناقابل تردید حقائق سے شروع کرتے ہوئے، یہ ممکن ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں برطانوی نوآبادیاتی نظام کا متبادل خاکہ، مراٹھوں کی فتوحات کو پورے ملک میں پھیلاتے ہوئے، مرتب کیا جاتا، جبکہ اس کی طاقت کی نگرانی کے لیے، مغل شہنشاہ کی ماتحتی کی سیاسی سہولت حاصل کی جا سکتی تھی، جس کا عمل پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ یوں مراٹھا، ایک کمزور مغل شہنشاہ کی محدود سی فرمانروائی کے ماتحت ملک پر حکومت کر سکتے تھے (جیسا کہ برطانوی خود کچھ عرصہ تک ایسا کرتے رہے تھے)، یہ ایک دستوری حکومت کے ناگزیر راستے کی طرف لے گیا ہوتا، جیسا کہ انگلینڈ (سترہویں صدی کے عظیم الشان انقلاب اور اس کے نتیجے میں دارالعوام کے استحکام سے) ایک مطلق بادشاہت سے دستوری بادشاہت میں تبدیل ہوا۔ یہ ہندوستان میں بھی ہو سکتا تھا جیسا کہ غیر نوآبادیاتی دنیا کے متعدد ممالک میں ہوا، پورا یورپ، مٹھی بھر ایشیائی ممالک جو نوآبادی نہیں بنے، خاص طور پر چین، جاپان اور تھائی لینڈ۔ یہ عمل تکلیف کے بغیر نہیں ہوا ہوتا؛ شاید انقلابات اور فوجی جدوجہد ہوئی ہوتی؛ انتشار و تصادم ہوا ہوتا؛ لیکن ہندوستان کے وسائل ہندوستان میں رہے ہوتے اور اس کا مستقبل اس کے عوام نے متعین کیا ہوتا۔ برطانوی نوآبادیاتی نظام کی یورش نے اس فطری ارتقاء میں خلل پیدا کر دیا اور اسے پھلنے پھولنے سے روک دیا۔ لیکن یہ کہنا لغو اور بغیر شہادت کے ہے، کہ برطانیہ کے بغیر ہندوستان کی سیاسی وحدت ممکن نہ ہوتی۔

مخالف نقطہ نظر کو ثابت کرنا بھی یقیناً ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر، کوئی بھی، ایسے واقعات جو درحقیقت ہوئے ہی نہیں، کے متعلق کسی درجہ یقین کے ساتھ بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، نہ ہی ایسی کسی مرکزی شخصیت کا نام لیا جا سکتا ہے جسے شاید انگریزوں کی غیر موجودگی میں ہندوستان کا بسمارک، میزینی، اتاترک یا گیری بالڈی کہا جا سکے۔ لیکن تاریخی واقعات اپنے ڈرامے کے کردار خود ڈھونڈتے ہیں، اور یہ کہنا خلاف عقل ہو گا کہ جو کچھ ہر خطے میں ہوا وہ ہندوستان میں نہ ہوا ہوتا۔ ایسے مخلوط ابتدائی نظام سے دستوری بادشاہت برآمد ہو سکتی تھی اور مغل نظام حکمرانی پر سیاسی ادارے تعمیر کیے جا سکتے تھے، جیسا کہ مراٹھوں نے اصلاحات کیں لیکن یہ سارے مفروضے ہیں۔ برطانیہ آ گیا، اور ایسا کوئی غیر نوآبادیاتی ہندوستان نہ بن سکا۔

مخالف نقطہ نظر مفروضہ جاتی ہیں لیکن حقائق وہی ہیں جو ہیں۔ حقائق انگریزوں کی طرف سے ہندوستان میں موجود سیاسی اداروں کے انہدام، برطانوی تسلط کو برقرار رکھنے اور بڑھانے کے نقطۂ نظر سے فرقہ وارانہ تقسیم اور منظم سیاسی امتیاز کو انگیخت دینے، کی واضح نشاندہی کرتے ہیں۔

آخر کار 1947 میں جب برطانوی گئے، تو انھوں نے ہندوستان کو بطور ایک کارآمد جمہوریت کے چھوڑا، اور بہت سے برطانوی اپنی ہندوستانی رعیت کو جمہوریت کی روح اور قانون کی حکمرانی ذہن نشین کروانے کا کریڈٹ لیتے ہیں، چاہے برطانویوں نے، ہندوستانیوں کو اس کے جوہر سے محروم ہی رکھا ہو۔ یہ دعویٰ بغور جائزہ لینے کے قابل ہے۔

سیاسی اداروں کی تباہی

یہ بھی قابل بحث ہے کہ برطانوی استعماریت پسندوں کی جمہوری قدریں دوسرے نو آبادیت پسندوں کی نسبت بہتر تھیں۔ چند محققین نے حال ہی میں بڑے سنجیدہ اعداد و شمار پیش کیے ہیں (سیاسی ادوار کے باہمی رشتے کے میزان کے شماریاتی تجزیہ کی بنیاد پر)، کہ سابقہ متعدد برطانوی نو آبادیات جمہوریتیں ہیں، اور یقیناً، کسی وقت میں برطانوی نو آبادی رہا ہونا، جمہوریت کے ساتھ سب سے زیادہ باہمی تعلق والا متغیرہ ہے۔ مائرون ویز نشاندہی کرتا ہے کہ امریکہ اور آسٹریلیا کے ممالک کے علاوہ، 'کم از کم دس لاکھ کی آبادی کا ہر ملک (اور تقریباً تمام چھوٹے ممالک بھی) جو نو آبادیاتی عملداری سے برآمد ہوا اور جہاں جمہوری عمل میں تسلسل رہا ہے، برطانیہ کی سابقہ نو آبادیات میں سے ہے'۔ (ایسی سابقہ برطانوی نو آبادیات بھی ہیں جن میں جمہوری عمل کا تسلسل نہیں رہا، البتہ فوجی ڈکٹیٹرشپ کے وقفے اس کی خصوصیت رہے ہیں، بشمول پاکستان اور بنگلہ دیش دونوں کے)۔ لہٰذا ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے تصورات کی توقعات پر پورا اترنے میں زیادہ تر ناکام رہے ___ بہر حال جتنا زیادہ انھوں نے ہندوستانیوں کو محروم رکھا، جیسا کہ انھوں نے 1776 سے پہلے امریکیوں کو 'انگریزوں کے حقوق' سے محروم رکھا ___ برطانویوں نے جمہوری اقدار کی دوا کی مناسب مقدار اپنی سابقہ نو آبادیات کو دی تاکہ وہ اپنے اتالیق سے بھی سبقت لے جائیں۔ لیکن برطانوی حکمرانی کی حقیقی تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ ایسی کوئی حکمتِ عملی یا دستور تھا۔ 1757 کے بعد کے سالوں میں برطانیہ نے بڑی چالاکی سے ہندوستانی راجاؤں کے مابین دراڑ پیدا کی، اور 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کی حکمت عملی، جو کہ 1858 کے بعد خطابات عطا کرکے 'تقسیم کرکے فتح کرو' ہو

گئی، کے ذریعے اپنی سلطنت کو بتدریج مضبوط کیا۔ اس وقت تک یہ خالصتاً سیاسی چالبازی تھی، اور تقسیم جس کی کمپنی حوصلہ افزائی کرنا چاہتی تھی، کی بنیاد مکمل طور پر لالچ اور ذاتی مفادات پر ہوتی، نا کہ مذہب یا سماجی گروہ بندی پر۔ کمپنی نے اپنی حمایت کے لیے اشرافیہ میں سے ایک کزن کو دوسرے کے خلاف کھڑا کیا؛ اور اکثر اوقات سوال فقط یہ ہوتا کہ کون کمپنی کو زیادہ ادائیگی کرے گا۔ وفاداریاں قابل خرید تھیں، بعض اوقات ایک سے زیادہ مرتبہ۔ لٰہذا 1757 میں، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، کلائیو نے، سابقہ نواب سراج الدولہ کے ساتھ پلاسی میں دغابازی کے صلہ میں، اچھی خاصی رقم لے کر میر جعفر کو بنگال کے تخت پر بیٹھایا؛ کلائیو کے جانشین نے میر جعفر کو معزول کر کے اس سے کچھ کم (رقم) میں میر قاسم کو اس کی جگہ بٹھایا (کیونکہ بہر حال رقم تو انھیں جاتی تھی، نا کہ کلائیو کو)؛ تین سال بعد، انھوں نے میر جعفر کو بحال کر دیا، کیونکہ اب اس نے میر قاسم کی نسبت اڑھائی گنا زیادہ ادائیگی کی؛ اور اس کے دو سال بعد، انھوں نے میر جعفر کو دوبارہ معزول کرنے کے لیے نجیم الدولہ سے پیسے پکڑے۔ اس قسم کا رشوت، حلف شکنی اور حکمرانی کا نظام احمقانہ محرکات کے حوالے سے قابل فہم تھا، کہ جس نے ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اندر روح پھونک دی۔ لیکن یہ پیش رو تھا انیسویں صدی میں آنے والے زیادہ پر فریب 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کی حکمت عملی کا، جو اس تقسیم کی بنیاد پر ہندوستانی کو ہندوستانی کے خلاف بھڑکائے گی، اور جس سے زیادہ دیرپا نقصان پہنچے گا۔

حکمران، جن کے محدود اختیار کے درپردہ ایسٹ انڈیا کمپنی حکومت کرتی تھی، کو تخت نشین کرنے اور اقتدار سے نکال باہر کرنے کے ابتدائی خام طریقے، ہندوستان کے مروج سیاسی اداروں کے لیے بہت معمولی احترام ظاہر کرتے، اور نہ ہی انھیں نئے عہد کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے قابل بنانے کی ضرورت (محسوس) کرتے۔ بہر حال ہندوستان کے اداروں کی کمزوری مزید بڑھتی گئی۔ 'دائمی بندوبست' کے نتیجے میں انگریزوں نے گاؤں کی کمیونٹی کو کمزور کر دیا، کیونکہ انھوں نے مقامی مقتدر افراد کے ساتھ، محاصل کی آمدن بڑھانے کے لیے، براہ راست روابط بنائے۔ انھوں نے عدلیہ و انتظامیہ کے اختیارات بھی مرکز میں مرتکز کر دیے، کہ جن اختیارات پر اس سے پہلے دیہاتی کمیونٹیز اپنے دائرہ اختیار میں خود عملدرآمد کرواتی تھیں۔ کمپنی کے مبصرین کی لکھی ہوئی رپورٹیں بیان کرتی ہیں کہ دیہاتی کمیونٹیز خود مختار جمہوریہ اور عملی معاشی اکائی کے طور پر، ماقبل نوآبادیاتی عالمی مارکیٹ کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں، مرکز میں چاہے حکومتیں آتی جاتی رہتیں، ان کا خود پر اپنا ہی راج ہوتا۔ برطانیہ کے ماتحت ان کی حقیقت ختم ہوگئی۔

یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ دیہات کسی قسم کی دہقانی زرعی علیحدگی میں نہیں رہ رہے تھے بلکہ سرگرم اور عملی سیاسی و معاشی اکائیاں بھی تھے۔ ایک ممتاز انگریز سرکاری ملازم نے لکھا، 'ہندوستان میں دیہی نظام ایک ایسا ہیت اجتماعی تھا جو طوائف الملوکی اور یورش کے لمبے عرصے میں بچ رہا، اور جب ہم نے ہندوستان کو فتح کیا تو یہ پورے دم خم میں تھا۔ وہ لوگ جو اس موضوع پر پڑھنا چاہتے ہیں، وہ سر ہنری سمنر مینے کی 'ہندوستانی دیہاتی کمیونٹیز' سے رجوع کر سکتے ہیں۔ لیکن خود حکمرانی کا نظام دیہات سے اوپر کے لیول پر قائم کرنے کی بجائے، جو کہ برطانوی اگر مخلص ہوتے، تو کر سکتے تھے، کمپنی نے جو موجود تھا وہ بھی تباہ کر دیا، اور تاج برطانیہ نے جب آخر کار ملک میں اقتدار سنبھالا تو اوپر سے، صوبائی اور مرکزی غیر منتخب قانون ساز کونسلز کو تھوڑا سا اقتدار سپرد کیا، جس کے ممبران ایک چھوٹی سی تعلیم یافتہ اشرافیہ کے نمائندہ تھے، نہ کہ عوام کو جواب دہ، لہٰذا نہ تو کوئی با معنی قانون پاس کر سکے، نہ حقیقی اختیارات کو استعمال کیا، اور خود کو مطمئن رکھا کہ حکومت نے ان سے مشاورت کی ہے چاہے انھوں نے کوئی بنیادی فیصلہ نہ لیا ہو۔

مسئلے کی ایک پرت یہ تھی کہ ہندوستان کی سماجی بنتر برطانویوں سے نا آشنا تھی، جنکے اپنے گاؤں ان کے زمینداروں کے ساتھ وسیع تر جاگیر داری تعلق میں وجود قائم رکھے ہوئے تھے۔ سلطنت کئی طرح سے، برطانوی سماجی بنتر کو مفتوحہ نو آبادیات میں پھیلانے کا ذریعہ تھی۔ سماجی سیاسی بنتر، جو برطانویوں نے اپنی سلطنت میں بنائی، بنیادی طور پر برطانیہ میں قائم روایتی، انفرادیت پسند، غیر مساوی، اور طبقات میں بٹے سماج کی عکاس تھی۔ سلطنت کے بانی، جو کچھ وہ جانتے تھے اس کے رد عمل میں، ٹوری انگلستان کا دیہاتی یوٹوپیا از سر نو تعمیر کرنا چاہتے تھے، جہاں سولہویں صدی سے لوکل گورنمنٹ کو زیادہ سماجی اثرورسوخ والے کنٹرول کرتے رہے تھے اور مستحکم زمینداروں کا جتھا حکومت کرتا رہا تھا۔ خود مختار دیہاتی حکومتیں جنھیں ہندوستان میں برطانویوں نے تباہ کیا کی بجائے، برطانوی دیہات روایتی لارڈز کے ہاتھوں میں تھے، امیر کبیر روساء کے ساتھ منسلک اشرافیہ ان کے ساتھ شریک تھی۔ انگریزوں نے اپنی نو آبادیات کے روایتی معاشروں میں اس جیسی بنتر پیدا کرنے کی کوشش کی اور جب ایسا نہ کر سکے تو اس کی مشابہت تخلیق کر لی۔ پھر 'بالواسطہ حکمرانی' کا حکومتی نظام پیدا ہوا، جو کہ سلطنت کے زیادہ تر حصے کی خصوصیت تھا، اس کے ساتھ ساتھ 'شریف آدمی' کا سوانگ بھرنے والے، اعلیٰ وادنیٰ کے تمام سراتب کو اختیارات منتقل کیے، بہت سوں کو برطانوی گھڑے ہوئے خطابات، جیسا کہ 'رائے بہادر' عطا کیے گئے، اور حتیٰ کہ ان کے کشت اٹھانے کے لیے انھیں اشراف بنایا گیا (اور بعض معاملات میں

نواب)۔ اور یہ دونوں سلطنت کے لیے زیادہ مہنگے نہیں تھے، اور جیسا کہ وطن میں انگریزی نظام کے ساتھ تھا، اسے غیر پیشہ ورانہ شریک کار چلاتے تھے، لہٰذا ہندوستانیوں میں ایسا پیشہ ورانہ طبقہ پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، جو اختیارات رکھتا، اور پھر سیاسی طاقت کو استعمال بھی کرنا چاہتا۔

برطانوی چلن، جو کہ ماضی میں ہندوستان کے اندر غیر مانوس تھا، نے دیرپا نقصان پہنچایا۔ مورخ جان ولسن دلیل دیتا ہے کہ ہندوستان کے پاس ایک متحرک معاشی وسیاسی انتظام تھا___ 'چھوٹے چھوٹے معاشروں کا ایک معاشرہ'___ جہاں حاکم و محکوم کے درمیان مسلسل گفت وشنید جاری رکھنے کا دستور تھا۔ ہندوستانی دیہات کوئی خود انحصار جمہوریہ نہ تھے جو کہ مسحور کن علیحدگی میں رہ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے اور ایک نیٹ ورک کے ساتھ منسلک تھے، اور یہ ہندوستانی صنعت کی تباہی تھی جس نے اور زیادہ زرعی معاشرہ اور کسانوں کی بے دخلی کا مسئلہ دونوں پیدا کرتے ہوئے، لوگوں کو پیچھے ہٹنے اور کھیتی باڑی پر توجہ مرکوز کرنے پر مجبور کیا۔ 1800 عیسوی کے ابتدائی سالوں میں، ہندوستان کو، ایک ابھرتے ہوئے اور پیچیدہ نیٹ ورک میں کام کرتے ہوئے، کاریگروں، تاجروں، جنگجوؤں اور سوداگروں کی سرزمین سے، کسانوں اور ساہوکاروں کے زرعی معاشرے میں بدل دیا۔ عمیق مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ کیسے برطانویوں نے بے اراضیت کا مظہر تخلیق کیا، خود انحصار کاشتکاروں کو مزاروں، ملازموں اور غلاموں میں بدلا، سماجی تعلقات کی ہیت بدلی جس کے نتیجے میں زراعت کا ارتقاء اور ترقی رک گئی۔ ان پالیسیوں کے اثرات آج تک جھیل رہے ہیں اور ہندوستان کے ارتقاء پر ان کا تباہ کن اثر رہا ہے: مثال کے طور پر بینرجی اور آئیر بیان کرتے ہیں کہ کیسے برطانوی نوآبادیاتی حکمت عملی کا انتخاب معاشی نتائج میں طویل اختلافات کا باعث بنتا ہے: 'جن علاقوں میں زمین کے حقوق ملکیت تاریخی طور پر زمینداروں کو دیے گئے، وہاں آزادی کے بعد کے دور میں، زرعی سرمایہ کاری اور پروڈکٹیویٹی بہت ہی کم رہی، بہ نسبت ان علاقوں کے جہاں یہ حقوق کاشتکاروں کو دیے گئے'۔ کوئی بھی نوآبادیاتی عمل بغیر بھینٹ کے نہ تھا، برطانویوں نے جو کچھ بھی کیا اس کی بازگشت آنے والے ادوار میں بھی سنائی دیتی رہی۔

ہندوستان میں برطانوی استعماری توسیع کے پیچھے ترغیبات و مفروضات کا ایک انبار تھا___ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، ایک غیر شائستہ تجارتی لالچ، اور منافع کے تحفظ کی خاطر سیاسی طاقت کو متحد کرنے کی ضرورت، بلکہ نسل پرست یورپی تصور کا اظہار بھی، نئی دنیا کی آئبیریائی فتح کے دوران بڑے بے ڈھنگے پن کے ساتھ ہوا، جو کہ 'کافر' ہندوستانی اقوام کو قانونی مقتدر ہستی کا مقام دینے کے قابل نہیں سمجھتا۔ امریکہ میں، یورپی تاجروں کے

ساتھ عداوت اور عیسائی انجیل کے خلاف مزاحمت کو، علاقوں کی فتح اور شکست خوردہ کی غلامی کی توجیہہ کرتے ہوئے، 'حق' کی جنگ کے لیے، مناسب وجہ خیال کیا گیا۔ جبکہ ایسا ہی قضیہ ہندوستان میں صراحت سے آگے نہ بڑھ سکا، برطانویوں نے وسیع پیمانے پر، اعتقادات کا ویسا ہی مجموعہ مشتہر کیا، جیسا کہ ان کے یورپی شریک کاروں نے مغرب میں کیا تھا۔

ابتداء میں راج گدی کا کھیل، جیسا کہ یہ تھا، کمپنی نے بطور سرکاری حکمران نوابوں کی پشت پناہی کر کے، ایک قدم پیچھے رہ کر کھیلا۔ ایسا اس لیے تھا کیونکہ 1764 میں کمپنی کا سرکاری مرتبہ، مشرقی ہندوستان میں تین اہم مغل صوبوں کے محاصل کے منتظم کا تھا، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، کہ یہ اختیار ایک شاہی فرمان کے ذریعے ایک معتدل اور بزدل بادشاہ نے عطا کیا، جس نے اس کام کے لیے ایک دیوانی جاری کی۔ رابرٹ کلائیو نے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو 27 جنوری 1764 کے ایک خط میں اپنے فرائض منصبی کی وضاحت پیش کی: 'ہمیں شاید ایسی بہار رُت خیال کیا جائے جو نواب کے نام کے سائے تلے چھپی ہوئی تھی، اور پوشیدہ طور پر بغیر اصل ساخت کو نقصان پہنچائے، حکومت کی اس وسیع مشینری کو تحریک دیتی تھی۔ ان کے استحقاق میں بے جا مداخلت کے بغیر ہی، ہماری طاقت میں اضافہ ہوا اور ان کی طاقت میں کمی۔ جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتے تھے، نواب ملکی انتظام، انصاف کی عمل داری، محکمانہ بندوبست اور ان کی تکریم کا جوہر تشکیل دینے والے تمام شاہی حقوق، اپنے ہاتھوں میں رکھتے، اور ہمارے مابین سب سے موزوں رکاوٹ اور دوسری یورپی نوآبادیوں کے حسد کی صورت گری کرتے'۔

بہر کیف بحث کے طور پر سہی، ہندوستانی راجاؤں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی متعدد فوجی فتوحات اور غیر مساوی صلح ناموں کو سلام، جنھوں نے ان کی محکومی کو مجسم کیا، جو ہندوستان پر برطانوی فرمانروائی کی حقیقت پہلے ہی واضح کر چکے تھے۔ ولیم بولٹز، ایک ولندیزی تاجر جس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے چند سال کام کیا، نے 1772 میں لکھا کہ کمپنی تاجروں کی مطلق العنان چند سری حکومت کے علاوہ کچھ نہ تھی جس نے مقتدرہ کا مقام و مرتبہ غصب کر لیا۔ بنگال کے نواب (کی حیثیت) 'وظیفہ خوار خدمت گار' سے کچھ ہی زیادہ تھی اور مغل شہنشاہ، ایک پنشنر اور 'ان کی طاقت کا محض ایک آلہ' تھا۔ بولٹز کے مطابق، محکمہ مال کی انتظامیہ کی ستر پوشی محض ایک من گھڑت کہانی تھی جو کہ نئے حاصل کردہ مقبوضہ علاقوں کے تصرف کے جواز کے لیے، 'کمپنی اور اس کے ملازمین کے ذاتی مقاصد کے لیے' گھڑی گئی۔ برطانوی مؤرخ ایڈورڈ تھامپسن دلائل پیش کرتا

ہے کہ 1819 کے بعد، جب لارڈ لیک نے مراٹھوں کو شکست دی، 'فقط حماقت یا منافقت، یا پھر موقع شناسی کی بہتاب ہی یہ ریاکاری کر سکتی تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی فرمانروا طاقت نہیں تھی یا یہ کہ کوئی بھی (ہندوستانی) راجہ اس کے مرتبہ کے برابر تھا'۔

اس سب کے اوپر ایسٹ انڈیا کمپنی کا گورنر جنرل صدارت کے فرائض انجام دیتا، جو کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا متعین کردہ مختار کار ہوتا، لیکن در حقیقت پیمائش کردہ کل رقبے کا شہنشاہ۔ ڈلر مپل ایک معاصر مبصر کی اس بات کا حوالہ دیتا ہے: 'انسانی مناصب میں، سب سے شاندار ہونے کے ساتھ ساتھ سب سے نامناسب، شاید برطانوی ہند کا گورنر جنرل ہے۔ ایک پرائیویٹ انگریز بھلے مانس اور ایک جائینٹ سٹاک کمپنی کے ملازم کو، اپنی حکومت کے مختصر عرصے کے دوران، دنیا کی عظیم الشان سلطنت کا حکمران مقرر کیا جاتا ہے؛ دس کروڑ لوگوں کا حکمران؛ جبکہ ماتحت بادشاہ اور راجے مؤدبانہ احترام اور فرمانبرداری کے ساتھ اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ تاریخ میں اس صورتحال سے مماثل کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔'

برطانوی اختیار کی توسیع کا وقتی مزاج اپنے ساتھ ہندوستان کے حکمرانی کے اداروں کی تباہی لے کر آیا۔ 1746 اور 1763 کے درمیان کمپنی نے تین 'کرناٹکی جنگیں' لڑیں، جن کا تعلق، مقامی تسلط حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ برطانویوں کی فرانسیسیوں کے خلاف بالادستی کے تنازع کے ساتھ جڑا ہوا تھا، اور جو کہ اسی وقت یورپ میں ہونے والی متوازی جنگوں کی عکاس تھیں۔ اپنی متعدد فتوحات و مہمات میں کمپنی اپنی فوجی جدوجہد کے لیے بھاڑے کے سپاہیوں اور مختلف طرح کے مسلح دستوں کو بیرونی ذرائع سے بھرتی کرنے میں کبھی نہیں ہچکچائی۔ سکالرز، ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک ایسی فوجی سرپرست ریاست کی مثال کے طور پر دیکھتے ہیں، جس نے کسی رسمی و ادارہ جاتی ڈھانچے کو ملحوظ رکھے بغیر، جنگجوؤں کے خانہ بدوش دستوں کو اپنی سرپرستی عطا کی۔ کمپنی کے تنخواہ دار سپاہیوں کو ان کی خدمات کے بدلے اور دوسروں کو ضروریات مہیا کرنے کے لیے مختلف فوائد کی پیشکش کی جاتی تاکہ ان کی حمایت کو یقینی بنایا جائے۔ آج کی زبان میں کہیں تو نان ہٹیٹ ایکٹرز کے ساتھ تشدد کے استعمال کا معاہدہ کیا جاتا۔ ایسے طریقوں نے، ہندوستان میں برطانوی فتوحات کے غیر روایتی اور غیر ادارہ جاتی کردار پر اصرار کیا، اور ملک میں سیاسی اداروں کی عمومی ترقی کے امکان کا راستہ روکا۔

آزادانہ گھومتے بھاڑے کے جنگجو آنہ عناصر کی معاونت نے ہندوستان کو کمزور کر دیا۔ مثال کے طور پر، لارڈ کارنیوالس کے پاس بے قاعدہ فوج کے گھڑ سوار یونٹس کو مستقل راشن مہیا کرنے کے وسائل نہیں تھے،

لہٰذا اس نے انھیں حکم دیا کہ اپنے معاش کے ذرائع خود تلاش کریں۔ فوجی دستوں کی پیش قدمی کے نتیجے میں غارتگری اور لوٹ مار ہوتی، ملکی آبادی کی محرومی اور مصیبتوں میں فقط اضافہ ہوتا؛ لیکن تب رعایا کی بہبود، کمپنی کی ترجیح نہیں ہوتی تھی۔ کمپنی کے شریک کار خود سر جنگجوؤں اور بھاڑے کے فوجیوں کے پاس، جس چیز پر بھی وہ ہاتھ ڈال سکیں، لوٹ لینے کا لائسنس تھا: ہندوستان کی گڈ گورننس میں بمشکل برطانیہ کا کوئی حصہ تھا۔

توسیع کا یہ قاعدہ رکنے والا نہ تھا، تاہم کمپنی کی ناقابل تردید فوجی برتری کو سلام، خاص طور پر جب دوسری یورپی نوآبادیات، جن کا کلائیو حوالہ دیتا ہے کہ سب کو شکست ہو چکی یا ان کی اوقات دکھائی جا چکی، اور کمپنی ـــ اگرچہ ابھی بھی تجارتی کارپوریشن تھی ـــ کو جلد ہی مقامی راجاؤں کو تخت سے ہٹانے اور ان کے راجواڑوں کو ضم کرنے پر پشیمانی ہوئی۔ تاج برطانیہ، نے جب ملکہ وکٹوریہ کے 1858 کے اعلامیہ کے ذریعے، راج کی ذمہ داری اٹھائی، تو خاصی حد تک ہندوستان کے روایتی حکمرانوں کو، ان کے اختیارات برطانیہ کے ماتحت رکھتے ہوئے، ان کے عہدوں پر برقرار رکھنے کو ترجیح دی۔ (وہ اپنے اختیارات کا نفاذ شاہی دربار میں تعینات 'ریزیڈنٹ' کے برائے نام عاجز عہدے کے ذریعے کرتے، انگریزوں کا بے رحم طاقت کی مکروہ حقیقت کو غلو بیانی کے ذریعے چھپانے کی ایک اور مثال۔)

ہندوستان پر ایک صدی سے زائد عرصے میں بتدریج قبضے کے دوران جہاں برطانویوں نے کسی مفتوح حکمران کے علاقے کا الحاق نہ کیا، وہاں اس سے غیر مساوی صلح نامے پر دستخط کروا لیے۔ جیسا کہ میں نے اس پورے باب میں بیان کیا ہے، فریب کاریوں کا یہ مرکب جس کے ذریعے برطانوی حکومت کر رہے تھے، ہندوستانی سیاسی اداروں کی ترقی میں معاونت کے قابل نہیں تھا، نہ ہی یہ اس برائے نام اختیار کی تکریم کا باعث تھا، مفروضہ کے طور پر جس کے نام پر اختیارات کا نفاذ کیا جاتا تھا۔

اس من گھڑت کہانی کو نشانہ بنانا بھی مناسب ہے کہ کمپنی میں جو بھی قباحتیں تھیں، اس کی حکومت پھر بھی ان غارت گر راجاؤں، جنھیں برطانویوں نے برطرف کیا، سے بری نہیں تھی۔ یہ بالکل غلط ہے۔ 1857 سے پہلے کی زیادہ تر برطانوی فتوحات اور توسیع نا تو نیک دل اور نا ہی خاص طور پر بے رحم مقامی حکمرانوں کے خلاف عمل میں آئیں۔ مراٹھا پیشوا، میسور کے حکمران اور شطرنج کھیلنے والا اودھ کا نواب، تینوں کا نام لیں، (کسی پر بھی) بدانتظامی کا الزام نہ تھا: وہ یا تو نوآبادیاتی تشفی کے لیے فقط زیادہ طاقتور تھے اور یا پھر اتنے دولت مند کہ (کسی طرح) برطانوی حرص کو لبھانے سے بچ پاتے۔ (درحقیقت ہندوستان میں اس وقت گڈ گورننس کی بڑی

نمایاں مثالیں تھیں، خاص طور پر ٹراونکور کی راجدھانی، جو 1819 میں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کی لازمی اور مفت پرائمری تعلیم کا آفاقی فرمان جاری کرنے والی دنیا کی پہلی حکومت بن گئی۔) حکمران جنھیں برطرف کیا گیا کے خلاف زیادہ تر برطانوی الزامات جھوٹے تھے: 1907 کی ایک سٹڈی نے نتائج اخذ کیے کہ 'ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وقعت بڑھانے کے شوق کے علاوہ ماضی کی اس تمام قنوطیت کے لیے بہت معمولی سی بنیاد ہے، چاہے کتنی ہی بددیانتی سے، یورپی اسالیب کی برتری (ثابت کی جائے)'۔ جہاں بدانتظامی کے برطانوی الزامات میں کچھ سچائی تھی، تو بنیادی طور پر وہ اس جگہ کمپنی کے مقرر کردہ حکمرانوں کے خلاف ہی تھی، یا پھر بیسویں صدی میں جن شہزادوں کو، اپنی سرزمین میں ہی اجنبی بنا کر، ان کے ثقافتی ماحول سے ہٹایا گیا اور ایٹن اور حارو میں پڑھایا گیا۔

کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ سارے کے سارے ماقبل نوآبادیاتی ہندوستان پر بہترین حکومت تھی___ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، کہ یہ انتشار کے ایک دور سے گزر رہا تھا، زمین بوس ہوتا ہوا مغل اقتدار، اور بہت سے علاقوں میں، حالات طوائف الملوکی کو چھو رہے تھے،___ بہرحال مطمع نظر محض اس تصور کو رد کرنا تھا کہ برطانوی لوٹ مار کو اس وقت کے زیادہ تر ہندوستانی بہتری کے طور پر دیکھتے تھے۔ برطانوی نوآبادیاتی توسیع کے عرصے کے دوران ہندوستان کے زیادہ تر حصوں میں، خاصی معقول، اور عوام کی عمومی طور پر تسلیم کردہ حکومتیں تھیں، جنھیں ہٹا کر برطانوی حکمرانوں سے بدل دیا گیا، جن کی اغراض اور طریقے، من حیث المجموع، مغلوب ہو جانے والوں کی نسبت زیادہ قابل مذمت تھے۔

تاجِ برطانیہ کا اپنے نگینے پر قبضہ

اب جبکہ ہندوستان میں کمپنی حکومت کی بدانتظامی کا معاملہ ناقابل تردید ہے___ دوسروں کے ساتھ ساتھ، ایڈمنڈ برک نے وارن ہیسٹنگز کے دھوم دھام سے کیے مواخذے میں، میکالے نے اپنی، نوابوں کی لالچ کی ملامت میں، اور کلائیو نے خود اپنی خودکشی کے ذریعے، اسے (ناقابل تردید) بنایا ہے___ تاج برطانیہ کا اپنے شاہی نگینے پر اختیار قائم ہونے سے کسی حد تک دلیل بدل گئی۔ 1858 میں ملکہ وکٹوریہ کے اعلامیہ کے ساتھ ہی، برطانویوں نے ہندوستان پر اپنی حکومت کا ایک مختلف بیانیہ پیش کیا: کہ وہ 'اس خوشحالی اور اس سماجی ترقی کہ جسے صرف اندرونی امن اور اچھی حکومت سے حاصل کیا جا سکتا ہے...' کی جستجو میں حکومت کریں گے۔ ملکہ نے 'عوامی استعمال اور بہبود کے کاموں کی ترویج کے لیے، اور وہاں رہنے والی اپنی تمام رعایا کے مفاد کے لیے

حکومتی بندوبست کر کے، ہندوستان کی پرامن صنعت کو متحرک کرنے کی سنجیدہ خواہش' کا اظہار کیا۔ 'ان کی خوشحالی میں ہماری طاقت، ان کے اطمینان میں ہماری سلامتی اور ان کا تشکر ہی ہمارا انعام ہے'۔

یہ 'ہم تمھارے فائدے کے لیے تم پر حکومت کریں گے' مکتبہ فکر کا پرجوش مینیفیسٹو تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی کی کھلی لوٹ مار، کم از کم اعلان کردہ عندیہ میں، کب کی چھوڑ دی گئی۔ 1877 کی تاجپوشی کے ساتھ ہی، بنجمن ڈسرائیلی نے برطانوی شہنشاہیت کو سامراجی آلے کے طور پر از سر نو تخلیق کیا__ ملکہ کو اس کے تاج میں نئے اور سب سے دمکتے نگینے ہندوستان کے ساتھ، خاتون شہنشاہ بنایا گیا، اور اس کی اقالیم پوری دنیا میں بے مثل وسعت میں پھیل گئیں۔

سامراجی منصوبے کے لیے اس کے ساتھ وابستہ جاہ و جلال کا ادراک بھی اتنا ہی اہم تھا۔ انگریز، ہندوستان میں شان و شوکت کی نمائش پر کافی زیادہ خرچ کرتے، لیکن نمائشی چمک دمک کا سامراجی مقصد بھی تھا: جان مورس کا خیال ہے، برطانویوں کا ارادہ، 'جزواً دیسیوں کو متحیر کرنے، اور جزواً اپنے گرد ایک فصیل کھڑی کرنے کا تھا۔ شہزادوں کے ملک میں، انھوں نے جان بوجھ کر شہنشاہیت کی پراسرار فضا کو سلطنت کے آلے کے طور پر استعمال کیا'۔

'گھٹیا تجارت اور دبدبہ' کی اس حکمت عملی، کی پیروی میں شاہی تقاریب کے امتیاز کے لیے تین عظیم الشان دربار منعقد کیے گئے__ 1887 میں ملکہ وکٹوریہ کی ہندوستان کی خاتون شہنشاہ کے طور پر تاج پوشی کا بڑے طمطراق طریقے سے شاہی دربار میں جشن منایا گیا، جس کی صدارت لارڈ لٹن نے کی؛ 1903 میں لارڈ کرزن نے ایڈورڈ ہفتم کی تخت نشینی پر اس سے بھی بڑا دربار منعقد کیا؛ اور تاج برطانیہ کا آخری شاہی دربار 1911 میں کنگ جارج پنجم اور کوئین میری کو دہلی کے نئے دارالحکومت میں خوش آمدید کہنے کے لیے ہوا۔

جاہ و جلال کے عروج پر، ہندوستان میں برطانوی سلطنت نے نئی دہلی میں ایک عظیم اور انتہائی دلنشیں نیا شاہی دارالحکومت سوچا اور تعمیر کیا۔ فرنچ سیاستدان جارجز کلیمینسیو شکوک کا اظہار کرتے ہوئے، شاہی حماقتوں کی لمبی لائن میں اسے حالیہ خیال کرتا ہے؛ کہا جاتا ہے کہ اس نے قہقہ لگایا، جب اس نے 1920 میں اس علاقے میں سات پرانے شہروں کے ملبے کے درمیان آدھی تعمیر شدہ نئی دہلی دیکھی، اور بیان کیا: 'یہ ان تمام کھنڈرات میں سب سے عظیم الشان ہو گی'۔ سالوں بعد، مینجمنٹ نظریہ دان سی. نارتھکوٹ پارکنسن، دوسری مثالوں کے ساتھ اپنے 'دوسرے قانون' کا فارمولا بناتے ہوئے نئی دہلی کی تعمیر کا حوالہ دے گا، کہ ان اداروں

نے عدم میں منتشر ہونے سے فوراً پہلے اپنی عظیم الشان یادگاریں تعمیر کیں۔

مورس، دہلی میں لارڈ کرزن کے منعقدہ دربار کی جزئیات بہت تفصیل سے بیان کرتا ہے، جہاں ہاتھیوں اور بگل کے درمیان، جواہرات سے لدے مہاراجے نذرانے پیش کر رہے تھے اور عوام برصغیر کے چاروں اطراف سے شاہی زرہ بکتر دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے، 'تھیٹر زندگی بن چکا تھا'۔ مناسب حد تک معقول، کرزن نے اس وقت کی حرکت کرتی تصویروں کی جدید ٹیکنالوجی کو استعمال کرتے ہوئے، دربار کو فلمایا۔ (اگرچہ مہاتما گاندھی نے، اپنی خودنوشت میں بیان کیا ہے کہ متعدد مہاراجوں نے، برطانویوں کو مناسب طور پر متاثر کرنے کی خاطر، جس حد تک انھیں جانا پڑا، تاکہ وہ اپنے تخت اور استحقاق بچا سکیں، اور انھیں جو پرتکلف پوشاکیں اور سامان زیبائش پہننا پڑا، اس پر نجی طور پر تاسف کا اظہار کیا۔)☆

کرزن نے، جو بطور وائسرائے شاہی جاہ و جلال کا ایک نمونہ تھا، تباہ کن قحط کے محض دو سال بعد تینوں میں سب سے بڑے دربار کا انعقاد کیا۔ جسے جان مورس، کرزن کا 'امارت کے گھمنڈ کا شوق' قرار دیتا ہے، اور نئیل فرگوسن اس کے 'ٹورینٹلزم' کا خطاب دیتا ہے، وہ اس کے وائسرائے کے عہدے کا لازمہ تھا، جسے اس نے ایسے انداز اور پدریت کے ساتھ اختیار کیا جو ماضی کی برطانوی اشرافیہ کے ورثاء کے لیے موزوں تھا (اس کا خاندان 800 سال قبل کے برطانیہ پر دھاوا بولنے والے فاتح نارمن کے اخلاف میں سے تھا۔) بلئیول کالج (آکسفورڈ) میں چار لائینوں کی 'تک بندی' اس کے آکسفورڈ میں زمانۂ طالبِ علمی سے اسے نشانہ بناتے ہوئے، لارڈ کرزن کی عوامی زندگی کے پیچھے پڑی ہوئی تھی، جو جب بھی اسے کوئی نیا عہدہ ملتا، لازماً پاپولر پریس میں چھپتی:

'نام میرا جارج نیتھینئل کرزن ہے
میں ہوں ایک مہاپرش
بال میرے کالے، چہرہ میرا چکنا
ہر ہفتے بلینہیم میں دعوت اڑاؤں'☆

☆ یہ صرف مہاراجے نہ تھے جنھیں تکلیف اٹھانا پڑی: ہر ہندوستانی سکول کے بچے کو ہندوستانیوں پر برطانوی 'لباس کے قواعد' کے اثرات پر افسوس کرنا چاہیے__ حتیٰ کہ آج بھی، ہندوستان کی نڈھال کر دینے والی گرمی میں خاص طور پر ایک ٹائی، لاکھوں سکول کے بچوں کی گردنوں کے گرد مستقل پھندے کے طور پر رہتی ہے۔

☆ میں نے اپنے اطمینان کے لیے اس اشاعت کی صحت جانچنے کے لیے 1890 کے برطانوی اخبارات سے رجوع کیا۔

جیسے اس انڈر گریجویٹ ٹھٹھے بازی نے اسے امر کیا، ویسے ہی اس کی وائسرائے شپ نے بھی، جسے آخرالامر اس کے مایوس کن سیاسی کیریئر میں ہر دوسری کامیابی کو گہنا دینا تھا۔ کرزن بچپن سے ہی وائسرائے بننے کی خواہش پالتا رہا تھا، اور اس نے اس میں شاہی جاہ و جلال کا تصور شامل کیا جسے پورا کرنے کے لیے وہ جوہر اور سٹائل دونوں چاہتا تھا۔

سٹائل جسے کرزن نے عروج بخشا، کا اظہار، برطانوی مصنف ڈیوڈ کیناڈئن جسے 'آرائش پسندی' کا نام دیتا ہے، میں ہوتا ہے۔ کیناڈئن کے مطابق، کرزن 'تقریبات کا ناظم و مہتمم' تھا۔ کیناڈئن نے اس قضیے کے لیے ایک پوری کتاب وقف کی تھی کہ برطانوی سلطنت، 'قدامت اور تقویم کی غلطی، روایت اور تکریم، امن اور اطاعت سے متعلق تھی؛ عظمت اور اولوالعزمی، گھوڑوں اور ہاتھیوں، نائٹس اور مصاحبین، جلوسوں اور تقریبات، طرے والے ہیٹ اور پشم کے چوغوں سے متعلق تھی؛ سرداروں اور امیروں، سلاطین اور نوابوں، وائسرائے اور صوبہ داروں، سے متعلق تھی؛ تخت اور تاج، مملکت اور حفظ مراتب، نمائش اور زیبائش پسندی سے متعلق تھی'۔ اور اسی رو میں یہ حتمی شکست تک جاری رہی، جب آخری وائسرائے لارڈ لوئیس مونٹ بیٹن کی تقریباتی پوشاکیں، اس کی سیاسی طاقت پر بتدریج کم ہوتی گرفت سے کراہت آمیز تناسب میں نظر آتی ہیں۔

اس جاہ و حشمت نے، برطانویوں کو محض اپنی ملکہ کی تعظیم کی ضمانت کے لیے، حفظ مراتب کے اصول کی شان بڑھانے میں مبتلا نہیں کیا، بلکہ اسے ہندوستان تک پھیلا دیا، 'مقامی راجاؤں' کو تکریم دے کر، دوسروں کو نواب بنا کر اور قائم مقام اشرافیائی روایت کی اختراع کو تقویت دے کر، تاکہ ان کی اپنی حکمرانی کو جائز قرار دیا جاسکے۔ لہٰذا برطانویوں نے ایک درباری کلچر تخلیق کیا، راجاؤں کو جس کی پیروی کرنا تھی، اور عہدوں کی ایک درجہ بندی تخلیق کی جو تاج برطانیہ کو مغل شہنشاہ کے وارث کے طور پر دیکھانا چاہتی تھی۔ توپوں کی سلامی کی مفصل درجہ بندی، نو سے انیس توپوں تک (اور صرف پانچ کیسوں میں اکیس ☆☆) متعلقہ حکمران کی اہمیت اور

☆ (بقیہ) دوبارہ نقل کرتے ہوئے اس کی اصلاح کی گئی ہے، اور شاید کچھ قارئین ان اشعار کی بدلی ہوئی صورت سے زیادہ شناسا ہوں:

'نام میرا جارج نیتھینئل کرزن ہے — میں ہوں ایک مہاپرش

گال میرے گلابی، بال میرے چکنے — ہر ہفتے بلینہیم میں دعوت اڑاؤں'

☆☆ جنگ عظیم اول تک، صرف حیدر آباد، بڑودہ اور میسور 21 توپوں کی سلامی کا حق رکھتے تھے؛ گوالیار اور جموں کشمیر کو ان کے فوجیوں کی جنگ عظیم میں برطانیہ کے لیے خدمات کی قدردانی کے لیے 1917 اور 1921 میں اس فہرست میں شامل کیا گیا۔ دوسرے حکمرانوں کو اپنی قلمرو میں 21 توپوں کی سلامی کی اجازت تھی، لیکن باہر صرف 19 کی، وغیرہ: پروٹوکول کی بہت باریک بینی سے صراحت کی گئی تھی۔

اطاعت شعاری کو مد نظر رکھتے ہوئے؛ قاعدہ کہ کون 'عزت مآب' ہے اور کون نہیں، اور کس قسم کا (پہلی جنگ عظیم کے دوران، حیدر آباد کا نظام 'عزت مآب' کے مرتبہ سے 'سلطان معظم عالیشان' کے رتبہ پر فائز ہو گیا، بنیادی طور پر جنگ کی کوششوں میں اس کی رقوم کے عطیات کی وجہ سے)؛ محتاط لغت کے مطابق 'مقامی سردار' ('بادشاہ' نہیں) 'حکمران' خاندانوں سے تھے نہ کہ شاہی 'خاندانوں سے'، اور ان کے علاقے 'رجواڑے' تھے نہ کہ 'مملکتیں' ـــــ یہ سب فریب نظر پھیلانے والے مفصل شہنشاہی نظام کا حصہ تھے۔ حتیٰ کہ لندن میں انڈیا آفس میں داخلے کے لیے دو ایک جیسے دروازوں والا کمرہ تھا، کہ اگر دو یکساں رتبہ کے ہندوستانی، فرمانرواؤں کا ایک ہی وقت میں استقبال کرنا پڑے، تو کوئی ایک، دوسرے کی پیش روی نہ کرے۔ اور یہ ایسے ہی چلتا رہا ـــــ

جیسا کہ ڈیوڈ گلمور نشاندہی کرتا ہے، تمام تفصیلی پروٹوکول اور دکھاوے کے لیے، برطانوی جن پر عنایت کرتے، اس ہندوستانی اشرافیہ کو بہت کم عزت دیتے۔ کرزن بذات خود انھیں حقارت کی نظر سے دیکھتا 'آدھے انگریز نما، آدھے اپنی قومیت سے خارج، یورپی عورتوں کا شکار کرنے والے، مصنوعی کھیل تماشہ، اور اکثر اوقات آخر میں شرابی نوجوان مقامی سردار'۔ لیکن اسے احساس تھا کہ ہندوستانی شاہان کی اس شاہی کیٹیگری کی اختراع کا الزام صرف برطانیہ کو ہی دیا جا سکتا ہے۔ 1888 میں، مرکزی ہندوستان میں ایک حکومتی عہدیدار نے رپورٹ کیا کہ اس کی ذمہ داری کے علاقہ میں 'نوجوان شہزادوں کے لیے ایک انگریزی ٹریننگ' کا ابھی تک کا نتیجہ 'دو لونڈے باز، ایک احمق، ایک نشئی.... (اور ایک) شریف آدمی ہے.... جسے دائمی سوزاک نے ملکہ برطانیہ کی سالگرہ کے موقع پر تسلیمات پیش کرنے سے روک دیا'۔ 1900 میں کرزن نے خود 'غیر سنجیدہ اور بعض اوقات فاسق، فضول خرچ اور مجہول (لوگوں)' کی شکایت کی، جنھوں نے جواہرات کے حامل ہندوستانی شہزادوں کا روپ دھارا ہوا تھا۔ اس نے ملکہ برطانیہ کو لکھا، ڈھول پور کا رانا، 'خمر اور نشے میں بڑی تیزی سے ڈوب رہا' تھا، پٹیالہ کا مہاراجہ 'ایک جاکی سے تھوڑا سا بہتر' تھا، مہاراجہ ہولکر 'آدھا پاگل' اور 'خوفناک بدکاریوں کا رسیا' تھا، اور کپور تھلہ کا راجہ پیرس میں محض عورتوں کے پیچھے پھرنے میں خوش تھا۔ یقیناً، روشن خیال اور رحم دل ہندوستانی راجے بھی تھے، اور حتیٰ کہ بصیرت والے بھی ـــــ بڑودہ، ٹراونکور اور میسور، تینوں کا نام لے لیں، ان کے حکمرانوں کی اپنی رعایا کی بہبود کے لیے فکر مندی کی نمایاں شہرت مثالی تھی ـــــ لیکن عیاش راجاؤں کے قصے گڈ گورننس کی کہانیوں کی نسبت بہت زیادہ تھے۔

غیر ہندوستانی نوکر شاہی

اگر ہندوستان پر قبضے کے لیے، تاج برطانیہ کی مکمل پوشاکیں اور خارجی زیبائش کافی تھی، تو (دوسری طرف) ملکہ اپنے اقتدار کی ماہیت کے حوالے سے مزید آگے بڑھ گئی۔ اس کے 1858 کے معروف اعلامیے میں، اس نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ 'ہماری رعایا جس بھی نسل یا دھرم سے متعلق ہو، کو آزادانہ و غیر جانبدارانہ طور پر ہماری ملازمت کے ان محکموں میں شامل کیا جائے، جن کے فرائض سے باضابطہ عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ اپنی تعلیم، قابلیت اور دیانت کے حوالے سے اہل ہوں'۔

لیکن حقیقت کیا تھی؟ ول ڈیورانٹ کے الفاظ میں، یہ ایک قسم کی 'سیاسی دھتکار اور سماجی تحقیر' تھی۔ 1857 میں بنگال میں نوآبادیاتی ناظم ایف۔ جے۔ شور، جس کا حوالہ میں اس سے پہلے بھی دے چکا ہوں، نے دارالعوام کے سامنے حلف لیتے ہوئے اعتراف کیا کہ 'ہندوستانیوں کو ہر اس مقام، مرتبہ اور محکمہ سے خارج کیا گیا جسے قبول کرنے کے لیے کوئی کمتر درجے کا انگریز بھی راضی ہو سکتا تھا'۔ چند عشروں بعد، ہندوستان، یورپ اور امریکہ کی اعلیٰ ترین یونیورسٹیوں کے ہندوستانی گریجویٹس، کو معلوم ہوا کہ سرکاری نوکریوں میں ان کے لیے زیادہ تر چھوٹے درجے کی (نوکریاں) ہی رکھی گئی تھیں؛ ڈیورانٹ کے مطابق، انڈین سول سروس (آغاز میں امپیریل) میں محض 4 فیصد 'طے شدہ' نوکریاں تھیں، اعلی درجے میں ہندوستانیوں کی بھرتی 1930 کے بعد شروع ہوئی۔ جیسا کہ نقادوں نے نشاندہی کی ہے، ایسا نہیں تھا کہ ہندوستان میں انگریزوں کے پاس جو نوکریاں تھیں ان پر بہترین اور لائق کو ہی رکھا جاتا تھا۔ لارڈ اسکوئتھ نے 1909 میں اعلان کیا کہ 'اگر اعلیٰ عہدے ہندوؤں کو دے دیے گئے جن میں سے نصف اتنے ہی نااہل ہیں جتنے کہ انگریز اور جو انھیں (نوکریوں کو) ہندوستان میں پر کریں گے، تو اسے ایک عوامی سکینڈل تصور کیا جائے گا'۔ اوسط صلاحیت کے مالک مختار کل تھے، اور انھیں ہندوستانیوں سے زیادہ اجرت ادا کی جاتی کیونکہ انھیں ہندوستانی گرمی کی 'سختیاں' برداشت کرنا پڑتیں ___ باوجود کہ زیادہ تر، ٹھنڈ اور سرد دبیز دھند میں شب گرفتہ وطن واپس جانے والوں کو سورج راحت بخش حدت بخشتا۔ (جیسا کہ ردیارڈ کپلنگ اپنے یادگار ناول، روشنی جو ناکام ٹھہری، میں لندن واپسی کو بیان کرتے ہوئے پیش کرتا ہے: 'یخ بستہ دھند کی ایک باریک تہہ شہر پر چھائی ہوئی تھی، اور گلیوں میں بہت ٹھنڈ تھی؛ کیونکہ انگلینڈ میں موسم سرما تھا'۔) ایک قاعدے کے لحاظ سے، وہ بھی نرالے انداز میں خوش وضع و اپنے آپ

میں مطمئن تھے اور اپنے رویوں میں ہندوستانیوں کی ناگوار سرپرستی کر رہے تھے (جب وہ محض متکبر نہ تھے)۔ جواہر لال نہرو نے اسے بڑے تیکھے انداز میں پیش کیا: اس نے کہا، انڈین سول سروس، 'نہ تو انڈین ہے، نہ سول، اور نہ ہی سروس'۔

برطانویوں نے، پروٹوکول، شراب اور بے حد تلخی کا پشتہ بنا کر غیر متزلزل خود اعتمادی کے ساتھ انیسویں صدی کے ہندوستان پر حکومت کی۔ سٹالن کو یہ مضحکہ خیز لگتا تھا کہ 'چند سو انگریز ہندوستان کو فتح کر لیں'۔ علم حساب کے لحاظ سے وہ درست نہیں تھا، لیکن اصولی طور پر وہ ٹھیک تھا: یہ غیر معمولی تھا کہ برطانوی راج اتنے کم لوگوں نے چلایا۔ 1805 میں ہندوستان میں 31000 برطانوی تھے (جن میں سے 22000 فوج میں اور 2000 سول گورنمنٹ میں تھے)۔ یہ تعداد 1857 کے بعد خاصی بڑھ گئی، لیکن اس کے باوجود 1890 تک ستر ہزار برطانوی فوجیوں اور اس سے زیادہ یونیفارم میں ہندوستانیوں کے ساتھ 6000 برطانوی عہدیدار، 25 کروڑ ہندوستانیوں پر حکومت کرتے تھے۔ 1911 میں 164000 برطانوی ہندوستان میں رہ رہے تھے (جن میں سے 66000 فوج اور پولیس میں اور صرف 4000 سول گورنمنٹ میں تھے)۔ 1931 تک یہ محض 168000 تک پہنچے (بشمول صرف 60000 فوج اور پولیس میں اور سول گورنمنٹ میں اب بھی وہی 4000) ایک ایسا ملک چلانے کے لیے جس کی آبادی 30 کروڑ کو چھونے والی تھی۔ یہ نسل پرستانہ خود یقینی، برتر ملٹری ٹیکنالوجی، جدیدیت کی فضا اور روشن خیال ترقی پسندی کے فریب کا غیر معمولی ملاپ تھا__ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح طور پر کہنا پڑے گا کہ، مفتوحین کی طرف سے کم ہمتی، طمع، موقع پرستی اور منظم مزاحمت کی کمی بھی تھی_ اس کے ساتھ ساتھ جب ضروری سمجھا گیا، بے رحم طاقت کے دانشمندانہ استعمال نے، سلطنت کو قائم رکھا۔ برطانوی، ہندوستان کی آبادی کا 0.50 فیصد سے زیادہ کبھی نہیں رہے۔ ہابس باؤم کے تمثیلی الفاظ میں، سلطنت 'بڑی آسانی سے فتح ہوئی، بمشکل بنی، احمقانہ سہولت سے راج کیا گیا، چند لوگوں کے خلوص اور اکثریت کی مجہولیت کو سلام'۔

کلائیو کے دور میں، کمپنی 'دوہرے' نظام کی منتظم تھی: اختیارات کا نفاذ کمپنی کرتی لیکن ایک کٹھ پتلی نواب کو سہارا دے کر۔ وارن ہیسٹنگز نے مکر چھوڑ دیا اور نواب کو نکال باہر کیا: براہ راست انتظام اب کمپنی کے کنٹرول میں تھا۔ کارنوالس نے 1785 میں، کمپنی ملازمین کی ایک پیشہ ورانہ مستقل جمعیت تیار کی، جسے کمپنی کے لیے ملک پر حکومت کرنا تھی، تمام اعلیٰ عہدے برطانویوں کے لیے مخصوص کرتے ہوئے اور انگریزوں کو 'کلکٹر' کے

درشت خطاب کے ساتھ ہر ضلع کا حاکم تعینات کرتے ہوئے، جیسا کہ ریونیو وصولی ہی ان کے وجود کی علت تھی۔ کلکٹر عام طور پر اپنے ضلع میں مجسٹریٹ کے دوہرے فرائض سرانجام دیتا☆ یوں برطانوی حکومت چلاتے، ٹیکس وصولتے، اور جو قرین انصاف ہوتا اس کا اہتمام کرتے۔ ہندوستانی ان تمام وظائف سے خارج تھے۔

ان کاموں کو سرانجام دینے کے لیے، ایک سول سروس وجود میں آئی، جس کے لیے کمپنی کے کرتا دھرتا اپنے شناسا بااثر نوجوان لوگوں میں سے نامزد کرتے، اور 1806 کے بعد، کمپنی کی خدمات کے لیے لندن کے قریب، ہیلیبری کالج میں تربیت دی جاتی۔ 1833 کے بعد، مقابلے کا امتحان متعارف کروایا گیا، اس کے باوجود ڈائریکٹران کے نامزد کردہ ابھی بھی ایک اشارۂ ابرو پر بھرتی کیے جاتے۔ 1853 کے بعد، انتخاب مکمل طور پر امتحانات کی بنیاد پر، تمام سفید فام انگریزوں کے لیے کھلا ہوا تھا۔ امپیریل سول سروس کے لیے مانگ بہت زیادہ تھی، کیونکہ کام کا ستم ظریفی کی حد تک اچھا معاوضہ دیا جاتا، اور کمپنی ملازمین ہندوستان میں حقیقی سیاسی طاقت کا استعمال کرتے، جبکہ انھیں برطانیہ میں اگر اس کے برابر کی نوکری ملتی تو یہ سب کچھ کرنے کی امید وہ نہیں کر سکتے تھے۔ امتحانات ہندوستان سے متعلقہ علم یا اس کے عوام کے بارے میں حساسیت بڑھانے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے؛ وہ صرف معقول انگریز شرفاء کو شناخت کرنے کے متلاشی تھے، اور کلاسیکی علمیت اور اعلیٰ درجہ کی ادبی استعداد پر زور دیتے۔ 1860 کے بعد، ہندوستانیوں کو بھی امتحانات میں شمولیت کی اجازت مل گئی۔ لیکن ہندوستانی سول سروس ابھی بھی برطانوی مزاج کی حامل ہی رہی۔ ایک وائسرائے لارڈ میو نے اعلان کیا، 'ہم تمام برطانوی شرفاء ایک کمتر نسل پر حکومت کرنے کے عظیم الشان کام میں مشغول ہیں'۔ چند ایک نے وکٹوریہ کے 'خاکی جلد والوں کے لیے رومانوی احساسات' سے بھی آگاہ کیا۔

ہندوستانیوں بارے ان کا نقطہ نظر بہترین حالات میں پدرانہ تھا، اور بدترین میں حقارت آمیز (بیسویں صدی میں بھی، انھوں نے، ہندوستانیوں کے بارے میں جو کہ خود پر حکومت کرنے کے اہل نہ تھے، کے ساتھ

☆ برطانوی مختلف متبادلات کے ساتھ ایک پیچیدہ انتظامی نظام چلاتے۔ اپنے جوہر میں، اور اپنے عروج پر، برطانوی ہند کو گورنر جنرل (بعد میں وائسرائے) کے ماتحت متعدد صوبوں اور پریزیڈینسیز میں منقسم کیا گیا.... جن میں سے ہر ایک کی سربراہی، اس کی اہمیت اور سائز کے مطابق، گورنر، لفٹیننٹ گورنر یا کمشنر کرتا۔ ہر صوبہ یا پریزیڈینسی متعدد ڈویژنوں پر مشتمل ہوتی، جس کی سربراہی ایک ڈویژنل کمشنر کرتا۔ یہ ڈویژن آگے اضلاع میں مزید منقسم ہو جاتے، جو کہ بنیادی انتظامی اکائی تھے؛ ہر ضلعے کا سربراہ ایک کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا ڈپٹی کمشنر ہوتا (زیادہ تر کیسز میں یہ سب ایک ہی شخص ہوتا، عموماً تونٹیز کے وسط کی عمر کا ایک نوجوان انگریز)۔

'بچوں' کے طور پر برتاؤ کرنے کی ضرورت پر لکھا اور کہا)۔ ہندوستان میں ملازمت کرنے والے خاندانوں میں سے چند ایک کی کئی نسلیں، تین صدیوں سے زیادہ، یہاں اپنی جڑیں بنائے بغیر رہتی رہیں: یہ اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے 'وطن' بھیجتے اور خود یہاں اپنے پیاروں کی سال ہا سال کی جدائی برداشت کرتے۔ یقیناً یہ سب ذاتی قربانی اور محنت ہی نہ تھی: جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، آئی سی ایس کے افسران دنیا میں کسی بھی عہدیدار سے زیادہ تنخواہ پاتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ فراخدلانہ لمبی رخصت اور پنشن کی ضمانت، اور کچھ کو تو اپنی آمدن کو خرچ کرنا 'بالکل ناممکن' لگتا۔ انگریز سیاسی مصلح جان برائٹ، بغیر کسی تحیر کے، سلطنت کو 'عظیم برطانیہ کی، اشرافیہ کے لیے بیرونی اعانت کا ایک عظیم الشان نظام' سمجھتا تھا۔

ہندوستان میں آئی سی ایس افسران اپنے کام کو روبہ عمل میں لانے کے لیے جو زاویہ نظر لے کر آئے، شوقِ تحقیق اور دردمندی سے لے کر، مروّت اور ظاہرداری تک انیسویں صدی کے آخر تک سب انحطاط پذیر ہو گیا۔ ایچ فیلڈنگ ہال نے آئی سی ایس میں تیس سالہ نوکری کے بعد لکھا، 'جن لوگوں پر حکومت حکمرانی کرتی تھی ان کی جانب، اس کے تمام رویوں میں بگاڑ پیدا ہو گیا۔ علم اور فہم کی طلب۔ اس کی جگہ، تعصب یا ناقص مشاہدہ یا پھر حالات جو بدل چکے ہیں، پر مبنی جامد آراء ہیں، اور ان کی تصحیح نہیں کی جاتی۔ نوجوان سیکریٹریز پرانے سرکلر پڑھتے اور انھی "نظائر کی پیروی کرتے ہوئے" ــــــــ لاتعداد مرتبہ غلطیاں دہراتے ہیں'۔

برطانوی لیبر سیاستدان کائیر ہارڈی، ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کو یوں بیان کرتا ہے، 'ایک عظیم فوجی استبدادیت جسے سول بیوروکریسی کسی حد تک اعتدال پر لائی'۔ یہ بیوروکریسی ہر جگہ سرایت کرنے والی، محنت سے زیادہ اجرت پانے والی، بے وقوفانہ حد تک پروسس کی ماری ہوئی، نمایاں طور پر نااہل اور عوام کی بہبود جس کے لیے بہر صورت اسے بنایا گیا تھا، سے زیادہ تر لاتعلق تھی۔ لارڈ لٹن نے ہلکے پھلکے انداز میں ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کو یوں بیان کیا 'دفاتر کی استبدادیت، کبھی کبھار چابیوں کی گمشدگی کے امتزاج کے ساتھ'۔ یہ بیوروکریسی کی استبدادیت، کمپنی کی حکومت کے ابتدائی سالوں، اٹھارویں صدی کے اواخر تک پہنچتی ہے، جب لارڈ کارنوالس نے اعلان کیا کہ 'تمام حقوق احاطہ تحریر میں لائے جا چکے تھے'۔ جیسا کہ جان سٹورٹ مل، جس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے 'ہندوستانی مراسلت کے معائنہ کار' کے طور پر خاصی عیش کی اسے یوں پیش کرتا ہے 'ہماری ہندوستانی انتظامیہ کا عظیم کارنامہ' اس کا 'تحریری تسلسل' تھا۔ لیکن درحقیقت یہ برطانوی نظام کا بہت بڑا سقم تھا۔ ہندوستانی حکمران ماضی میں اپنی مقامی رعایا کے ساتھ بات چیت کرتے تھے کیونکہ انھیں ان کے

ساتھ رہنا تھا۔ اب کمپنی ان سے فاصلہ اور صرف ایک چیز کا خیال رکھتی تھی ___ ایک نیٹ ورک جو دور دراز لندن میں ڈائریکٹران کو جتنا ممکن ہو اتنی مستعدی اور سرعت سے کیش فراہم کر سکے۔ جیسا کہ جان ولسن کا خیال ہے، حقیقت میں کاغذ کا غیر معمولی بہاؤ جسے مل 'الفاظ کی دنیا کی تعمیر' سے یاد کرتا ہے 'بہی کھاتے اور لین دین کے کھاتے جن کا اپنا ایک پراچین قاعدہ تھا ___ لیکن جو دیہی سماج کی صورت گری کرنے والی قوتوں کا ادراک یا ان پر حکمرانی نہیں کر سکتے تھے ___ کاغذی کاروائی کے گورکھ دھندے نے ریاست اور مقامی سرداروں کے درمیان دوطرفہ عوامی تعلقات کی تخلیق روک دی، جس پر اس سے پہلے سیاسی قوت اور معاشی خوشحالی کا انحصار تھا'۔

اس کا یہ بھی مطلب تھا کہ اب غیر ملکی بغیر کسی میل جول کے ان کی قسمتوں کے فیصلے کریں گے اور یہ فیصلے زیادہ تر بند دروازوں کے پیچھے، دفاتر میں ہوا کریں گے۔ حکمرانوں کی طاقت کے عوامی جلوے، کو ناقابل فہم کاغذات کی پرائیویٹ اشاعت سے بدل دیا گیا۔ فیصلے وہ لوگ کرتے جو ان فیصلوں سے متاثر ہونے والوں کی نظر میں کہیں تھے ہی نہیں۔ عوامی جگہیں جہاں ہندوستانی اپنے حکمرانوں کی پکڑ کر سکتے تھے، پہنچ سے باہر تھیں، لہٰذا سازشوں اور کرپشن کے مواقع بھی زیادہ ہو گئے۔ ہندوستانیوں کو بہت تشویش تھی کہ جو فیصلے کیے جاتے ہیں ان میں ان کی کوئی رائے نہیں ہوتی۔ اہم فائلوں میں جو لکھا گیا ہے وہ ڈھونڈنے کے لیے، کلرکوں کو رشوت دینا پڑتی۔ ناڈیا کا راجہ، بند دروازوں کے پیچھے جو کچھ ہو رہا تھا، کے بارے میں بہت فکر مند تھا کیونکہ اس نے یہ بتانے کے لیے ایک بنگالی کلرک کو ادائیگی کی تھی کہ ضلعی دارالحکومت اور کلکتہ کے مابین ہونے والی خط و کتابت میں کیا لکھا ہے۔

پرانے قابل رسائی ہندوستانی حکمرانوں کی جگہ نئے مداخلت کرنے والے برطانوی بیوروکریٹس لے چکے تھے جو کاغذی کاروائی ہنر مندی سے برتنے میں ماہر تھے، جنھیں نئے قوانین نے خلق کیا تھا لیکن رعایا کی بہبود میں جن کی دلچسپی بہت معمولی تھی اور اپنے قوانین کے حوالہ کے بغیر اپنی اتھارٹی قائم کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔ اور جب ان کی خلاف ورزی کی جاتی تو وہ فقط امن و امان کے بزور قوت نفاذ میں پناہ لے پاتے۔ ولسن کہتا ہے 'نیا نظام ہندوستانی مضافات میں پائیدار سیاسی امن قائم کرنے کے لیے نہیں بنایا گیا تھا۔ اس کا مقصد ضمیر فروشی اور بدکرداری کے برطانوی الزامات سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی صداقت کا دفاع کرنا تھا۔ اس (کمپنی) نے اپنی زندگی کا آغاز میٹروپولیٹن شہروں کی اخلاقی بے چینی کو بہتر کرنے کی کوششوں سے کیا، نہ کہ کمپنی افسران ہندوستان

میں کیا کر رہے ہیں کی ہندوستانی شکایات سے نپٹنے کے لیے'۔ کمپنی دفاتر میں رکھے صاف ستھرے رجسٹر 'برطانوی افسران کو یہ تصور کرنے کی آزادی دیتے کہ انھوں نے ایک مؤثر اور متفق علیہ حکمرانی کا ڈھانچہ تیار کر لیا ہے؛ انھوں نے طاقت کے ایک واہمے کی پرورش کی'۔

یہ وہ روایت تھی جو کمپنی نے تاج برطانیہ کے سپرد کی، جس نے اسے بغیر کسی تبدیلی کے برقرار رکھا۔ جیسا کہ لٹن اشارہ کرتا ہے، زیادہ تر برطانوی بیوروکریسی حد سے زیادہ ضوابط کی پابند تھی؛ کاغذی کاروائی اور پروسیجر کا خبط شاید اس رینگتی ہوئی امید کا نتیجہ ہو کہ چار گنا فارمز بھرنے کا نتیجہ ممکنہ طور پر غیر منصفانہ نہیں ہو سکتا۔ (یا ایک برطانوی ایجاد، اسٹامپ پیپر پر لکھنا، جو ایک دستاویز کو ساکھ کے احساس سے بہرہ مند کرتا اور برطانویوں کو تسلط کا احساس دلاتا۔) ضوابط کی کتاب در کتاب تخلیق کرنا، مقبوضہ سماج پر قبضے کی نازک نوعیت کو چھپا دیتا۔ ضابطے اجتماعی طور پر، بغیر سیاق و سباق کے، اور جن پر نافذ کیے جاتے، ان افراد کے حالات کی حساسیت کو مدنظر رکھے بغیر، ان پر نافذ کرنے کے لیے وضع کیے اور مدنظر رکھے جاتے۔ فیصلے قوانین کی بنیاد پر کیے جاتے نہ کہ حقائق کی، اکثر اوقات، شروعات میں فقط سیاسی حالات سے کٹے ہوئے افسران کو فیصلہ کرنے کے لیے طلب کیا جاتا۔

ہندوستان میں برطانوی نظام حکومت کسی بھی معیار سے عجیب و غریب تھا۔ ایک چوبیس سالہ ضلعی آفیسر کو پتہ چلتا ہے کہ وہ چار ہزار مربع میل اور دس لاکھ لوگوں کا انچارج ہے۔ فرائض جو ایک ضلعی آفیسر کو ادا کرنے پڑتے تھے انھیں ایک معاصر تذکرے میں یوں شمار کیا گیا ہے: 'زمینی محاصل کا کلکٹر۔ ضلع میں املاک ارضی کا رجسٹرار۔ مالک و کرایہ دار کے مابین جج۔ عدالت انصاف کا معاون آفیسر۔ ضلع کا خزانچی اور اکاؤنٹنٹ۔ ضلعی اکسائز کا ناظم۔ مقامی ریٹ کمیٹی کا بلحاظ عہدہ صدر۔ عوامی مقاصد کے لیے حاصل کردہ زمینوں کی دادرسی کے نزاعی معاملات کا ریفری۔ ان تمام دعووں میں حکومت کا ایجنٹ جس میں وہ فریق ہو۔ مقامی عوامی کاموں میں ریفری۔ نابالغوں کی جائیدادوں کا مہتمم۔ مجسٹریٹ، پولیس مجسٹریٹ اور فوجداری جج۔ پولیس کا افسر اعلیٰ۔ میونسپلٹیز کا بلحاظ عہدہ صدر.....' یہ تمام کام، ایک غیر ملک میں، مقامی زبانوں اور حالات کے معمولی علم کے ساتھ، ایک نوجوان آدمی کو، دستور العمل کے ان ضوابط کی پیروی میں جو ایک دور دراز حکومت نے وضع کیے تھے، ادا کرنے تھے، مگر جن پر انھیں حکمران مقرر کیا گیا تھا، ان پر پیدائشی برتری اور ان تمام مناصب پر نفاذ اختیار کے خدائی تفویض کردہ حق کا اسے کامل یقین تھا۔ فلاح و بہبود نہیں بلکہ اختیار؛ ضلع میں برطانوی عہدیدار

کے لیے جو کام مقرر کیے گئے ان میں کوئی بھی 'ترقیاتی کام' نہیں تھا۔

اگر یہ سب کافی نہ ہوتا، تو نوجوان آدمی حفظ مراتب پر یقین رکھنے والے سماج میں 'فضیلت کے حساب سے نشست' کے جبر اور پروٹوکول کی سختیوں کا شکار ہو جاتا، تنہائی کے تریاق کے طور پر تاش کے کھیل کا اہل ہونے کی مایوس کن اہمیت سیکھتا، اور وقت کے ساتھ ساتھ، اعلیٰ عہدوں کے متواتر سماجی فرائض کا مذاق اڑاتا (ایک لیفٹیننٹ گورنر نے، ایک ہی دن میں، دریا کنارے دوپہر کا کھانا، باغ میں ڈانس پارٹی اور کلب میں عشائیہ کی میزبانی کی)۔ انحرافات بہ افراط تھے۔ ناقابل عذر طور پر اپنی ہی لذات کے ساتھ بیاہی، برطانوی نوکر شاہی، میدانوں کی جھلسا دینے والی گرمی سے بچنے کے لیے، مسلسل کئی مہینوں تک، پہاڑی کمین گاہوں میں پناہ کے لیے پہاڑوں کا رخ کرتی، وہاں وہ اپنا وقت تفریح، ڈانس اور سماجی نمود و نمائش میں گزارتے جبکہ ان کی حکمرانی کے مفعول، ہندوستانی عوام کا نیچے بے رحمی سے استحصال کیا جاتا۔

گرمیوں کا دارالحکومت شملہ، ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھاتی 'طلاق یافتہ خواتین' کی آبادی کے ساتھ، جبکہ ان کے خاوند گرم میدانوں میں مشقت کر رہے ہوتے، تو اہم کام دھندے 'جوا، شراب نوشی اور ساتویں حکم الٰہی کی خلاف ورزی' تھے۔

بہت سے غیر عسکری افراد کی دلیرانہ کوششوں بارے کوئی شک نہیں، جنھوں نے نہریں نکالیں، کالج تعمیر کیے اور انصاف کا بول بالا کیا، حتیٰ کے بعض کیسز میں ہندوستانی خود مختاری کی وکالت بھی کی۔ ان کے نام برصغیر کے جغرافیہ کا حصہ بن چکے ہیں: شہر جو اب ایبٹ آباد، لائلپور، اور کوکس بازار پکارے جاتے ہیں، کوربٹ پارک، کاٹن ہل اور مکنا بواہ نہر۔ آئی سی ایس میں ایک نایاب بائیں بازو سے تعلق رکھنے والا جان مینارڈ وضاحت کرتا ہے کہ 'بدصورت، بے رونق، ترش مزاج آدمی اپنی شکایت آمیز بے قناعتی اور معمولی خواہشات کے درمیان بھی اہم کام سرانجام' دینے کے قابل تھے۔

لیکن ان کا طرزِ زندگی زیادہ تر انھیں اس عوام سے علیحدہ رکھتا جس پر وہ حکمرانی کرنا چاہتے تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں نے، گلاب اور فرن اُگا کر اور اپنے کاٹیجز کو نوسٹیلجیا چھائے ہوئے نام، جیسا کہ گرائمیر لاج (اوٹی میں) اور ولوڈیل (دارجلنگ میں) دے کر، انگریزیت کے چھوٹے چھوٹے جزیرے قائم کیے۔ انیسویں صدی کے اوائل تک، برطانوی خود کو ایک حکمران ذات کے طور پر منوا چکے تھے، لیکن ہجوم کے سربراہ کے طور پر: وہ 'چھوٹی' جات والوں کے ساتھ شادی بیاہ اور کھانا نہ کھاتے، دوسرے الفاظ میں'

ہندوستانیوں کے ساتھ؛ وہ کنٹونمنٹ اور سول لائن کہلانے والے اپنے علاقوں کے اندر بنگلوں میں رہتے، جو 'بلیک ٹاؤنز' جہاں مقامی رہتے سے علیحدہ ہوتے تھے؛ وہ اپنے کلبوں میں الگ تھلگ رہتے، جن میں ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع تھا؛ ان کی وفاداریاں اب بھی ان کے دوردراز وطن کے ساتھ وابستہ تھیں؛ ان کے بچوں کو بحری جہازوں پر برطانوی پبلک سکول سسٹم میں بھجوادیا جاتا اور وہ 'مقامیوں' کے ساتھ میل جول نہ رکھتے؛ ان کے کپڑے اور سودا سلف برطانیہ سے آتا، جیسا کہ ان کی کتابیں اور خیالات۔ ہندوستان میں اپنے کیریئر کے اختتام پر ان میں سے زیادہ تر 'وطن' لوٹ جاتے۔ جیسا کہ انگریز مصنف ہنری نونسن، انیسویں صدی کے پہلے عشرے میں مشاہدہ کرتا ہے: 'ایک ملک بعید کے مٹھی بھر لوگوں نے سماجی میل ملاپ، شادی یا مستقل سکونت میں نرمی اختیار کیے بغیر تسلط برقرار رکھا'۔ ایک اور ہمدرد انگریز نے 1907 میں لکھا، 'ہندوستان کا انتظام اب درحقیقت، تسلسل کے ساتھ، کارپٹ کے بنڈل بنانے والے انگریزوں کے اختیار میں ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو کارپٹ کے بیگوں کے ساتھ نکلے اور صندوقوں کے ساتھ واپس لوٹے، جنھیں عموماً مقامیوں کے ساتھ اتنی ہی حقیقی ہمدردی ہے جتنا اپنی عادات وروایات کا گہرا علم'۔

انڈین سول سروس، خاص طور پر تقاضا کرتی کہ تمام آئی سی ایس افراد تیس سال کی عمر تک کنوارے رہیں۔ اس وجہ سے وہ 'ماہی گیر بیڑے' کے ذریعے (عورتوں کو) قابو کرنے پر آمادہ ہوتے، کیونکہ انیسویں صدی کے درمیان اور اواخر میں، انگریز عورتوں، کا ان کشتیوں کے ذریعے خاوندوں کو جال میں پھانسنے کے لیے ہندوستان آنا حقیقت تھا۔ یہ خواتین عموماً، برطانوی بالائی اور اوپری درمیانے طبقے کی ٹھکرائی ہوئی ہوتیں، یہ وہ عورتیں تھیں جو 'اچھے خاوند' تلاش کرنے میں یاتو بہت تیز طرار تھیں یا پھر بہت سادہ اور اپنی عمر کے دوسرے عشرے کے ابتدائی یا آخری سالوں میں تھیں۔ انگریزی شادی کے معاملات میں ایک دفعہ اگر آپ زیادہ بوڑھے لگنے لگیں، تو یا تو ہندوستان کو جانے والی کشتیاں تھیں اور یا پھر وطن میں بطور گورنس کے ناکتخدا کی زندگی___ اور نوآبادیات میں برطانوی طرز زندگی کی آسائشوں کی کہانیاں یقیناً کشتی کو ایک زیادہ پرکشش انتخاب بناتیں۔ آئی سی ایس افسران (اور اس معاملہ میں، دوسرے غیر فوجیوں)، کا مقامی عورتوں کے ساتھ ہم صحبت ہونا ممنوع تھا، جو کہ عمر کے تیسویں سال تک بوریت، تنہائی اور مایوسی کا شکار ہو چکی ہوتیں، اور چنے جانے کے لیے آمادہ ہوتیں۔ انگریزی کلبوں اور ٹینس میچوں میں، خوشنمار قص اور شیر کے شکار میں، ماہی گیر کشتیوں والی عورتیں خود کو، بااثر سویلینز کے ذریعے ایک پرجوش جھومر رقص کے حوالے کر دیتیں۔ پرورش سے ہی

ہندوستان سے الگ رہنے اور نئے سماجی حالات کے باعث، انتظار کرتے ہوئے ملازمین کے چھوٹے سے بحری بیڑے، اور کسی دوسرے ہندوستانی کے ساتھ رابطے سے نابلد، سفید وکٹورین انگلینڈ کے تعصبات سے متاثرہ، یہ خواتین عام طور پر نسل پرستی اور ملکی تحقیر کی سب سے زیادہ مجرم ہوتیں۔ یہ برطانوی سوسائٹی کو نفیس اور معقول بنانے کے لیے بلکہ ہندوستانیوں کے ساتھ تعلقات میں اس کے رویوں کو کسی حد تک ریاکار بنانے کی ذمہ دار تھیں۔

یہ زندگی تھی آئی سی ایس کے افراد کی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، پھر برصغیر میں پچیس یا اس سے کچھ زیادہ سالوں کے بعد، وہ برطانوی مضافات، چیلٹن ہیم یا جنوبی کینسنگٹن کو، جو 'ایشیامائنز' کے طور پر جانے جاتے ہیں کی طرف، یا 'اینگلوانڈین کوارٹر' جو اس سرزمین کی علامات و آثار سے گھرے ہوتے جس پر انھوں نے حکمرانی کی، کی جانب پلٹ جاتے۔ ایک سویلین دریائے ٹیمز کے کنارے ٹریڈنگٹن میں آباد ہوا اور اپنے پرانے گھر کو بلوچستان کے دارالحکومت 'کوئٹہ' کا نام دیا۔ ایک اور ولیم سٹریچے نے 'چائے کے اوقات میں ناشتہ کرتے اور زندگی کا زیادہ تر حصہ شمع کی روشنی میں گزارتے ہوئے' انگلینڈ میں رہتے ہوئے بھی اپنی گھڑی پر کلکتہ کا وقت ہی رکھا۔ یہ بہت تکلیف دہ تصور ہے، لیکن شمع کی روشنی مدھم ہو چکی ہے: برطانوی ناموں والی جگھوں میں سے زیادہ تر کے نام بدلے جا چکے ہیں۔ پاکستان میں لائلپور کا نام سعودی بادشاہ کے نام پر فیصل آباد رکھا جا چکا ہے۔ پرانی حکمران ذات کو اب کوئی فضیلت حاصل نہیں۔

امپیریئل سروس میں ہندوستانیوں کی شمولیت

ایک ہندوستانی کی نظر میں جس عنصر کے باعث یہ نظام موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے ــــ وہ اس کا غیر ملکی ہونا اور ہندوستانی عوام جن کے مفاد کے لیے یہ نافذ ہونا چاہیے تھا، اس سے اس کا تعلق نہ ہونا تھا ــــ تاہم ہو سکتا ہے کہ انگریزوں کی نظر میں یہ خوبی تصور کیا جائے۔ آئی سی ایس میں ہندوستانیوں کی موعودہ شمولیت کی مزاحمت برطانوی حکومت کی ہر سطح پر کی گئی، اور یہ برطانوی گرفت سے اس انعام کی طرح تھا، جیسے سونے کے متلاشی کی لاش کی مٹھی میں سونے کی ڈلی۔ حتیٰ کہ ایچ فیلڈنگ ہال جیسے ایک معتدل سول سرونٹ (جس نے ریٹائرمنٹ کے بعد ہندوستان کے متعلق کتابیں لکھیں جو سامراجی رویوں کے خمیر کے باوجود، ہندوستانیوں کے حوالے سے ہمدردی سے بھرپور تھیں)، کو سول سروس میں ہندوستانیوں کی شمولیت کے میثاق پر اعتراض کرتے

ہوئے یہ کہنا پڑا: 'حکومتِ ہند، ہندوستانی نہیں انگریز ہے۔ یہ فی نفسہٖ انگریز ہے، ایسی ہی ہے اور بالخصوص ایسی ہی ہے کیونکہ یہ ہندوستان میں ہے... انگلینڈ خود کو ہندوستان کے لیے ذمہ دار ٹھہرا چکا ہے، اور وہ اس ذمہ داری کو تقسیم یا اس سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔' اس نے مزید کہا: 'حکومت کو اپنا کام لازماً اپنے طریقے سے کرنا چاہیے، اور یہ طریقہ انگریزی ہے۔ کوئی ہندوستانی نہیں بتا سکتا کہ یہ کیا ہے'۔

اس کا نتیجہ تھا کہ سول سروس کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے والے ہندوستانیوں کی تعداد سے زیادہ ہندوستانی علاقے میں ملکہ وکٹوریہ کے مجسمے تھے۔ محض نسلی امتیاز کے دلائل کے برخلاف، یقیناً بامعنی جواز ہمیشہ موجود رہے ہیں: 'جہاں ملٹری یا ملٹری پولیس کے افسران کے ساتھ تعاون ضروری ہوتا، ان عہدوں پر ہندوستانیوں کا تقرر ناممکن ہوتا'۔ لیکن مسئلہ بہت جلد گھمبیر شکل اختیار کر گیا۔ ہندوستان میں گورے کسی ہندوستانی کو حقیقی اختیار والے عہدے پر قبول نہیں کریں گے۔ فیلڈنگ ہال نے 1913 میں زور دیا تھا: 'کہ ہندوستانیوں کو یورپینز پر حکمرانی کرنی چاہیے، مگر ہندوستانیوں کے لیے امن وامان کو برقرار رکھنا اور فوجداری و دیوانی انصاف کی فراہمی ناقابل تصور ہو گی۔ انتظامیہ مستحکم اسی وجہ سے ہے کہ انگریز ہے، اور اس استحکام کو کسی قسم کا خطرہ برداشت نہیں کیا جائے گا'۔

اپنے دعویٰ کے ثبوت میں، فیلڈنگ ہال، آئی سی ایس میں ایک ابتدائی ہندوستانی 'مسٹر شیٹھی' کے تجربہ کو یاد کرتا ہے، جسے رن اور آکسفورڈ سے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد، سول سروس کے امتحان میں اعلیٰ درجے پر شمار کرتے ہوئے ہندوستان کے ایک ضلع میں تعینات کیا گیا۔ لیکن وہاں کے کلب __ جو تمام اہل کاروں اور دوسرے انگریز شہریوں کی سماجی سرگرمیوں کا مرکز تھا __ نے اسے بطور ممبر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ ایک ذاتی محرومی سے زیادہ کا معاملہ تھا: یہ مکمل طور پر اس کے کیریئر میں رکاوٹ تھی، کیونکہ بہت سے سرکاری کام اور پیشہ وارانہ تعلقات کلب میں ایک جام پر نمٹائے اور بھگتائے جاتے تھے۔ فیلڈنگ ہال اپنے انگریز رفیقوں کی نسلی امتیاز کی روش کو رد نہیں کرتا، بلکہ جو نوکریاں محض انگریزوں کو کرنی چاہئیں ان پر ہندوستانیوں کو بھرتی کرنے کی غیر دانشمندانہ پالیسی کو الزام دیتا ہے۔ وہ شیٹھی جیسے آئی سی ایس افسران بارے غور و فکر کرتا ہے: 'سماجی طور پر وہ کسی دنیا سے تعلق نہیں رکھتا۔ اپنی (دنیا) وہ چھوڑ چکا ہے اور کسی دوسری میں وہ داخل نہیں ہو سکتا۔ اور آپ سماجی زندگی کو دفتری زندگی سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہ دو نہیں، ایک ہی چیز ہے'۔ وہ مزید کہتا ہے: 'آخر میں شیٹھی نے خود کو گولی مار لی۔ یہ ایک ایسے انسان کا المناک انجام تھا جو

خداداد صلاحیت کا حامل اور پسندیدہ تھا۔ اور حالانکہ ایسا انجام غیر معمولی تھا، لیکن اس کی وجوہات آفاقی تھیں۔ میں ایسے بہت سے سویلینز کو جانتا ہوں جو کہ ہندوستانی تھے اور ___ میرا خیال ہے کہ وہ سب رنجیدہ تھے۔

کوئی بھی جدید ذہن یہ پڑھتے ہوئے کپکپائے گا، لیکن فیلڈنگ ہال کسی بھی طرح اپنے قبیلے کا بدترین نہیں: اس کے متعلق آپ محسوس کریں گے، کہ اپنے زیادہ تر ساتھیوں کی نسبت زیادہ کشادہ ذہن اور انسان پرور تھا۔ نسلی امتیاز آئی سی ایس میں سرائیت کیے ہوئے تھا۔ ہندوستانی نظری طور پر انڈین سول سروس کے اعلیٰ عہدوں کے اہل تھے، اور ستیندر ناتھ ٹیگور (نوبل انعام یافتہ شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کا بڑا بھائی) اس کے ممتاز عہدوں پر 1863 میں ہی فائز ہو گیا، زیادہ تر درخواست گزاروں کو رد کر دیا گیا اور محض مٹھی بھر ہی عشروں بعد اس کے جانشین بن سکے۔ ستیندر ناتھ ٹیگور اور اس کے بعد آنے والوں نے اپنے کیریئر میں، بڑا خوفناک نسلی امتیاز اور ذاتی تحقیر برداشت کی۔ تیس سال کی آئی سی ایس سروس کے بعد، ستیندر ناتھ، جو کہ ایک ذہین ماہر لسانیات، نغمہ نگار اور سماجی مصلح تھا، غیر اہم عہدوں کی ایک سیریز میں، صوبہ مہاراشٹر کے قصبے ستارا سے ایک جج کی حیثیت سے ریٹائر ہو سکا۔

لارڈ لٹن 1878 میں بطور وائسرائے اپنے اعلیٰ افسران کو لندن میں رازداری کے ساتھ لکھتے ہوئے، 'موجودہ ممبران کی امنگوں کو مطمئن کرنے کے قابل ہوئے بغیر، حکومت جن تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی ترقی کی، حوصلہ افزائی کرتی تھی کے حوالے سے ان کی دھوکہ دہی بارے بے تکلف تھا؛ ایسا ہر ہندوستانی ماضی میں مخصوص کردہ موعودہ (مثلاً سینئر سول) سروس کے عہدوں پر، اگر ایک دفعہ، سرکاری ملازمت میں قبول کر لیا جاتا، تو اسے استحقاق حاصل تھا کہ وہ اس محکمے میں، قانونی طریقہ کار کے مطابق، اعلیٰ عہدے پر ترقی کے لیے اپنی تقرری کی توقع اور مطالبہ کرے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ مطالبات اور توقعات نہ پوری ہوں گی اور نہ ہو سکتی ہیں۔ [اصل پر اصرار ہے] ہمیں انھیں منع کرنے اور انھیں دغا دینے میں سے ایک چننا ہو گا، اور ہم نے سب سے کم تر دیانت دارانہ راستہ اختیار کیا'۔

دھوکہ دہی مزید کئی عشروں تک خوفناک طریقے سے جاری رہی۔ ابتداء میں ہی آئی سی ایس میں داخل ہونے والے ایک اور ہندوستانی، ستندر ناتھ ٹیگور کے بعد دوسرے، سریندر ناتھ بینرجی، کو اس کی عمر کی غلط بیانی کے الزامات کے تحت، شروع میں اس محکمے سے نکال دیا گیا، جس میں وہ 1869 میں بھرتی ہوا تھا۔ اس کی اپیل منظور ہو گئی اور اس کا تقرر سلہٹ میں ایک چھوٹے عہدے پر کر دیا گیا، لیکن اسے معاف نہیں کیا گیا، اور

1874 میں ایک معمولی خلاف ورزی پر نوکری سے مکمل طور پر ڈسمس کر دیا گیا(سول لائنز میں انگریزوں کے برابر رہائش کی درخواست، غیر ارادی طور پر ضابطے کی بے قاعدگی، جس پر ایک انگریز افسر کو شاید سرزنش بھی نہ کی جاتی)۔ وہ ترقی کرتا ہوا ایک ممتاز عالم، صحافی، ایڈیٹر، مقرر (ایک انگریز صحافی نے اسے گلیڈسٹون سے اب تک انگریزی کا اعلیٰ ترین مقرر کہہ کر خراج تحسین پیش کیا) اور دو مرتبہ انڈین نیشنل کانگریس کا صدر بنا، لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ اپنے ہم عصروں سے کہیں زیادہ روشن خیالی اور انتظامی صلاحیت کے حامل فرد کو برطانویوں نے قابلیت کے طور پر نہیں دیکھا جسے حکومتی مفادات کے لیے استعمال میں لایا جا سکے، بلکہ ایک ایسے عنصر کے طور پر جسے ملازمت سے برطرف کر کے جان چھڑائی جائے۔ (حالانکہ قریباً چار عشروں کے بعد، بینرجی، جو کہ نمایاں طور پر اپنے ہم وطنوں پر زور دیتے تھے کہ، 'تحریک چلاؤ، تحریک چلاؤ، تحریک چلاؤ، تمھیں ابھی للکارنے کا عظیم فن سیکھنا ہے' نے نائیٹ ہڈ کا خطاب قبول کر لیا۔ جیسا کہ مایوس نیشنلسٹ دلائل دیتے تھے، کہ شاید تب تک وہ کسی حد تک تبدیل ہو چکا تھا، اور اسی طرح برطانوی بھی۔ پہلے دونوں آئی سی ایس ہندوستانیوں نے ناقابل فہم تناسب کے خلاف جو راستہ تراشا اور ہموار کیا، اس پر اب ان کے ہم وطنوں کی زیادہ تعداد کسی حد تک زیادہ آسانی سے قدم رکھ سکتی تھی۔

اسی طرح، اربندو گھوش نے __ اس وقت اکرويد گھوش کے نام سے __ مانچسٹر کے سینٹ پال سکول اور کیمبرج یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد، انڈین سول سروس کے امتحان میں کئی ہزار امیدواروں میں سے دوسری پوزیشن حاصل کی، لیکن بینرجی کے برعکس اس کا انتخاب نہیں کیا گیا کیونکہ خیال تھا کہ وہ گھوڑ سواری کے امتحان میں فیل ہو چکا ہے۔ (اس کے نامور پیش رووں کی طرح، برطرف ہونے کے بعد شاید یہی تجربہ اسے تیاگ کی طرف لے گیا، کیونکہ اس کا مزاج برطانوی حکام سے بدگمان ہوا ہو گا۔ وہ عالمی روحانی تحریک، جو کہ آج بھی پانڈیچری میں پھل پھول رہی ہے، کے بانی سری اربندو کے طور پر، عالمی شہرت اور ابدیت پانے کے لیے نکل کھڑا ہوا)۔

یہ تو جب پہلی جنگ عظیم میں ہزاروں نوجوان برطانوی مردوں کے انبوہ کو سلطنت میں خدمات سرانجام دینے کی بجائے افسرانہ فرائض کے لیے خندقوں میں جانا پڑا، تب برطانویوں کو بادل ناخواستہ مزید ہندوستانیوں کو بھرتی کرنے کی ضرورت کا احساس ہوا، اور آئی سی ایس میں ہندوستانیوں کی تعداد راج کے آخری تین عشروں میں بتدریج بڑھنے لگی۔

لیکن تب تک، ہندوستانیوں کے پاس شاید عہدے تھے لیکن حقیقی اختیارات نہیں۔ ایک غیر معمولی کیمبرج کے تعلیم یافتہ ہندوستانی جج کو 1887 میں الہ آباد ہائی کورٹ کے بنچ میں تعینات کیا گیا، جسٹس سید محمود روزانہ امتیازی سلوک اور بد گمانی برداشت کرتا، خاص طور پر چیف جسٹس سر جان ایج کی طرف سے، جو کہ محمود محسوس کرتا کہ اس سے ایک عدالتی ہم سر کی بجائے ایک مفتوح محکوم کے طور پر پیش آتا تھا۔ سلطنت کے بارے میں پرجوش، حال ہی میں برطانیہ پلٹ نوجوان آدمی کے طور پر، محمود نے اس دن کا خواب دیکھا جب 'انگریز ان کے لیے حکمران اور غیر ملکی فاتحین سے زیادہ دوست اور ہم وطن ہوں گے'۔ لیکن ایسا ہونا نہیں تھا۔ نامور مصلح سر سید احمد خان، ہندوستانی مسلمانوں کے ہمراہ جن کا تعاون برطانویوں کے لیے نہایت اہم تھا، کے دوسرے بیٹے ___ محمود نے، برطرف ہو جانے کی آخری حد پر ___ 1892 میں استعفیٰ دے دیا، وہ برطانوی انصاف، فراہم کرنے والے ادارے کے اعلیٰ عہدے سے نکلنے کے بعد، اس پر اپنا اعتماد بحال کرنے سے معذور تھا، وہ شراب نوشی اور ڈپریشن میں گھر گیا، اور ترپن سال کی عمر میں ایک شکست خوردہ آدمی کے طور پر مر گیا۔

اس کے والد، سر سید احمد خان، اینگلو محمڈن کالج کے بانی، اور ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کے شہرت یافتہ وکیل، نے اپنے بیٹے کے بطور جج الہ آباد ہائی کورٹ، کے جبری استعفیٰ کے وقت لکھا: 'اگر ایک ہندوستانی اپنی عزت نفس جو کہ شرافت و دیانتداری کے ساتھ لازم و ملزوم ہے، کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے اپنے یورپی کولیگز کے ساتھ تعلقات تلخ ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف، اگر عزت نفس سے بالکل لاپرواہ ہو کر، وہ خود کو اپنے یورپی کولیگز کی خواہشات کا غلام بنالے، جو کہ خود کو طبعاً برتر سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا تعلق ایک فاتح قوم سے ہے، تو وہ بہت اچھی طرح آگے بڑھ سکتا ہے۔ لیکن اس کی توقع کسی ایسے آدمی سے نہیں کی جا سکتی جو اپنے ضمیر کے ساتھ دیانت دار رہتا ہے، اور جس کی رگوں میں اس کے (شریف) آباؤ اجداد کا خون دوڑتا ہے۔ یہ کوئی راز نہیں کہ انگریزوں کا اپنے ہم وطنوں اور دوسروں کے مابین سلوک میں وہی تفاوت ہے جو کہ کالے اور گورے کے درمیان [اصل پر زور ہے]'۔

کالا اور گورا، رات اور دن: یہ فرق ہر سطح پر سرائیت کیے ہوئے تھا۔ میں یہ موضوع چھیڑ چکا ہوں کہ ہندوستان میں برطانوی بیوروکریٹس کو کتنا زیادہ معاوضہ ادا کیا جاتا تھا، لیکن معاملات اور پیچیدہ ہو جاتے ہیں جب (پتہ چلتا ہے کہ) ان کے مقامی ہم رتبہ کے مقابلے میں ان کی تنخواہیں کتنی غیر متوازن تھیں۔ بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں، جے. ٹی. سندرلینڈ نے بیان کیا کہ تنخواہ اور مشاہرے کا فرق اتنا زیادہ تھا کہ سرکاری

ملازمت میں، آٹھ ہزار برطانوی افسران نے 13930554 پونڈ کمائے جبکہ ایک لاکھ تیس ہزار ہندوستانیوں کو مشترکہ طور پر کل 3284163 پونڈ ادا کیے گئے۔ ہندوستانیوں کو، ان کے رتبے، اختیارات، مقررہ عہدے، کیریئر میں ترقی کی کمی کے ساتھ، ہر مہینے تنخواہ کی سلپ دیتے وقت ان کی اوقات دیکھائی جاتی۔

اس کے دیرپا نتائج میں، ہندوستان میں افرادی قوت کی نمو کی ناکامی شامل تھی، جیسا کہ دادا بھائی نوروجی نے 1880 میں بیان کیا: 'مادی دولت کے ساتھ ملک کی حکمت اور تجربہ بھی چلا گیا۔ ہر سرکاری محکمے کے زیر انتظام بالواسطہ یا بلاواسطہ تقریباً تمام اعلیٰ آسامیوں پر یورپی قابض تھے۔ حالانکہ وہ ہندوستان میں ہندوستانی دولت، تجربہ اور حکمت پر قبضہ کر چکے تھے؛ اور جب وہ گئے، تو ہندوستان کو مادی اور اخلاقی دولت میں مزید مفلسی کے حوالے کر کے، وہ دونوں ساتھ لے گئے۔ لہٰذا ہندوستان ان کے بغیر رہ گیا، اور اس کے پاس حکمت و تجربہ میں وہ عاقل نہ ہو سکتے تھے جو ہر ملک میں پروان چڑھنے والی نسلوں کے لیے ان کے قومی و سماجی اطوار میں، اور ان کے ملک کی تقدیر میں فطری رہنما ہوتے ہیں؛ اور کتنا دلگیر، غمناک نقصان ہے یہ!'

سامراجی نسل پرستی: نرالا علیحدہ پن

بہرحال یہ ایک سوچی سمجھی پالیسی تھی۔ ولیم میک پیس ٹھاکرے، نے ہندوستانیوں کی روح کے 'گھمنڈ، عمیق خیال اور آزادی' کو کچلنے کی ضرورت پر اظہار خیال کیا: 'وہ ہمارے مفادات اور قوت کے براہ راست مخالف ہیں۔ ہم جنرلز، سیاستدان اور مقنن نہیں چاہتے۔ ہم ماہر صنعتی کاشتکار چاہتے ہیں'۔ نتیجہ یقیناً ہر سطح پر نسلی امتیاز تھا۔ جیسا کہ 1915 میں لندن میں 'انڈین نیشنل پارٹی' کا شائع کردہ ایک کتابچہ استدلال پیش کرتا ہے: 'جس کی کوشش انگلینڈ نے کی، وہ محکوم نسلوں کو مکمل طور پر لاطینی بنانے اور یکجان کرنے کا رومن نظام نہیں، بلکہ ایک نسل کا اپنے مادی مفادات کے لیے، دوسری نسل کے استحصال اور تحقیر کا نظام ہے'۔

نسل پرستی نے محض نوکر شاہی کو ہی نہیں بلکہ سلطنت کے ہر پہلو کو روگ لگا دیا۔ یقیناً، نسل پرستی سامراجی منصوبے کا مرکزی نقطہ تھی: یہ بہت دور رس، ننگی اور انتہائی ہتک آمیز تھی، اور برطانوی طاقت بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ بدتر ہوتی گئی۔ اس بات پر توجہ مرکوز کرنا بھی سبق آموز ہو گا کہ ہندوستان میں گوروں کے ابتدائی رویے اس وقت کیا تھے جب وہ ابھی غالب پوزیشن میں نہیں تھے۔ ولیم ڈیلرمپل نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی 1600 سے 1800 تک کی دو صدیوں کی حکمرانی کو بہت اچھی طرح بیان کیا ہے، جو کہ استبدادکار

(کلونائزر Coloniser) اور استبداد زدہ (کلونائزڈ Colonised) کے مابین غیر معمولی درجے کے باہمی میل جول سے مخصوص تھیں۔ اس میں محض کاروباری بندھن اور سیاسی و معاشی تعلقات ہی شامل نہ تھے، بلکہ اس میں دوستانے، معاشقے، اور اکثر و بیشتر شادیاں بھی شامل تھیں۔ ڈیلریمپل لکھتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے دوران، 'مغرب والوں میں ہندوستان کی روایات اور حتیٰ کہ مذہب اختیار کرنا اتنا ہی عام تھا جتنا کہ اس کے برعکس۔ اسٹیریو ٹائپ کے برخلاف، کمپنی ملازمین کی ایک حیران کن تعداد نے بتدریج اپنی برطانویت کو غیر ضروری جلد کی طرح اتار کر اور ہندوستانی لباس اپنا کر اور مغل حکمران طبقہ جس کی وہ جگہ لینے آئے تھے، کے اطوار اختیار کر کے، ہندوستان کا اثر قبول کیا'۔ سلمان رشدی اِسے 'چٹنی بنانے کا عمل' (چٹنی فیکیشن) قرار دے چکا ہے؛ ڈیلرمپل اس طرز پر عمل کرنے والوں کو 'گورے مغل' کا خطاب دیتا ہے۔

ڈیلرمپل کہتا ہے، '1780 اور 1785 کے دوران کمپنی عہدیداران کی وصیتیں یہ بتاتی ہیں کہ تین میں سے ایک اپنا سب کچھ ہندوستانی بیویوں کے لیئے چھوڑ کر جا رہا تھا، اکثر اوقات محبت کے دلگداز پیمان کے ساتھ، اپنے قریبی دوستوں کو اپنے "بہت محبوب" ہندوستانی شریکِ حیات کی دیکھ بھال کی درخواست کرتے ہوئے، یا جیسا کہ ایک نے لکھا ہے، "میرے دو بچوں کی نفیس اور قابل تعظیم ماں جس کے لیے میں بے پایاں عشق، محبت اور احترام محسوس کرتا ہوں۔" جس آسانی سے دو نسلوں اور مذاہب کا میلاپ ہوا اُس کے لیے اس دور کے فیملی پورٹریٹ، قابل ذکر ہیں، پگڑی اور کرتا پاجامہ میں ملبوس برطانوی مردوں کے ہمراہ یورپی انداز میں یورپی فرنیچر پر براجمان ان کی ہندوستانی بیویاں۔ بوسٹن کا پیدائشی، ایک عہدیدار، سر ڈیوڈ آکٹرلونی، جو ہر شام اپنی تمام تیرہ بیویوں کو ہمراہ لے کر دہلی کے گرد و نواح میں نکلتا تھا، ہر ایک اس کے اپنے ہاتھی کی پشت پر ہوتی، وہ وہاں تک جاتے جہاں وہ اپنے اور اپنی بڑی بیگم کے لیے گلستانی مقبرہ تعمیر کروا رہا تھا، جہاں مرکزی گنبد کے اوپر ایک صلیب لگی ہوئی تھی اور اطراف میں میناروں کا جنگل تھا۔ آکٹرلونی کی ایک یادداشت اس دور کے کثیر المذاہب لہجے کا ایک حیران کن منظر پیش کرتی ہے۔ اس نے کلکتہ رپورٹ کیا کہ "لیڈی آکٹرلونی نے مکہ میں ادائیگی حج کی اجازت کے لیے درخواست گزاری ہے"۔'

برطانوی دور حکومت کے نصف آخر کے برخلاف، غیر متنازع برطانوی سیاسی اور فوجی غلبے کا دعویٰ اور 'ماہی گیر بحری بیڑے' کی آمد کے ساتھ ساتھ خوف اور غصہ جو 1857 کے انقلاب (یا بغاوت) کے بعد کئی گنا بڑھ گیا، حیران کن ہے۔ سر جان میلکم بعد میں بمبئی کے گورنر نے 1832 میں لکھا، 'ہماری مشرقی سلطنت.....

تلوار سے حاصل ہوئی اور اسی کے ذریعے قائم بھی رکھیں گے'۔ نہ صرف یہ کہ محکوم کی منشاء کے مطابق اس پر حکمرانی کا کوئی دکھاوا نہیں تھا (میلکم نے مزید کہا کہ 'ایک مجہول وفاداری :تو [تمام] ہندوستانی اپنے غیر ملکی آقاؤں کے ساتھ ہمیشہ کرتے رہے ہیں'۔) بلکہ اپنے بھیتر میں یہ مکمل طور پر نسلی تفریق تھی، نسلی امتیاز پر کامل یقین، 'اور نسلی اور مذہبی قیود سے باہر تھوڑی بہت دوستیوں اور شادیوں پر کڑی نگرانی'۔

یہ سب 1942 میں، ملایا، سنگاپور اور برما سے برطانیہ کی تباہ کن پسپائی کے دوران دوبارہ ظاہر ہونا شروع ہو گیا۔ جیسا کہ مہاتما گاندھی نے اپنے اخباری کالم میں اگست 1942 میں لکھا: اگر ہزاروں نہیں تو بھی سینکڑوں، برما سے واپسی کے راستے میں خوراک اور پانی کی کمی کی وجہ سے زندگی کی بازی ہار گئے، یہاں تک کہ ان مصیبت زدہ لوگوں کے چہروں پر بدبخت امتیازی سلوک ثبت ہو چکا تھا۔ ایک راستہ گوروں کے لیے، دوسرا کالوں کے لیے! خوراک اور پناہ گاہ کی فراہمی گوروں کے لیے، کالوں کے لیے کچھ بھی نہیں! جاپانیوں کی آمد سے کافی پہلے ہی ہندوستان کو خاک میں ملایا اور ذلیل کیا جا چکا تھا'۔ حتیٰ کہ اس مہینے شکست میں نسلی امتیاز کی تلخی نے بھی، گاندھی جی کے، ہندوستان سے برطانیہ کی روانگی کے مطالبے پر، 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک شروع کرنے کے فیصلے میں کوئی خاص کردار ادا نہ کیا۔

سامراجی ادب کے زیادہ تر حصے نے برطانوی سلطنت کی تصویر کشی ایک 'خاندان' کی طرح اور ملکہ کی بطور شفیق ماں کی شبیہہ کے کی، جو اپنے دور دراز بچوں پر حسِ مزاح سے عاری سربراہ عورت جیسی سرپرستی کر رہی ہے، ہندوستانیوں کو سادہ بچوں کی طرح سخت نظم و نسق کی ضرورت ہے، اور سلطنت کی فضاء بذاتِ خود ایک طرح کا پر تکلف وکٹورین ڈرائینگ روم ہے، جس میں غیر مذہبی سرکش جھنڈ کو مہذب اطوار سکھائے جا سکتے ہیں۔ ایسا ہی استعارہ ای ایم فوسٹر کے 'ہندوستان کا بحری سفر' میں رونی اور مسز موور کے جھگڑے میں نمودار ہوتا ہے، جب رونی کہتا ہے کہ 'ہندوستان کوئی ڈرائنگ روم نہیں' جبکہ اس کی ماں برطانوی سلطنت کو 'ایک مختلف ادارے' میں ڈھالنے کے لیے شائستگی اور مہربانی کے گھریلو اوصاف کو معاون کے طور پر دیکھتی ہے۔

اقدار کو الٹ پلٹ دینا سامراجی پراجیکٹ کے لیے کتنا ضروری تھا، یہ ردیارڈ کپلنگ کی 'نابوتھ' جیسی ایک کہانی سے آشکار ہوتا ہے، ایک ہندوستانی ہاکر یا پھیری والے کی کہانی جو ایک نو آبادیاتی انگریز کی فراخدلی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کی زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ ہتھیالیتا ہے اور وہاں اپنے لیے ایک جھونپڑی بناتا ہے۔ یقیناً آخر میں، انگریز ہندوستانی کو نکال باہر کرتا ہے (کہاں سے، جو بہر حال ہندوستانی سرزمین تھی!) اور

کہانی احسان فراموش ہندوستانی پر اکیلے راوی کے جشن فتح پہ اختتام پذیر ہوتی ہے: 'نابو تھ اب جا چکا ہے، نمک کی بجائے مٹھائیوں کے ساتھ، اس کی آبائی مٹی میں ہی اس کی جھونپڑی پر حل چلا دیا گیا، ایک علامت کے طور پر کہ یہ جگہ منحوس ہے۔ میں گلستان کے انجام کو نظر انداز کرنے کے لیے ایک گرمائی رہائش گاہ تعمیر کر چکا ہوں، اور یہ میری سرحد پر ایک قلعہ کے جیسی ہے جہاں میں اپنی سلطنت کی حفاظت کرتا ہوں'۔

حالانکہ اس نے برطانیہ کے خطاب یافتہ شاعر (پوئیٹ لاریئٹ) بننے کی متعدد گزارشات ٹھکرا دیں، (اس کے باوجود) ردیارڈ کپلنگ (1865 تا 1936) اپنی بالغ زندگی کے بیشتر حصے میں سلطنت کا غیر سرکاری خطاب یافتہ شاعر رہا۔ منتخب شدہ سامراجی مصنف کے طور پر اس کی جڑیں گہری تھیں: کپلنگ، لاہور اور لکھنو کے اخبارات میں سات سال تک نو آموز رپورٹر تھا، اٹھارہ سال کا تھا جب لارڈ رپن نے ہندوستانی ججوں کو یورپیوں کے مقدمات سننے کی اجازت دینے کی ناکام کوشش کی، اور اس تنازع (جس میں یقیناً، اس کی ہمدردیاں اپنے نسل پرست ساتھی نو آباد کاروں کے ساتھ تھیں) نے 'بغیر ضابطہ قانون کے کمتر نسل' پر 'سلطنت' کے مفاد کے اس کے رویے کی تشکیل کی۔ کپلنگ نے ہندوستانیوں کے خود پر حکومت کرنے کی نااہلیت ثابت کرنے کے مقصد سے مضامین لکھے، کپلنگ کو نمائندہ تصور کر کے بعد کے سامراجی پیامبر کڑک دار لہجے میں گوروں کی نوازشات و فرائض بارے جوشیلی تقریریں کرتے رہے۔ ان دونوں نمائندہ مثالوں میں، سامراجیوں کے سرپرست اعلیٰ کپلنگ نے، ایک ہمدرد سرگزشت نویس کے اعتراف میں، ہندوستانیوں کے متعلق، 'بعض اوقات ایک نرالی فہم کے ساتھ، بعض اوقات بد مزاج سٹیریو ٹائپ حقارت کے ساتھ' لکھا۔ کپلنگ کے کام میں اہمیت، ہندوستانیوں کی نہیں، نہ ہی ہندوستان کی ان طبعی اور سماجی جزئیات کی ہے جنھیں وہ ارادتاً اپنے بیانیوں میں بیان کرتا ہے، بلکہ اس وسعت اور جوش کی ہے جو اس کی بصیرت کو جلا بخشتا اور بذات خود سلطنت کی ترجمانی کرتا ہے۔ سکالرز کپلنگ کی تحریروں کو 'استعماریت کے ایک متعین اظہار' کے طور پر دیکھتے ہیں، جس سے 'ثقافتی غلبے (کلچرل ہیجمونی) اور ثقافتی اختلال ذہنی (کلچرل شیزوفرینیا) دونوں کا مستقل نقش بنتا ہے، جو انگریزوں کے بطور ادھورے خدا اور بطور انسانی ناکامی، بطور استعمار پسند اور بطور نیم مقامی کے درمیان تقسیم پیدا کرتا ہے'۔

برطانوی خود کو تہذیب پیدا کرنے والی قوت سمجھتے تھے، شاعر سر لیوس مورس کے شعر میں، جو ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی کی تقریب کے موقع پر کہا گیا، 'جزیراتی قلعہ کے جواں مرد / ناراض طوفان کے

سمندر'۔ میکالے اپنے تمام تر گناہوں کے باوجود، سامراجی مشن کے تضادات کے لیے زیادہ متحرک تھا: اس نے لکھا 'عوام کے لیے باپ اور ستمگر بنو، منصف اور غیر منصف، معتدل اور غارتگر بنو'۔ ہندوستان میں ہر انگریز کو سلطنت کے اس گمراہ کن تصور کو پروان چڑھانے کے عظیم خیالات رکھنے کا ملزم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بہت سے، جیسا کہ فوسٹر کے 'انڈیا کا بحری سفر میں' معلم سیرل فیلڈنگ، اپنے ہندوستان میں رہنے کی وجہ محض یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں نوکری کی ضرورت تھی __ وہ ذاتی طور پر نہیں سمجھتے کہ معمولی انسان اعلیٰ مقصد کی بجا آوری پر متعین ہیں، ایک مقصد جس کا پرچار انھوں نے بائیبل، سنگینوں اور برانڈی کی شکل میں ہوتے ہوئے دیکھا۔

یقیناً، برطانوی اشرافیہ خود کو ہندوستانیوں کے کسی بھی شجرہ نسب کے ممکنہ امتیازات سے فائق تصور کرتی تھی۔ لندن کے ہیرلڈ کالج نے ایک دفعہ نوٹ کیا کہ 'آغا خان کو اس کے پیروکار براہ راست خدا کی آل میں سے سمجھتے ہیں۔ انگریز ڈیوک اس میں بھی سبقت لے گئے'۔

ردیارڈ کپلنگ انیسویں صدی کے اواخر کے قضیے کی علامت تھا: سامراجی اپنے مشن کو محض علاقے فتح کرنے اور ان پر حکومت کرنے کے حوالے سے نہیں دیکھتے تھے، بلکہ کمزور ہوتے ہوئے دارالحکومت کی ریڑھ کی ہڈی کو مضبوط کرنے کے اہم کام کے طور پر دیکھتے تھے۔ سرکش سرحدیں سخت جان انگریزوں کے لیے ہمت آزمانے، سخت جانی کا مظاہرہ کرنے، جواں مردی کی صفت کا جشن منانے، بھائی بندوں کی ٹولی کے ساتھ نمک حلالی کرنے، اور ملکہ اور ملک کے ساتھ وفاداری نبھانے، کی جگہیں تھیں۔ کم، انگریز سرغنہ، سب سے شاندار زمزمہ توپ سے آغاز کرتا ہے، جو کہ پنجاب پر قبضے اور اختیار کی علامت تھی، جو اس کے سامنے ہندوؤں اور مسلمانوں سے چھین لی گئی۔ 'جس کے قبضے میں "آگ اگلنے والا اژدھا" زمزمہ ہے، اسی کے قبضے میں پنجاب ہے، کیونکہ یہ عظیم الشان سبزی مائل کانسی کا ٹکڑا ہمیشہ فاتح کی لوٹ مار میں اولین (ترجیح) رہا ہے۔ کم کے لیے اس میں کچھ جواز موجود تھا.... چونکہ انگریزوں کا پنجاب پر قبضہ تھا اور کم انگریز تھا'۔

اس طرزِ استدلال کے مطابق، سامراجی انٹرپرائز کو ہمت والے افراد کی ضرورت تھی جو تشدد کرنے کے قابل ہوں، لڑائی کے لیے تیار اور ناپاک لشکروں کے خلاف غلبہ پانے کے لیے ہر وقت چاک و چوبند، کپلنگ اور 'مردانگی کے حامی' دوسرے سامراجی لکھاری، انھی اوصاف کی اپنی تحریروں میں تجدید کرتے ہیں (جیسا کہ سٹاکی اینڈ کو، جس میں برطانوی سکولوں کے طلباء سفاک کرداروں کے ذریعے جشن فتح مناتے ہیں)۔ یہ ادبی تجدید زیادہ مضحکہ خیز ہے، کیونکہ یہ ان اوصاف کا جشن مناتی ہے، جنھیں مہذب بنانے کے مشن کی جستجو میں فخر

سے اختیار کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں، سلطنت کے ہیرو وہ افراد تھے جو مفروضہ بربریت پسندوں کی سرکوبی کے لیے بربریت کا استعمال کرتے تھے۔

جیسا کہ لیفٹیننٹ ہربرٹ ایڈورڈز نے 1846 میں ہندوستان میں اپنے مشن کے متعلق لکھا: 'پنجاب جیسی قوم کی ایال پر تہذیب کا ہاتھ رکھنے میں ایک طرح کی نجابت ہے.... اور حیوانی جذبات کی تحقیر ہے'۔ یہ حیران کن ہے کہ پنجاب اس استعارے میں ایک جنگلی درندے کی طرح ہے جس کی 'ایال پر مہذب بنانے والے برطانویوں کے ہاتھ کی پکڑ مضبوط ہونی چاہیے۔ لارڈ کرزن نے 1907 میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں سامعین کو بتایا کہ یہ سلطنت کے غیر تہذیب یافتہ مضافات تھے جن سے ہمارے نوجوانوں کو امارت و تقویت حاصل کرنے کی ترغیب ملی، جس نے انھیں زنگ آلود تن آسانی اور مغربی تہذیب کے فاسد ولولے، دونوں سے ایک ہی طرح محفوظ رکھا'۔ انھی تصورات سے ترغیب پاکر، انیسویں صدی کے نصف آخر کے دوران سامراجیوں نے تعلیم یافتہ خاکیوں (ناتواں، تہذیبی طور پر دوغلے مغرب زدہ مشرقی شرفاء، جن کا بعد میں میکالے کے پتر کہہ کر تمسخر اڑایا گیا) کی نسبت وحشی امراء (غیر متمدن، جنگلی، جنگجو لیکن 'جواں مرد' قبائلی اور اس کی نسل) کو انتہائی فوقیت دی اور اس کا اظہار کیا۔ کپلنگ کے نسلی گھناؤنے (کردار)، کم میں، مؤخرالذکر کو ہری چندر مکرجی 'بابو' کے کردار میں علامتی طور پر ظاہر کیا گیا ہے، برطانوی عہدیداران کی ملازمت میں علم الاقوام کا ماہر (ایتھنوگرافر) جو اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور برٹش رائل سوسائٹی میں منتخب ہونے کی مایوس امیدوں کے ساتھ ہے، اس کا ایسی خواہش رکھنے پر جو کہ وہ بن ہی نہیں سکتا، تمسخر اڑایا جاتا ہے ___ نوآبادکاروں کے طبقے کارکن ہونے کی بجائے محض ان کی رعایا کا ایک فرد۔

حتیٰ کہ انگریز ناول نگار، ای ایم فوسٹر، جس کے، ہندوستان کے بحری سفر، جو کہ سلطنت کے تصور کی ہی بازگشت تھا، کو اس کے دور میں ہندوستانی نیشنلسٹوں کی طرف سے غیر ناقدانہ پذیرائی ملی (انڈیا لیگ کے سربراہ، کرشنا مینن نے تو ایلن لین کے ذریعے اس کی اشاعت کا بندوبست بھی کیا) خاص طور پر اس کے ناول کی آخری لائنیں جن میں وہ ایک انگریز اور ہندوستانی کے مابین دوستی کے عدم امکان کی تصویر کشی کرتا ہے:

> 'ہم اب دوست کیوں نہیں بن سکتے؟' دوسرے نے اسے محبت سے پکڑتے ہوئے کہا۔ 'یہی ہے جو میں چاہتا ہوں۔ یہی ہے جو تم چاہتے ہو۔' لیکن گھوڑے یہ نہیں چاہتے ___ وہ دونوں جدا ہو گئے: زمین کو اس کی چاہت نہیں، جو پتھر ایسے چنتی ہے کہ جس میں سے سوار ایک قطار میں گزر

سکیں؛ مندر، ٹینک، جیل، جگہ، پرندے، مردار، مہمان خانہ، جو نظارہ بنتے گئے، جیسے ہی خلاسے بر آمد ہوئے اور نیچے ماؤ کو دیکھا: وہ ایسا نہیں چاہتے، انھوں نے اپنی سینکڑوں آوازوں میں کہا، نہیں، ابھی نہیں' اور آسمان نے کہا نہیں، وہاں نہیں'۔

یقیناً، فوسٹر کا ہندوستانی حلیف، ایک روایتی مسلمان درمیانے طبقے کا ڈاکٹر، انگریز فیلڈنگ کا سماجی و ذہنی طور پر ہم پلہ نہ تھا، اور شاید ان کے درمیان حقیقی دوستی غیر سامراجی ہندوستان میں بھی ممکن نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن فوسٹر، جس کی کتاب میں ہندوستانی نیشنلسٹ تحریک کو نظر انداز کیا گیا ہے، اور جو اپنے واحد مرکزی ہندوستانی کردار کا خاکہ اڑاتا ہے، بظاہر اس جیسے ہندوستانی کرداروں کا تصور کرنے سے قاصر ہے (جیسے سریندر ناتھ بینر جی) جس نے آئی سی ایس میں داخلے کا راستہ بنایا یا پھر (جواہر لال نہرو جیسا) جس کی سلطنت پر تنقید، برطانوی راج کی بنیادوں کو چیلنج کر رہی تھی۔ یہ ٹھٹھہ اڑانے والی محدود بصیرت تھی، جو پراسراریت اور پراگندہ خیالی سے ماورا نہیں ہو سکتی تھی، کہ جس سے یہ نیک نیت انگریز ہندوستان کو جیسا کہ وہ ہے ویسے دیکھ پاتا۔ فوسٹر کے ھاورڈز کا خاتمہ کا یادگار اقتباس کہتا ہے 'صرف تعلق پیدا کرنا': ہندوستانی قاری کے طور پر، کوئی یہی خواہش کر سکتا ہے کہ اس نے اور برطانویوں نے ہندوستان میں (کاش) یہ کیا ہوتا۔

برطانوی حکمرانی، سوادیشی تحریک اور مہاتما گاندھی کی آمد

جیسا کہ میں نے باب اول میں بیان کیا ہے، برطانیہ کا مقصد شاید مکمل طور پر خود غرضانہ ہو، لیکن اس کا مثبت پہلو تھا، کہ اس کی استعماریت، ماضی میں طوائف الملوکی لگنے والے (حالات) کے درمیان امن وامان لے آئی، جنگجو گروہوں اور ریاستوں کے مابین دائمی تنازعات کو حل کیا، اور نسبتاً ایک کم متشدد سیاسی مقابلے کی شکل کو روا رکھا جو شاید ہی بصورت دیگر ہندوستان میں وقوع پذیر ہوتا۔ رابرٹ کیلان تجویز پیش کرتا ہے، 'استعماریت اقتدار اعلیٰ کے بندھنوں سے آزاد اور مقبول شکل پیش کرتی ہے، جس کا تصرف طوائف الملوکی اور مکمل ریاستی کنٹرول کے مابین ہوتا ہے'۔ یقیناً 'مقبول' ایک قابل بحث اصطلاح ہے، لیکن رضامندی بھی قبولیت کی ایک شکل ہے، اور بہت سے ہندوستانیوں نے آخر کار، برطانوی اقتدار اعلیٰ محض اس وجہ سے تسلیم کر لیا تھا کیونکہ ان کے پاس اور کوئی متبادل نہیں تھا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1858، نے گورنر جنرل کے عہدے (جلد ہی بطور وائسرائے دوبارہ صورت

گری کر دی گئی) کی کایا کلپ کر دی، جو کہ صوبائی گورنروں کے ساتھ، ہندوستان کی حکمرانی کے لیے براہ راست ذمہ دار ہو گا۔ گورنر جنرل یا وائسرائے کی کونسلز بنائی گئیں، جن کے ممبران نامزد کیے جاتے تھے۔ 1861 میں، نئی قانون سازی نے گورنر جنرل اور صوبائی گورنروں کی قانون ساز کونسلز میں ہندوستانیوں کو بذریعہ نامزدگی شامل کرنے کی اجازت دی۔ 1885 میں ایلن ہیوم اور ولیم ویڈربرن کے ساتھ ساتھ نامور انگریزی بولنے والے متعدد ہندوستانیوں کی جانب سے انڈین نیشنل کانگریس قائم کرنے کے فوری بعد، ہندوستانیوں کو 1892 کے انڈین کونسلز ایکٹ (جس نے 1861 کے ایکٹ میں ترمیم کی) اور اس کے بعد 1909 میں منٹو مارلے اصلاحات تک، دونوں کا انتظار کرنا پڑا، تاکہ مرکز اور صوبوں دونوں کی کونسلز میں ہندوستانیوں کی بڑھتی ہوئی شمولیت سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

تاہم، 1892 اور 1909 کے قوانین بہترین حالات میں مروجہ نظام میں زیبائشی ترامیم تھیں اور معمولی حد تک ہی متاثر کرتی تھیں کہ ان ہندوستانی کونسلز کو کیسے بنایا اور چلایا جائے۔ انھوں نے بالواسطہ الیکشن کے ذریعے کونسل ممبر شپ میں اضافہ کیا (دوسرے الفاظ میں، برطانویوں کی جانب سے انتخاب) لیکن حقیقت میں، ان کونسلز کے پاس ایسا کوئی اختیار نہ تھا، جس کا ذکر کیا جا سکے۔ ان کے پاس کونسلز میں معاملات اٹھانے کا حق تو تھا لیکن فیصلہ کرنے کا نہیں؛ وہ ہندوستانی عوام کی آواز تو بن سکتے تھے (یا کم از کم طبقہ اعلیٰ کے، انگریزی تعلیم یافتہ حصے کی) لیکن ان کے پاس کوئی قانون یا بجٹ پاس کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ اختیارات ابھی تک گورنر جنرل کے پاس تھے، جو کونسل کی پاس کردہ کسی بھی قرارداد (ریزولیوشن) کو مسترد کر سکتا تھا یا کونسل کو مزید جائزہ لینے کی ضرورت کا حکم دے سکتا تھا اور اگر وہ ہندوستان کے لیے ضروری خیال کرتا تو کوئی قرارداد بھی پاس کر سکتا تھا۔

ہندوستان کے سیکرٹری آف سٹیٹ جان مارلے، جس نے 1909 کی اصلاحات کو اپنا نام دیا تھا، نے تو ہندوستانی کونسلز میں ہندوستانیوں کی بڑھتی ہوئی ممبر شپ کی مخالفت بھی کی اور دلیل پیش کی کہ اس کے نقطہ نظر کے مطابق ہندوستان میں برطانوی حکومت، ہندوستانی عوام کی اتنی رضامندی اور نمائندگی کے ساتھ ہی چل رہی ہے جتنی کہ اسے ضرورت ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ '[اگر] اصلاحات کا یہ باب براہ راست یا ناگزیر طور پر ہندوستان میں ایک پارلیمانی نظام کے قیام کی طرف لے گیا، تو میرے پاس اس کے لیے کرنے کو کچھ خاص نہیں ہو گا'۔ ان اصلاح کاروں کے ذہنوں سے ایسی سوچ بعید از قیاس نہ تھی؛ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935

تک، ہر 'اصلاح' جو حکومت برطانیہ نے ہندوستانی طرز حکمرانی میں متعارف کروائی، نے گورنر جنرل اور برطانوی پارلیمنٹ کے مطلق اختیارات کو تحفظ فراہم کیا۔ مرکز اور صوبوں میں ہندوستانی کونسلز ہمیشہ ایسے ادارے رہے جن کے پاس اہم معاملات اور بجٹ پر کوئی حقیقی اختیارات نہیں تھے، دفاع اور امن وامان پوری طرح برطانوی ہاتھوں میں رہے۔ مقصد نمائندہ طرز حکمرانی میں بتدریج اضافہ تھا، نہ کہ مکمل جمہوریت کا قیام۔

سی. اے. بیلے اپنی کتاب آزادیوں کی بحالی میں، اس دلیل کے لیے ایک متاثر کن کیس تیار کرتا ہے کہ برطانیہ نے، سکول و کالج، اخبارات اور نوآبادیاتی قانون کی عدالتوں کے ادارے قائم کر کے، ہندوستان میں پنپنے کے لیے لبرل ازم کی مدد کی، اور اس طرح ہندوستانیوں کی ایک پوری نسل کے اپنے مستقبل کے بارے سوچنے کے انداز کو یوں بدل دیا کہ وہ (انھیں) آج کی ہندوستانی جمہوریت تک لے آیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس لبرل ازم کو انتہائی محدود دائرے کے اندر ہی عمل میں لایا گیا۔ انڈین نیشنل کانگریس 1885 میں، معتدل دستور پسند ہندوستانی رائے عامہ کے طور پر، اسکاٹش، ایلن اوکٹیوین ہیوم اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اسٹیبلشمنٹ نواز ہندوستانیوں نے قائم کی۔ ایک حقیقی روشن خیال حکومت کے طور پر اس پیش رفت کا خیر مقدم کرنے کی بجائے جیسا کہ اسے کرنا چاہیے تھا کہ آہستہ آہستہ اسے جمہوری بنانے کی کوشش کرتی، انگریزوں نے اس پر مختلف درجے کی نفرت وحقارت کے رد عمل کا اظہار کیا۔ انگریز صحافی ہنری نیونسن نے 1908 میں لکھا:

> بائیس سال تک، 'یہ (کانگریس) امن اور دستوری شائستگی کا نمونہ تھی۔ اس نے نہایت اعلیٰ قراردادیں پاس کیں، اس نے تسلیم شدہ تکالیف کے ازالے کا مطالبہ کیا، اس نے بااعتماد وفاداری کے ساتھ تاج برطانیہ کے نمائندگان کے لیے وفود کا انتظام کیا۔ اینگلو انڈین (ہندوستان میں برطانوی)☆ کے ساتھ ان کی دستوری شائستگی کو بزدلی کہا گیا، اس کی قراردادیں توجہ سے محروم رہیں۔ اس کی تکالیف بنا دادرسی کے ہی رہیں اور تاج برطانیہ کے نمائندگان نے ان کے وفود کا استقبال کرنے سے انکار کر دیا.... [ہندوستانیوں کو احساس ہوا] کہ سرکاری ردی کی ٹوکری کو خطاب کرنے والی یہ تکریمی قراردادیں بے کار ہیں۔'

☆ انگریز، 'اینگلو انڈین' کی اصطلاح ہندوستان میں رہنے اور کام کرنے والے برطانویوں کے لیے اور 'یوریشین' کا استعمال ان مخلوط نسل والوں کے لیے کرتے، جو عموماً کم مرتبہ اور 'دوسری حیثیت' بچے تھے، جو ماہی گیر بیڑے سے عورتوں کو دام میں پھانسنے کی حیثیت نہیں رکھتے تھے اور آخر کار ہندوستانی عورتوں کے ساتھ رہتے اور بعض صورتوں میں شادی کر لیتے۔ اب ان یوریشین کی اولاد 'اینگلو انڈین' کہلاتی ہے، یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو نوآبادیاتی دستاویزات کے قارئین کے لیے پریشانی کا باعث بنتی ہے، جب بھی یہ اصطلاح صرف ہندوستان میں انگریزوں سے منسوب کی جاتی ہے۔

کسی بھی اور چیز سے زیادہ، یہی وہ رویہ تھا، جس نے ہندوستانی نیشنلسٹ تحریک کو زیادہ جارحانہ بنانے کے لیے اس کی قلب ماہیت کی۔ برطانوی جو ایسی سیاسی سرگرمیوں کو دبانے کی کوشش کرتے جن میں محض تقریر کی آزادی کو روبہ عمل میں لانا شامل ہوتا، سے ان کی ریاکاری کا اظہار ہوتا ہے، یا اس سے لبرلزم کے کسی بھی دعویٰ کی قلعی کھل جاتی۔ مثال کے طور پر، نیونسن، جس نے صدی کے اختتام پر مدراس کے ساحل پر ایک ہندوستانی سیاسی میٹنگ میں شرکت کی، نے اپنے خیالات یوں قلمبند کیے ہیں:

> چیئرمین.... نے، لڑکوں اور طالبعلموں کو سیاسی وجوہات اور باغیانہ مجالس کے قانون کے تحت، شکوک، جبر، جلاوطنی، قید، اور کوڑے مارنے کی پچھلے سال کی تاریخ کا خلاصہ پیش کیا۔ یہ سب بغیر کسی جذبے یا مبالغے کے کیا گیا، اور اس کا اختتام ایک سادہ قرارداد پر ہوا جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ جلاوطنی کے قانون کو منسوخ کیا جائے کیونکہ یہ ان حقوق کے خلاف ہے جو انگلینڈ نے حبس بے جا کے تحت اپنے لیے حاصل کیے ہیں۔ چار مقررین نے قرارداد کی حمایت کی اور سب نے ایک سی پرسکون معقولیت کے ساتھ بات چیت کی، مشرقی ذہن کے ہمارے تصور سے بالکل مختلف.... صرف اینگلو انڈینز [جیسا کہ ہندوستان میں انگریز] ہی تقاریر کو باغیانہ قرار دے سکتے تھے۔ ایک عمومی سطح کے اینگلو انڈین ذہن کے لیے، حکومت پر کسی قسم کی تنقید، مزید آزادی کا کسی بھی قسم کا مطالبہ، بغاوت تھا۔ لیکن چونکہ یہ واضح طور پر انتہاء پسندوں کی میٹنگ تھی، تقریروں میں مطالبہ محض انسانی حقوق کا تھا، جو کہ دوسرے لوگ اپنے معاملات میں اظہار رائے کا حق اور اپنی دولت کے خرچ کرنے کے حق کی شکل میں استعمال کر رہے تھے۔

چونکہ ایسے نقطہ ہائے نظر کام نہیں کر رہے تھے، لہٰذا برطانویوں پر متاثر کن اثرات مرتب کرنے کے لیے قومی تحریک نے جلد ہی ایک مختلف حکمت عملی اختیار کرنا شروع کر دی، جو کہ کرزن کی 1905 کی تقسیم بنگال کے خلاف عوامی سیاسی مزاحمت تھی۔ بپھرے ہوئے بنگالی نوجوانوں نے لوگوں کو ان کی مادر وطن کی نوآبادیاتی تقسیم کی مخالفت کا احساس دلانے کے لیے شہروں اور دیہاتوں میں، سوادیشی تلقین (ہندوستانی اشیاء پر انحصار) اور برطانوی اشیاء کے بائیکاٹ کی ترغیب کی مہم چلائی، دکانیں جن پر ودیشی اشیاء کی فروخت جاری تھی، کو نوجوان گھیرے ہوئے ہوتے، جو متوقع خریداروں کے سامنے عاجزی سے خود کو گرا کر، گاہکوں سے التجا کرتے کہ خوف سے نہیں بلکہ اپنے ملک کی خاطر بغیر خریداری کیے چلے جائیں۔ اس طرح کا احتجاج متشدد نہیں تھا، لیکن یہ ویسا

بھی نہیں تھا جس کے برطانوی عادی تھے۔ چنانچہ بنگال میں برطانوی تاجروں نے اپنی بکری میں ڈرامائی مندے اور مستقل منافع کے خلافِ معمول نقصان میں بدلنے کی شکایت کی، مزاحمت کامیاب رہی؛ برطانویوں نے تقسیم منسوخ کر دی۔

یہ عوامی سیاست کی کامیاب مختصر سرگرمی کی مکمل آگہی تھی، کہ پتلا دبلا، چشمے والا، ادنیٰ سے گھر کے بنے کپڑے پہنے، ایک وکیل، موہن داس کرم چند گاندھی جنوبی افریقہ میں ایک لمبے قیام کے بعد 1915 میں ہندوستان لوٹا۔ یہاں ان کی 'سچائی کی آزمائش' اور ہندوستانی جمعیت کی اخلاقی طور پر برانگیختہ ان کی قیادت نے انھیں مہاتما (عظیم روح) کے لقب سے نوازا۔ ایک ہندوستانی نے جنوبی افریقہ میں ایک عام سے کیس میں وکالت کے لیے خدمات حاصل کیں، خاص خداداد وکیل نہ ہو کر بھی آغاز کیا، اور گاندھی جی ایک متاثر کن شخصیت میں ڈھل گئے۔ نسلی امتیاز، جس کے شکار جنوبی افریقہ میں ان کے ہم وطن تھے، سے دہشت زدہ ہو کر، گاندھی جی قانونی اور سیاسی کارروائیوں کے ایک سلسلے پر رضا مند ہو گئے، جو کہ برطانویوں اور بوئرز (جنوبی افریقہ میں ولندیزی کسان) کی ہندوستانیوں پر مسلط کردہ ناانصافیوں کے خلاف احتجاج اور ان کے خاتمے کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا۔ صاحبانِ اقتدار کے سامنے حصولِ انصاف کے لیے دعویٰ دائر کرنے کی کوششوں کے بعد (اور ہندوستانیوں کا رضاکارانہ ایمبولینس بریگیڈ منظم کر کے ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا) جب یہ غیر موثر ثابت ہوا، تو گاندھی جی نے سول نافرمانی کے ذریعے مزاحمت کا ایک منفرد طریقہ تخلیق کیا۔

تنظیم سازی کے لیے گاندھی جی کی قابلیت (انھوں نے نیٹل انڈین کانگریس کی بنیاد رکھی)، ان کی آزمائشِ نفس اور فلسفیانہ جستجو کے لیے انتہائی رغبت کے ہم پلہ تھی۔ بورژوائی راحتیں، جو کہ ساؤتھ افریقہ میں ہندوستانی کمیونٹی میں ان کی حیثیت کا استحقاق ہوتیں، کو قبول کرنے کی بجائے، گاندھی ڈربن سے باہر اپنے قائم کردہ اجتماعی فارم میں گوشہ نشین ہو گئے، ہنری ڈیوڈ تھوریو کا مطالعہ کیا، جان رسکن اور لیو ٹالسٹائی جیسے لوگوں کے ساتھ، اس دور میں، ذاتی زندگی اور عوامی معاملات دونوں میں 'سچائی' کی تفہیم تک پہنچنے کے لیے، خط کتابت کی۔ درخواست گزاری کی سیاست سے ستیہ گرہ تک کا سفر نہ تو مختصر تھا اور نہ ہی آسان، لیکن یہ کر کے اور پھر اپنے آبائی وطن لوٹ کر، مہاتما نے ہندوستان کی ابتدائی قومی تحریک کو درویشانہ اور حکمت عملی دونوں اعتبار سے غیر معمولی شہرت بخشی۔

مہاتما کی غیر معمولی بصیرت تھی، کہ ڈرائینگ روم کی سیاست کرنے والی خود پرست اور غیر منتخب اشرافیہ

کی پاس کردہ قراردادوں سے خود مختاری حاصل نہیں کی جاسکتی۔ ان کے مطابق، خود مختاری کے حصول کے لیے، خون پسینہ ایک کرنے والے کثیر عوام، جن کے نام پر بالائی طبقہ داخلی خود مختاری کا ہنگامہ برپا کرتا ہے، کو شامل کرنا پڑے گا۔ یہ صورتحال ہندوستان کے سیاسی طبقے کے لیے زیادہ اچھی نہیں تھی، جو کہ ان دنوں زیادہ تر اشرافیہ اور وکلاء پر مشتمل تھا، جو صاحب ثروت تھے، انگریزی میں گفتگو کرتے اور انگریزوں والے حقوق کا مطالبہ کرتے تھے۔ نہ ہی گاندھی کا اصرار تھا کہ عوام کو 'شہزادوں اور حکمرانوں' (ان کا اپنا جملہ) کے طریقہ کار سے متحرک کیا جائے، بلکہ قدیم روایات سے اخذ کردہ اخلاقی اقدار کے ذریعے، اور سوادیشی اور ستیاگرہ کے ذریعے عملی شکل دی جائے۔

اپنے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے، مہاتما نے ایک آشرم میں تقریباً مکمل غربت کی سادہ سی زندگی بسر کی، اور پورے ملک میں تیسرے درجے کے ریلوے کمپارٹمنٹس میں سفر کیا، اچھوت پن، حفظانِ صحت کے ناقص انتظامات اور بچپن کی شادی کے خلاف تحریک چلائی، جنسی نفس کشی سے لے کر کھڈی پر کپڑا بننے اور بکثرت جلاب لینے کے مفید اثرات جیسے منتخب کردہ اوصاف کی تبلیغ کی۔ وہ اتنے منفرد تھے کہ شک و شبہ سے بالاتر لگتے؛ انھوں نے عوام کے درمیان جو ایک تار چھیڑی وہ بالکل واضح تھی؛ وہ ایک ایسی زبردست سیاسی قوت تھے جسے جلد واضح ہونا تھا۔

جیسا کہ بارلے بیان کرتا ہے، برطانوی راج کے اپنے دعویٰ کردہ اصولوں اور اقدار کی توقعات پوری کرنے میں ناکامی نے، گاندھی جی کی اٹھان کو قوت بخشی، جس نے برطانوی لبرلزم کے رد ہونے کی تصدیق کی نہ کہ اس کے اثبات کی۔

❖

حتیٰ کہ بیسویں صدی میں، جب برطانوی بغض اور دیوانے پن سے اس طرف بڑھ رہے تھے جسے ہندوستان کے سیکرٹری آف سٹیٹ لارڈ مونٹیگیو نے 'ذمہ دار خود حکومتی' کا نام دیا، تب بھی ہندوستان میں قابلِ اعتماد سیاسی ادارے قائم کرنے کا کوئی سنجیدہ ارادہ نہیں تھا۔ ہندوستانی فوجی دستوں کی قربانیوں سے قطع نظر، وسیع پیمانے پر یہ توقعات تھیں کہ جنگ عظیم اول میں برطانیہ کے لیے ہندوستان اور خاص طور پر مہاتما گاندھی کی حمایت کے نتیجے میں، ہندوستان کو اس لڑائی کے خاتمے پر، ڈومینین کا درجہ دے دیا جائے گا (جس کا مطلب سلطنت کے اندر خود مختار ملکی حکومت ہوگا، جیسا کہ آسٹریلیا، کینیڈا اور دوسری 'گوری کامن ویلتھ' پر اطلاق ہوتا

تھا)۔ 1917 میں، لارڈ مونٹیگیو نے برطانوی کابینہ کے سامنے ایک مجوزہ اعلامیہ رکھا جو 'ہندوستان میں آزاد اداروں کے بتدریج قیام کے ساتھ آخر کار خود حکومتی کے تصور' کی ضمانت دیتا تھا۔ سابقہ وائسرائے اور بعد میں سیکرٹری خارجہ، لارڈ کرزن، کا خیال تھا کہ (بات) بہت دور تک چلی جائے گی، اور اس نے، سر ہمفیری اپلیبیئ کے یس منسٹر میں سے سیدھا متبادل جملہ تجویز کیا __ کہ حکومت 'انتظامیہ کے تمام شعبوں میں ہندوستانیوں کی شراکت میں اضافے کے لیے اور خود مختار اداروں کے بتدریج قیام کے ساتھ ساتھ، سلطنت برطانیہ کے ناگزیر جزو کے طور پر، ہندوستان میں جوابدہ حکومت کے بتدریج حصول کے تصور' کے لیے کام کرے گی۔ کابینہ نے مونٹیگیو کے اصل الفاظ کی جگہ اس تہہ دار اور بے ایمانہ فارمولے کو منظور کر لیا اور فوراً اس ارادے سے منحرف ہو گئے جس کا اشارہ دیا تھا۔

مونٹیگیو چیمسفورڈ اصلاحات کے تحت اس اعلامیے کو پورا کرنے کے لیے جو ملکی حکومت متعارف کروائی گئی، اس کا نتیجہ ایسے نظام کی شکل میں نکلا جس میں برطانوی سامراجی طاقت کے لیے دوکان میں برائے فروخت سجے ہوئے مال کے طور پر ہندوستانی خدمات بجالائیں گے۔ نمائندے __ حلقہ رائے دہی سے منتخب ہوتے، جو اتنا محدود اور چنیدہ تھا کہ 250 ہندوستانیوں میں سے صرف ایک کو ووٹ کا حق تھا __ ایسے بے ضرر شعبوں کی نگرانی کریں گے جنھیں برطانوی قابل توجہ نہیں سمجھتے، جیسا کہ تعلیم اور صحت، جبکہ حقیقی طاقت بشمول محصولات، امن و امان اور ہندوستانی قانون سازوں کے ووٹ کو مسترد کرنے کا اختیار، صوبوں کے برطانوی گورنر کے پاس رہے گا۔ گورنر، اور مرکز میں وائسرائے، کے پاس منتخب قانون ساز کے ووٹ کو مسترد کرنے اور کوئی بھی قانون جسے منتخب نمائندے پاس کرنے سے انکاری ہوں، وضع کرنے کا اختیار موجود تھا۔ 'ہندوستان میں جوابدہ حکومت کے بتدریج حصول' کی طرف رہنمائی کرنے کی بجائے، درحقیقت یہ رجعت پسندانہ تھا، اور اسے ہندوستانی رائے عامہ اور شدید دھوکہ کھائے مہاتما نے متفقہ طور پر مسترد کر دیا۔

تحریک عدم تعاون کا المناک انجام ہوا، اور اگرچہ مہاتما نے ہندوستانی قوم پرستوں کی جانب سے دل دہلانے والے تشدد کے واقعات کے بعد اسے ختم کر دیا تھا، برطانوی استعماریت کے ساتھ مفاہمت سے گریز لاینحل ہو چکا تھا۔ 1930 تک، انڈین نیشنل کانگریس 1918 کے اعتدال پسند مقاصد سے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس نے 26 جنوری 1930 کو آزادی کا اعلامیہ جاری کیا:

ہندوستان میں برطانوی حکومت نے ہندوستانی عوام کو نہ صرف ان کی آزادی سے محروم کیا ہے

بلکہ اپنی بنیاد عوام کے استحصال پر رکھی ہے، اور ہندوستان کو معاشی، سیاسی، تہذیبی اور روحانی طور پر پامال کیا ہے..... چنانچہ..... ہندوستان کو برطانیہ سے ناطہ توڑنا ہو گا اور پورنا سوراج یا مکمل آزادی حاصل کرنا ہو گی۔

عالمی جنگ اور گہرا فریب

غداری کی اس تفہیم کے پس منظر کو سمجھنا کافی اہم ہے۔ گاندھی کے ہندوستان آنے سے آٹھ سال قبل اور جنگ سے کافی پہلے، ہنری نیونسن پہلے ہی 1908 میں، ہندوستانیوں کے برطانوی راج سے غیر مطمئن ہونے کی وجوہات تفصیلاً بیان کر چکا تھا:

ہندوستان میں بے چینی..... بنگال کی تقسیم کے ہندوستانی احساسات سے حقارت آمیز بے اعتنائی برتنے اور ہندوستانی دروغ گوئی پر لارڈ کرزن کی یونیورسٹی تقریر کا ــــــ نتیجہ تھی؛ ملکہ وکٹوریہ کے 1858 کے اعلامیہ کے برخلاف، سرکاری عہدوں سے قابل ہندوستانیوں کا اخراج؛ عدالتوں میں بے انصافی کے متعدد بدنام کیسز، جن میں انگریز مجرم ملوث تھے؛ سیاسی آراء کی وجہ سے معمولی ایذارسانی کی متعدد مثالیں؛ شخصی آزادی اور آزادی اظہار کو دبانے کے اقدامات؛ پولیس اور ڈاکخانہ عہدیداران کا جاسوسی کرنا؛ اور اینگلو انڈین میں سے گنواروں کی گستاخیاں، جیسا کہ عامیانہ کردار کا مظاہرہ اور اخبارات جو ان کے خیالات کی نمائندگی کرتے تھے۔

اس سب پر جنگی سرگرمیوں کے لیے ہندوستان کی غیر معمولی اعانت کا اضافہ اور اس کا تحقیر آمیز برطانوی ثمر۔

تھوڑے نہیں، 74187 ہندوستانی سپاہی پہلی عالمی جنگ کے دوران مارے گئے اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں زخمی ہوئے۔ ان کی کہانیاں اور ان کی جوانمردی، جنگ سے متعلقہ زیادہ تر مقبول برطانوی تاریخ سے خارج کر دی گئیں، یا پھر فٹ نوٹس میں جگہ دی گئی۔

ہندوستان کے متعدد ڈویژنز اور بریگیڈز نے یورپ، بحیرہ روم، میسوپوٹامیا، شمالی افریقہ اور مشرقی افریقہ کے جنگی محاذوں میں شرکت کی۔ افراد، جانوروں، راشن، سپلائی اور روپے پیسے میں، ہندوستان کا برطانیہ کو مہیا کیا گیا حصہ، کسی بھی دوسری قوم سے زیادہ تھا۔ تاریخی متون میں، اکثر اوقات باقاعدہ طور پر یہ نظر آتا ہے کہ حکومتِ ہند نے برطانیہ کو امداد کی پیشکش کی، اور یہ کہ شہنشاہ معظم کی حکومت نے اس پیشکش کو بڑی شفقت

سے، غیر منصفانہ طور پر بڑی رقوم کی ادائیگی کے لیے قبول کیا، بشمول یورپی جنگ کے لیے، ایچ ایم جی اخراجات کی مد میں مخصوص امداد کے 10 کروڑ پونڈ کی کل ادائیگی کے لیے۔ یقیناً، اس سے یہ حقیقت خارج از امکان ہو گئی کہ انگریزوں پر مشتمل 'حکومت ہند' برطانیہ میں شہنشاہ معظم کی حکومت کو جوابدہ ہے۔

پہلی عالمی جنگ میں ہندوستان سے سمندر پار خدمات کے لیے فوجیوں اور امدادی عملہ کی تعداد بہت زیادہ تھی: ان میں سے 588717 میسوپوٹامیا گئے، 116159 مصر، 131496 فرانس، 46936 مشرقی افریقہ، 4428 گیلی پولی، 4938 سیلونیکا، 20243 عدن اور 29457 خلیج فارس گئے۔ ان ہندوستانیوں میں سے 29762 مارے گئے، 59296 زخمی ہوئے، 3289 لاپتہ، جنھیں مردہ تسلیم کر لیا گیا، اور 3289 کو قید کیا گیا۔ کل 1215318 فوجیوں کو ملک سے باہر بھیجا گیا، 101439 مارے گئے۔

برطانیہ نے ہندوستان سے آدمی اور پیسہ اکٹھا کیا، اور اس کے ساتھ ساتھ خوراک کی بڑے پیمانے پر فراہمی، کیش اور سامان حرب، یہ ہندوستانیوں اور برائے نام خود مختار رجواڑوں، دونوں پر برطانوی ٹیکس لگا کر، جمع کیا گیا۔ مزید یہ کہ، ہندوستان نے 35 لاکھ پونڈ، برطانوی افسروں اور ہندوستان کی عام چھاؤنیوں کے افراد کی 'جنگی گریجویٹی' کے طور پر ادا کیا۔ مزید ایک کروڑ اکتیس لاکھ پونڈ ہندوستانی محاصل سے جنگی سرگرمیوں کے لیے ادا کیا گیا۔ اس وقت اندازہ تھا کہ زر نقد اور اجناس میں ہندوستانی امداد کی مالیت تقریباً 14 کروڑ باسٹھ لاکھ پونڈ تھی جو آج کے حساب سے تقریباً 50 ارب پونڈ بنتی ہے۔ (کچھ اندازے ہندوستانی امداد کی مالیت اس سے بہت زیادہ بتاتے ہیں)۔

یورپ میں، ہندوستانی فوجی خندقوں کی ہولناکی کی بھینٹ چڑھنے والے پہلے شکاروں میں سے تھے۔ جنگ کا دوسرا سال شروع ہونے اور متعدد جرمن حملوں کی شدت سہارنے سے پہلے ہی ان کے گروہ کے گروہ مارے گئے۔ ہندوستانی جوانوں نے 1914 کی خزاں میں پیرس میں جرمن پیش قدمی کو روکا، اور اس کے فوری بعد جنگ شروع ہو گئی، جبکہ برطانوی ابھی اپنی فوجی بھرتی اور ٹریننگ کر رہے تھے۔ نیوو چیپل کے بہادرانہ لیکن بے نتیجہ معرکے میں سینکڑوں ہلاک ہوئے۔ ایک ہزار سے زائد ان میں سے گیلی پولی میں مارے گئے، چرچل کی خام سوچ اور غلط منصوبہ بندی کی حماقت کو سلام جس نے کریمیا کی جنگ میں لائٹ بریگیڈ کے حملے کی یاد تازہ کر دی۔ تقریباً سات لاکھ ہندوستانی سپاہی میسوپوٹیمیا میں جرمنی کی اتحادی سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف نبرد آزما تھے، ان میں سے بہت سے ہندوستانی مسلمان تھے، جنھوں نے برطانوی سلطنت کے دفاع کے لیے اپنے ہم مذہبوں

کے خلاف ہتھیار اٹھا رکھے تھے۔

فرانس اور بلجیئم سے ہندوستانی فوجیوں نے جو خطوط اپنے گاؤں میں اپنے خاندان کے افراد کو بھیجے، ان میں تہذیبی اجنبیت اور المیہ کا اظہار تمثیلی زبان میں کیا گیا ہے۔ ایک نے یوں بیان کیا، 'گولے یوں برس رہے ہیں جیسے مون سون میں بارش'۔ ایک اور نے لکھا، 'لاشیں ملک میں یوں بچھی پڑی ہیں جیسے مکئی کی تیار فصل کے گٹھے'۔

ایسے آدمی یقیناً ہیرو تھے: فخر سے کچھ ہی زیادہ کے لیے ہر دن اپنی جانوں کو داؤ پر لگائے، (جنھوں نے) اجنبی سرزمینوں میں جنگ کو سرفرازی بخشی، تند اور یخ موسمی حالات جن کے لیے نہ تو وہ تیار تھے اور نہ ہی عادی، ایک ایسے دشمن سے جنگ جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس کے باوجود جن کا مقدر تھا کہ جب جنگ ختم ہو تو بھی زیادہ تر غیر معروف ہی رہیں: برطانویوں کی طرف سے نظر انداز، جن کے لیے انھوں نے جنگ لڑی، اور اپنے وطن کی طرف سے بے پرواہی، جہاں سے وہ آئے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ اپنے وطن کے لیے جنگ نہیں لڑ رہے تھے۔ ان فوجیوں میں سے کوئی بھی جبری بھرتی کیا ہوا نہ تھا: سپاہ گری ان کا پیشہ تھا۔ وہ اس برطانوی سلطنت کے لیے فرائض سرانجام دے رہے تھے جو دیس میں ان کے ہم وطنوں پر ظلم ڈھا رہی تھی۔

ہندوستان کی غیر معمولی حمایت کے بدلے، برطانیہ نے جنگ کے خاتمے پر ہندوستان کو بتدریج خود مختاری دینے کا جھوٹا وعدہ کیا۔ شاید، اگر وہ اپنا وعدہ نبھاتے، تو پہلی عالمی جنگ میں ہندوستانی سپاہیوں کی قربانیوں کو ان کے اپنے وطن میں ہندوستان کی آزادی کی کوشش کے طور پر دیکھا جاتا۔

لیکن برطانیہ نے اپنا عہد توڑ دیا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، مہاتما گاندھی، جو جنوری 1915 میں جنوبی افریقہ سے کچھ کرنے کے لیے اپنے وطن لوٹے، نے جنگ کی حمایت کی، جیسا کہ وہ بوئیر کی جنگ میں برطانیہ کی حمایت کر چکے تھے۔ انھوں نے لکھا، انھیں امید تھی کہ 'ہندوستان اس کارگزاری کے ساتھ، (برطانیہ کا) سب سے پسندیدہ شراکت دار بن جائے گا، اور نسلی امتیاز ماضی کا قصہ بن کر رہ جائے گا'۔ سر رابندرناتھ ٹیگور قومیت پرستی کے بارے میں کچھ زیادہ ہی زہر خند تھے: انھوں نے جنگ کے دوران لکھا، 'ہمیں مشرق کے فاقہ زدہ، چیتھڑے لپیٹے مفلوک الحال انسانوں کو، پوری انسانیت کے لیے آزادی حاصل کرنی ہے!۔ ہمارے پاس اپنی زبان میں ''قوم (نیشن)'' کے لیے کوئی لفظ نہیں'۔ ہندوستان جنگ کی اعانت کے لیے زیادہ ٹیکسوں اور اس کے ساتھ

وابستہ بدترین افراطِ زر کی وجہ سے تباہ حال تھا، جبکہ اس تنازع کے باعث تجارتی افراتفری وسیع پیمانے پر معاشی تباہی کی جانب گامزن تھی ___ یہ سب اس وقت ہو رہا تھا جب ملک زکام کی ہولناک وباء، جو لاکھوں جانیں لے گئی، سے ڈگمگا رہا تھا۔ لیکن قوم پرست مونٹیگیو کے 1917 کے اعلامیے سے عام طور پر یہی سمجھ رہے تھے کہ جنگ کے خاتمے پر ہندوستان کو ڈومینین سٹیٹس مل جائے گا جو اب تک صرف 'گوروں کی دولت مشترکہ' کے لیے مخصوص تھا۔ ایسا نہیں ہوا۔ جب جنگ برطانیہ کی فتح پر منتج ہوئی، تو ہندوستان کو اس کا موعودہ صلہ دینے سے انکار کر دیا گیا۔ خود حکومتی کی بجائے 1918 میں برطانیہ نے فریب پر مبنی مونٹیگیو۔ چیمسفورڈ اصلاحات کی پیشکش کی جس نے تمام اختیارات برطانوی ہاتھوں میں رہنے دیے اور ہندوستانیوں کو معمولی امور پر تھوڑے سے اختیارات دھوکہ دہی سے سونپنے کی کوشش کی۔ اگر ہندوستانی ناامید تھے، تو انصاف کے احساس کے تحت برطانوی بھی تھے۔ برطانوی ایم پی ڈاکٹر ردر فورڈ نے بیان کیا:

> دنیا کی تاریخ میں کبھی عظیم لوگوں کے ساتھ ایسے فریب کا ارتکاب نہیں کیا گیا جیسا کہ انگلینڈ نے ہندوستان کے ساتھ کیا، جب جنگ کے دوران ہندوستان کی بے بہا خدمات کے عوض، ہم نے ہندوستانی قوم کو ایسا ناقابلِ اعتبار، شرمناک، غیر جمہوری اور غاصب آئین دیا۔

مزید جمہوریت کی پیشکش کرنے کی بجائے، برطانیہ مزید مخالف سمت میں چلا گیا۔ اس نے 1919 میں جابرانہ رولٹ ایکٹ پاس کیا، آزادیٔ اظہار و مجلس پر جنگ کے دور کی پابندیاں ہندوستان پر دوبارہ عائد کر دیں جو کہ التوائے جنگ میں اٹھائی جا چکی تھیں۔ پریس کی زبان بندی اور سنسر، سیاسی کارکنوں کو بغیر مقدمہ چلائے حراست میں لینے اور کسی بھی فرد کو سلطنت کے خلاف بغاوت کے شک میں بغیر وارنٹ گرفتاری کے ذریعے، اس قانون میں وائسرائے کی حکومت کو سلطنت کے خلاف بغاوت کچلنے کے غیر معمولی اختیارات عطا کیے گئے۔ یہ قانون صاحبانِ اقتدار کو اختیار دیتا تھا کہ محض شک کی بنیاد پر ہندوستانیوں کو گرفتار کر لیا جائے، اور ان کو وکیل یا اپیل کا حق دیے بغیر، ان پر خفیہ مقدمہ چلایا جائے۔ یہ سپین کے تفتیشی طریقہ کار کی طرف رجوع تھا، جس میں مفروضہ جرم کے ذریعے روح پھونکی جاتی، اور وہ لوگ جو سمجھتے تھے کہ وہ اپنی سیاسی منزل کو کنٹرول کرنے کا حق حاصل کر چکے تھے، کے خلاف، ملزم کا کسی قسم کا حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔

اس استبدادی قانون سازی کے خلاف عوامی احتجاج کو بے دردی سے کچلا گیا۔ بدترین واقعہ اپریل 1919 میں سینکڑوں غیر مُسلح معصومین کا جلیانوالہ باغ قتلام تھا، جسے تفصیلاً باب نمبر 3 اور 4 میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ

حقیقت کہ برطانوی بریگیڈیر ریجنالڈ ڈائیر، جس نے امرتسر میں غیر معمولی بربریت اور نسل پرستی کا مظاہرہ کیا تھا، کا بطور ہیرو برطانویوں نے استقبال کیا، جنھوں نے اس کے عمل کا صلہ دینے کے لیے اچھا خاصا چندہ جمع کیا، اس نے برطانوی استعمار اور ہندوستان رعایا کے درمیان آخری پھوٹ کی نشاندہی کر دی۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور نے 'ہندوستان میں برطانوی رعایا کے طور پر ہماری بے کسی کی صورتحال' کے خلاف احتجاج میں برطانیہ کو سر کا خطاب واپس کر دیا۔ ٹیگور کی برطانوی حکمرانی کے فوائد و نقصانات کے بارے میں ابتدائی دو جذبیت امرتسر کے بعد بدل گئی جسے اس نے 'ایک غیر ملکی نسل کی حکمرانی کی افتاد' میں 'بدبخت فریب کے ازالے' کا نام دیا،۔ وہ 'تذلیل کے بے محل موقع' پر 'تمغہ' نہیں چاہتا تھا۔

جنگ کا بیانیہ، جس میں ہندوستان نے اپنا سب کچھ جھونک دیا اور بدلے میں تضحیک اٹھائی، کا انجام برطانوی دھوکہ دہی کی وجہ سے اتنا تکلیف دہ ہوا، کہ ہندوستانی قوم پرستوں نے محسوس کیا کہ فریبی البیون سے خود مختاری، قانونی طریقے سے حاصل نہیں کی جا سکتی، لہٰذا اسے آزادی کی جدوجہد کے ذریعے برطانوی اڑیل گرفت سے چھیننا پڑے گا۔

سوم

جمہوریت، پریس، پارلیمانی نظام اور قانون کی حکمرانی

سوم

جمہوریت، پریس، پارلیمانی نظام اور قانون کی حکمرانی

لبرل جمہوریت کا برطانوی مقدمہ__ (جزوی) آزاد پریس__ آزادی اور پابندیاں__ ہندوستانی اخبارات کا عروج__ دیسی زبانوں کا پریس ایکٹ__ دی ہندو__ امریتا بزر پتریکا اور اس کا کشمیر کا راز فاش کرنا__ پریس ایکٹ 1910__ ہندوستان میں پارلیمانی نظام__ 'قانون کی حکمرانی': بوٹ اور تلی__ کیا انگریز ہندوستانیوں کو قتل کر سکتے ہیں؟__ عورت دشمن قوانین__ نسل پرستی__ 'مجرم قبائل'__ نوآبادیاتی دور کے تعصبات کو تعزیرات ہند میں جگہ دینا__ سیکشن 377، بغاوت اور زنا__ برطانوی قوانین نوآبادیت کے بعد بھی قائم

ہندوستان میں سیاسی وحدت اور جمہوریت تخلیق کرنے کے برطانوی کیس کا ایک اچھا پہلو نوآبادیاتی دور کے دوران جمہوریت کی تین تشکیلی اکائیون کے ارتقاء میں مضمر ہے: ایک آزاد پریس، ابتدائی پارلیمانی نظام اور قانون کی حکمرانی۔ ریس میں جیتنے والے تینوں گھوڑوں کی یہ شرط (ٹرائیفیکٹا) جسے ہندوستان نے قائم رکھا اور اپنے طریقے سے پروان چڑھانا جاری رکھا، نوآبادیاتی دور میں بھی موجود تھی، لیکن خاصی مسخ شدہ حالت میں، اور اسی لیے پرکھنے کے لائق ہے۔

اکیسویں صدی کے ابتدائی دنوں میں سامراجی گھمنڈ کے ساتھ امریکہ عراق پر لشکر کشی کے لیے پر تول رہا تھا، روس پسپائی اختیار کر چکا تھا، طالبان تتر بتر تھے اور بن لادن روپوش تھا، گلوبلائزیشن کا چلن پوری دنیا میں شدت سے (اور بظاہر بغیر مزاحمت کے) جاری و ساری تھا، متنازع اسکاٹ مؤرخ نیال فرگوسن نے 'سلطنت: برطانیہ نے دنیا کی تشکیل کیسے کی' شائع کی، جو ماضی میں ان اوصاف کو تلاش کرتی ہے جن کا جشن وہ آج منانا چاہتی ہے۔ برطانوی فرگوسن نے لکھا، مشترکہ تجارت، فتوحات، اور کچھ 'انجیلی استعماریت'، گلوبلائزیشن کی

ابتدائی شکل میں، __ یا خاص طور پر نامناسب لفظ، 'اینگلوبلائزیشن' اور ایسا کر کے برطانیہ نے دنیا کے بڑے حصے کے لیے اپنی 9 نو انتہائی امتیازی اور قابل توصیف خصوصیات ترکہ میں چھوڑیں، جو کہ ایسی تھیں جنھوں نے برطانیہ کو عظیم بنایا: انگریزی زبان، انگریزی ملکیت اراضی کے حقوق کا نظام، اسکاٹ اور انگریزی بنکنگ، قانون عامہ، پروٹسٹنٹ ازم، ٹیم سپورٹس، 'نگہبان' ریاست، نمائندہ اسمبلی، اور آزادی کا تصور۔ وہ کہتا ہے، ان میں سے آخری، 'سلطنت کی سب سے امتیازی خصوصیت' کیونکہ جب بھی 'برطانوی مطلق العنان طریقے سے پیش آتے، ہمیشہ برطانوی سماج کے اندر سے ہی ایسے کردار کو لبرل تنقید کا نشانہ بنایا جاتا۔

ہم فرگوسن کے تجزیہ کی جامع مبادیات (اور سلطنت کے دوسرے عذر خواہ جیسا کہ لارنس جیمز) کی طرف ساتویں باب میں لوٹیں گے، لیکن ابھی ہمیں لبرل جمہوریت کے دعوے نے روک رکھا ہے۔ فرگوسن غیر مصالحت پسندانہ ہے: 'دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت، ہندوستان کے لیے، برطانوی حکمرانی کا اعتراف کرنے کے فیشن سے زیادہ کا قرض واجب الادا ہے۔ اس کے اشرافیائی سکول، اس کی یونیورسٹیاں، اس کی نوکر شاہی، اس کی فوج، اس کا پریس اور اس کا پارلیمانی نظام، ہر ایک ابھی بھی قابل شناخت برطانوی نمونہ رکھتے ہیں....' وہ مزید لکھتا ہے، 'برطانوی حکمرانی کے اثرات کے بغیر، یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ پارلیمانی جمہوریت کا ادارہ، دنیا کے زیادہ تر ممالک نے اختیار کر لیا ہوتا، جیسا کہ وہ آج کر چکے ہیں۔

جیسا کہ ایک معاشیاتی مؤرخ کے لیے موزوں ہوتا ہے، فرگوسن اپنے ایک بعد کے تھیسس جس پر ہندوستان سے کہیں پرے کا گمان ہوتا ہے، میں دلیل پیش کرتا ہے، کہ سلطنت 'نہ صرف اجناس، محنت اور سرمایہ کے عالمی آزادانہ تبادلے کی ضمانت مہیا کرتی ہے، بلکہ ایسا ماحول تخلیق کرتی اور برقرار رکھتی ہے جس کے بغیر منڈی کی سرگرمیاں نہیں چل سکتیں __ امن و امان، قانون کی حکمرانی، باضمیر انتظامیہ، مستحکم مالگزاری اور مالیاتی پالیسیوں کے ساتھ ساتھ عوامی بہبود کا اہتمام جیسا کہ ٹرانسپورٹ کا نظام، ہسپتال اور سکول، جو کہ اس کے بغیر وجود میں نہ آتے'۔ سلطنت کے لبرلزم کا مطلب تھا کہ وہ جو محکوم ہوئے انھوں نے اپنی اس محکومی سے بہت فائدہ اٹھایا، اور یوں فرگوسن ثابت کرتا ہے کہ سلطنت نے استعمار زدہ عوام (کلونائزڈ) کے ساتھ ساتھ استعماری مرکز کو بھی فائدہ پہنچایا۔ ہندوستان میں برطانوی حکمرانی، فرگوسن کے تھیسس کے ثبوتوں میں سے ایک تھا، اور اس باب میں (جیسا کہ پہلے اور اگلے ابواب میں)، برطانوی راج کے عذر خواہوں کی جانب سے اکثر حوالہ کے طور پر پیش کردہ لبرل جمہوریت کی شیخی بگھارنے والے عناصر (کی بحث) کو آگے بڑھانے کے لیے،

ہم برطانیہ کے حقیقی ریکارڈ کا تجزیہ کریں گے۔

(جزوی طور پر) آزاد پریس

شروع کے اخبارات سے آغاز کرتے ہوئے اور ان حقوق کے شعور کے فروغ سے جن سے ایک آزاد شہری استفادہ حاصل کرنے کا مستحق تھا، برطانیہ کے عذر خواہ، اور بہت سے نقاد، ہندوستان میں آزاد پریس کے تصور کو متعارف کروانے کا سہرا سلطنت کے سر باندھنے پر مائل ہیں۔ یہ یقیناً درست ہے کہ ہندوستانی نیشنلزم اور آزادی کی تحریک، آزاد پریس کی عملی شمولیت کے بغیر ملک میں بھر نہیں پھیل سکتی تھی۔

اگرچہ برصغیر میں پہلا پرنٹنگ پریس 1550 میں پرتگیزیوں نے متعارف کروایا تھا، یہ صرف کتابوں کی اشاعت کرتا تھا جیسا کہ فی الحقیقت بمبئی میں 1664 میں قائم برطانوی پرنٹنگ پریس نے کیا۔ ہندوستان میں پہلے اخبار کی اشاعت میں ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ لگا، جب 1780 میں، جیمز آگسٹس حیکی نے بنگال گزٹ یا کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر شائع کیا۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی نے جلد ہی اس کی ناموافق آراء کو شک کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا اور، دوسالہ جمع شدہ برہمی کے بعد، اس کا پریس 1782 میں بند کر دیا۔

بہر حال، اس سے حیکی کی نسبت کم متنازع فیہ اسلوب والے دوسرے دل برداشتہ نہیں ہوئے اور جلد ہی ہندوستان میں برطانوی اخبارات کثیر تعداد میں شائع ہونا شروع ہو گئے: کمپنی کے دارالحکومت کلکتہ میں پہلے چار اخبار__ 1784 میں کلکتہ گیزٹ، 1785 میں بنگال جرنل و اوریئنٹل میگزین آف کلکتہ اور 1786 میں کلکتہ کرونیکل__ اور پھر دوسرے اہم برطانوی تجارتی مراکز میں دو اور، مدراس کوریئر 1788 میں اور بمبئی ہیرالڈ 1789 میں۔ یہ اخبارات محض چھوٹی سی یورپی کمیونٹی کے مفادات کے عکاس تھے، خاص طور پر تجارتی مفادات کے، اور اگرچہ ہمیشہ درست نہ سہی لیکن جہازوں کی آمد و رفت اور کالونی کے بندوبست میں بہتری کی مفید خبریں مہیا کرتے تھے۔ تاہم، انھوں نے ہندوستان میں اخباری کلچر پروان چڑھایا، بہر کیف ان ابتدائی اخبارات میں سے اگرچہ کوئی بھی قائم نہ رہ سکا، لیکن یہ جلد ہی واضح ہو گیا کہ پریس اب یہاں قدم جما چکا ہے۔

ان کے پھیلاؤ سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے، اور اس فکر میں کہ کہیں کمپنی کے بد اندیش اور دشمن (قابل فہم طور بشمول فرانسیسی) پریس کو کمپنی کے مفادات کے خلاف استعمال نہ کریں، لارڈ ویلزلے نے سینسر شپ آف دی پریس ایکٹ 1799 متعارف کروایا، جو کہ ہندوستان میں تمام اخبارات کو اشاعت سے قبل

حکومت ہند کے محاسبہ (سکروٹنی) کے تحت لے آیا۔ اس ایکٹ کو بعد میں ہر قسم کی پبلیکیشن __ اخبارات، میگزینز، کتابوں اور پمفلٹس، کا احاطہ کرنے کے لیے 1807 میں مزید وسعت دی گئی۔ زیادہ سرکش پبلیکیشنز میں سے چند ایک کو بند کر دیا گیا؛ انڈین ورلڈ، بنگال گیزٹ اور کلکتہ جرنل کے مدیران کو تو کمپنی کے عہدیداران اور اس کی پالیسیوں پر تند تنقید کے باعث گرفتار کیا گیا اور انگلینڈ ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ ہندوستان میں آزاد پریس کے تصور کے لیے یہ کوئی سازگار شروعات نہیں تھیں۔

سفاکانہ پابندیوں سے جلد ہی نجات مل گئی، کیونکہ کمپنی نے ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور اسے یورپی حریفوں کا خطرہ بھی ختم ہو گیا۔ اور مادر وطن (انگلینڈ) میں پریس کی بڑھتی ہوئی آزادی کی عکاسی ہندوستان میں بھی ہونے لگی۔ اسی اثنا میں بہت سے ابتدائی اخبارات بند ہو گئے __ بعض اوقات ناشرین کی اموات یا روانگی کے باعث، بعض اوقات تجارتی طور پر قابل عمل نہ ہونے کی وجہ سے کیونکہ ان کے قارئین کا حلقہ بہت چھوٹا تھا، اور بعض اوقات محض اس وجہ سے کہ مدیران اور عملے کا اپنے کام میں جوش و خروش ختم ہو گیا اور مناسب متبادل نہ مل سکا __ باقیوں نے نہ صرف یہ کہ اپنا وجود قائم رکھا بلکہ پڑھنے والوں کا اچھا خاصا حلقہ بنا لیا۔ ٹائمز آف انڈیا جو 1838 میں بمبئی میں شروع ہوا تھا، اور کلکتہ سٹیٹس مین (جس نے 1875 میں زندگی کا آغاز کیا، لیکن جس میں فرینڈ آف انڈیا کا انضمام ہوا، جو کہ 1818 میں قائم ہوا تھا) نے جلد ہی خود کو اسٹیبلشمنٹ کے قابل اعتماد ستون کے طور پر منوا لیا، برطانوی سامراجی مفادات کے ساتھ بھرپور طریقے سے وابستہ ہونا، لیکن ذمہ دارانہ طریقے سے حکومت کے اعمال اور پالیسیوں پر تنقید کی اہلیت بھی رکھنا۔ جب برطانویوں نے شمالی ہندوستان میں قدم جما لیے، تو لکھنو میں اخبارات کے نو آبادیاتی اتحاد ثلاثہ میں پائنیر کا تیسرے کے طور پر اجراء ہوا، جس کے نظریات کو عمومی طور پر ہندوستان میں برطانوی کمیونٹی کی نمائندگی کے طور پر لیا جاتا تھا۔

چنانچہ، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ برطانوی تھے جنھوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں اخبارات کا اجراء کیا، جو نو آبادیاتی حکومت سے پہلے ہندوستان کے لیے اجنبی تھے، اور اس کا سہرا انھی کے سر ہے کہ انھوں نے ہندوستانیوں کو، چھوٹی سی انگریزی اشرافیہ (اور اس کے پرجوش پیروکار) کا خیال کرنے کے لیے انگریزی اور ہندوستانی مقامی زبانوں میں ہمسری کرنے کی اجازت دی۔ گجراتی میں، بمبئی سماچار، 1822 میں قائم ہوا (یہ اب بھی چل رہا ہے، اور بڑے فخر سے خود کو ایشیا کا اب بھی شائع ہونے والا سب سے پرانا اخبار کہتا ہے) اور چند عشروں بعد، دو بنگالی اخبارات نے کلکتہ میں اس کی تقلید کی، 1879 میں دی بنگالی، (جسے سریندر ناتھ بینرجی، ز

آئی سی ایس چھوڑنے کے بعد خریدا اور سینتیس سال تک ایڈیٹ کیا) اور 1868 میں عظیم امریتا بازار پتریکا (جو کہ بنگالی زبان میں اشاعت کا اجراء کرنے کے بعد، اور 1878 میں قومی مفادات کی وکالت کے لیے انگریزی زبان کے اخبار میں بدلنے سے پہلے، کچھ عرصہ کے لیے دوزبانوں کا ہفت روزہ رہا۔ امریتا بازار پتریکا کانگریس کی حمایتی دہشت ناک آواز بن گیا اور 1986 میں بند ہونے سے پہلے، بیسویں صدی کے اواخر تک قائم رہا۔)

دوسرے انگریزی زبان کے ہندوستانی ملکیتی اخبارات ہندوستانی قارئین سے مخاطب ہوتے، لیکن اس آگہی کے ساتھ کہ ان کے خیالات پر نوآبادیاتی حکمران ضرور متوجہ ہوں گے؛ یوں تحریک آزادی میں ان کے اثرات بتدریج بڑھتے گئے۔ استدلالی طور پر، ان میں سب سے اہم مدراس میں دی ہندو تھا، جس کا اجراء 1878 میں بطور ہفت روزہ ہوا، اور 1889 سے روزنامہ میں تبدیل ہو گیا، جسے برطانوی ایک عرصے تک ذمہ دار ہندوستانی رائے عامہ کی آواز سمجھتے رہے۔ (دی ہندو کے پہلے شمارے کی کل 80 کاپیاں، ایک روپے اسی آنے میں قانون کے چار طلباء اور دو اساتذہ کے گروپ نے قرض لے کر شائع کیں۔)

بیسویں صدی کے آغاز میں، ہندوستانی قوم پرستوں نے اپنے مقصد کی وکالت کے لیے بے جھجک اخبارات قائم کرنا شروع کر دیے تھے: ان میں سے بہترین بمبئی کرونیکل تھا، جو کانگریس کے سابق صدر سر فیروز شاہ مہتا نے 1910 میں قائم کیا، ہندوستان ٹائمز، جسے کانگریس کے حمایتی کاروباری برلا خاندان نے 1924 میں شروع کیا، اور جواہر لال نہرو کا اپنا نیشنل ہیرلڈ، جس کی اشاعت 1938 میں شروع ہوئی۔ مسلم لیگ نے پیروی کی، جب جنگ کے سالوں کے دوران اس کا سیاسی نصیب جاگ اٹھا، محمد علی جناح نے کراچی اور دہلی سے 1941 میں ڈان کا اجراء کیا۔

ایک اندازے کے مطابق، 1875 تک، ہندوستان میں 475 اخبارات تھے، اور ایک بڑی تعداد ہندوستانیوں کی ملکیت تھی اور وہی ایڈیٹ کرتے تھے۔ وہ پڑھی لکھی اقلیت کی دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ___ جو کہ اس وقت آبادی کے 10 فیصد سے بھی کم تھی ___ لیکن ان کے اثرات اس حلقے سے کافی وسیع تھے، کیونکہ شائع ہونے والی خبریں اور خیالات زبانی کلامی دہرائے اور پھیلائے جاتے۔ ہندوستان میں ابھرتی ہوئی لائبریری تحریک نے خاصی مدد کی، جیسا کہ عوامی ریڈنگ رومز نے، اور ایک بکنے والی کاپی سے کم از کم درجن بھر قاری مستفید ہوتے۔ حالانکہ اخبارات بڑے شہروں میں چھپتے اور شائع ہوتے، (لیکن ان کے) ایڈیشنز بعض اوقات تین دن بعد دیہاتی علاقوں اور مضافاتی شہروں میں پہنچتے، جہاں ان کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا جاتا اور بڑے

شوق سے پڑھے جاتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پریس نے ہندوستان میں قوم پرست احساسات کو بڑھاوا دینے اور پروان چڑھانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا، ایک وسیع تر عوامی شعور کا تصور راسخ کیا، نو آبادیاتی انتظامیہ کی ناکامیوں سے پردہ ہٹایا اور برطانوی حکمرانی کے بہت سے پہلوؤں کی مخالفت کو برانگیختہ کرنے میں بہت پر اثر کردار ادا کیا۔

ناگزیر طور پر، برطانوی حکمرانوں کو خطرہ محسوس ہونا شروع ہو گیا: لارڈ لٹن ہندوستانی زبانوں کے اخبارات کو ضابطے میں لانے کے لیے 1878 میں (مقامی زبانوں میں صحافت کا قانون) ورنیکلر پریس ایکٹ لے آیا، جبکہ اس کی حکومت نے انگریزی زبان کے اخبارات پر نظر کرم رکھی۔ (اسی قانون کا نفاذ تھا جس نے امریتا بازار پتریکا کو راتوں رات، انگریزی زبان کے اخبار میں بدلنے پر مائل کیا تاکہ اس قانون کی زد میں آنے سے بچا جا سکے۔) ابھی بھی، وطن میں برطانوی عوام پر مکمل سینسر شپ اور جبر پوری طرح ختم نہیں ہوا تھا، اور حکام کو بڑی سختی سے پیش آنا پڑتا تھا۔ جبکہ برطانیہ کو درپیش شدید خطرات کے بعض موقعوں پر، خاص طور پر جنگ کے دور میں، اور بڑھتی ہوئی قوم پرستانہ مزاحمت کے وقفوں کے دوران، سامراجی مفادات کے تحفظ کے لیے پریس کو براہ راست محدود کر دیا جاتا ___ رولٹ ایکٹ ذہن میں آتا ہے ___ اکثر اوقات برطانوی انتظامیہ پر تنقید کی کھلی اجازت دی گئی۔ در حقیقت، ہندوستانی مقامی زبانوں کی صحافت کو غیر مہذب طنزیہ تنقید کی اجازت دی گئی: مثال کے طور پر، 1889 میں، ایک بنگالی اخبار حالیشاہر پتریکا، نے برطانوی لیفٹیننٹ گورنر سر جارج کیمپبل کو بڑے رنگین انداز میں 'بالوں بھرے جسم کے ساتھ بطور بابون کیمپبل' کے پیش کیا.... 'اس کی آنکھیں غصے سے دہک رہی تھیں اور اس کی دم مکمل طور پر شعلوں میں لپٹی ہوئی تھی'۔ لیکن کیا اس کی نو آبادیاتی مخالفت نے واضح طور پر سیاسی آہنگ اختیار کیا تھا، مثلاً برطانوی حکمرانی کی بنیاد پر سوال اٹھایا تھا، یا اس کے خاتمے کے لیے آواز بلند کی تھی، (ایسا ہوتا تو) حاکمان اتنے متحمل مزاج نہ رہتے۔

متناسب آزادی کے دور میں، ہندوستانی قوم پرست میڈیا کی سب سے اہم کامیابیوں میں سے ایک وہ تھی، جس کے سائے بدقسمتی سے آج بھی برصغیر پر منڈلا رہے ہیں۔ 1891 میں امریتا بازار پتریکا کے ایک صحافی نے کسی طرح وائسرائے لارڈ لینس ڈاؤن کے دفتر کی ردی کی ٹوکری کی تلاشی لینے کا بندوبست کر لیا۔ وہاں اسے ایک خط کے پھاڑے گئے ٹکڑے ملے، جنھیں کافی کوشش کے بعد وہ جوڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ خط ایک دھماکہ خیز خبر پر مشتمل تھا، جو ہندو مہاراجہ کے ماتحت مسلم اکثریتی ریاست جموں و کشمیر کے الحاق کے وائسرائے کے

منصوبے کی کافی تفصیلات کو بیان کرتا تھا۔ برطانوی عہدیداروں کی سراسیمگی میں، امریتا بازار پتریکا نے یہ خط اپنے پہلے صفحے پر شائع کر دیا۔ بلی تھیلے سے باہر تھی: اخبار مہاراجہ کشمیر کے پاس پہنچا، جس نے فوراً احتجاج کیا، اور لندن کے لیے سمندری سفر پر روانہ ہو گیا اور وہاں کے صاحبان اقتدار کے ساتھ بھرپور لابنگ کی کہ وہ اپنے پیش روؤں کی، اس کی ریاست کے 'آزاد' سٹیٹس کی گارنٹی کا وعدہ پورا کریں۔ مہاراجہ کامیاب رہا، اور ہندوستانی قوم پرستوں نے پتریکا کو نوآبادکاروں کے سامراجی عزائم کے راستے میں مزاحم ہونے پر مبارک باد پیش کی۔ اگر یہ راز نہ کھلتا، تو کشمیر کی 1947 میں آزادی کے دوران الحاق کے لیے، کسی ایک ملک اور شرائط کو قبول کرنے کے لیے 'ایک راجواڑے کی حیثیت' باقی نہ رہی ہوتی؛ یہ برطانوی ہند کا ایک صوبہ ہوتا، جو بٹوارے کے دوران تقسیم کے لیے، برطانوی قلم کی بے پرواہ جنبش قلم کا رہین منت ہوتا۔ 'مسئلہ کشمیر' کی صورتحال آج بالکل مختلف نظر آ رہی ہوتی۔

اس کے باوجود، لینس ڈاؤن-پتریکا والا واقعہ ایک استثناء تھا: زیادہ عرصہ، ہندوستانی میڈیا سخت پابندیوں کے زیر اثر کام کرتا رہا۔ نظر ثانی شدہ پریس ایکٹ 1910، عوامی رائے پر ایڈیٹر کے اثرات کو کم کرنے کے لیے بنایا گیا؛ یہ ہندوستانی پریس پر برطانوی کنٹرول کا ایک بنیادی آلہ بن گیا۔ اس کی دفعات کے مطابق ایک مسلمہ پریس یا اخبار کو پانچ ہزار کا سیکورٹی ڈپازٹ جمع کروانا پڑتا تھا (ان دنوں خاصی بڑی رقم تھی)؛ ایک نئی اشاعت کو دو ہزار تک کی ادائیگی کرنا پڑتی۔ اگر اخبار کچھ ایسا شائع کرتا جو حکومت کے لیے قابل اعتراض ہوتا، تو رقم قرق ہو سکتی تھی، پریس بند ہو سکتا تھا، اور اس کے مالکان و مدیران پر مقدمہ چلایا جا سکتا تھا۔ مثال کے طور پر، کانگریسی قائد اینی بیسنٹ نے داخلی خود مختاری کی وکالت کرنے والے ایک اخبار کی سیکورٹی جمع کرانے سے انکار کر دیا، اور اس میں ناکامی کے باعث اس قانون کی خلاف ورزی پر اسے گرفتار کر لیا گیا۔

یہ قابل ذکر ہے کہ صرف ہندوستانی تالیفات ہی حکمرانوں کو جمع کروائے گئے حقیقی بانڈز کی قرقی کی زد میں آتیں، اگر وہ اشتعال انگیز اور توہین آمیز آرٹیکلز شائع نہ کرنے کی ذمہ داری پوری کرنے میں ناکام ہو جاتیں؛ برطانویوں کے زیر ملکیت پریس کی نسل پرستی پر ایسی بندشیں نہیں تھیں۔ صوبوں میں برطانوی نوآبادیاتی حکومتوں کو کسی بھی اخبار، اگر وہ 'بغاوت آمیز' ہوتا تو اس کے احاطے کی تلاشی لینے اور کسی بھی مواد کو ضبط کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ دوسرے الفاظ میں، ہندوستانی پریس آزاد ہونے کی بجائے زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، بہرحال اس کا وجود تھا، اور یہ رائے عامہ ہموار کرنے کا فریضہ ادا کر سکتا تھا، اور اس کا کریڈٹ برطانوی صاحبانِ

اقتدار اور ہندوستانی جنھوں نے میڈیا میں کام کیا دونوں کو جاتا ہے۔

ہندوستانی پریس__ خاص طور پر مقامی زبانوں کا (پریس) جس میں نو آبادیاتی آقاؤں کو ملامت کرنے کا میلان ابھی کم ہی تھا__ کو جرمانہ کیا گیا، کچلا گیا اور بند کیا گیا؛ اس کے مدیران اکثر اوقات جیل میں ڈالے گئے، اور کئی مرتبہ صرف ایک طنزیہ دشنام کے لیے 23 مہینوں کی قید با مشقت؛ اور پریس ایکٹ کے تحت ان کا ٹائپنگ کا سٹاک، جس کے بغیر وہ کچھ چھاپ نہیں سکتے تھے، قرقی کا سزاوار ٹھہرتا لیکن ہندوستان میں برطانوی سامراج کے حمایتی اخبارات ایسے خطرات کا مرکزی ہدف نہیں تھے۔ غیر متعصب برطانوی مبصر ہنری نیونسن نے 1908 میں لکھا، 'کسی بھی ہندوستانی اخبار کی نسبت میں نے اینگلو انڈین اخبارات (جیسا کہ برٹش سیٹلرز) میں نسلی تنفر پر اکسانے اور فساد کی ترغیب دینے کی دانستہ کوششیں دیکھیں، جنھیں کوئی نقصان نہیں ہوا'۔ نیونسن 'کلکتہ میں ایک اینگلو انڈین ہفت روزہ، دی ایشین، کی جانب سے غیر امتیازی قتل عام کی اس واضح ترغیب کو بطور مثال پیش کرتا ہے (9 مئی 1908)':

> مسٹر کنگسفورڈ [کلکتہ میں ایک برطانوی مجسٹریٹ جس کی عدالت بم کا نشانہ تھی] کے پاس بہترین موقع ہے، اور ہمیں امید ہے کہ وہ قریبی فاصلے کے انتہائی عمدہ نشانہ باز ہیں۔ ہم موزر پسٹل جس کے ساتھ گولیوں کی نکل کے ساتھ رگڑی ہوئی نوک، یا کولٹ کی آٹومیٹک، جو بھاری بھرکم ملائم گولیاں چلاتی ہے اور سخت ضرب لگانے والا سزا دینے والا ہتھیار ہے، کی طرف ان کی توجہ مبذول کرواتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ مسٹر کنگسفورڈ ایک بڑا بیگ بچانے کا انتظام کرلیں گے اور ہم ان کی اس موقع شناسی پر رشک کریں گے۔ ان کے لیے مائز سے بھی زیادہ ہے کہ وہ ہر اجنبی مقامی جو ان کے گھر یا ذات کے قریب آرہا ہو کو فہمائش کریں، اور ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی عافیت کے لیے، اپنے ہتھیار کو کوٹ کی جیب سے نکالے بغیر بالکل سیدھا گولی چلانا یاد رکھیں گے۔ اس سے وقت بھی بچے گا اور دس پندرہ گز کے فاصلے سے بالکل درست زاویہ بھی مل جائے گا۔ ہم ایک ایسے انسان کی کامیابی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں، جس نے ثابت کیا ہے کہ اس کے پاس صورتحال کی نزاکت کا درست زاویہ نظر ہے۔

نیونسن مزید کہتا ہے کہ 'اینگلو انڈین پریس کا لہجہ تقریباً بلا تغیر گستاخانہ اور اشتعال انگیز تھا۔ اگر 'باغیانہ' کا مطلب محض 'فساد ہونے کا احتمال' تھا تو یہ بغاوت بھی تھی۔'

دوسرے الفاظ میں، پریس آزاد تھا، لیکن کچھ اخبارات (برطانویوں کی ملکیت والے) دوسروں کی نسبت زیادہ آزاد تھے۔

ہندوستان میں پارلیمانی نظام

آزادی کے وقت تک، ہسپانوی، پرتگیزی، فرانسیسی، ولندیزی اور بلجئین رفقاء (نو آبادیات) کے برعکس، برطانوی ہند، اور بہت سی دوسری برطانوی نو آبادیات میں الیکشن، (سیاسی) جماعتیں، ایک کم یا زیادہ آزاد پریس، اور قانون کی حکمرانی موجود تھی۔ جمہوری عمل چاہے آہستہ رو، کینہ پرور اور بتدریج تھا، لیکن یہ کسی بھی اور جگہ کی نسبت سابقہ برطانوی نو آبادیات میں زیادہ کامیاب تھا۔ ہندوستانی قوم پرستی کی جدوجہد اور مختلف مراحل میں اس کا ارتقاء__ قانونی حقوق کے متلاشی مہذب لبرلز، سوراج کے لیے غل غپاڑہ کرتے 'انتہا پسند'، اہنسائی جدوجہد کی وکالت کرتے گاندھی اور ان کے پیروکار، کانگریس، مسلم لیگ اور دوسری پارٹیاں، محدود حق انتخاب کے ساتھ ہی سہی لیکن ووٹوں کے لیے ایک دوسرے کے بالمقابل تھیں: قبل از آزادی کے یہ تجربات، جمہوریت کے لیے ایک طرح کے سماج سازی کے عمل میں معاون اور ملک کی آزادی کے سفر کو آسان بنانے میں مددگار ثابت ہوئے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ جب ہندوستانی قوم پرست، اپنی آزادی کی جدوجہد میں فتح یاب ہو گئے، اور آزاد ہند کا دستور لکھنے بیٹھے، تو انھوں نے سیاسی نظام مکمل طور پر برطانوی پارلیمانی جمہوریت کی بنیاد پر تخلیق کیا۔ کیا یہ محض اس لیے تھا کہ کہ انھوں نے اس کا مشاہدہ دور سے کیا تھا اور اس تک ان کی رسائی ممنوع تھی، لہٰذا وہ ہندوستان میں ویسٹ منسٹر کا چربہ چاہتے تھے، یا پھر شاید برطانویوں نے طاقت کی مثال کے ذریعے، ہندوستانیوں کو واقعی قائل کر لیا تھا کہ ان کا نظام قابل رشک ہے؟

یہاں ایک جملہ معترضہ ہے: ذاتی طور پر، میرے لیے یہ بعید از قیاس ہے کہ برطانوی نظام ہندوستان کے لیے مناسب تھا۔ ہم نے جو پارلیمانی جمہوریت اختیار کی اس میں انتظامیہ بنانے کے لیے مقننہ چننے کی برطانوی گمراہی شامل تھی: اس نے قانون سازوں کی ایسی نرالی نسل پیدا کی جو زیادہ تر قانون سازی کے لیے نااہل تھی، جو محض انتظامیہ کے اختیارات کو قابو (پر اثر انداز ہونے کے لیے) میں رکھنے کے لیے الیکشن چاہتے تھے۔ اس سے ایسی حکومتیں پیدا ہوئیں جو پالیسی اور کارکردگی کی بجائے سیاست پر توجہ مرکوز کرنے پر مجبور تھیں۔ اس نے

رائے دہندگان کی ووٹنگ ترجیحات مسخ کر دیں جو یہ تو جانتے تھے کہ کون سا فرد انھیں چاہیے لیکن کون سی پالیسیاں چاہئیں یہ (جاننا) ضروری نہیں۔ اس سے ایسی پارٹیوں کی افزائش ہوئی جو تصورات کے مربوط نظام کے وسیلے کی بجائے انفرادی مفادات کے باعث وفاداریاں تبدیل کرتیں۔ اس نے حکومتوں کو مجبور کیا کہ وہ حکمرانی پر کم اور اپنی حکومت بچانے پر زیادہ توجہ مرکوز کریں، اور اس نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اپنی اتحادی جماعتوں کے سب سے کم تر مشترکہ نامزد کاروں کا بھی خیال رکھیں۔ یہ وقت ہے تبدیلی کا۔

تکثیری جمہوریت ہندوستان کی سب سے بڑی طاقت ہے، لیکن اس کے موجودہ طرزِ عمل کا ماخذ ہماری بنیادی کمزوریوں میں ہے۔ ہندوستان کے بہت سے معاملات ایسے سیاسی بندوبست کا تقاضا کرتے ہیں جو فیصلہ کن اقدامات کی اجازت دے، جبکہ ہمارا تذبذب اور صراط مستقیم سے انحراف روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ ہمیں ایسا نظام حکومت چاہیے جس میں قائدین حکومت میں رہنے کی بجائے حکمرانی پر توجہ مرکوز کریں۔ پارلیمانی نظام جتنی بہتری کر سکتا تھا اس سے زیادہ عرصہ زندہ رہ چکا؛ یہ ابتداء سے ہی ہندوستانی حالات کے لیے مناسب نہیں تھا اور بنیادی طور پر ہماری بہت ساری حقیقی سیاسی برائیوں کے لیے یہی ذمہ دار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بار بار ہندوستان کے لیے صدارتی نظام حکومت کی وکالت کی ہے، نہ صرف نئی دہلی میں وفاقی حکومت کے لیے، بلکہ گاؤں، شہروں، ریاستوں اور مرکز میں ایک چیف ایگزیکٹو کے براہِ راست انتخاب کا نظام، جو مقررہ میعاد کے لیے منتخب ہوں اور مقننہ کی ترنگ اور میونسپل کونسلوں یا دیہی پنچایت کی تبدیل ہونے والی اکثریت کو جواب دہ ہونے کی بجائے، ہر پانچ سال کے لیے ووٹرز کو جواب دہ ہوں۔

پارلیمانی نظام برطانیہ میں اختراع کیا گیا تھا___ ایک چھوٹے جزیرے کی قوم کے ساتھ، ابتداء میں ایک ایم پی کے لیے چند ہزار ووٹروں کی رائے دہندگی اور حتیٰ کہ آج بھی ایک حلقہ انتخاب کے لیے ایک لاکھ سے کم لوگ___ جہاں بہت سے ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے جو کم از کم ہندوستان میں موجود نہیں تھے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ واضح طور پر متعین سیاسی جماعتیں ہوں، ہر ایک کے پاس پالیسیوں اور ترجیحات کا ایسا مربوط نظام ہو جو ایک کو دوسری سے ممیز کر سکے، جبکہ ہندوستان میں ایک جماعت اکثر اوقات آسائش کا ایک لیبل ہوتا ہے، جسے سیاست دان اتنی تیزی سے اختیار اور ترک کرتے ہیں جتنی تیزی سے بالی وڈ کے اداکار لباس تبدیل کرتے ہیں۔ اہم ترین جماعتیں، چاہے قومی ہوں یا دوسری، اپنی آراء بارے غیر یقینی الجھاؤ کا شکار ہوتی ہیں: ہر جماعت کی 'آئیڈیالوجی' کم یا زیادہ درجہ پر کانگریس کے نہروین سوشلزم سے اخذ کردہ، معتدل پوپلزم کا ایک یا

دوسرا نمونہ ہے۔ لیکن ہمارے اوپر یہ نظام مسلط کرنے کے لیے ہم برطانویوں کو الزام نہیں دے سکتے، اگر چہ یہ ان کی 'پارلیمنٹس کی ماں' ہی تھی جس کی ہمسری ہمارے اجداد نے کرنا چاہی۔ پہلی بات یہ کہ، برطانویوں کا ہندوستان میں جمہوریت کے نفاذ کا کوئی ارادہ نہیں تھا؛ دوسری یہ کہ، ہندوستانیوں نے قانون ساز اسمبلی میں آزادانہ طور پر پارلیمانی نظام کا انتخاب خود کیا۔

دو صدیاں قبل کے امریکی انقلابیوں کی طرح، ہندوستانی قوم پرست 'انگریزوں کے حقوق' کے لیے لڑے، جسے وہ پارلیمان کے ایوانوں کے نقش ثانی کا خلاصہ اور گارنٹی دونوں سمجھتے تھے۔ جب سابق برطانوی وزیر اعظم کلیمنٹ ایٹلی نے، برطانوی آئینی کمیشن کے رکن کے طور پر، ہندوستانی قائدین کو امریکی صدارتی نظام بطور ماڈل تجویز کیا، تو وہ یاد کرتا ہے کہ 'انھوں نے اسے بڑی شدت سے رد کر دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ سمجھ رہے ہیں کہ میں انھیں مکھن کی جگہ مارجرین پیش کر رہا ہوں'۔ ہمارے بہت سے آزمودہ کار ارکان پارلیمنٹ — جن میں سے کئی ایک انگلینڈ میں تعلیم حاصل کر چکے تھے اور برطانوی پارلیمانی روایات کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے تھے — نے برطانوی پارلیمانی کنوینشنز کے ساتھ اپنی وابستگی پر جشن مسرت منایا اور اپنے طرز عمل کے مستند ہونے کی خود ہی توصیف کی۔ ہندوستانی ایم پیز آج بھی پسندیدگی کے لیے ہاتھوں سے تالیاں بجانے کی بجائے، منظوری کے لیے ڈیسک بجاتے ہیں۔ جب کوئی بل ووٹنگ کے لیے پیش کیا جاتا ہے تو اظہار توثیق کے لیے اب بھی 'یس' کی بجائے 'ایے' ہے۔ حتیٰ کہ ہمارے کمیونسٹ بھی اس نظام کو بڑی خوشی سے قبول کر چکے ہیں؛ ایک انگریز نواز مارکسسٹ ایم پی، پروفیسر ہیرن مکرجی، بڑے فخر سے جتایا کرتے تھے کہ برطانوی وزیر اعظم انتھونی ایڈن وقفہ سوالات کے دوران آسٹریلین کی نسبت ہندوستانی پارلیمان میں زیادہ مانوسیت محسوس کرتے تھے۔

لیکن آزادی کے چھ عشرے خاصی اہم تبدیلی لے کر آئے ہیں، جوں جوں برطانوی اعمال کی تاثیر زائل ہوتی گئی ویسے ہی ہندوستانی فطری تندی واپس عود آئی۔ وفاقی نظام میں چند ریاستوں کی اسمبلیاں پہلے ہی فرنیچر پھینکے جانے، مائکروفون توڑے جانے اور سرکش قانون سازوں کے سلیپرز پھینکنے کے واقعات کی شاہد ہیں، ہاتھا پائی اور سیاستدانوں کے درمیان دھینگا مشتی میں کپڑے پھٹنے کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ ایک احتجاج کرنے والے رکن پارلیمنٹ کی جانب سے قومی مقننہ میں بجا طور پر مرچوں کا سپرے کیا جا چکا ہے۔ اور اس کے لیے شاید ہم انگریزوں کو الزام نہیں دے سکتے۔

اور یہ دلیل کہ برطانیہ ہمیں خود مختار اداروں اور جمہوریت کی زین پوش کے ساتھ چھوڑ کر گیا، اس دلیل کی سچائی نوآبادیاتی جبر کی حقیقت کے سامنے ناکام ہو جاتی ہے۔ مجھے اس کا حوالہ دینے دیں جو واقعی نوآبادیاتی آزمائش سے ہو کر گزرا ہے، جواہر لال نہرو، جس نے ایک انگریز لارڈ لوتھین کو 1936 کے ایک خط میں لکھا کہ برطانوی حکومت 'ایک پھیلے ہوئے فساد کی انتہائی شکل پر بنیاد رکھتی ہے اور اس کا واحد قاعدہ دہشت ہے۔ یہ ان عمومی آزادیوں پر قدغن لگاتی ہے جو عوامی ترقی کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں؛ یہ مہم جو، بہادر اور حساس کو کچل دیتی ہے، اور بزدل، موقع پرست اور ابن الوقت، چاپلوس اور دنگاباز کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اس نے جاسوسوں، مخبروں اور فتنہ انگیزوں کی فوج کے درمیان خود کو پھنسایا ہوا ہے۔ کیا یہ وہ ماحول ہے جس میں مرغوب صفات پنپتی اور جمہوری ادارے پروان چڑھتے ہیں؟ نہرو بات کرنا جاری رکھتے ہیں، انسانی عزت نفس اور شائستگی کو کچلنا، روح کے ساتھ ساتھ جسم کو بھی زخمی کرنا جو کہ ان کی بھی تذلیل کرتی ہے جو اسے استعمال کرتے ہیں اور ان کی بھی جو اسے جھیلتے ہیں۔ ہندوستان میں جمہوریت اور اس کے اصولوں کے احترام کی ترویج و بہرہ مندی کا بامشکل ہی یہ طریق ہو سکتا تھا۔ ہندوستان کی روح جو ایک قوم کی عزت نفس کی بنیاد ہے ـــــ کو دیا گیا یہ زخم ـــــ ہی وہ چیز ہے جس سے نوآبادیات کے عذر خواہوں نے ہمیشہ چشم پوشی کی ہے۔

'قانون کی حکمرانی': بوٹ اور تِلی

یہ دلیل کہ برطانیہ نے ہندوستان کو سیاسی وحدت اور جمہوریت دی کا ایک منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اس نے ملک میں 'قانون کی حکمرانی' قائم کی۔ ایسا کئی طرح سے برطانوی تصور ذات کے سامراجی مقصد کے لیے مرکزی تھا۔ ہم اس سے قبل اس کے دوسرے پہلوؤں پر بھی غور کر چکے ہیں جسے برطانوی، ہندوستان میں اپنے مشن کے طور پر دیکھتے تھے۔ قابل استدلال طور پر مقامی لوگوں کو برطانوی قانون متعارف کروانا، اس مشن کے سب سے اہم اجزاء ترکیبی میں سے ایک تھا؛ کپلنگ، ان کے لیے قانون لانے کے قابل عزت فرض پر رطب اللسان رہا تھا، جو قانون کے بغیر تھے۔ برطانویوں نے قانون بنایا اور اپنی اور دنیا کی نظروں میں، ایسا کرنے کا جواز گھڑا۔ یقیناً، برطانویوں نے قانون کے ذریعے ہی اختیارات استعمال کیے؛ لیکن جہاں برطانوی نظام قانون سے پہلے ایک نظام قانون وجود رکھتا تھا، جیسا کہ ہندوستان کے معاملے میں تھا، تو برطانوی قانون کو ایک پرانی اور زیادہ پیچیدہ تہذیب جو اپنا قانونی تمدن رکھتی تھی پر نافذ کیا گیا، اور یہیں پر کپلنگی دلائل اپنا اثر کھونا شروع کر دیتے ہیں۔

ہندوستان میں برطانوی اپنا راستہ بنانے کے لیے جبر اور ظلم کرنے پر مجبور تھے؛ اکثر اوقات سول سوسائٹی کی دوبارہ صورت گری کرنے کے عمل میں، انھیں متروک شدہ سابقہ طریقوں کے ساتھ ساتھ روایتی بندوبست بھی اختیار کرنا پڑتے۔ جیسا کہ ایک برطانوی سکالر نے لکھا ہے، ان حالات میں، 'یہ بامشکل ہی کہا جا سکتا ہے کہ جو قانون نافذ کیا گیا اس نے نوآبادیات کے عوام کے مفادات کی نگہبانی کی ہو گی'۔

ہندوستان میں برطانوی سامراجیت کے ورثے میں، عموماً سب سے اعلیٰ مقام سلطنت کی طرف سے ہندوستان کو قانونِ تعزیرات عطا کرنے کو دیا جاتا ہے، جسے میکالے نے 'مفتوحہ نسل کے لیے قانون سازی' کے تسلیم شدہ مقصد کے ساتھ تیار کیا، اور 'جس تک ہمارے آئین کی برکتیں ابھی تک بھی محفوظ طریقے سے نہیں پہنچ سکیں'۔ میکالے تین سال تک اونچی دیواروں کے پیچھے بیٹھا رہا، ان لوگوں سے مکمل قطع تعلق کیے جن کے لیے بظاہر وہ کام کر رہا تھا، اور ایک فوجداری قانون کا ضابطہ تیار کیا 'جو فلسفہ قانون کا ایک متن تھا، جو ہر کسی کے لیے لکھا گیا اور کسی کے لیے بھی نہیں، جس کا سابقہ ہندوستانی قوانین اور دوسری ساخت کی حکومتوں کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا'۔ حتیٰ کہ برطانوی بھی اس کی کوششوں کے بارے میں ابہام کا شکار تھے، اور میکالے کا تعزیراتی قانون، 1837 میں جب اس نے یہ مکمل کیا، اس کے بعد چوبیس سال تک پاس نہ ہو پایا آخر کار 1861 میں یہ قانون وضع ہوا، اور ابھی تک یہ پوری وکٹورین آب و تاب کے ساتھ کافی حد تک رائج ہے۔ مزید یہ کہ، برطانویوں نے جیوری کے ذریعے مقدمہ، اظہار رائے کی آزادی اور طے شدہ قوانین کے مطابق انصاف کے اپنے تصورات متعارف کروائے۔ یہ غیر متنازعہ قانونی اقدار ہیں، بجز اس کے کہ اگر ان کا اطلاق ان کے حقیقی معنوں میں کیا گیا ہوتا، نوآبادیاتی دور کے دوران، قانون کی بالادستی پوری طرح غیر جانبدار نہیں تھی۔

برطانوی ہند میں انصاف بالکل بھی اندھا نہیں تھا؛ یہ مدعاعلیہ کی جلد کے رنگ بارے بہت چوکس تھا۔ ہندوستانیوں کے خلاف گوروں کے کیے گئے جرائم پر کم سے کم سزا دی جاتی؛ ایک انگریز جس نے اپنے نوکر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا، کو چھ ماہ قید اور معمولی جرمانہ (اس وقت تقریباً 100 روپے) کی سزا دی گئی، جبکہ ایک انگریز عورت کے ساتھ اقدام ریپ کے ہندوستانی مجرم کو بیس سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے پہلے 150 سالوں میں محض مٹھی بھر انگریزوں کو قتل میں مجرم ٹھہرایا گیا۔ انگریز کے ہاتھوں ہندوستانی کی موت ہمیشہ ایکسیڈنٹ ہی ہوتی، اور ایسا انگریزوں کے ساتھ ہوتا تو ہندوستانیوں کے افعال

ہمیشہ مہلک جرائم ہوتے۔ ہندوستانی ججوں کو نسلی امتیاز کا سامنا کرنا پڑتا، جیسا کہ ہم جسٹس سید محمود کے واقعہ میں دیکھ چکے ہیں۔ جب لارڈ رپن ___ واحد انسان صفت، نسلی امتیاز کے بغیر وائسرائے جسے انیسویں صدی میں ہندوستان بھیجا گیا ___ نے ہندوستانی ججوں کو اجازت دینے کی کوشش کی کہ برطانوی مدعاعلیہان کا مقدمہ سنیں اور میونسپل کے معاملات میں اہم کردار ادا کریں (البرٹ بل کے ذریعے)، تو جوابی ردعمل بہت شدید تھا۔ اس کے ماتحتوں نے احتجاج کیا کہ اس طرح 'بنگالی بابوؤں کو ان کے سکولوں اور نالیوں پر بحث کی اجازت دینا کہیں برطانوی سلطنت کو تہس نہس نہ کر دے'، لیکن جہاں تک برطانویوں کا تعلق تھا تو انھیں، نہ ہی عدالتوں کا اور نہ ہی میونسپلٹیوں کا میدان، ہندوستانیوں کی شمولیت کے لیے قابل قبول تھا۔ برطانوی تارکین وطن نے رپن کا بائیکاٹ کیا اور نسل پرستانہ آہ و زاری کے نتیجے میں البرٹ بل کا خاتمہ ہو گیا اور رپن کو قبل از وقت اس کے عہدے سے فارغ کر دیا گیا۔

برطانوی نو آبادیاتی عدالتوں میں ایک خاص قسم کے کیسز کافی تعداد میں سامنے آتے رہے۔ بہت سے ہندوستانی جن کی تلی ملیریا (یا کسی دوسری بیماری) کے نتیجے میں بڑھی ہوئی ہوتی؛ جب کوئی برطانوی آقا اپنے مقامی ملازم کے معدے پر لات مارتا ___ ان دنوں یہ کوئی غیر معمولی قسم کا برتاؤ نہیں تھا ___ ہندوستانی کی بڑھی ہوئی تلی پھٹ جاتی، اور اس کی موت کا باعث بنتی۔ قانونی سوال یہ تھا کہ: کیا اس طرح مہلک لات مارنا قتل کے زمرے میں آتا ہے یا پھر غفلت مجرمانہ کے؟ جب رابرٹ آگسٹس فلر نے 1875 میں انھی حالات میں اپنے ملازم پر جان لیوا حملہ کیا ___ فلر کا دعویٰ تھا کہ اس نے اسے چہرے پر مارا تھا، لیکن تین گواہوں نے شہادت دی کہ اس نے اسے معدے پر لات ماری تھی ___ اسے صرف 'عمداً مجروح کرنے' کا قصوروار ٹھہرایا گیا اور پندرہ دن قید یا بیوہ کو ادا کرنے کے لیے تیس روپے جرمانہ کی سزا دی گئی۔ (کورونر کے مطابق، ملازم کی تلی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ ہلکے سے تشدد سے بھی پھٹ جاتی۔)

کیپٹن سٹینلے ڈی ویر جولیس نے 1903 میں اپنے 'نوٹس آن سٹرائیکنگ نیٹوز' میں لکھا، 'گرمیوں میں آدھی رات کے وقت، پنکھا رک گیا، اور بیرک والے کمرے میں ایک آدمی گرمی اور جگراتے سے اکتایا ہوا اٹھا، نتائج سے بے پرواہ آگے بڑھا، اور پنکھا جھلنے والے کو غلط جگہ، اس کی تلی پر لات ماری۔ کیا آپ اسے الزام دیں گے؟ ہاں یا نہیں۔ اس کا انحصار جزوی طور پر اس بات پر ہے کہ کہیں وہ جوتے پہننے کے لیے تو نہیں رکا تھا'۔ کچھ نے تو 'مضبوط برطانوی بوٹ' پر پورا قصیدہ لکھا، مقامیوں کو سیدھا رکھنے کے لیے پسندیدہ ہتھیار۔ درحقیقت یوں:

آؤ ہم گائیں، آؤ ہم چلائیں چمڑے کے نعل دار پاؤں کے لیے، / اور اپنے پرچموں پر نقش کریں، "مضبوط برطانوی بوٹ"۔'

ہندوستان میں برطانوی ججوں کا کسی بھی ہندوستانی کے قتل میں انگریزوں کو مجرم قرار دینے سے گریز، کا دلچسپ انعکاس، وکٹورین لندن میں قتل کے الزامات میں درج شدہ کمی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مارٹن وینر نے ایک 'برآمدی' ماڈل تجویز کیا: اس کا خیال تھا کہ برطانیہ میں قتل کی شرح کم ہوئی ہے کیونکہ 'سب سے زیادہ فسادی شہری سمندر پار بربادی پھیلانے میں مصروف تھے'۔ یقیناً اس کی تائید ہوتی ہے، کہ لندن میں مہلک لات مارنے کے معاملے سے قتلِ عمد کے طور پر نمٹا جاتا جبکہ ہندوستان میں محض 'مضروب کرنے' یا 'ناعاقبت اندیشانہ اور لاپرواہانہ عمل کرنے' کا الزام لگایا جاتا__ بشرطیکہ اس کا شکار کوئی ہندوستانی ہوا ہو۔

یہ سچ ہے کہ، بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ہندوستانی نیشنلسٹوں کی طرف سے دہشت گردی کا خطرہ تھا، شاید مقامیوں کے خلاف گوروں کے تشدد کے کیسز کا فیصلہ کرنے میں ججوں پر اس کے اثرات بھی مرتب ہوئے ہوں۔ لیکن یورپینوں کے ہاتھوں ہندوستانیوں کی زیادہ تر اموات میں سوادیشی بمب پھینکنے والوں کی بجائے ملازمین یا دوسرے احقر تھے اور ان کے کیسز سیاسی دہشتگردی سے جڑے ہوئے نہیں تھے۔ ہنوز، کسی انگریز کے قاتلانہ اطوار کی شدت کم کرنے کے لیے حالات و واقعات میں مبالغہ کیا جاتا ہے۔ جب ایک ہندوستانی لڑکے کو بنگلور میں لیفٹیننٹ تھامپس اور نیو نے گولی مار کر ہلاک کر دیا اور ہندوستانی دیہاتیوں نے زبردستی نیو کی بندوق ضبط کر لی، تو یہ دو دیہاتی تھے جنہیں، گورے کے ہتھیار میں تصرف بے جا کے جرم میں، چھ ماہ قید کی سزا سنائی گئی، جبکہ قاتلوں کی سزا سے گریز کیا گیا۔ درحقیقت کیس درج ہی 'یورپیوں کے خلاف مقامیوں' کی واردات کے طور پر کیا گیا تھا۔

برطانوی ججوں نے جو سزائیں سنائیں وہ ہندوستانی اور یورپیوں کے لیے برابر نہیں تھیں: کلکتہ میں، ایک اندازے کے مطابق ہندوستانی قیدیوں کی سزائیں، ایک ہی جرم کے لیے یورپیوں کی نسبت 10 گنا زیادہ تھیں۔ ہندوستانی مدعاعلیہان نے متشدد جرائم کے لیے یورپیوں کی نسبت دوگنا سے بھی زیادہ قتل اور اقدام قتل کے الزامات کا سامنا کیا۔ شماریاتی لحاظ سے، ہندوستانیوں پر یورپیوں کے حملے یورپیوں پر ہندوستانیوں کے حملوں کی نسبت بہت زیادہ تھے، پھر بھی ثانی الذکر تقریباً تمام پر قتل کا الزام عائد کیا گیا جبکہ زیادہ تر یورپیوں کے جرائم کو حادثاتی یا پھر ذاتی دفاع خیال کیا گیا، اور کسی بھی کیس میں قتل کو جسمانی حملے کی سطح پر گھٹا دیا گیا۔ ایک کیس

جس میں برطانوی جج کو شہادت مل گئی کہ ایک جرم 'واضح طور پر' قتل تھا، تو برطانوی قاتل کو فاتر العقل قرار دے دیا گیا لہٰذا وہ اپنے اعمال کے لیے ذمہ دار نہیں تھا۔

تمام برطانوی اس قسم کے نظامِ انصاف پر یکساں مطمئن نہیں تھے۔ 1902 میں، جب نویں لانسرز کے تین فوجیوں نے سیالکوٹ میں ایک ہندوستانی کو رات گزارنے کے لیے انھیں ایک عورت مہیا کرنے سے انکار پر مار مار کر ہلاک کر دیا، تو رجمنٹ کے افسران نے تفتیش کے لیے کوئی سعی نہیں کی اور انھوں نے کوشش کی کہ نشانہ بننے والے کو شرابی کے روپ میں پیش کر کے جان چھڑوائی جائے۔ لیکن اس واقعہ سے ہندوستان میں رہنے والے برطانویوں کی کافی زیادہ تعداد برہم ہوئی۔ حتیٰ کہ وائسرائے لارڈ کرزن، جو خود بھی ہندوستانیوں کا خیر خواہ نہیں تھا، اتنا خوفزدہ ہوا کہ اسے اعلان کرنا پڑا: 'کسی غلط معاملے میں، جو اس ملک میں بہت زیادہ ہیں، کو بیہودگی سے کھیلنے میں، یا اس نظریے میں کہ ایک گورا ایک کالے کو، آزادی کے ساتھ لاتیں مار کر یا پیٹ کر محض اس وجہ سے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے کہ وہ ایک بدقسمت نیگرو ہے، میں فریق نہیں بنوں گا'۔ کرزن سزا تو نہیں بڑھا سکتا تھا، لیکن اس نے ملوث پوری برطانوی رجمنٹ کو عدن ٹرانسفر کر دیا۔ اس کے باوجود، چند ہفتوں بعد اسے مجبور کیا گیا کہ وہ دہلی میں بے حسی سے وہ پریڈ دیکھے، جس میں ہجوم کا برطانوی دھڑا جب وہی رجمنٹ سلامی پیش کرتی تو اس کے حق میں خودسرانہ نعرے لگاتا۔ اگر تمام عوام کے، کرزن کو، ہندوستانیوں کے بارے میں ہمدردانہ بیان دینے پر مجبور ہونا پڑا، تو اس سے مسئلے کی شدت کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

ایک محقق جورڈانا بیلکن بیان کرتا ہے کہ اس نسلی بنیادوں پر انصاف کی اقدار میں چند مستثنیات تھیں (اگرچہ بہت ہی کم)۔ تین غیر معمولی کیسوں میں، انگریزوں کو ہندوستانیوں کے قتل میں سزائے موت دی گئی: جان رُد کو بنگال میں (1861)، ولسن، اپوسل، نکولس اور پیٹر نام کے چار ملاحوں کو بمبئی میں (1867)، اور جارج نیرنس کو بنگال میں (1880)۔ لیکن برطانوی حکمرانی کے دو سو سالوں میں، اور ہزاروں کیس جن میں ہندوستانی اپنے نوآبادیاتی آقاؤں کے ہاتھوں مارے گئے، یہ تین کیس محض استثنات تھے۔ عمومی تاثر تھا کہ برطانوی سویلین جج اور مضافاتی مجسٹریٹس یورپیوں کو سزا دینے میں ہچکچاتے تھے، جبکہ فوجی عدالتیں اور شہری ہائی کورٹس، ہندوستانیوں پر حملے کے لیے نسبتاً زیادہ سخت سزائیں دینے پر آمادہ ہوتے۔ ایک آئی سی ایس آفیسر، جس نے انیسویں صدی کے اواخر میں تیس سال تک خدمات انجام دیں، کے مطابق، 'عوام اور عدالتوں کے مابین بہت بڑا اور خطرناک خلا ہے، اور اسے پاٹنے کا کوئی طریقہ نہیں'۔

اعتدال پسند قوم پرست میگزین پربھات، دسمبر 1925 کی اشاعت میں، ایک انگریز کے ہندوستانی کو لاتیں مار کر قتل کرنے سے بریت اور رہائی پر لکھنے کے بعد، یوں ماتم کناں ہوا:

ہندوستانی برطانوی حکمرانی سے نالاں کیوں ہیں کا جواب اس طرح کے واقعات میں تلاش کرنا ہو گا۔ ہندوستانی جانوں سے ایسا تکلیف دہ اغماض، کچھ اور نہیں محض ہر ہندوستانی کے دل پر ایک گہرا نشان ثبت کرے گا، اور کوئی اچنبھا نہیں کہ مہاتما گاندھی کی اہنسا کی مسلسل نصیحت کے باوجود، فریب خوردہ ہندوستان میں انقلابی سازشیں سنائی دیں۔ جب تک بوٹ اور تلی کا یہ تعلق برقرار رہے گا، ہندوستان اس دنیا کا سب سے زیادہ اچھوت اور گھٹیا ملک رہے گا۔

سامراجی نظامِ قانون ایک غیر ملکی نسل نے بنایا اور ان مفتوحہ لوگوں پر لاگو کیا، جن سے اس کے بنانے میں کسی قسم کی مشاورت نہیں کی گئی۔ یہ خالص اور بلاشبہ نو آبادیاتی کنٹرول کا ایک آلہ تھا۔ جیسا کہ ہنری نونسن نے بھی بیان کیا ہے کہ قانون کی حکمرانی، جیسا کہ یہ تھی، ایک ایسے نظام میں کام کرتی تھی جس میں ہندوستانیوں کو 'سرکاری نگرانی کے ایسے نظام کے تحت مستقلاً رہنے پر مجبور کیا جاتا تھا، جس میں ان کے نجی خطوط پڑھے جاتے تھے، ان کے ٹیلیگرام روکے جاتے، اور ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے آدمی بھرتی کیے جاتے'۔

اور پھر بھی یہ قانون کی بالادستی تھی، انگریزوں نے ہمیں یہی پڑھایا ___ ہمیں بہت کچھ اَن سیکھا کرنا پڑے گا۔

دوسرے مسائل بھی ہیں۔ نو آبادیاتی 'قانون کی حکمرانی' گورے آباد کاروں، اشرافیہ اور مردوں کے حق میں کام کرتی تھی۔ نسلی امتیاز قانونی تھا: جیسا کہ ہم نے دیکھا، محض گوروں کے لیے کھولے گئے کلبوں کے ساتھ ساتھ، کافی سارے برطانوی ہوٹلوں اور دوسری عمارتوں پر 'ہندوستانیوں اور کتوں کا داخلہ ممنوع ہے'، جیسی تحریری علامتیں تھیں۔ (انھی میں سے ایک، واٹسن ہوٹل بمبئی سے نکالے جانے کا تجربہ تھا، جس نے جمشید جی ٹاٹا کو اس وقت کے، دنیا کے عمدہ اور آسودہ ترین ہوٹلوں میں سے ایک، تاج محل تعمیر کرنے پر مائل کیا، جو ہندوستانیوں کے لیے کھلا ہوا تھا)۔

عورتوں کے ساتھ وکٹورین پدریت کا سلوک کیا جاتا نہ کہ تھوڑی بہت عورت بیزاری کا۔ مثلاً، ادارہ جاتی طور پر، مالابار ساحلوں پر خواتین جو مادری شجرہ کے قوانین سے فیض حاصل کرتیں اور وسیع جائیداد اور سماجی حقوق سے استفادہ حاصل کرتی تھیں، جن کی جسمانی آزادی کے بارے کیا کہنا، انھیں پدرسری زنجیروں کو

'درست' اور 'اخلاقی' طرزِ زندگی کے طور پر قبول کرنے، اور جسمانی، سماجی اور معاشی طور پر خود کو اپنے خاوندوں اور بیٹوں کے ماتحت رہنے پر مجبور کیا گیا۔ (جنوبی ہند کی عورتوں نے، جن کے پستان رواجی طور پر برہنہ ہوتے تھے، نے خود کو وکٹورین معیارات کی پارسائی سے مطابقت کی ہتک جھیلنے پر مجبور پایا؛ جلد ہی پستان ڈھانپنے کا حق اونچی ذات کی حرمت کی علامت بن گیا اور نچلی ذات کی عورتوں کو اس استحقاق سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی، جو مشنری متاثرہ نوآبادیاتی جستجو پر منتج ہوئی، جیسا کہ ٹراونکور اور مدراس پریزیڈینسی میں 1813 سے 1859 تک پستانی جامہ ایجیٹیشن۔) ہندوستان کا جنسی زیادتی کا قانون نوآبادیاتی دور کے تعزیرات ہند سے ماخوذ ہے، جو 'اچھے کردار' اور ریپ ہونے کے ثبوت کا بار، زیادتی کے شکار پر ڈالتا، جو اسے غیر معتبر بنانے کے لیے مخالف وکیل کے نشانے پر لے آتا تھا۔ وہ رسوائی، جس کا سزاوار، یہ نظام زیادتی کے شکار کو ٹھہراتا تھا، اس کے نتیجے میں اکثر ریپ کبھی رپورٹ ہی نہیں ہو پاتے تھے۔

چونکہ قانون کی بالادستی کا مقصد ہندوستان پر برطانوی قبضے کا دوام تھا، اس لیے اسے سامراجی حکمرانی کے آلے کے طور پر بنایا گیا تھا۔ سیاسی اختلافات کو مختلف ضابطوں کے ذریعے قانوناً دبایا جاتا۔ تعزیراتی قانون میں ریاست سے اختلاف کے متعلقہ جرائم کی انچاس شقیں شامل تھیں (اور موت سے متعلقہ جرائم کی صرف گیارہ)۔

نوآبادیاتی ریاست کی نسل پرستی تعزیراتی قانون میں بھی منعکس ہوتی تھی۔ جرائم پیشہ قبائل کی قانون سازی (کریمینل ٹرائب لیجیسلیشن) 1911 نے برطانویوں کو، نقل و حرکت محدود کرنے، اور مخصوص گروہوں کے لوگوں کی تلاش اور حتیٰ کہ حراست کا اختیار دے دیا، کیونکہ ان کے ممبران بارے قیاس تھا کہ وہ عادی طور پر 'مجرمانہ' سرگرمیوں میں ملوث رہتے تھے۔ یہ بری سماجیات اور بدتر قانون تھا، لیکن یہ آزادی کے بعد تک کتابوں میں رہا۔ بدتر، اس کے اثرات غیر انسانی تھے۔ محقق سنجے نیگم کی تصنیف یہ بتاتی ہے کہ کیسے 'جرائم پیشہ قبائل' کے تصور کی برطانوی اختراع، اور اس کیٹیگری کو مستحکم کرنے کے لیے ان کی قانون سازی، جو نجی تفصیلات میں بے جا مداخلت کے ریکارڈ جمع کرنے، ان قبائل کے ممبران کی نقل و حرکت پر پابندیوں، 'جرائم پیشہ قبائل' سے تعلق رکھنے والے افراد کی دیہی آبادکاری یا اصلاحی کیمپس میں جبری منتقلی، اور والدین سے ان کے بچوں کی عمداً علیحدگی، پر منتج ہوئی۔

یقیناً، عدالتی نظام، تعزیراتی ضابطہ، فلسفہ قانون کی تکریم اور نظام انصاف کی قدر و قیمت __ چاہے

نوآبادیاتی دور میں ان کا اطلاق ہندوستان میں مناسب انداز میں نہ کیا گیا ہو__ پھر بھی یہ تمام قابل قدر میراث ہیں اور ہندوستانی انھیں پا کر بہت خوش ہیں۔ لیکن اس عمل میں برطانیہ نے ہمارے اوپر ایک مخاصمانہ نظام قانون لاد دیا، ضابطے کے قواعد میں انتہائی سست رو، جو کہ ہندوستان کے روایتی نظام قانون سے بالکل کٹا ہوا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ روایتی نظام جیسا کہ شمال کی کھپ پنچایت کی اپنی سخت حدود و قیود تھیں اور اکثر اوقات بے انصاف سماجی نظم کو برقرار رکھنے کے لیے استعمال ہوتیں، لیکن جیسا کہ روانڈا نے اپنی گاکاکا عدالتوں کے ساتھ دکھایا، روایتی نظام، ضابطے کی غیر ضروری تاخیر، رسمیت اور مغربی نظام کے اخراجات کے بغیر بھی، انصاف کی ماڈرن اقدار سے مطابقت اختیار کر سکتا ہے۔ نوآبادیاتی میراث سے مراد مقدمات کا ایک نا مختتم اور لمبے عرصے سے زیر سماعت کیسز کا نظام ہے، جس نے ہندوستان کو عدالتی ذخیرے کے ناقابل رشک ورلڈ ریکارڈ کے ساتھ چھوڑا جو کہ دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک سے بہت زیادہ ہے۔ (ہندوستان کی بعض چھوٹی عدالتوں میں ایسے کیسز آج بھی زیر سماعت ہیں جو برطانوی راج کے دنوں میں فائل کیے گئے۔)

عدم مداخلت یا ہیرا پھیری

برطانوی نوآبادیت کی خیر اندیشی کے لیے (دیے گئے) دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ برطانوی، ایک حد سے آگے، عموماً عدم مداخلت والے حکمران تھے، جنھیں ہندوستانی عوام کے مقامی معاملات میں مداخلت کی کوئی خواہش نہ تھی، جن کا اعتقاد تھا کہ ہندوستانی رسوم ورواج چاہے کتنے ہی "گھناؤنے" اور "فرسودہ" کیوں نہ ہوں، لازماً ان کی تکریم کی جانی چاہیے۔ جیسا کہ ملکہ کا 1858 کا اعلامیہ سادگی سے یہ بیان کرتا ہے:

> ہم اپنے شاہی فرمان اور پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں کہ__ کسی کے مذہبی عقائد اور ان کی پیروی کے باعث کسی کے ساتھ بدسلوکی یا کسی کو نااہل قرار نہیں دیا جائے گا؛ ہاں البتہ سب قانون کے تحفظ سے مساوی اور غیر جانبدارانہ طور پر برابر لطف اندوز ہوں گے، اور ہم تاکیداً انھیں یہ ہدایت اور فرمان جاری کرتے ہیں جو ہمارے ماتحت صاحب اختیار ہیں کہ وہ ہماری رعیت کے کسی بھی فرد کے مذہبی عقائد و عبادات میں کسی قسم کی بھی مداخلت سے باز رہیں، ہماری انتہائی ناپسندیدگی کا خطرہ مول لے کر (اگر ایسا ہوا تو)۔

چونکہ برطانویوں نے نہ تو سپین کی صلیبی عیسائیت سے اور نہ ہی فرانس کے تہذیبی ولولے سے تحریک حاصل کی تھی، بلکہ محض دولت کی لالچ سے، لہٰذا وہ ہندوستانی سماج کی کایا پلٹنے یا اسے اپنے تصور کے مطابق بنانے

کے لیے غیر ضروری طور پر فکر مند نہ تھے۔ یہ کافی حد تک درست ہے کہ برطانوی نسل پرستی، عیسائی برتری کے یقین کامل کا اظہار تھا: جیسا کہ ولیم ولبر فورس، برطانیہ کا سب سے معروف انا جیلی عیسائی اسے پیش کرتا ہے:

'ہمارا مذہب پُر شکوہ، خالص اور کریم النفس ہے۔ اور ان کا (مذہب) رذیل، اخلاق باختہ اور کٹھور ہے'۔

بہت سے برطانویوں کے لیے، سامراجیت بنیادی طور پر ہندوستانیوں کو 'جہالت، بت پرستی اور بدی' سے نجات دلانے کے لیے اخلاقی جہاد (عیسائی جہاد، کروسیڈ) کے طور پر جائز تھی۔ لیکن اس پر عمل پیرا ہونے میں وہ پوری طرح پس و پیش کرتے تھے۔ مثال کے طور پر، جہاں پرتگیزیوں نے گوا کو بہت تیزی سے عیسائی بنایا، وہیں برطانوی 1813 تک اپنا پہلا بشپ نہیں لا سکے۔ جان ولسن لکھتا ہے، ہندوستان میں برطانوی طاقت کا پہلا اور عموماً واحد مقصد 'ہندوستانی سرزمین پر برطانوی موجودگی کی حقیقت کا دفاع کرنا تھا'۔ اکثر سامراجیوں کے لیے ہندوستان ایک ذریعہ معاش تھا، نہ کہ مذہبی جنگ۔ مقصد، ہندوستان کو بدلنا نہیں تھا؛ بلکہ ہندوستان سے دولت حاصل کرنا تھا۔ جیسا کہ انگس میڈیسن بیان کرتا ہے، 'گاؤں کی معاشرت، ذات پات کے نظام، اچھوتوں کی حیثیت، مشترکہ خاندانی نظام، یا زرعی پیداواری طریق میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی'۔ وہ مکمل طور پر درست نہیں: درحقیقت، جیسا کہ ہم دیکھیں گے، ذات پات کا نظام قبل از نو آبادیاتی ہندوستان کی نسبت برطانویوں کے ماتحت مزید مضبوط ہوا۔ پھر بھی برطانوی، ستی (خاوند کی چتا پر بیواؤں کا خود کو قربان کرنا، جو اس حقیقت کی وجہ سے مزید بدنما ہو جاتا ہے کہ ان میں سے بہت سی قربان ہونے والی نوجوان لڑکیاں خود سے بہت زیادہ بوڑھے مردوں سے بیاہی گئی تھیں) اور ٹھگی (کالی دیوی کے نام پر مجرموں کے گروہ کی ڈکیتی اور قتل کرنے کی رسم جس نے انگریزی زبان کو مشترکہ اسم، ٹھگ دیا) کی وحشیانہ رسم ختم کرنے کا کریڈٹ لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی سماجی رسوم میں مداخلت تب کرتے جب ایسا کرنا ان کے موافق ہوتا۔ آفاقیت کے لبرل اصولوں اور انصاف و حکمرانی کے حقیقی نو آبادیاتی بندوبست کے درمیان وسیع خلیج حائل تھی۔ میں کتاب میں اس کے بعد برطانوی سماجی اصلاحات کے کچھ اور گمراہ کن دعووں پر بات کروں گا؛ میں یہاں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ برطانویوں نے مقامی رسوم میں مداخلت تب کی جب ایسا کرنے کو ان کا دل کیا، دوسری صورت میں اس سے باز رہے، اور ہر دو صورتوں میں نیک نامی کے دعویدار رہے۔

نظامِ قانون کی تدوین اور تعزیراتِ ہند جاری کرنے کے عمل میں، برطانویوں نے ہندوستان کو نو آبادیاتی دور کے اُن تعصبات سے بھر دیا جو کہ وہ اپنے وطن میں عرصۂ دراز سے ترک کر چکے تھے لیکن جس کی

لکیریں ہندوستان میں کھینچی گئیں، جو لاکھوں لوگوں کے لیے ان کہی بدحالی کا باعث بنیں۔ ہندوستان میں 2006 میں متعدد تند تنازعات، جو بظاہر غیر متعلقہ تھے، لیکن ایک عنصر جو ان سب میں مشترک تھا جس نے بہت زیادہ توجہ حاصل کی ــــــ وہ تمام فوجداری جرائم سے متعلقہ تھے جنھیں نو آبادیاتی دور میں برطانوی قانون سازی میں مدون کیا گیا جس سے ہندوستان آگے بڑھنے میں ناکام یا نارضامند ثابت ہوا۔

دوسری باتوں کے ساتھ (اور یہ صرف چند مثالیں ہیں) برطانوی سامراجی حکمرانوں کا انیسویں صدی کے وسط میں تیار کردہ تعزیرات ہند کا مسودہ، جو ہم جنس پرستی کو سیکشن 377 کے تحت جرم قرار دیتا ہے؛ 'بغاوت' کا ایک جرم بھی اختراع کرتا ہے جس کے تحت نعرے بازی کرنے والے طلباء کو گرفتار کیا جا سکتا ہے؛ اور ارتکاب زنا کے بارے میں دہرے معیار کا اطلاق کرتا ہے۔

'بغاوت' کے سفاکانہ تصور کی بطور ایک جرم 1870 میں قانون سازی کی گئی تا کہ برطانوی پالیسیوں پر تنقید کو دبایا جا سکے۔ تعزیرات ہند کی دفعہ 124 اے کے تحت، کوئی بھی شخص جو 'الفاظ، اشاروں یا واضح اظہار کو حکومت کے خلاف کشیدگی کو ہوا دینے کے لیے' استعمال کرتا، اس پر بغاوت کا الزام لگایا جا سکتا ہے اور امکانی طور پر عمر قید کی سزا سنائی جا سکتی ہے۔ اس وقت ایک مطیع ریاست میں آزادی اظہار پر پابندی کو بنیاد بنا کر، اس نظریہ کے شارحین اسے واضح طور پر جائز قرار دے رہے تھے۔ 1870 میں ایک برطانوی نے صاف گوئی سے 'بغاوت کے جرائم جن میں مطلق امن شکنی شامل نہ ہو' کی روک تھام کی ضرورت پر گفتگو کی۔ دوسرے الفاظ میں، ہندوستانیوں کے لیے کوئی آزادی اظہار نہیں۔

جب 1898 میں قانون میں مزید سختی کی گئی، اسے انگلینڈ کی نسبت زیادہ بے رحم بنانے کے لیے، تو بنگال کے برطانوی لیفٹیننٹ گورنر نے تسلیم کیا: 'یہ واضح ہے کہ بغاوت کا ایک قانون جو ایسے لوگوں کے لیے موزوں ہو جن پر ان کی اپنی قوم اور اعتقاد کے لوگوں کی حکومت قائم ہو، وہ شاید ان لوگوں کے لیے ناموزوں یا کسی حد تک نامناسب ہو، جن پر غیر ملکی حکمران ہوں'۔

لہٰذا واضح تھا کہ بغاوت کو ہندوستانی قوم پرستوں کو خوفزدہ کرنے کے ہتھیار کے طور پر وضع کیا گیا: مہاتما گاندھی اس کے سب سے بڑے شکاروں میں سے تھے۔ جمہوری ہندوستان میں اس کا اطلاق ہوتے دیکھ کر بہت سے ہندوستانیوں کو دھچکہ لگا۔ فروری 2016 کو ایک سزا یافتہ دہشت گرد کے شریک جرم کی پھانسی کی سزا کے خلاف احتجاج کے دوران (جے این یو) جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی کے طلباء کے، ہندوستان مخالف نعروں کی

وجہ سے، بغاوت کے الزامات میں گرفتاری، اور اگست 2016 میں ایمنیسٹی انٹرنیشنل کے خلاف انھی الزامات کی بنیاد پر ایف آئی آر کا اندراج، بے لگام اور نو آبادیات سے تحریک یافتہ الفاظ پر بنی قانون کے بغیر ممکن نہ ہوتا۔

بطور ممبر پارلیمنٹ، قانون میں نو آبادیاتی دور کی دفعات کے خلاف برہمی سے متفق ہوتے ہوئے، ان قوانین میں ترمیم کے لیے، میں نے ایوان زیریں میں بل پیش کیا۔ میری دلیل تھی کہ قانون کی کتابوں میں ان دفعات کی موجودگی نے ہندوستانیوں کے آئینی حقوق سلب کرنے کے ذریعے، ہمارے تعزیراتی قانون کو صاحبان اقتدار کے ہاتھوں نامناسب استعمال کے مستوجب بنا چھوڑا ہے۔ میرا بل کسی فرد پر بغاوت کا الزام صرف تب ہی عائد کرنے کے حق میں تھا جب اس کے الفاظ یا اعمال کا براہ راست نتیجہ تشدد یا تشدد کی ترغیب یا ایسے جرم کا ارتکاب ہو جس کی سزا تعزیرات ہند کے تحت عمر قید ہو__ جیسا کہ قابل مواخذہ قتل، قتل عمد اور ریپ۔ محض حکومت کے اقدامات یا انتظامی افعال پر تنقید کرنے والے الفاظ یا اشارے بغاوت کا جرم تشکیل نہیں دے سکتے۔ میرا مقصد تشدد پر ابھارنے والے الفاظ کے استعمال کے خلاف پیش بندی کی یقین دہانی کے ساتھ ساتھ، آزادی اظہار اور حکومت کے خلاف اختلاف رائے کے حق کی ترویج تھا__ حق انتخاب جو کہ ہندوستانیوں کو برطانوی حکومت کے ماتحت دستیاب نہیں تھا۔

اسی طرح تعزیرات ہند کی دفعہ 377 کا قانون 1860 میں وضع کیا گیا، جو 'فطری عمل کے خلاف شہوانی اختلاط' کو جرم قرار دیتا ہے__ ایک اصطلاح جو اتنی قدیم ہے کہ اکثر جدید معاشروں کی تضحیک کو دعوت دے گی۔ ہندوستانی کلچر اور سماجی سرگرمیوں میں ہم جنس پرستی کے خلاف کوئی ٹیبو کبھی بھی نہیں تھا__ حتیٰ کہ برطانوی وکٹورین نے یہ متعارف کروایا۔ اس حد تک کہ دفعہ 377، خلوت میں بالغوں کے رضامندانہ جنسی افعال کو جرم ٹھہراتی ہے، یہ آزاد ہندوستان کے آئین کے آرٹیکل 21 (زندگی اور آزادی بشمول خلوت اور عزت نفس)، آرٹیکل 14 (قانون کے سامنے برابری) اور آرٹیکل 15 (امتیازی سلوک کی مناہی) کے تحت ضمانت کردہ بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔

دفعہ 377 میں میری ترمیم، کسی بھی جنس اور ترجیح کے رضامند بالغان کے مابین جنسی عمل کو قانوناً جائز قرار دے چکی ہوتی۔ تاہم حکومتی پارٹی بی جے پی کے قدامت پسند ایم پیز نے پارلیمان میں یہ بل پیش کرنے کے خلاف ووٹ دیا، انھوں نے ایل جی بی ٹی کے ایکٹیوسٹوں کو سپریم کورٹ کو تحریک دینے پر آمادہ کیا، جو کہ قانون

کی حمایت میں اپنے پہلے فیصلے کے خلاف 'اصلاحی نظر ثانی' کی پٹیشن سننے کے لیے تیار تھا۔ درحقیقت عدلیہ کا راستہ، شاید، تعزیراتی ضابطے کی اس سیاہ کارشق کو منسوخ کرنے کا بہتر طریقہ پیش کرے۔ اٹھاون ہندوستانیوں کو محض دو سالوں (2014 اور 2015) میں، اپنے گھروں کی خلوت میں کیے گئے افعال کی بنا پر گرفتار کیا گیا۔ یہ اٹھاون ہندوستانی بہت زیادہ ہیں۔

مضحکہ خیز بات تو یہ ہے کہ ہندوستان میں ہمیشہ مختلف جنسی شناختوں اور جنسی رجحانات کے لوگوں کے لیے قبولیت رہی ہے۔ ہندوستانی تاریخ اور دیومالا جنسی تفاوت کے خلاف تعصب کی کوئی مثال پیش نہیں کرتی۔ اس کے برعکس، مہابھارت کی عظیم رزمیہ میں، جنس بدلنے والی شیکھنڈی، بھیشم کو قتل کرتی ہے۔ اردھن ریشور بھگوان کو آدھے مرد اور آدھی عورت کی صورت تصور کرتا ہے، جو 1980 میں آندھرا پردیش کے مووی سٹار وزیر اعلیٰ این ٹی رام راؤ کو بطور اردھن ریشور لباس زیب تن کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور اس کے پیروکاروں کو حیران کر دیتا ہے___ ایک غیر معمولی، حتیٰ کہ سنکی عمل، جسے آج بھی ہندوستانی روایات کو کافی حد تک قائم رکھنے والا سمجھا جاتا ہے۔ ویدوں اور پرانوں کے ادب میں خواجہ سراؤں کو ناپنسک جنس سمجھا جاتا تھا، اور پوری تاریخ میں ہندوستان میں انھیں مناسب اہمیت دی جاتی تھی (اور حتیٰ کہ مغلیہ حکومت کے ادوار کے دوران اسلامی عدالتوں میں بھی)۔ جین متون، نفسیاتی جنس سے جسمانی جنس کے تفاوت کے تصور پر بات کرتے ہوئے جنسی شناخت کے ایک زیادہ وسیع تصور کو تسلیم کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے، برطانیہ کا مرتب کردہ تعزیرات ہند کا ضابطہ انسانی کردار اور انسانی حقیقت کے ان پہلوؤں کو جرم قرار دیتا ہے، جنھیں ماضی میں ہندوستان کے اندر جرم نہیں سمجھا جاتا تھا یا ان کے لیے قانونی جواز کی ضرورت نہیں تھی۔ تعزیرات ہند کی دفعہ 377 اور کریمنل ٹرائب ایکٹ 1871، خواجہ سراؤں کی کمیونٹی کے ساتھ ساتھ ہم جنس پرستوں کی کمیونٹی کو نشانہ بناتے ہیں۔ وہ غالباً کم از کم دو ہزار سال پرانی ہندوستانی تہذیبی سرگرمیوں، دیومالا، تاریخ، پرانوں اور طرزِ زندگی کی ہندوستانی روایات اور قومی اخلاق کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ہندوستان کی روایتی رواداری اور 'جیو اور جینے دو' کی بجائے انگریزوں نے، نوآبادیاتی دور کی تعبیر کہ ہندوستانیوں کے لیے کیا اچھا اور بہتر ہے، ملک پر لاد دی۔ بھارتیا سنسکرتی کے خود ساختہ محافظوں کو خزانے کے بنچوں پر اب برطانوی وکٹورین اخلاقیات کے بدترین تعصبات کے نگہبانوں کے روپ میں دیکھنا، مضحکہ خیز ہے۔

تعزیرات ہند کا ضابطہ ہم جنس پرستوں کی طرح جنسِ مخالف کی جانب کشش رکھنے والی خواتین

(straight women) کے لیے بھی کوئی بہتر نہیں۔ دفعہ 497، زنا (اڈلٹری) کو جرم قرار دیتے ہوئے، شادی شدہ خواتین کو شامل کر کے ماوراء ازدواجی تعلق کی بنا پر سزاوار ٹھہراتا ہے لیکن شادی شدہ مردوں کو نہیں۔ ایک خاوند اپنی بیوی، اور اس شخص جو اس کی بیوی کے ساتھ جنسی تعلقات رکھتا ہے کے خلاف زنا کے کیس میں قانونی چارہ جوئی کر سکتا ہے، لیکن ایک عورت اپنے شوہر کے خلاف ماوراء ازدواج تعلقات رکھنے کی وجہ سے مقدمہ دائر نہیں کر سکتی، بجز اس کے کہ اس کا ساتھی کم عمر یا شادی شدہ نہ ہو۔ اس دوہرے معیار کا بھانڈا، حالیہ مقدمات کے ایک سلسلے میں پھوٹا، اور دوبارہ اکیسویں صدی کے اخلاقی تصورات کی بجائے وکٹورین اقدار کی عکاسی ہوئی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان تینوں معاملات میں، برطانیہ اپنے قوانین کی تصحیح کر چکا ہے، لہٰذا کوئی بھی تقصیر جسے انھوں نے ہندوستان میں جرم قرار دیا تھا، برطانیہ میں غیر قانونی نہیں ہے۔ نو آبادیاتی نظام کی ایک بدترین میراث یہ ہے کہ اس کے برے اثرات سلطنت سے زیادہ دیرپا ثابت ہوئے۔

میرا مقصد ان ناانصافیوں کے دوام کے لیے محض برطانویوں کو الزام دینا نہیں۔ بلکہ برطانویوں نے ان قوانین کو متبرک بنایا، جن میں ترمیم کرنا اب خاصا مشکل ثابت ہو رہا ہے۔ ڈرامائی طور پر، ہندوستان کے سربراہ ریاست سے کسی کم رتبہ نے نہیں، بلکہ صدر پرناب مکھرجی نے ضابطہ تعزیرات ہند پر مکمل نظر ثانی کی ضرورت کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے اس کی 155 ویں سالگرہ کا انتخاب کیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ہمارا فوجداری قانون زیادہ تر 'نو آبادیاتی ضروریات پوری کرنے کے لیے برطانویوں نے بنایا'۔ ہمارے 'ہم عصر سماجی ضمیر' کی عکاسی کے لیے اس پر نظر ثانی ہونی چاہیے، جو ان بنیادی اقدار کی اہمیت اجاگر کرے جن پر ایک تہذیب کھڑی ہے، تاکہ اس کی سچی عکاسی ہو سکے۔ یہ کام ہندوستانی آج تک نہیں کر سکے، اور یقیناً یہ کوتاہی برطانویوں کی نہیں، لیکن کتابوں میں ایسے بے منصفانہ قوانین شامل کر کے، برطانیہ اپنے پیچھے ظالمانہ میراث چھوڑ گیا۔ اکیسویں صدی کے ہندوستان کے لیے یہی وقت ہے کہ حکومت کو بیڈروم سے باہر نکالے، جہاں برطانوی بے شرمی سے مداخلت کرتے تھے۔ یہ احساس بھی ایک گزرا وقت دلاتا ہے کہ ایک جاندار اور متنازعہ جمہوریت میں جائز سیاسی آراء کے تنوع کو بغاوت کے مضر قانون کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کیا جا سکتا۔

چہارم

حکومت کرنے کے لیے تقسیم کرو

چہارم

حکومت کرنے کے لیے تقسیم کرو

تقسیم کرو اور حکومت کرو، بطور نو آبادیاتی منصوبہ - ذات پات، نسل اور درجہ بندی - کمیونٹی احساسات کی اختراع - برطانوی برہمنیت - مردم شماری سے اتفاق رائے کیسے ختم کیا گیا - برطانوی نو آبادیت کی خود توجیہی - نو آبادیاتی نظام میں ذات پات کی تجسیم - ہندو مسلم دھڑے بندی - فرقہ واریت کی نو آبادیاتی ترکیب - انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ - انگریز اور شیعہ سنی تفریق - برطانوی نو آبادیاتی تعصب - گنہگاروں کے درمیان ایک درویش - جداگانہ رائے دہندگان - ہر مجدون کے معرکہ کی جانب لڑکھڑاہٹ - کانگریس کے استعفے - ہندوستان چھوڑ دو - مسلم لیگ کی تجدید - کرپس مشن - آخری معرکہ: الیکشن، انقلاب، تقسیم - پسپائی پر بات چیت - دو دفعہ ہتھیار ڈالنا: برطانیہ کی دست برداری اور کانگریس کا اطاعت قبول کرنا - ہندوستان چھوڑنا، تخلیق پاکستان - 'تقدیر سے ملاقات کا وعدہ'

اگرچہ انگریز، نمو پذیر سیاسی اداروں کی ہندوستان میں تخلیق کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن جمہوری جذبہ، مؤثر افسر شاہی اور قانون کی بالا دستی، سب پچھلے ابواب کے تجزیہ میں کھوکھلے نظر آتے ہیں، ہندوستان کے ترکے میں سیاسی وحدت چھوڑنا ان کا غالب اصرار ہے جو ان دعووں کو سہارا دیتا ہے۔ لیکن جب اوپر بیان کردہ واقعات رونما ہو رہے تھے تو ایک دوسرا برطانوی جمہوریت مخالف منصوبہ ثمر آور ہو رہا تھا، جو کسی بھی ایسے معتبر نقطہ نظر کی ساکھ ختم کر دیتا ہے جس کا دعویٰ ہو کہ برطانوی نو آبادیاتی نظام کا مقصد ہندوستان کی سیاسی وحدت تھا۔

ہندو اور مسلمان سپاہیوں نے جو 1857 میں اکٹھے بغاوت کرتے اور ساتھ ساتھ لڑتے دیکھ کر، جو ایک دوسرے کے احکامات کے تحت مجتمع ہونے کو تیار تھے اور ناتواں مغل شہنشاہ کے ساتھ مشترکہ وفاداری کا عہد لے چکے تھے، برطانویوں کے لیے خطرے کی گھنٹی بجادی، جنھوں نے اس نتیجے پر پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگایا

کہ دونوں گروہوں کو تقسیم کرنا اور آپس میں لڑانا، سلطنت کے غیر متنازعہ تسلسل کو یقینی بنانے کے لیے سب سے مؤثر طریقہ ہو گا۔ 1859 میں، بمبئی کا برطانوی گورنر لارڈ الفانسٹون، لندن کو تاکید کرتا ہے کہ 'تقسیم کر کے حکومت کرو ایک پرانا رومن مقولہ ہے، اور یہی ہمارا بھی ہونا چاہیے'۔ (وہ یقیناً درست نہیں تھا: یہ اصطلاح رومنوں نے وضع نہیں کی تھی، بلکہ مقدونیہ کے فلپ دوم نے کی تھی، اگرچہ کچھ رومن فاتحین نے اس کے ہدایت نامہ کی پیروی کی تھی۔) چند عشروں کے بعد، سر جان سٹریچے نے اس رائے کا اظہار کیا کہ 'ہندوستانی لوگوں کے درمیان معاندانہ عقائد کی موجودگی، ہندوستان میں ہماری سیاسی پوزیشن' کے لیے ضروری ہے۔

ذات پات، نسل اور درجہ بندی

اپنی تمام نوآبادیات میں، فرقہ وارانہ شناختیں اختراع کرنے اور ان میں مبالغہ آمیزی کرنے کے ساتھ نسلی بنیادوں پر انتظامی حدود قائم کرنے میں برطانویوں کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ محققین نے نظریہ سازی کی ہے کہ اس عمل کی جڑیں شاید انگریزوں کی اپنی مثالی انگلش شناخت کے کمزور ہو جانے کے خوف میں تھیں، جس کی خواہش کرنے کی ان کے نوآبادیاتی محکوموں کو اجازت نہ تھی۔ اس معاملے میں وہ فرانسیسیوں کے بالکل برعکس تھے، جن کی تہذیبی جذب کی پالیسی اس حد تک چلی گئی کہ چھوٹے افریقی اور ایشیائی بچوں کو سینیگال یا ویتنام کے سکولوں میں فرض شناسی کے ساتھ (گاؤلز، ہمارے آباءواجداد) پڑھتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔ ہندوستانی ہمیشہ رعایا تھے نہ کہ شہری؛ سلطنت کے پورے دور میں، کسی ہندوستانی کی جسارت نہ تھی کہ وہ کہہ سکتا 'میں برطانوی ہوں' جس طرح ایک فرانسیسی افریقی کی یہ کہنے کے لیے حوصلہ افزائی کی جاتی تھی کہ 'میں ایک فرانسیسی ہوں'۔

تقسیم کرنے کا رجحان برطانویوں کے رویوں میں شروع سے ہی عیاں تھا۔ درحقیقت، اس کی شہادت پہلے سے نوآبادی بنائے گئے واحد گوروں کے ملک آئرلینڈ سے مل چکی تھی؛ آئرستانیوں کو برطانوی نسل میں جذب کرنے کی بجائے، نئے آقاؤں نے انھیں محکوم بنایا، ان کے مابین شادی ممنوع تھی (جیسا کہ آئرستانی زبان سیکھنا یا آئرستانی لباس کے انداز اختیار کرنا) اور اکثر آئرستانی باشندوں کو 'مطلق ناشائستہ قرار دے' کر الگ تھلگ کر دیا جاتا تھا. اگر برطانوی اپنے جیسے دکھنے والے لوگوں کے ساتھ ایسا کر سکتے تھے، تو ہندوستان کے سیاہی مائل لوگ جنھیں انھوں نے فتح کیا تھا کے ساتھ تو اس سے زیادہ برا کرنے پر مائل ہوتے۔ اب جبکہ ہم اس مظہر کے چند

پہلوؤں کا سابقہ ابواب میں جائزہ لے چکے ہیں، تو میں چاہوں گا کہ اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ کیسے انھوں نے ہندوستانیوں کی غیر متغیر کیٹیگریوں میں درجہ بندی کی، خاص طور پر ذات پات اور مذہب کی۔

ہم برطانویوں کو شک کا فائدہ دیتے ہوئے اور یہ فرض کرتے ہوئے آغاز کرتے ہیں کہ شاید برطانوی یہ گمان کرنے پر مائل ہوں کہ ہندوستانی بھی انھی کی طرح کے ہوں گے، اور خود اپنی شناختوں کے پیچھے پناہ لینے سے زیادہ کچھ نہیں چاہتے ہوں گے۔ لیکن اپنی رعایا کے نسلی، مذہبی، فرقہ وارانہ اور ذات پات کے اختلافات کو سمجھنے کی برطانوی کوشش، ناگزیر طور پر ان اختلافات کو متعین کرنے، درجہ بند کرنے اور دوام دینے کی مشق میں بدل گئی۔ لہٰذا نوآبادیاتی انتظامیہ نے باقاعدگی سے رپورٹیں لکھیں اور مردم شماریاں کروائیں جو ان کی رعایا کو، ان کی زبان کی بنیاد پر، مذہب، فرقے، ذات پات، گوت، نسل اور جلد کے رنگ کی پہلے سے بھی زیادہ گمراہ کن محدود اصطلاحات میں زمرہ بند کرتیں۔ اس زمرہ بندی اور تقسیم کے عمل نے، نہ صرف کمیونٹی کے تصورات کو مجسم کیا، بلکہ ایسے لوگوں کی بالکل نئی کمیونٹیز تشکیل دیں جو شعوری طور پر خود کو اپنے گردونواح کے دوسرے لوگوں سے مختلف نہیں سمجھتے تھے۔

ایک امریکی سماجی ماہر بشریات، نکولس بی ڈرکس، اسے بہت صراحت سے بیان کرتا ہے: 'نوآبادیت، حکمرانی کی کلچرل ٹیکنالوجی کے ذریعے بھی اتنی ہی تشکیل پذیر ہوئی، پھر برقرار رہی اور مضبوط ہوئی، جتنی کہ یہ فتح کے زیادہ یقینی اور ظالمانہ طریقوں سے ہوئی، جنھوں نے سب سے پہلے غیر ملکی ساحلوں پر حکومت قائم کی.... نوآبادیت بذات خود تسلط قائم رکھنے کا ایک کلچرل پراجیکٹ تھا۔ نوآبادیاتی علم نے فتوحات کو ممکن بھی بنایا اور اسی کے ذریعے وجود پذیر بھی ہوا؛ چند اہم حوالوں سے، علم وہی تھا جو کچھ نوآبادیت تھی۔ معاشروں میں تہذیبی صورتوں، جن کی نئی زمرہ بندی "روایتی" کے طور پر کی گئی تھی، کی اس علم کے ذریعے از سر نو تشکیل و کایا کلپ کی گئی، جس سے نئی کیٹیگریز اور استبداد کار (کلونائزر) اور استبداد زدہ (کلونائزڈ) کے درمیان اختلافات کی تخلیق ہوئی، یورپی اور ایشیائی، جدید اور روایتی، مغرب اور مشرق.... جیسا کہ نوآبادیاتی مفادات کے لیے ہندوستان کی بشریاتی تشریح کی گئی، اس کی سماجی تشکیل، سیاسی قابلیت اور اس کی تہذیبی میراث سے متعلقہ بیانیہ میں نوآبادیاتی ناگزیریت اور برطانوی سامراجی حکومت کے دوام کی کہانی زیادہ شدت سے سنائی دینے لگی'۔

ہندوستان میں برطانوی نوآبادیت کے ایک محقق، برنارڈ کوہن، نے دلیل دی تھی کہ برطانویوں نے بیک وقت ان خصوصیات کی جو انھوں نے ہندوستانی سماج میں دیکھیں، غلط تعبیر کی اور انھیں حد سے زیادہ سادہ معنی

پہنائے، اور ہندوستانیوں کو سٹیریو ٹائپ خانوں میں رکھا جو انھوں نے متعین کیے تھے، اور جن کے ساتھ انھیں قدیم روایات کے نام پر منسوب کیا گیا: 'تصوراتی سکیم جو برطانویوں نے ہندوستان کو سمجھنے اور عمل کرنے کے لیے تخلیق کی، انھوں نے مستقلاً اسی منطق کی پیروی کی؛ انھوں نے بہت پیچیدہ ضابطوں اور ان کے ساتھ وابستہ معنویت کو چند مجازی الفاظ میں محدود کر دیا'۔ قوانین کو ان اصطلاحات میں منتقل کیا گیا جنھیں برطانوی سمجھتے اور ان کا اطلاق کرتے تھے۔ ہندوستان جیسے پیچیدہ، اکثر منتشر اور ہمیشہ حرکت پذیر سماج کو برطانویوں نے قانون و ضوابط کی سرزمین کے طور پر دوبارہ متعین کیا؛ برطانویوں نے ایک مرتبہ اپنے اطمینان کے لیے جو تعریف متعین کر لی، اور ہندوستانی قوانین اور روایات کے طور پر جو کچھ انھوں نے تشکیل دیا، پھر ہندوستانیوں کو ان تشکیلات کی تعمیل ہی کرنا پڑی۔

اس طرح کی سرگرمی شاید دورِ جدید سے پہلے ممکن نہ ہوتی، جب شناختیں زیادہ ڈھیلی ڈھالی اور 'مبہم' تھیں، اور جدائی ڈالنے والے فاصلوں کی مشکلات، اور آمدورفت کے پھیلاؤ، نے محض مقامیت سے آگے شناخت کے شعور کی تخلیق کو مشکل بنا دیا تھا۔ قومیت پرستی پر روایت شکن مصنف و مفکر، بینیڈکٹ اینڈرسن، قائل کرنے والے انداز میں نشاندہی کرتا ہے کہ لوگوں کی بڑی تعداد کو متحد کرنے والی شناختیں فقط ٹیکنالوجی کے ایک خاص لیول پر پہنچنے کے بعد ہی پیدا ہو سکتی تھیں۔ اس پر کوئی خاص تنازع نہیں کہ وسیع کمیونٹیز پر مشتمل شناختوں کا واضح اتصال نسبتاً نیا مظہر ہے، اور جیسا کہ اینڈرسن نے نہایت عمدگی سے فرض کیا ہے کہ ان شناختوں کو اتنے بڑے پیمانے پر "تصور" اور "اختراع" نہیں کیا گیا تھا۔ جوں جوں اس طرح کی شناختی تخلیق ممکن ہوتی گئی، برطانویوں کی ہندوستان پر حکومت مستحکم ہوتی گئی، ٹرانسپورٹ اور مواصلات کی جدید ترقی کا شکریہ۔ جبکہ اکبر نے شاید ایسی ٹیکنالوجی کو اپنے گوناگوں عوام کو باہم جوڑنے کے لیے استعمال کیا ہوتا، جسے انگریزوں نے انھیں علیحدہ کرنے، درجہ بند اور تقسیم کرنے کے لیے استعمال کیا۔

چند نقاد کہتے ہیں کہ برطانویوں کو ہندوستانی سماج میں پہلے سے موجود تقسیم کے لیے بامشکل ہی الزام دیا جا سکتا ہے، خاص طور پر ذات پات کے لیے، جس نے اکثریتی ہندو آبادی کو آپس میں استثنائی انداز میں اور اکثر ناموافق سماجی طبقات میں بانٹ دیا تھا (اور ابھی تک بانٹ رہی ہے)۔ بجا سہی، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ برطانوی جانتے بوجھتے یا بن جانے، ذات پات کے نظام کو مستحکم کرنے اور دوام بخشنے میں معاون بنے۔ چونکہ برطانوی درجہ واری سماج جس میں طبقاتی نظام سرایت کیے ہوئے تھا سے ہی آئے تھے، تو طبعاً وہ ہندوستان میں بھی ایسا ہی

نظام تلاش کرنے کی جانب راغب تھے۔ انھوں نے ہندوستانی سماج کو 'طبقات' میں بانٹ کر تجزیہ کرنے سے آغاز کیا جس کا حوالہ وہ دیتے کہ اپنی نوعیت میں 'بنیادی طور پر مذہبی' ہے۔ اس کے بعد وہ ذات پات پر اٹک گئے۔ لیکن برطانوی دور سے پہلے ذات پات کبھی بھی پائیدار سماجی ڈھانچہ نہیں رہی؛ اگرچہ، زمان و مکان کے مطابق اس کی مختلف شکلیں تھیں، ذات پات وسیع پیمانے پر سماجی تنظیم کی حرکت پذیر شکل تھی، جو مستقل طور پر، اس دور کے مقتدر افراد کے اعتقادات، سیاست اور اکثر اوقات معاشی مفادات سے تشکیل اور تخلیق پاتی تھی۔ تاہم برطانویوں نے یہ نظریہ مشتہر کیا کہ ذات پات کی درجہ بندی و امتیاز نے ہندوستانی سماج کی فعلیت کو متاثر کیا۔ قابل استدلال طور پر یہ بہت ہی محدود تعریف تھی کہ درحقیقت برطانوی دور سے پہلے ہندوستانی سماج کیسے عمل پذیر تھا، اور سلام ہے نوآبادیاتی حکمرانی پر کہ اب یہ روایتی دانش میں بدل چکی ہے۔

ڈرکس، نے اپنی بنیادی کتاب ذہن کی ذاتیں (کاسٹس آف مائنڈ) میں تفصیل سے وضاحت کی ہے کہ انگریزوں کے تحت یہ کیسے ہوا کہ: 'ذات' ہندوستان کی سماجی شناخت، کمیونٹی اور تنظیم کی متنوع اشکال کے اظہار، ان کی تنظیم اور سب سے بڑھ کر ایک نظام میں ڈھلنے کے قابل واحد اصطلاح بن گئی۔ برطانویوں کے دو سو سالہ غلبے کے دوران، نوآبادیاتی جدیدیت کے ساتھ حقیقی مقابلے کے نتیجے میں.... نوآبادیاتی نظام نے ذات کو وہ بنادیا جیسی کہ وہ آج ہے [میری تاکید]۔ ڈرکس نے ذات کے تصور کو حقیقت کا روپ دینے، اور ذات کو تمام سماجی پہلوؤں کی کسوٹی بنانے کے لیے، نوآبادیاتی طاقت استعمال کرنے پر، برطانوی سامراجی کردار پر کڑی تنقید کی ہے۔

وہ کہتا ہے، 'درحقیقت، ذات دوسری بہت سی کیٹیگریز میں سے ایک تھی، شناخت کی نمائندگی اور ترتیب کا ایک طریقہ۔ مزید یہ کہ، ذات درجہ بندی کی واحد کیٹیگری یا اکلوتی منطق نہیں تھی، حتیٰ کہ براہمنوں کے لیے بھی، جو کہ ذات پات کے اس تصور کے حقیقی مفاد علیہ تھے۔ علاقائی، دیہی، یا سکونتی کمیونٹیز، خونی رشتہ داریاں، گروہی دھڑے، خصوصی وفود، سیاسی وابستگی وغیرہ شناخت کے عنوان کے طور پر ذات کی جگہ لے سکتے تھے اور ذات پات کی ترتیب کے ڈھنگ کو دوبارہ وضع کر سکتے تھے.... نوآبادیاتی نظام کے تحت، ذات پات کو جتنی کہ وہ پہلے کبھی تھی، اس سے زیادہ سرائیت کرنے والا، زیادہ مکمل اور مزید یک رنگ بنایا گیا'۔ ڈرک، اسے نوآبادیاتی طاقت کی اس بنیادی خصوصیت کے طور پر دیکھتا ہے، جو ہندوستانی سماج کے علم کی صورت گری کرتی ہے۔ اس کی رائے میں، ذات پات بالکل ارادی طور پر 'سول سوسائٹی کی نوآبادیاتی شکل بن گئی' یا پرتھا چیٹرجی کی اصطلاح

میں، کہ ہندوستان میں سول سوسائٹی کیوں پروان نہیں چڑھ سکی، کے متعلق نوآبادیاتی دلیل؛ اور یہ (دلیل) ہندوستانیوں کے سیاسی حقوق کے انکار کا جواز مہیا کرتی ہے، جو بہر حال رعایا تھے نہ کہ شہری، اور نوآبادیاتی حکمرانی کی ناگزیر ضرورت کی وضاحت کرتی ہے۔

محققین جنھوں نے ما قبل نوآبادیاتی ذات پات کے تعلقات کا مطالعہ کیا ہے وہ ورن کے اس تصور کو رد کرتے ہیں __ ذاتوں کو حفظ مراتب کے چار گروہوں میں تقسیم کرنا، برہمن سب سے اونچے درجے پر اور اسی طرح بادشاہ اور جنگجو ان سے تھوڑا نیچے __ اور قابل فہم طور پر یہی بات حقیقت کی مکمل تصویر پیش کر سکتی ہے (مثال کے طور پر، کشتری بادشاہ عملی طور پر برہمنوں کے ماتحت نہیں تھے، جنھیں وہ ملازمت دیتے، تنخواہ ادا کرتے، سرپرستی کرتے، نظر کرم کرتے یا ملازمت سے برطرف کرتے، جیسا کہ وہ مختلف اوقات میں مناسب سمجھتے)۔ اور نہ ہی یہ سادہ زمرہ بندی عقلی طور پر اس وسیع برصغیر میں تمام ہندوستانیوں کی سماجی شناخت اور تعلقات کو ترتیب دے سکتی تھی؛ متبادل شناختیں، گوت، قبائل اور دوسرے قوائد بھی موجود تھے اور مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے پروان چڑھ رہے تھے۔ جدید محققین اہم شہادت کے پیش نظر وثوق سے بیان کرتے ہیں کہ پورے ہندوستان میں پھیلتا ہوا اور اس کی پیچیدہ تہذیب کی وسعت سے ہمکنار ہوتا ہوا چار پرتوں پر مشتمل ذات پات کی ترتیب کا تصور، فقط برطانوی نوآبادیاتی نظام کے زیر اثر مخصوص حالات میں، پروان چڑھا۔ برطانوی یا تو اسے سمجھ نہیں سکے یا انھوں نے اسے نظر انداز کرنے کو ترجیح دی، بنیادی حقیقت یہ تھی کہ نظام کو ویسے چلنے کی ضرورت نہیں تھی جیسا کہ تھیوری میں بیان کیا گیا۔

برطانوی برہمنیت

اٹھارھویں صدی کے اواخر میں، جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کر رہی تھی اور اس کے سینئر عہدیدار بشمول ان چند ایک کے جو ملک کو سمجھنے میں حقیقی دلچسپی رکھتے تھے، اس وقت برطانویوں نے شاستروں کا مطالعہ شروع کیا، تاکہ وہ قانونی اصولوں کا ایک نظام وضع کر سکیں جو ہندوستانی سول سوسائٹی کے جھگڑے نمٹانے میں ان کی معاونت کرے۔ گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز، نے جنتو قوانین یا پنڈتوں کے فرامین کے نام سے معروف ہونے والے ضوابط کی تدوین کے لیے گیارہ پنڈتوں کو ملازم رکھا۔ چونکہ برطانوی قدیم سنسکرت عبارات نہ تو پڑھ سکتے تھے اور نہ ہی ان کی تعبیر کر سکتے تھے، لہٰذا انھوں نے اپنے براہمن مشیروں کو کہا

کہ ہندوستانی مذہبی عبارات اور ہندوستانی روایات کے قوانین اپنے علم کی بنیاد پر وضع کریں۔ حاصل نتیجہ ایک اینگلو براہمن متن تھا جس نے قابل استدلال طور پر حقیقی دستور کو ظاہراور جوہر دونوں حوالوں سے مسخ کر دیا: ظاہراً، یوں کہ یہ حقیقی کی نسبت غیر مبہم تھا، اور جوہر کو یوں، کہ پنڈت تعبیر کرتے ہوئے بلکہ مقدس 'روایات' تخلیق کرتے ہوئے جن کی در حقیقت کوئی شاستری سند (شاستروں میں) نہ تھی اپنی ذات برادری کے حق میں اس کام سے فائدہ اٹھانے کے چکر میں پڑ گئے۔ اس نے ملک میں ذات پات کی درجہ بندی کے مسئلے کو بڑھانے میں کردار ادا کیا۔

محققین دلیل دیتے ہیں کہ، اس سے قبل، ہندوستانی سول سوسائٹی میں جھگڑوں کا تصفیہ جاتی یا برادری کرتی تھی، جیسا کہ کسی شخص کی قسمت کا فیصلہ ایک کمیونٹی یا قبیلے کے اندر اس کے اپنے ہی ساتھی مقامی رسوم اور اقدار کے مطابق، بغیر ذات برادری کے کسی اعلیٰ مجاز کی منظوری کی ضرورت کے، خود ہی کرتے تھے۔ پنڈتوں نے وسیع پیمانے پر عمل پذیر اس دستور کی عکاسی کی بجائے، اپنے رتبے کو واحد مجاز شخصیت کے طور پر متبرک بنانے کے لیے، لمبے عرصے سے نظر انداز عبارات سے مذہبی جواز کے حوالے پیش کیے، اور اکثر برطانویوں نے انھی کے کہے کو سچ مان لیا۔ (چند ایک کو شکوک و شبہات تھے۔ برطانوی مستشرقین میں سب سے فاضل، ولیم جونز، جس نے 1797 میں کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی اور نظام عدل کی عدالت عالیہ میں فرائض انجام دیے، نے کہا، 'میں اپنے پنڈتوں کے رحم و کرم پر رہنا مزید برداشت نہیں کر سکتا جو ہندو قانون کے ساتھ جیسا چاہتے ہیں برتاؤ کرتے ہیں، اور جب وہ انھیں تیار شدہ دستیاب نہیں ہو سکتا تو مناسب بھاؤ پر اسے تراشتے ہیں'۔ لیکن المیہ ہوا کہ جونز جوانی میں ہی وفات پا گیا اور اس کی دانش کی پیروی اس کے جانشینوں میں نہیں ہو سکی۔)

ہندستانی سماج پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حقیقی سماجی چلن ضروری نہیں کہ سرکاری یا 'شاستری' ضوابط کی پیروی کرے، البتہ قدیم متون کے اب حوالے دیئے جاتے تھے، اور انھیں بے لچک بنا دیا گیا جو کہ در حقیقت وہ نہیں تھے، یقیناً سماج کی آزادی کو پابند کرنے کے لیے تاکہ مذہبی سند کے نام پر اسے زیادہ آسانی سے کنٹرول کیا جائے۔ اس سے برطانوی پالیسی کے مفادات کا تحفظ ہوا، جو واضح طور پر، حکومتی مقاصد کے لیے، (نو آبادیاتی) آبادی اور وسائل کا، 'تعین کرنا ان کی زمرہ بندی کرنا اور ان کا تخمینہ لگانا چاہتے تھے'۔ نسلی، سماجی، خاندانی اور ذات پات کی تقسیم سامراجی حربے کے ایک حصے کے طور پر زیادہ موثر

انداز میں کی گئی تاکہ نوآبادی بنائی گئی ہندوستانی آبادی پر کنٹرول حاصل کیا اور قائم رکھا جا سکے۔ یہ روش بھی ان کے ابتدائی اعتماد کی توثیق کرتی ہے کہ برہمن ویدوں کے اپنے علم کے ساتھ سب سے زیادہ قابل ہیں اور ہندوستان پر حکمرانی کے لیے ان کے وچولے کے طور پر سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ برہمنوں نے دوسرے گروہوں کی نسبت برطانوی پشت پناہی سے استفادہ حاصل کیا اور خود کو دوسری تمام ذاتوں سے برتر خیال کرنا شروع کر دیا، برہمنوں کے تعصبات کو اپنا کر، انگریز بھی جنھیں کمتر ذاتیں سمجھتے تھے۔

اس کا غیر معمولی نتیجہ برطانوی راج میں برہمنوں کا کلیدی عہدوں پر غیر معمولی تسلط تھا۔ براہمن جو کہ آبادی کے دسویں حصے سے زیادہ نہ تھے، ماسوائے حقیر نوکریوں کے علاوہ، ہندوستانیوں کے لیے مخصوص سرکاری محکموں کی نوکریوں کے 90 فیصد حصے پر چھائے ہوئے تھے؛ ہندوستانیوں کے لیے دستیاب شعبوں میں ان کا غلبہ تھا خاص طور پر وکالت اور میڈیسن میں؛ اور وہ صحافت اور اکیڈیمیا میں بھی شامل ہو گئے، چنانچہ یہ انھیں کی آواز تھی جسے ہندوستانی رائے عامہ کے طور پر سب سے زیادہ سنا گیا۔ قابل استدلال طور پر، برطانوی راج کے، براہمنوں کو اس غالب پوزیشن میں تقدس فراہم کرنے سے پہلے، ہندوستان کہیں زیادہ قابلیت کو مد نظر رکھنے والا سماج تھا۔

نسلیت کے انیسویں صدی کے تصورات مکس کر دیئے گئے۔ امریکی سکالر تھامس میٹکاف دکھاتا ہے کہ اس دور میں نسلیت کے نظریے نے کیسے یورپی تہذیب کو انسانی ترقی کی معراج کے طور پر متعین کیا، جبکہ گہری رنگت والی نسلوں کا نقشہ قدیم غیر متمدن، کمزور اور ترقی کے لیے یورپی سرپرستی پر انحصار کرنے والوں کے طور پر کھینچا گیا۔ ہندوستانی ان میں سے بہت سے تعصبات کو اپنا چکے ہیں، دو صدیوں کے گوروں کے تسلط اور برطانوی برتری کے مسلک کا بگل بجا بجا کر انھیں ذہن نشین کروا دیا گیا۔ انگلینڈ کو گئے ایک ہندوستانی سیاح کی سرگزشت جو بچپن میں پڑھی تھی مجھے یاد ہے، جو اس بات پر حیران تھا کہ وہاں بوٹ پالش کرنے والے لڑکے بھی انگریز تھے، برطانوی شان و شوکت کے اسرار کو ہندوستان میں کتنا مکمل طور پر اپنا لیا گیا تھا۔ نوجوان شہزادہ، اور بعد کا کرکٹ سٹار رنجی، انگلینڈ میں بطور طالبعلم پہنچنے پر، برطانویوں کو معمولی مرتبہ والے کاموں میں مشغول دیکھ کر 'ششدر رہ گیا' (اسے یقین تھا کہ قلی صرف آئیر لینڈ کے لوگ ہوتے ہیں)۔

مردم شماری نے یکجہتی کو کیسے نقصان پہنچایا

برطانوی نقشہ کشی کے علم (کارٹوگرافی) نے مقامات کی حد بندی اس لیے بہتر طور پر کی تاکہ ان پر حکمرانی کی جاسکے؛ نقشہ نو آبادیاتی کنٹرول کا ایک آلہ بن گیا۔ حتیٰ کہ گراں قدر برطانوی میراث، عجائب گھر، برطانوی منصوبے کو آگے بڑھانے کے لیے اختراع کیا گیا کیونکہ یہاں اشیاء، نوادرات اور علامات پر قبضہ کیا، انھیں نام دیا، ان پر لیبل لگایا، انھیں مرتب کیا، ترتیب دیا، زمرہ بند کیا اور یوں بالکل اسی طرح کنٹرول کیا جاسکتا تھا، جیسے عوام کو۔

انیسویں صدی میں مردم شماری، نقشے اور عجائب گھر کے ساتھ برطانوی سامراجی تسلط کے آلے کے طور پر شامل ہو گئی۔ تقسیم انواع کے اصولوں (ٹیکسونومی) اور سماجی زمرہ بندی کے لیے برطانوی رغبت کا ثبوت ان کے پورے عہد حکومت میں ملتا رہا، اور اسے مردم شماری کے ذریعے باضابطہ بنایا گیا جو کہ انھوں نے سب سے پہلے 1872 میں کی اور 1881 سے ہر دس سال کے بعد، اور 1901 میں اسے 'نسلی جغرافیائی مردم شماری' (ایتھنو گرافک) میں بدل دیا گیا۔

مردم شماری نے ذات پات کو متعین کرنے کے عمل کو مزید مستحکم کیا، مخصوص صفات ان سے منسوب کیں اور پوری پوری کمیونٹی کے لیے نرالے لیبل اختراع کیے، جیسا کہ 'جنگجو ذاتیں (مارشل ریسز)' اور 'مجرم قبائل (کریمنل ٹرائبز)'۔ جیسا کہ 'براہمن' مقدس سماجی رتبے والے مرغوب منصب پر فائز ہو گیا، ویسے ہی مردم شماری نے کسی فرد کی ذات کے تعین کے سلسلے میں کسی بھی 'شودر' کی پورے ملک میں شناخت مقرر کر کے اس کی قسمت پر مہر لگا دی۔ جب کہ برطانوی حکومت سے پہلے شودر محض اپنا گاؤں چھوڑ کر ہندوستان کے کسی بھی دوسرے رجواڑے میں اپنی قسمت آزما سکتا تھا، جہاں اس کی ذات اس کا پیچھا نہ کرتی، نوآبادیاتی نظام نے اسے ساری زندگی کے لیے شودر بنا دیا، چاہے وہ جہاں بھی ہو۔ 'جنگجو قبائل' کی جنگی صلاحیتوں کے برطانوی اعتقاد نے ان لوگوں کے کیریئر امکانات محدود کر دیے جو اس زمرے میں شامل نہیں تھے، کیونکہ برطانوی فوج کی بھرتی پالیسی کی بنیاد عموماً اسی ذات پات کی زمرہ بندی پر ہوتی تھی۔ پرانے زمانے میں، کوئی بھی مطلوبہ قد کاٹھی والا فرد سپاہ گری کو اپنا ذریعہ معاش بنا سکتا تھا، چاہے اس کی ذات کا پس منظر کچھ بھی ہو۔ برطانوی ہند میں، یہ اگر ناممکن نہیں بھی تھا تو بھی انتہائی مشکل تھا، کیونکہ پوری کی پوری رجمنٹس ذات پات کی شناخت کی بنیاد

پر تشکیل دی گئی تھیں۔

برطانوی ہند میں ہونے والی مردم شماری کا طریقہ برطانیہ میں ہونے والی مردم شماری سے خاصا مختلف تھا، کیونکہ وطن کے برعکس، ہندوستان میں ہونے والی مردم شماری میں برطانوی ماہرین بشریات، ہندوستانی سماجی ڈھانچے کا تجزیہ کرنا چاہتے تھے تاکہ اس پر بہتر طریقے سے کنٹرول اور حکمرانی کر سکیں۔ جیسا کہ میں اس سے قبل بیان کر چکا ہوں، قبل از نو آبادیاتی دور میں ہندوستانی غیر واضح طور پر متعین کردہ 'مبہم' کمیونٹیز کے ساتھ ساتھ باہم مربوط ثقافتی اطوار میں زندگی بسر کرتے تھے، ان کا شعور ذات انتہائی محدود اور بہت ہی عمومی تفصیلات کے علاوہ، دوسری کمیونٹیز کے ساتھ ان کے اختلافات کی جزئیات کا شعور نہ ہونے کے برابر تھا۔ سکالر سدیپتا کویراج اس کا شعور رکھتا تھا، جس نے یہ بیان کیا کہ قبل از نو آبادیاتی کمیونٹیز کی حدود بڑی غیر واضح ('مبہم') تھیں کیونکہ اکثر اجتماعی شناختیں علاقائی بنیادوں پر استوار نہیں تھیں، اور کیونکہ 'سماجی خاکے کے اس ابہام کا ایک جزو اس لیے پیدا ہوا کہ جدید کمیونٹیز کے برعکس روایتی کمیونٹیز کی فہرست سازی نہیں کی گئی تھی۔

یقیناً، مردم شماری نے اسے بدل کر رکھ دیا، جیسا کہ نو آبادکاروں نے اپنے نئے اور غیر مبہم نقشوں میں زیادہ پائیدار علاقائی لکیریں کھینچیں۔ قبل از نو آبادیاتی دور میں، کمیونٹی کی سرحدیں کہیں زیادہ غیر واضح تھیں، اور اس کے نتیجے میں کمیونٹیز کی خود شناسی ویسی نہیں تھی جیسی نو آبادیاتی حکومت کے زیر سایہ ہو گئی۔ دورِ جدید کی 'فوکسڈ اور تند وفاداریوں' کی غیر موجودگی میں، قبل از نو آبادیاتی گروہ، کمیونٹی احساسات یا فرقہ وارانہ اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کے مخالف کم ہی ہوتے تھے۔ محض انگریزوں کی طرفین کی اختصاصی اصطلاحات میں ان کی 'تعریف متعین' کرنے کے نتیجے میں وہ ایسے ہوئے۔

برطانویوں کے لیے ایسا کوئی نہ تھا جسے وہ وضاحت کرتے کہ کسی مخصوص کمیونٹی کی تعداد کیا تھی اور وہ کہاں تھی؛ مردم شماری کمشنرز پر یہ ظاہر ہوا کہ ہندوؤں، سکھوں اور جینیوں کے درمیان لکیر بمشکل ہی موجود تھی، اور یہ کہ ملک کے بیشتر حصوں میں متعدد ہندوؤں اور مسلمانوں کے گروہوں کے شادی، میلے، کھانے پینے اور عبادات سے متعلقہ سماجی اور ثقافتی رواج مشترک تھے۔ یہ بات اس نو آبادیاتی مفروضے کے خلاف تھی کہ کمیونٹی کو لازماً اختصاصی طور پر دونوں میں سے کوئی ایک ہونا چاہیے اور ایک فرد کا تعلق محض کسی ایک یا دوسری کمیونٹی سے ہی ہونا چاہیے، یوں برطانویوں نے، مردم شماری کمشنرز کے سوالات کے غیر جامع جوابات کی بنیاد پر، لوگوں کو مذہب، ذات پات اور قبائل میں تقسیم کر کے، ہندوستانی حقیقت پر محض اپنے مفروضوں کا

اطلاق کر دیا۔

برطانوی اسلوب ناگزیر طور پر اس دور کے تعصبات اور حدود و قیود سے متاثر ہوا: لہٰذا 1901 کی مردم شماری کے مردم شماری کمشنر اور مجموعہ 'ہندوستان کے باشندے' کے مصنف آئی سی ایس، ہربرٹ ریسلے، نے ماہر بشریات اور ماہر اصلاح نسل کا اسلوب اختیار کیا، اور اس مروجہ مفروضے پر ہندوستانی کھوپڑیوں اور ناک کی جسمانی پیمائش کی، کہ یہ جسمانی خصوصیات نسلی سٹریوٹائپ کو ظاہر کرتی ہیں۔ (یہ وہی تھا جس نے اعلان کیا کہ 1901 کی مردم شماری نسلی جغرافیائی مردم شماری ہو گی، اور ذاتی طور پر اس کی قیادت کی)۔ چہرے کے نقوش اور سماجی رواجوں کی تفصیلی تصویروں کی اعانت سے، ریسلے کے کام نے برطانویوں کو کمک پہنچائی کہ وہ اس زمرہ بندی کو ہندوستانیوں پر یورپیوں کی حیاتیاتی برتری کے ان کے اعتقاد کو مستحکم کرنے، اور ہندوستانی لوگوں کے مختلف گروہوں کے مابین نسلی، سماجی اور قبائلی اختلافات تشکیل دینے، دونوں کے لیے استعمال کریں، اس سے 'سماجی علم کے مسلط کردہ نمونے' کی تشکیل نو کرنے اور اسے حقیقی ثابت کرنے میں معاونت حاصل ہوئی۔

ریسلے کی ٹیم کے ہندوستانیوں سے سوالات نے ان کی ذات پات کی شناختوں اور دوسری ذاتوں پر ان کے مخصوص استحقاق کے دعوی کی متوقع طور پر تصدیق کی، انھیں اختلافات پر زور دیا گیا جنھیں انگریز دیکھنا اور سامنے لانا چاہتے تھے۔ ایسا کر کے وہ اپنے گروہی مفادات حاصل کرنا چاہتے تھے ــــ مثال کے طور پر کچھ خاص ملٹری رجمنٹس میں بھرتی یا چند تعلیمی اداروں میں سکالر شپس ــــ دوسروں کے برابر یا دوسروں کے اخراجات پر۔ ماقبل برطانوی دور میں ذات پات کا یہ مقابلہ موجود نہیں تھا؛ ذات پات کی آگہی کبھی بھی اتنی واضح نہیں رہی جتنی انیسویں صدی کے اواخر میں ہوئی۔

اس کے نتیجے میں ان تمام زمرہ بندیوں نے نوآبادکاروں کے مفادات پروان چڑھانے کے لیے انھیں ایک ایسا آلہ مہیا کیا جو ان کے درمیان اتحاد ختم کرنے کے لیے، گروہوں کے درمیان اختلافات کا ادراک پیدا کرتا تھا اور برطانوی حکمرانی کے مقام کو جائز قرار دیتا تھا ــــ واحد حکومت جسے ان اختلافات سے ماوراء اور نیک ارادوں والی سلطنت کی شفیق سرپرستی کے زیر سایہ، ہندوستانیوں کو ایک اعلیٰ، زیادہ تہذیب یافتہ، دوسری دنیا، کی بابت رہنمائی کرنے والی کے طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ برطانویوں نے ان اختلافات کو ایسا جزو ایمان بنایا کہ ایک ایسا مصنف جسے عام طور پر ہندوستانیوں کا دردمند سمجھا جاتا تھا، ای ایم فوسٹر جس کا ایک ہندوستانی حلیف، عزیز، 'ہندوستان کا سفر' میں کہتا ہے ــــ 'پورے ہندوستان سے کوئی بھی بغل گیر نہیں ہو سکتا، کوئی بھی نہیں، کوئی

بھی نہیں'۔

برطانوی ہند میں شناخت کی تخلیق کا یہ نو آبادیاتی پراسیس، لسانی شناختوں کی تشکیل میں بھی رونما ہوا۔ ڈیوڈ واشبروک اور ڈیوڈ لیلیولڈ کو یقین ہے کہ علاقائی متعین کردہ لسانی آبادیوں کا جنم، ہندوستانی سماج کو__ کنٹرول کرنے کے لیے __ اسے کیٹیگری بنانے، شمار کرنے اور زمرہ بندی کرنے کے برطانوی منصوبے سے ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ لسانی شناختوں کا یہ تصور، انیسویں صدی کے اس اعتقاد سے پیدا ہوا کہ زبان سماجی تعلقات کے مضبوط بندھن قائم کرتی ہے اور اخذ کردہ کامل یقین کہ 'نسل' اور 'قوم' ایک مشترکہ زبان بولتی ہے اور ایک متعین علاقائی مقام پر رہتی ہے۔ اتفاقی طور پر، زمرہ بندی بنانے کے جوش میں، برطانویوں نے، قدیم پیشوں جو کہ شرمناک نہیں تھے، جیسا کہ دیوداسی (مندر کی رقاصاؤں) اور بائی جی (درباری گائیکہ) کو بھی نئے معنوں کا جامہ پہنایا، جو کہ کسی حد تک جاپان کی گائشاؤں جیسی خدمات ادا کرتی تھیں، انھیں 'طوائفوں' کی بداخلاق اور اور تیار شدہ کیٹیگری میں شامل کیا، اور یوں پہلی مرتبہ انھیں عزت دار معاشرے سے نکال باہر کیا۔

سماجی غلبے کے اس تبدیل شدہ نمونے کا ایک پریشان کن ذیلی پہلو سیاسی تھا: برطانوی حکمرانی کے زیر اثر، جمہوری تصورات کو ہندوستانی سماج کے تمام طبقات تک نہیں پھیلایا گیا۔ اس کی ایک سبق آموز علامت آزاد ہند میں متعدد 'پچھڑے ہوئے طبقات' کی سیاسی اعلیٰ مناصب تک رسائی میں دیکھی جاسکتی ہے، جو کہ صرف اسی وقت ممکن ہو پائی جب جمہوریت نے، آزاد ہندوستانیوں کو برطانوی توثیق شدہ ہندوستانی سماجی نظم کی زیادہ مضرت رساں کرختگیوں کو ختم کرنے کا موقع دیا۔

ان برطانوی پالیسیوں کا نتیجہ، چاہے اتفاقی یا طے شدہ تھا، یا پھر دونوں، بہر حال سماجی علیحدگی کا ایک عمل تھا، جس نے جلد ہی اپنا اظہار نفسیاتی مغائرت اور نااتفاقی کے شعور کے طور پر کیا، جو جہاں ممکن ہوا مادی علیحدگی پر منتج ہوا اور __ جس وقت خود مختار حکومت کا مطالبہ بلند ہوا ـــــ سیاسی شکستگی کا عمل، جیسا کہ ہر کمیونٹی کو ڈرایا گیا تھا کہ دوسروں کی کامیابی سے ان کے اپنے مفادات کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔

ہندو مسلم تقسیم

شناخت کے اختلافات میں سب سے اہم خلیج مذہبی تھی، تصوراتی یا حقیقی، بہر حال فی الفور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مرکوز ہو گئی۔

مذہب 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کا ایک کارآمد آلہ بن گیا۔ جیسا کہ امریکی مذہبی سکالر پیٹر گوٹسچالک لکھتا ہے کہ ہندو مسلم تقسیم کو برطانویوں نے دانستہ سٹریٹیجی کے طور پر واضح و نمایاں کیا اور پروان چڑھایا۔ جیسا کہ رومیلا تھاپر نے واضح کیا ہے، تین دلائل، ہندوستانی تاریخ کی نوآبادیاتی تشریح کے لیے بنیادی ہیں۔ پہلی، حکمرانوں کے مذہب کی بنیاد پر لیبل لگا کر، ہندوستانی تاریخ کی 'تاریخی ادوار' میں برطانوی تقسیم: چنانچہ جیمز مل نے "برطانوی ہند کی تاریخ" (1817 اور 1826 کے دوران شائع ہوئی) میں ہندو، مسلم اور برطانوی ادوار وضع کیے۔ ادوار کی اس تشکیل میں یہ مفروضہ پوشیدہ تھا کہ ہندوستان ہمیشہ سے یکساں اور باہم معاندانہ مذہبی کمیونٹیز، خاص طور پر ہندو اور مسلم پر مشتمل تھا۔ دوسری بنیادی دلیل یہ تھی کہ ہندوستان کی قبل از نوآبادیاتی سیاسی معیشت 'مشرقی مطلق العنانی' کی ایک شکل تھی، اس سے درحقیقت یہ دعویٰ کیا جاتا کہ ہندوستانی سماج ایک جامد سماج تھا جس پر 'مطلق العنان اور جابر حکمرانوں' کی فرمانروائی تھی جو عوام کو کنگال کر دیتے تھے۔ یہ وہ تصور ہے جسے میں اس کتاب میں پہلے ہی زیر بحث لا کر رد کر چکا ہوں۔ تیسری بنیادی دلیل __ کہ ہندو سماج ہمیشہ سے چار بنیادی ذاتوں یا ورنوں میں منقسم رہا ہے __ کا جواب علیحدہ سے اس باب میں دیا گیا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں مِل، میکالے اور برطانیہ میں کام کرنے والے جرمن ماہر ہند، (فریڈرک میکس) میولر کی تکڑی نے ہندوستانی ماضی کی نوآبادیاتی تشکیل بڑے مؤثر انداز میں پیش کی، حتیٰ کہ ہندوستانیوں کو بھی داخلی طور پر اسے اپنانے کے لیے تعلیم دی گئی۔ ان کے مطالعہ میں ہندوستانی تہذیب کو اساسی طور پر، اعلیٰ جاتیوں کی جانب سے متعین کردہ تعریف کے مطابق ہندو، اور آرین نسل کے اخلاف کے طور پر دیکھا گیا، جن کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ قریباً 1500 قبل مسیح میں انھوں نے شمال میں وسط ایشیائی میدانوں سے یلغار کی، گھربار چھوڑ کر دیسی آبادی کے ساتھ جذب ہو گئے، ایک رہائش پذیر زرعی تہذیب کو پروان چڑھایا، سنسکرت بولتے تھے اور وید مرتب کیے۔ مسلمان، حملہ آوروں اور فاتحین کے پہلے ریلے کے طور پر آئے، اور آخر کار برطانویوں کی طرف سے معزول کر دیے گئے۔ انیسویں صدی کے اواخر کے ہندوستانی قوم پرستوں کے لیے، ہندو اور مسلمان احیائے ماضی کے حامیوں کے لیے، اور حتیٰ کہ قدیم ہندوستانی روحانیت سے پھوٹی کاسموپولیٹن تحریکوں جیسا کہ تھیوسوفیکل سوسائٹی کے لیے، جس کے شریک بانی کرنل ایچ ایس اولکوٹ، انیسویں صدی میں 'آرین سلسلہ نسب' کے نظریے کے بنیادی شارح تھے، کے لیے یہ تاریخ اس کے بعد تحصیل شدہ حکمت بن گئی۔ حالانکہ اولکوٹ وہ پہلا شخص تھا جس نے یہ دلیل دی کہ آرین ہندوستان کے مقامی لوگ تھے اور وہ

ہندوستان سے تہذیب مغرب تک لے کر گئے، یہ وہی تصور ہے جو آج ہندوتوا کے شارحین شد و مد سے پیش کرتے ہیں۔

مسلمانوں کو بنیادی قومی بیانیے سے خارج کر کے، ہندوستانی تاریخ کی انیسویں صدی کی نو آبادیاتی تشریح نے بیسویں صدی کے دو قومی نظریے کی تشکیل میں مدد فراہم کی جس نے آخر کار ملک کا بٹوارہ کر دیا۔ سکالر شپ کی پرت چڑھا کر، اس نے تقسیم کرو اور حکومت کرو کی برطانوی سٹریٹیجک پالیسی کا جواز پیدا کیا، جس میں سامراجیوں نے ہندو اور مسلمانوں کے مابین اختلافات کو نمایاں کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تاکہ آخر الذکر کو اکسایا جائے کہ اس کے مفادات اول الذکر کی ترقی کے ساتھ ہم آہنگ نہیں۔

ایک بار پھر، جیسا کہ ذات پات اور زبان کے اختلافات کے ساتھ تھا، اس مذہبی اختلاف کی ماقبل نو آبادیاتی تاریخ میں کوئی بنیاد نہیں تھی۔ فاضل محقق گیننندر پانڈے کی رائے ہے کہ مذہبی فرقہ واریت بڑے پیمانے پر ایک نو آبادیاتی تشکیل تھی۔ اس کی تالیف وضاحت کرتی ہے کہ نو آباد کاروں کی ہندوستانیوں کو جن پر وہ حکومت کرتے تھے، کی فہرست سازی، زمرہ بندی اور درجہ بندی کی کوششیں کیسے براہ راست 'افقی ذات پات کے شعور' کو ابھارنے کی جانب لے گئیں، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مذہبی اختلافات کا شعور پیدا کرنے میں بھی کردار ادا کیا۔ نو آبادیاتی عہدیدار اکثر دونوں کمیونٹیوں کے نمائندوں سے خود-شعوری طور پر تشکیل کردہ 'محکم' روایت بارے پوچھتے جیسا کہ ان سے پوچھتے کہ گائے کی قربانی کے حوالے سے مروجہ اعتقادات اور رواج کیا ہیں، جس سے دونوں گروہ، یہ سمجھنے کے باوجود کہ اعتقادات و رواج کیسے ہونے چاہئیں، اس کا مبالغہ آمیز بے لچک نقطہ نظر پیش کرنے پر انگیخت ہوتے! حالانکہ پانڈے تصدیق کرتا ہے کہ یہ شناختیں 'ماقبل نو آبادیاتی دور میں موجود تھیں، اس کا یقین ہے کہ نو آبادیاتی پالیسیوں نے ان فرقہ وارانہ شناختوں کو مزید مضبوط بنا دیا۔

یہ بالکل قرین قیاس ہے۔ قبل از نو آبادیاتی دور میں دونوں کمیونٹیوں کی عموماً ایسے معاملات پر اکٹھے کام کرنے کی کہانیوں کی بہتات تھی، جن سے بنیادی طور پر کسی ایک کا فائدہ ہوتا تھا: مثال کے طور پر ہندو، مسلمانوں کی ایک مزار کی دوبارہ تعمیر کے لیے مدد کرتے، یا مسلمان ایسا ہی کرتے جب ایک ہندو مندر کی دوبارہ تعمیر کرنی ہوتی۔ پارسا ہندوؤں کو بعض اوقات مسلمانوں والے نام دیے جاتے اور اکثر اوقات فارسی کے فصیح عالم ہوتے؛ مسلمانوں نے مراٹھا (ہندو) جنگجو بادشاہ شیواجی کی فوج میں اسی طرح خدمات سرانجام دیں، جس طرح ہندو

راجپوتوں نے کٹر اسلام پرست اورنگزیب کی فوج میں۔ وجے انگارہ کی فوج میں مسلمان گھڑ سوار دستے شامل تھے۔ بہت سے مورخین یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ، دیہات کی سطح پر، رواجوں اور اعتقادات کا ایک وسیع سلسلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مشترکہ تھا، حتیٰ کہ، بعض اوقات مشترکہ طور پر ایک ہی ولی یا مقدس جگہ کی پوجا کی جاتی تھی۔ کیرالہ میں یاترا کے مشہور مقام صاباریمالا میں چوٹی پر لارڈ ایاپا کی درگاہ کی دشوار گزار چڑھائی کے بعد، بھگت سب سے پہلے ان کے مسلمان چیلے، واوار سوامی کی درگاہ کو سامنے پاتا ہے۔ مسلمانوں کی روایت کے مطابق، اس کے اندر کوئی بت نہیں، محض ایک علامتی پتھر کی سل، ایک تلوار (واوار ایک جنگجو تھا) اور ایک سبز لباس ہے، جو کہ اسلام کا رنگ ہے۔ مسلمان سیوک مزار کا انتظام کرتے ہیں۔ (ایک اور حیران کن مثال میں، حیران کن کیونکہ یہ تاریخی طور پر غلط بھی ہے اور اجتماع ضدین بھی، ٹوڈی پوٹ تامل ناڈو کے ایک مندر میں ایک مقدس ہستی موتال راوتن ایک مسلمان سپہ سالار ہے ___ داڑھی، قم قم اور تاڑی کے کٹورے سے کامل ___ جس نے مہابھارت میں دروپدی کو بچایا۔ یقیناً یہ بات قابل غور ہے کہ اسلام اس وقت ابھی وجود پذیر ہی نہیں ہوا تھا جب مہابھارت لکھی گئی، لیکن اسلام کے بعد کے دور کے مکرر بیانیے میں ایک مسلمان سپاہ سالار کہانی کے خاکے میں داخل ہو گیا!)

ہندوستانی تمام مذہبی کمیونٹیز بڑے عرصے سے باہم مل جل کر رہ رہی تھیں، اور حتیٰ کہ مذہبی رواجوں میں خارج کرنے کا عمل نہ ہونے کے برابر تھا: چنانچہ مسلمان موسیقاروں نے ہندو بھجن گائے، ہندوؤں کا مجمع صوفی مزارات پر اکٹھا ہوتا اور وہاں ان صوفیاء کی پوجا کرتا، اور بنارس میں مسلمان کاریگر ہندو رام لیلا کے سوانگ کے لیے روایتی مکھوٹے تیار کرتے۔ شمالی ہند نے، جسے 'گنگا جمنی تہذیب' کہتے ہیں، اجتماع ضدین والے اس کلچر، جس میں دونوں اعتقادات کے ثقافتی رواج یکجا ہو گئے تھے، کو یادگار بنا دیا۔ رومیلا تھاپر نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ ان شعراء نے کتنی عمیق بھگتی شاعری کی تھی، جو کہ پیدا مسلمان ہوئے تھے لیکن ہندو دیوتاؤں کو پوجتے تھے، خاص طور پر سید ابراہیم، جو عام طور پر راسخان کے نام سے جانے جاتے ہیں، جن کے مہاراج کرشن کے نام معنون دوہے اور بھجن، سولھویں صدی میں بہت زیادہ پڑھے جاتے تھے۔ وہ بیان کرتی ہیں، بہت سی سنسکرت مذہبی کتب کے فارسی میں ترجمے کا سب سے سنجیدہ سرپرست مغل دربار بن گیا، بشمول رزمیہ مہابھارت (جس کا ترجمہ رزم نامہ کے نام سے کیا گیا) اور بھگوت گیتا کے، ان تراجم میں فارسی کے علماء کے ساتھ برہمن پنڈتوں کا اشتراک ہوتا تھا۔

گیانندر اپانڈے کے مطابق، یہ کہانیاں اور ان کے ساتھ ساتھ مغل دربار میں ہندو جرنیلوں کی حکایات، یا پھر سکھ حکمران رنجیت سنگھ کے مصاحبین میں ہندو اور مسلم وزراء کا ہونا یہ بتاتا ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں باشندوں کے درمیان مذہب (یا حتیٰ کہ ذات پات کی بنیاد پر بھی) کی بنیاد پر خود شعوری شناختیں دھندلی تھیں اور خود تعینی نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ کہانیاں باہمی ناموافقیت یا معاندانہ نظریات بارے کچھ نہیں بتاتیں۔ جیسا کہ سوامی وویکانند نے شکاگو میں عالمی مذہبی پارلیمنٹ میں بڑی عمدگی سے بیان کیا کہ تمام تر طویل تہذیبی تاریخ کے دوران، اختلافات کی قبولیت، ہندوستانی تجربے میں مرکزی حیثیت کی حامل رہی تھی۔

ماضی میں اجتماعی عمل کے لیے مذہب ناگزیر طور پر مکمل بنیاد نہیں تھا، یہ محض سیاسی تھا: ذات، کمیونٹی، جاتی اور برادری اپنا کردار ادا کرتی تھیں۔ لیکن بہت سی کمیونٹیوں کے دائرہ کار میں تصرفِ بے جا کے ذریعے ملکی سماجی تعلقات کو درہم برہم کر دیا گیا، یوں نو آبادیاتی ریاست نے ان روابط کو کم کر دیا جو انھیں ان اختلافات کے باوجود نسلوں سے آپس میں جوڑے ہوئے تھے۔

حقائق واضح ہیں: ہندوؤں اور مسلمانوں (مذہبی تعریف کے مطابق) کے مابین وسیع پیمانے پر کشمکش نو آبادیاتی حکمرانی کے زیرِ اثر شروع ہوئی؛ بہت سے دوسرے سماجی تنازعات پر بھی مذہب کا ٹھپہ لگایا گیا کیونکہ نو آبادکار اور مستشرقین کا مفروضہ تھا کہ ہندوستانی سماج میں مذہبی تقسیم ہی بنیادی ہے۔ اس بات پر عمومی اتفاق رائے ہے کہ یہ نقطہ قابل بحث ہے، کہ کیا انیسویں صدی سے پہلے ہندوستان میں بامعنی طور پر مکمل ہندو یا مسلم شناخت موجود تھی۔

میں جانتا ہوں کہ یہ دعویٰ تشکیکین کو ابھارے گا، جو یہ دلیل دیں گے کہ مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کا کشت و خون 712 عیسوی سے کرتے چلے آ رہے تھے، جب نوعمر عرب جنگجو محمد بن قاسم نے ہندو مملکت سندھ کو فتح کیا۔ درحقیقت، یہ دلیل کہ کشیدگی 12 سو سال پہلے، اسلام کی شمالی ہند میں آمد سے چلی آ رہی تھی، عموماً پاکستانیوں (علیحدگی کے جواز کے لیے) اور ہندوتوا مقاصد کے معاونین دونوں کی جانب سے دی جاتی ہے، جو عموماً یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ 60000 کے قریب ہندو مندروں کو صدیوں کے دوران مسلمان حکمرانوں نے مسمار کیا، اور ان میں سے 3000 مندروں کی بنیادوں پر مسجدیں تعمیر کیں۔

ان میں سے چند ایک تو ناقابل تردید طور پر واقعتاً کی گئیں: آپ کو اس کے لیے صرف قطب کمپلیکس دہلی میں سلطان التتمش کی بنائی ہوئی یادگار مسجد اور اس کے گرد و پیش کے فن تعمیر کی سیاحت کرنی ہو گی جہاں آپ

آج بھی اس کے ستونوں پر آراستہ دقیق ہندو مذہبی کندہ کاری دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے دو مختلف علاقوں میں مورخین سنتھیا ٹالبوٹ اور رچرڈ ایم ایٹن کا علیحدہ سے کیا گیا کام یہ بیان کرتا ہے کہ مندروں کی بے حرمتی عمومی طور پر جنگ کے مواقع پر سرحدوں کے پھیلاؤ کا مظہر تھی، اور زیادہ تر علاقائی حدود کی تبدیلی کے دوران جنگی لڑائی کے شدید جنون میں کی جاتی۔ ایٹن کا خیال ہے کہ ترک اور دوسرے مسلمان حکمرانوں کی جانب سے مندروں کی مسماری زیادہ تر مملکتوں کو فتح کرنے کے عمل کے دوران ہوئی؛ ہندو سیاسی افکار میں شاہی مندر راجہ کی طاقت کی علامت تھا، لہٰذا اس کی تباہی راجہ کی مکمل تذلیل کو ظاہر کرتی تھی۔ آندھرا پردیش کے علاقے میں مسلمانوں کی توسیع پسندی کے دور سے متعلقہ ٹالبوٹ کی تحقیق بھی ایسے ہی نتائج پیش کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں، حملہ آوروں کے مندروں پر حملے مذہبی تحریک کی بجائے سیاسی تھے۔ ایٹن اور ٹالبوٹ دونوں یہ دلیل دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی اسلامی بت شکن کے طور پر تصویر کشی، اور مذہبی انتہا پسندی کی وجہ سے ان کا مندروں کو مسمار کرنا سچائی کے بالکل خلاف ہے۔ یقیناً جو حملہ آور آئے اور واپس چلے گئے جیسا کہ محمود غزنوی، محمد غوری اور نادر شاہ وہ تباہی اور لوٹ مار پر مائل تھے، لیکن وہ مسلمان جو ہندوستان میں رک گئے انھوں نے مندروں کو تباہ کرنے کے لیے حملہ نہیں کیا، بلکہ انھیں اہمیت دی اور ان کی معنویت کو سمجھا۔

ایسی کوئی بھی دلیل خاص طور پر مسلمان جنگجوؤں کی بت شکنی کی پیش کی گئی متعدد مثالیں لازماً متنازعہ فیہ ثابت ہوں گی۔ کیونکہ ہم آہنگی اور صلح کل کی مثالیں۔ اس سے کہیں زیادہ کثیر التعداد ہیں۔ قبل از نو آبادیاتی دور میں ہندوستانی مذہبی رواداری کی بہترین مثال، شناختوں کو ایسے تخلیقی انداز میں قائم کرنے کی ہے جو بڑی آسانی سے ایک دوسرے کے رنگ میں رنگ جاتی تھیں، یہ موجودہ ریاست کیرالہ، جسے برطانوی ساحل مالابار پکارتے تھے، سے ملتی ہے۔ بیرونی اثرات کی جانب کھلا پن ــــ عربی، رومی، چینی، برطانوی، اسلامی، عیسائی، برہمنی ــــ جس کا انعکاس ملیالی عوام کا تجارتی ورثہ بنانے میں ہوا۔ دو قرنوں سے بھی پہلے کیرالہ کے لوگوں کے تجارتی تعلقات نہ صرف باقی ہندوستان بلکہ عرب دنیا، فونیقی اور رومی سلطنت کے ساتھ بھی تھے، چنانچہ ملیالی لوگ بڑے عرصے سے باقی انسانیت کی طرف ایک فیاض اور خیر مقدمی رویہ رکھتے تھے۔ رومی آزار سے بھاگ نکلنے والے یہودیوں کو یہاں پناہ ملتی؛ کرینگانور میں ان کی بود و باش کے شواہد 68 عیسوی تک ملتے ہیں۔ اور 1500 سال بعد، کوچی میں یہودی رہائش پذیر ہوئے، جہاں انھوں نے ایک عظیم الشان سیناگوگ تعمیر کیا جو آج بھی موجود ہے۔ کیرالہ کے عیسائیوں کا تعلق، فلسطین سے باہر عیسائیوں کی قدیم ترین کمیونٹی سے ہے۔ اور جب

حضرت عیسیٰؑ کے بارہ حواریوں میں سے ایک، سینٹ تھامس، کیرالہ میں عیسائیت لے کر آئے، تو یہ کہا جاتا ہے کہ ایک بانسری بجاتی یہودی لڑکی نے ساحل پر انھیں خوش آمدید کہا۔ سینٹ تھامس نے اعلیٰ نسب کے نمبودری برہمنوں کو عیسائی بنایا، جس کا مطلب ہے کہ ایسے ہندوستانی تھے جن کے خاندان عیسائیت پر اس وقت عمل پیرا تھے، جس وقت کا دعویٰ کسی بھی برطانوی کے آباءواجداد نہیں کر سکتے۔

کیرالہ میں اسلام تلوار کے ذریعے نہیں آیا، جیسا کہ شمالی ہندوستان میں ہوا، بلکہ تاجروں، سیاحوں اور مبلغین کے ذریعے پہنچا، جو ساحلی عوام کے لیے اس کا مساوات اور مواخات کا پیغام لائے۔ نئے عقیدے کو رد کرنے کی بجائے، پرامن طور پر اپنایا گیا اور اس کی حوصلہ افزائی کی گئی: جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، فی الحقیقت کالی کٹ کا زامورن اس کمیونٹی کی بحری مہارت سے اتنا متاثر تھا کہ اس نے سولہویں صدی میں ایک فرمان جاری کیا کہ اس کی مملکت میں ہر مچھیرے کا خاندان پابند ہے کہ اس کی مسلمان نیوی جس کی کمان عرب حسب نسب کے مسلمان ملاحین، کنجالی مراکر کے پاس تھی میں بھرتی کے لیے، ایک بیٹے کی پرورش بطور مسلمان کے کرے۔ کیرالہ میں مسلم کمیونٹی سے متعلقہ فساد کا پہلا ریکارڈ شدہ واقعہ، جو مخالف جنگجوؤں یا بادشاہوں کی متصادم افواج کی بجائے مذہبی طور پر متعین ہوا، وہ برطانوی ہند میں وقوع پذیر ہوا جب 1920 میں 'موپلا بغاوت' ہوئی۔

مسلمانوں کے حملوں کے دور میں (چودھویں سے سولہویں صدی تک) جنوبی ہند کے جزیرہ نما پر نظر ڈالتے ہوئے، سنتھیا ٹالبوٹ نے بیان کیا کہ، چونکہ ازمنہ وسطی کے جنوبی ہند کی زیادہ تر آبادی غیر مسلم رہی، حتیٰ کہ ان علاقوں میں بھی جہاں مسلمان سیاسی طور پر غالب تھے، دونوں معاشرتی طبقات ایک دوسرے کے ساتھ موافقت میں رہے۔ ان حالات میں ایک خاص حد تک تعاون اور اشتراک ناگزیر تھا۔ جزیرہ نما کے مسلمان حاکمین محاصل اکٹھا کرنے اور مضافاتی علاقوں میں امن وامان برقرار رکھنے کے لیے ہندو عہدیداروں اور جنگجوؤں پر انحصار کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی خطیبانہ تصویر کشی کے حوالے سے، 'دوسرے کی بدنامی اور رواداری کی تصویر کشی دونوں ملتی ہیں'، لیکن ان کا مدعا مذہب کی بجائے بدیسی ہونے کو نمایاں کرنا تھا۔ اور یقیناً بدیسیت ایک ایسی صفت تھی جو وقت کے ساتھ اگر مکمل طور پر ختم نہیں بھی ہوئی تو کم ہوتی چلی گئی۔

ما قبل نو آبادیاتی ماضی اور ہندو مسلم تقسیم کی دانستہ سامراجی ترکیب سے برطانوی انکار کے سیاسی نتائج، 1857 کے بعد انیسویں صدی کے اواخر میں بڑی شدت سے واضح ہونا شروع ہو گئے۔ جب ایلن اوکٹیوین ہیوم

نے انڈین نیشنل کانگریس بنائی تو اس نے ہر عقیدے کے ہندوستانیوں کو تنظیم میں خوش آمدید کہا؛ اس کے پہلے چند صدور ہندوؤں، عیسائیوں، پارسیوں اور مسلمانوں پر مشتمل تھے۔ برطانویوں نے ہیوم کے لبرل طریقے کی اجازت نہیں دی۔ (کیا وہ انگریزی پڑھے لکھے ہندوستانی کو آپریٹو طبقے کو اختیارات دینے میں مخلص تھے، وہ ان لبرل وکلاء کو جو کہ ان میں سے زیادہ تر تھے، کو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے لیے نامزد کر کے، ایسا بآسانی کر سکتے تھے)۔ اس کی بجائے انگریز، مذہب سے ماورا، ایک سیکولر تنظیم کانگریس کو، شہرت کی بلندیاں طے کرتے، بڑھتی ہوئی ناپسندیدگی کے ساتھ دیکھتے رہے، اور اسے ہندو اکثریتی جماعت قرار دیا۔ 1906 میں، انھوں نے ڈھاکہ کے ایک مسلم اشراف نواب سلیم اللہ کو، فقط اپنے ہم مذہبوں کے لیے، ایک مقابل تنظیم ــــ مسلم لیگ شروع کرنے پر اکسایا۔

اس دوران، 1905 میں لارڈ کرزن کے تقسیم بنگال کے فیصلے نے، جو بظاہر انتظامی وجوہات کی بنا پر لیکن درحقیقت مشرق میں ایک مسلم اکثریتی صوبہ بنانے کے لیے کیا گیا، نے بنگالی سوسائٹی کے تمام طبقوں کی اور ہر علاقے کے ہندوستانی قوم پرستوں کی شدید مخالفت کو ابھارا، جو اسے ملک کو تقسیم کرنے کی واضح کوشش کے طور پر دیکھتے تھے۔ برطانویوں نے دانستہ طور پر مسلمانوں کو ان کے مفادات کی ترویج کے لیے بنگال کی تقسیم پر 'قائل' کیا، لہٰذا نواب آف ڈھاکہ، جس نے پہلے پہل اپنے صوبے کی تقسیم کو 'درندگی' کہہ کر رد کیا تھا، لارڈ کرزن کے ساتھ اپنی ملاقات کے زیر اثر اپنا ذہن تبدیل کرنے پر مائل ہو گیا۔ اس کے بعد تقریریں کی گئیں جن میں وائسرائے نے وعدہ کیا کہ تقسیم 'مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں یگانگت قائم کرے گی، جس سے انھوں نے پرانے مسلمان وائسرائے اور بادشاہوں کے ادوار سے لے کر اب تک استفادہ حاصل نہیں کیا'۔ گولی مزید میٹھی کرنے کے لیے، برطانوی حکومت نے نواب کو رعایتی شرح سود پر ایک لاکھ پونڈ کا ذاتی قرض دیا، اور جلد ہی نواب اور اس کے پیروکاروں نے تقسیم بنگال کے کٹر حمایتی بنتے ہوئے یوٹرن لے لیا۔

برطانویوں نے اپنی جانبداری چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ ہربرٹ ریسلے، اس سکیم کا منصوبہ ساز، بڑی بے تکلفی سے تسلیم کرتا ہے کہ 'ہمارا ایک مقصد نفاق پیدا کرنا تھا اور یوں ہماری حکمرانی کے مخالفین کی مضبوط تنظیم کو کمزور کرنا تھا'۔ بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر سر بمپفیلڈ فلر نے کھلم کھلا کہا ــــ 'کہ اس کی دو بیویوں (مطلب اس کے صوبے کے ہندو اور مسلمان فریقین) میں سے، مسلمان پسندیدہ ہے' ــــ بعد میں اس نے کہہ دیا کہ ایسا اس نے مذاق میں کیا تھا۔ اس کے 'مذاق' کو بہرحال چند مسلمان عناصر نے کافی سنجیدگی سے لیا، انھوں نے یہ

نتیجہ نکلا کہ ان الفاظ کے ساتھ برطانوی صاحبان اقتدار انھیں ہندو مخالف فسادات کے لیے سزا سے بریت دینے پر تیار تھے، جس کا پھر مشرقی بنگال میں آغاز بھی ہو گیا۔ اس کے بعد ہندو اقلیت پر حملے، ریپ اور اغوا شروع ہو گئے: ہنری نونسن رپورٹ کرتا ہے کہ 'یوں مشرقی بنگال میں ایک نئی مذہبی عداوت کی بنیاد پڑی'۔ جیسا کہ احتجاج کرنے والوں نے بڑا واضح طور پر دیکھا کہ انتظامی تقسیم، نے بنگالی کمیونٹیز کی سماجی یگانگت پر حملے کا مقصد پورا کیا۔

نونسن مزید لکھتا ہے:

جہاں کہیں بھی نسل یا مذہب کی عداوت تھی، میں نے تقریباً بلا تغیر انگریز افسران اور عہدیداران کو مسلمانوں کا طرفدار ہی پایا۔ اور مشرقی بنگال میں حکومت کے واضح عزم سے اس قومی میلان کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی تاکہ اپنے اختیارات کو کسی بھی طرح استعمال کر کے تقسیم کے لیے مسلمانوں کی حمایت حاصل کی جائے۔ یہ فقط ہندوؤں کے خلاف تھی کہ افسر شاہی کی جانب سے ہر طرح کی معمولی سے معمولی اذیت کی ہدایت کی جاتی۔ وہی تھے جنھیں حکومتی عہدوں سے خارج کیا گیا؛ یہ ہندو سکول تھے جن سے حکومتی سرپرستی ختم کی گئی۔ جب مسلمانوں نے دنگے کیے تو تعزیری پولیس نے ہندو گھروں کی تلاشی لی، اور ٹھگنے گورکھوں کی کمپنیاں ہندو آبادیوں پر تعینات کی گئیں۔ یہ ہندو ہی تھے، جن کے لیے ایک علاقے میں دریا کنارے بیٹھنے پر پابندی عائد کی گئی۔ یقیناً، عذر یہی تھا کہ فقط ہندو تھے جو اپنی باقی نسل سے علیحدہ کیے جانے کی حکومتی پالیسی کے خلاف تھے، چنانچہ وہی اکیلے تھے جنھیں کچلنے کی ضرورت تھی۔

اس پر کانگریس نے شروع میں چاہا کہ اس ہونی کو اپنی پیش قدمی کے لیے استعمال کرے: لیگ کو مسلم عوام کے مابین محض اشرافیہ، طبقہ اعلیٰ کے تاجروں اور زمینداروں کی نمائندہ سمجھتے ہوئے، اس نے اسے خطرہ تصور نہ کیا۔ درحقیقت، معتدل آغا خان کے اس کے پہلے صدر کے طور پر الیکشن سے اس اندازے کی تصدیق ہوتی تھی۔ کانگریس نے اعلان کیا کہ لیگ کی رکنیت رکھنا کانگریس کی رکنیت کی نقیض نہیں، لیگ اراکین کو کانگریس میٹنگز میں مدعو کرنا جاری رکھا گیا، اور تین بے مثال موقعوں پر، مسلم لیگ کے منتخب اراکین سے کانگریس کی صدارت کروائی گئی۔ (حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی اور ڈاکٹر ایم اے انصاری نے، بغیر کسی ایک پارٹی کو چھوڑے، کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی صدارت کا غیر معمولی امتیاز حاصل کرنے کا لطف اٹھایا۔)

موتی لال نہرو کو ایک ذہین نوجوان مسلمان وکیل محمد علی جناح کے ساتھ کانگریس نے 1916 میں چنا تاکہ مسلم لیگ کے ساتھ تعاون پر رہنمائی کرنے والے اصولوں کا مسودہ تیار کریں۔ ان کے کام نے یہ اصول تسلیم کیا کہ اقلیتی کمیونٹی کے مفادات اور اعتقادات کو متاثر کرنے والے فیصلے، اس کمیونٹی کے نمائندوں کی اکثریت کی رضامندی کے بغیر نہیں لیے جائیں گے، اس سے ان بنیادوں کی تشکیل ہوئی جنھیں وسیع پیمانے پر معاہدہ لکھنو کہا گیا۔ کانگریس کے ممتاز ادبی ستارے، شاعرہ سروجنی نائیڈو نے جناح صاحب کو 'ہندو مسلم اتحاد کے سفیر' کا خطاب دیا، اور ان کی تقریروں اور تحریروں کے مجموعے کی ایڈیٹنگ شروع کر دی۔

در حقیقت، برطانویوں کے تمام تر بڑھاوے کے باوجود، ہندوستان کے مسلمان من حیث المجموع اپنے مستقبل کو اپنے ہندو ہم وطنوں کے ساتھ وابستہ ہونے کے علاوہ کچھ اور خیال نہیں کرتے تھے۔ یہ حیران کن ہے کہ، 1918 تک، اپنی سب سے بنیادی کتاب 'ہندوستانی سوال' میں آغا خان نے بڑی صراحت سے ہندوستانی بصیرت کو چار تہذیبوں کا سنگم قرار دیا__ 'مغربی، مشرق بعید، براہمنی اور محمڈن__' اور ایک 'ہندوستانی حب الوطنی' کا اظہار کیا جو کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قریبی میل جول کو تسلیم کرتی ہے، (بشمول مشرقی افریقہ کو برطانیہ کی بجائے ہندوستان کی نو آبادی بنانے کی ایک عمومی خواہش کے)۔ بعینہٖ، وہ 'سیاسی پان اسلام ازم' کو رد کرتے ہوئے، اسلام کو ایسی سماجی، تمدنی اور روحانی قوت بیان کرتے ہیں جو پوری دنیا کے مومنین کو اخلاقی طور پر جوڑتی ہے، لیکن وہ زور اس بات پر دیتے ہیں کہ مذہب موجودہ دنیا میں دنیاوی معاملات سے متعلق کم اور روحانی معاملات سے متعلق زیادہ بڑی قوت بن چکا ہے۔ اس (دور) میں قومی اور مادی مفادات مذہبی تعلقات پر حاوی ہو چکے ہیں۔ دوسرے تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمان بھی وسیع پیمانے پر نظریات رکھتے تھے، اور تقریباً اس سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار جسٹس سید محمود نے چار عشرے پہلے کیا تھا۔

مہاتما گاندھی کانگریس کی قیادت سنبھالنے پر، جنگ عظیم اول میں سلطنت عثمانیہ کے بکھرنے کے بعد، ہندوستانی مسلمانوں کے ترکی میں خلافت بحال کرنے کے مطالبے کی حمایت میں خلافت تحریک کا ہراول دستہ بنے، وہ مسلمان رائے عامہ کے ساتھ مشترکہ مقصد بنانا چاہتے تھے۔ یہ تحریک غیر موثر ہو گئی جب اس پر داخلی معاملات کا غلبہ ہو گیا (بشمول خلافتی جیالوں کے ہندوؤں پر حملوں کے، جن کی حمایت کو مقصد کے لیے ناکافی تصور کیا گیا) اور کسی طور بھی، ترکی میں حالات کی وجہ سے غیر متعلق ہو گئی، لیکن یہ کانگریس کا اعتقادات سے قطع نظر، تمام ہندوستانیوں کی نمائندگی، اور مذہبی تقسیم کے برطانوی منصوبے کے آگے نہ جھکنے، کی پر عظم

کوششوں، کا سنجیدہ اظہار تھا۔

برطانویوں کی انجام دی گئی مردم شماری کی واضح سیاسی اہمیت تھی، کیونکہ بیسویں صدی کے اوائل میں مردم شماری کے اعداد وشمار سیاسی مباحث کے لیے فیصلہ کن تھے۔ برٹش انڈین آرمی کی تشکیل میں انھیں نظرانداز کیا گیا، جس میں آبادی کا 20 فیصد ہونے کے باوجود، یونیفارم میں نوکری کرنے والے ہندوستانیوں میں مسلمان 50 فیصد تھے۔ (دلت لیڈر ڈاکٹر بی آر امبیڈکر کی رائے تھی کہ فوج میں غیر متناسب نمائندگی کا یہ ڈھانچہ قصداً بنایا گیا تھا تاکہ برطانوی راج کے خلاف 'ہندو ایجیٹیشن' کی قوتوں کا سدباب کیا جا سکے۔) لیکن جب بات سیاست کی ہوتی، تو کچھ مسلمانوں میں، خطرے سے دوچار اقلیت کے اندیشے کو افزوں کرنے کے لیے مردم شماری کے اعداد وشمار برطانویوں کے لیے سب سے مفید ثابت ہوتے تھے۔ جب پہلی مرتبہ مذہبی شناخت کی بنیاد پر منٹو مارلے اصلاحات کے ذریعے جداگانہ انتخابات کا تعین کیا گیا، تو منصوبے کے مطابق، فرقہ وارانہ شناخت اور نمائندگی اہم امور بن گئے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، بالکل اسی طرح، جب برطانویوں نے صوبہ بنگال کو تقسیم کرنا چاہا، تو نوآبادیاتی حکمرانی میں مردم شماری کے اعداد وشمار نے ایک غیر معمولی آشوب کو جنم دیا۔

بالکل اسی طریقے سے، آخر کار جب ایک محدود حق رائے دہی کو مونٹیگیو۔چیلمسفورڈ اصلاحات کے ذریعے عام ہندوستانیوں تک پھیلایا گیا کہ وہ برطانوی توثیق شدہ مجالس میں محدود اختیارات کے عہدوں کے لیے ووٹ دیں، تو سامراجی افسران نے سیاسی حق انتخاب، برطانوی حکومت کی ہندوستانی سماج میں تخلیق کردہ مختلف فرقہ وارانہ شناختوں کو سونپ دیا، استعمار پسندوں سے عنایات کے حصول کے لیے ہر ایک دوسرے کے مقابل تھی۔ چنانچہ ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور دیگر کے لیے نشستیں مخصوص کی گئیں۔ اس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ شناختیں زیادہ سنگین ہو گئیں، لہٰذا تھوڑی سی سیاست کی جو اجازت دی گئی تھی وہ بہت تیزی کے ساتھ محدود وسائل کے حصول کے لیے فرقہ وارانہ مقابلے میں ڈھل گئی۔ عوامی جذبات برانگیخت ہونے سے ہندوستانیوں کے مابین اختلافات شدت اختیار کر سکتے تھے، جو برطانوی مفاد کو تقویت دیتے، جو یقیناً ان سب سے مقدم تھے۔ چنانچہ انگریز، جو گولڈرز گرین کے یہودیوں کو لندن الیکشن میں جداگانہ ووٹ کی اجازت دینے کے خیال سے ہی کپکپا اٹھتے ہوں گے، نے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بڑی گرم جوشی سے جداگانہ حلقہ انتخاب کا اہتمام کیا، جہاں مسلمان ووٹرز صرف مسلمان امیدوار کو ووٹ دے سکتا تھا، سکھ صرف سکھ کو اور عیسائی صرف عیسائی کو۔ اس عمل نے ول ڈیورانٹ کو ترغیب دی کہ وہ بیان کرے کہ برطانوی اپروچ نے اس نسلی اور مذہبی

تقسیم'، جس کا کوئی بھی مدبر سیاستدان تصفیہ کرانا چاہے گا، اس کی حوصلہ افزائی کی اور اس کی شدت میں اضافہ کیا۔

لیکن حکومتی پالیسی کا مقصد تصفیہ نہیں تھا، جیسا کہ ہم اس باب کے آغاز سے ہی دیکھ چکے ہیں: تقسیم شدہ عوام کو مغلوب کرنا آسان ہوتا ہے۔ انڈیا کے لیے سیکرٹری آف سٹیٹ، لارڈ اولیور نے 1920 میں 'مسلم کمیونٹی کی موافقت میں برطانوی افسران کے غالب تعصب..... تاکہ عمومی طور پر ہندو قوم پرستی کے خلاف توازن قائم کیا جاسکے' کا برملا اعتراف کیا۔ یہ اس برطانوی میلان کے ساتھ جڑا ہوا تھا کہ مسلمان جتنا مانگتے ہیں اس سے بھی زیادہ انھیں دیا جائے۔ لہٰذا جب مسلم لیگ نے پانچ مسلم اکثریتی صوبوں میں دو ممکنہ استحقاق میں سے ایک کا مطالبہ کیا، یا تو مخلوط انتخابات کے ساتھ قانون میں تحفظ فراہم کرتی قانونی بالغ رائے دہی، یا پھر مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات، برطانویوں نے کمیونل ایوارڈ میں انھیں جداگانہ انتخابات کے ساتھ قانونی بالغ رائے دہی بھی عطا کر دی، تاکہ مسلم لیگیوں کو بغیر روک ٹوک یہ دونوں طرح سے مل جائیں۔

ستم ظریفی ملاحظہ کریں، کیا ہندوستانی سیاست کو برطانوی سیاست کی طرح پروان چڑھنے کی حوصلہ افزائی کی گئی، نظریاتی خطوط کے ساتھ ساتھ، ایک قدامت پسند اور ایک سوشلسٹ پارٹی اور ان کے درمیان چند لبرلز کی نمود کو کوئی بھی دیکھ سکتا تھا؛ یہ تمام میلانات ہندوستانی عوام الناس کے درمیان موجود تھے۔ اس طرح کا روایتی سیاسی مباحثہ ہندوستان کو متحد رکھ سکتا تھا، جہاں ہندوستانی عوامی ڈومینین میں جناح اور نہرو اپنے دور کے ڈزرائیلی اور گلیڈسٹون بنتے۔ لیکن نوآبادیاتی پالیسیاں قدامت پسندوں اور سوشلسٹوں کو بنیادی طور پر ایک ہی طرح فرقہ وارانہ سوال کو متعین کرنے کی جانب لے گئیں، جو آخر کار ملک کو المناک تقسیم کی جانب لے گیا۔

اس کے باعث ہندوستانی حساسیت میں جو تغیرات رونما ہوئے وہ بہت عمیق تھے۔ ہندوستانی تاریخ کے اکثر محققین نے پہلے بیان کردہ مشترکہ متخالف تہذیبوں کی بتدریج کتربیونت کا الزام برطانویوں پر عائد کیا ہے۔ جیسا کہ ایلکس وون تنزیلمان نے اپنی تاریخ 'ہندوستانی موسم گرما: ایک سلطنت کے خاتمے کی خفیہ تاریخ' میں لکھا ہے جب 'برطانویوں نے مذہبی شناخت کی بنیاد پر "کمیونٹیز" کا تعین کرنا شروع کیا اور سیاسی نمائندگی ان کے ساتھ نتھی کی، تو بہت سے ہندوستانیوں نے اپنے خیالات کے تنوع کو قبول کرنا چھوڑ دیا اور یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ ان کا تعلق کس خانے سے ہے'۔

اس طرح کی تفریق نہ صرف مذہبی کمیونٹیوں کے مابین بلکہ ان کے بھیتر بھی بڑھ گئی۔ لہٰذا لکھنو کی مسلم

آبادی کے درمیان ماضی میں ناموجود شیعہ سنی تناؤ کی تخلیق کے لیے عمومی طور پر برطانیہ کو موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اودھ کے برطانوی الحاق سے قبل، دونوں فرقے ایک شیعہ نواب کے زیر حکومت موافقت سے رہتے تھے، جس کے شیعہ تہوار محرم کی تقریبات میں سنی اور ہندو بھی شامل ہو کر رعایا کے بھائی چارے کا عوامی اثبات کرتے تھے۔ جب برطانویوں نے 1856 میں ایک دفعہ نواب کو تخت سے ہٹا دیا، تو تخت کے اتحاد کی علامت ختم ہو گئی، اور حکمران شیعہ اشرافیہ اور ریاست کی غیر شیعہ رعایا (سنی اور ہندو) کے درمیان تعلقات ناقابل تنسیخ طور پر تبدیل ہو گئے۔ فرقہ وارانہ شناختوں میں برطانوی مبالغہ آرائی نے اب دونوں مسلمان فرقوں کے مابین فرقہ پرستانہ اختلافات کو بھی شامل کر لیا۔

جیسا کہ محقق کیتھ جور ٹشوج تفصیل سے بیان کرتا ہے: '1905 تک، شیعہ اور سنیوں کے مابین مذہبی جوش خطابت اس سطح تک جا پہنچا تھا کہ سنیوں نے محرم کے دوران لکھنو میں مرثیہ خوانی میں شرکت نہیں کی، بلکہ اس کی بجائے پہلے تین خلفاء کی توصیف پڑھنے لگے، جسے مدح صحابہ کہتے تھے۔ شیعہ نے صحابہ پر تبراہ کے ساتھ اس کا رد عمل دیا'۔ شیعہ قائدین نے برطانوی حکومت کو قائل کرنے کا اہتمام کر لیا کہ محرم کے دوران سنی طرز عمل بڑی حد تک بے محل ہے، لہٰذا برطانویوں نے سنیوں کے ایسے اعمال جو شیعوں کے لیے ناگوار ہوں، کے خلاف سخت قوانین بنائے۔ اس سے بہت پہلے برطانوی فیصلہ کر چکے تھے کہ شیعہ اور سنی جلوسوں کو محرم منانے کے لیے علیحدہ پروانہ عطا کیا جائے۔

لکھنو میں برطانوی سپانسر کردہ شیعہ سنی تفریق واضح مثال ہے کہ کس طرح انگریز، اختلافات کی حوصلہ افزائی کرتے، اور کیسے ہندوستانی ان کمیونٹیز کو تخلیق کرنے کی سعی کرتے جنھیں راج شناخت بخشا اور سیاسی اہمیت دیتا۔ یہ ویسے ہی ہوا، جیسے ہوتا آیا تھا، بالکل اسی وقت جب بہت سے سیاسی گروہ، منٹو مارلے اصلاحات کے تحت اعلان کردہ وائسرائے اور گورنر کی کونسلز میں بڑھتی ہوئی ہندوستانی نمائندگی میں جگہ بنانے کے لیے باہم مقابلہ کر رہے تھے۔ جور ٹشوج وضاحت کرتا ہے کہ 'جب برطانوی صاحبان اختیار نے مذہبی تقریبات، جھگڑوں کی ثالثی اور جلوسوں کے راستوں کے انتظام کی اجازت یا پابندی کی ذمہ داری اٹھالی، تو انھوں نے مذہبی اختلافات کو عوامی، سیاسی اور قانونی معاملات میں تبدیل کر دیا۔ اور وہ ایسے ہی رہے'۔

ہندوستانی سیاسی وحدت کو پروان چڑھانے کے برخلاف، برطانوی پالیسیاں ان اختلافات کو شناخت کرتیں، ان پر زور دیتیں اور ان کو جواز فراہم کرتیں۔ ہندو مسلم تفریق کا کھرانہ صرف ان کے دروازے تک

جاتا ہے بلکہ شیعہ سنی کمیونٹیز کے مابین نئی سیاسی تفریق کی قانونی تعریف متعین کرنے کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے۔

برطانوی تقویت یافتہ خلیج نے مسلم کمیونٹی کو بھی تقسیم کر دیا۔ ایک نامور دیوبندی عالم، مولانا حسین احمد مدنی، جنھوں نے برطانوی پروان چڑھائی گئی فرقہ وارانہ قطبیت کی مخالفت کی اور لیگ کے پاکستان پروجیکٹ کے خلاف نبرد آزما رہے، نے 1945 میں اپنے ایک ہم مذہب کو بڑے پر جوش انداز میں لکھا:

> مسلمان ہندوؤں کے ساتھ تب سے رہتے آرہے ہیں جب سے وہ ہندوستان منتقل ہوئے۔ اور میں تب سے ان کے ساتھ ہوں جب سے میں پیدا ہوا۔ میں یہیں پیدا ہوا اور پلا بڑھا۔ اگر ایک ہی ملک، ایک ہی شہر میں دو لوگ اکٹھے رہتے ہیں تو ایک دوسرے کے ساتھ بہت سی چیزوں میں ساجھ کرتے ہیں۔ جب تک ہندوستان میں مسلمان موجود ہیں وہ ہندوؤں کے ساتھ رہیں گے۔ بازاروں میں، گھروں میں، ریلوے میں، ٹرام، بسوں اور لاریوں میں، سٹیشنوں، کالجوں، ڈاکخانوں، جیلوں، تھانوں عدالتوں، کونسلوں، اسمبلیوں اور ہوٹلوں وغیرہ میں۔ آپ بتائیے کہ کہاں اور کب ہم انھیں نہیں ملے یا ان کے ساتھ نہیں رہے۔ آپ ایک زمیندار ہیں۔ کیا آپ کے مزارع ہندو نہیں؟ آپ ایک تاجر ہیں؛ کیا آپ ہندوؤں کو بیچتے اور (ان سے) خریدتے نہیں؟ آپ ایک وکیل ہیں: کیا ہندو آپ کے مؤکل نہیں؟ آپ ایک ڈسٹرکٹ یا میونسپل بورڈ میں ہیں؛ کیا آپ ہندوؤں سے معاملات نہیں کرتے؟ کون ہندوؤں کے ساتھ نہیں؟

برطانوی سامراجی پالیسی کی سب سے اہم کامیابی ہندو مسلم عداوت کی تخلیق اور اس کا دوام تھی: تقسیم کر کے حکومت کرنے کی حکمت عملی (پراجیکٹ) بٹوارے کی ہولناکی میں اپنے عروج کو پہنچ گئی، جس کے ساتھ ہی آخر کار، 1947 میں برطانوی اقتدار زمین بوس ہو گیا۔

پاپیوں کے درمیان رِشی

برطانوی راج کے مخالف عظیم ہندوستانی، مہاتما گاندھی، نے نوآبادیاتی حکمرانی کی مخالفت انوکھے انداز میں کی: تشدد سے نہیں بلکہ اخلاقی قوت کے بل بوتے پر۔ یقیناً، گاندھی کی زندگی ان کا درس ہی تھا۔ اپنے عزم میں وہ بیسویں صدی کے سیاستدانوں میں منفرد تھے، نہ صرف اپنے اعتقادات کے مطابق زندگی بسر کرنا بلکہ عقیدے اور عمل کے درمیان کسی قسم کی تفریق کو بھی رد کرنا۔ گاندھی ایک فلسفی تھے، جو مستقل اپنے

تصورات کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا تھے، چاہے ان کا اطلاق، انفرادی عرفان ذات پر ہو یا سماجی تبدیلی پر: ان کی خودنوشت کا مخصوص انداز میں ذیلی عنوان تلاشِ حق (The Story of My Experiment with Truth) ہے۔ حق کا حصول باطل اور غیر منصفانہ طریقوں سے نہیں کیا جاسکتا، جن میں اپنے مخالف پر تشدد کرنا بھی شامل ہے۔ اسباب، مقاصد کے لیے موزوں ہونے چاہئیں، اگر ایسا نہ ہو تو مقاصد بھی فوت ہو جائیں گے۔

اپنے اسلوب کو بیان کرنے کے لیے گاندھی ستیاگرہ کا لفظ اختراع کرتے ہیں، جس کا لفظی مطلب 'حق کے ساتھ وابستگی ہے' یا جیسا انھوں نے متعدد دفعہ بیان کیا، سچائی کی طاقت، محبت کی طاقت یا روح کی طاقت ہے۔ وہ انگریزی اصطلاح 'مجہول مزاحمت' کو ناپسند کرتے تھے، کیونکہ ستیاگرہ فعالیت کا تقاضا کرتی ہے، مجہولیت کا نہیں۔ گاندھی کا خیال ہے کہ اگر آپ حق پر یقین رکھتے ہیں اور اسے حاصل کرنے کے لیے کافی تردد کرتے ہیں، تو آپ مجہول رہنا برداشت نہیں کرسکتے: آپ کو حق کے لیے تکلیف جھیلنے کے لیے خود کو مستعدی سے تیار کرنا پڑے گا۔ لہٰذا عدم تعاون اور غیر وابستگی کی طرح بہت سے بعد کے تصورات جن پر 'ترک' کا لیبل لگا ہوا تھا، کی طرح، اہنسا (عدم تشدد) کا مطلب محض مخالف کے انکار سے کہیں زیادہ تھا؛ اس کا مفہوم محض تشدد کا نہ ہونا نہیں تھا۔ اہنسا مخالف کی بجائے اپنی ذات کو اذیت پہنچا کر، حق کو قائم کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ یہ ناگزیر تھا کہ اپنے یقین کامل کی قوت کے اظہار کے لیے دانستہ سزا قبول کی جائے۔

یہ وہ طریقہ کار (اپروچ) تھا جو گاندھی آزادی ہند کی تحریک کے لیے لائے اور یہ کام کر گیا، جہاں کبھی کبھار کی دہشت گردی اور معتدل دستور پسندی، دونوں غیر مؤثر ثابت ہوئے، گاندھی آزادی کے مسئلے کو، صحیح اور غلط کے سادہ انداز میں عوام تک لے آئے، اور انھیں ایک ایسی تکنیک سے آشنا کیا جس کا برطانویوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ کونسلوں اور میٹنگ رومز سے آگے نکل کر اس نے عوامی متخیلہ کو گرفت میں لیا۔ تشدد سے پرہیز کرکے مہاتما نے اخلاقی برتری حاصل کی۔ غیر متشدد طریقے سے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، اس نے قانون کی ناانصافی کو واضح کیا۔ اپنی ذات پر تھوپی گئی سزاؤں کو قبول کرکے، اس نے اپنے صیاد کا مقابلہ اسی کے ظلم کے ساتھ کیا۔ رضاکارانہ طور پر، بھوک ہڑتال کی تکلیف خود پر مسلط کرکے، انھوں نے بتا دیا کہ جسے وہ حق سمجھتے ہیں اس کے دفاع کے لیے کس حد تک جانے کو تیار ہیں۔ آخرکار برطانوی حکمرانی کے دوام کو ناممکن بنا دیا۔

یوں، جس کا خیال 1905 میں لالہ لاجپت رائےؒ نے پیش کیا تھا: گاندھی اسے مجسم کر رہے تھے، لالہ نے کہا تھا، 'برطانوی روحانی لوگ نہیں۔ وہ یا تو جنگجو نسل ہیں یا تجارت پیشہ قوم۔ ان سے اعلیٰ اخلاقی اصولوں یا عدل یا اخلاقی قدروں کے نام پر اپیل کرنا ایسا ہی ہو گا جیسے سؤر کے سامنے موتی پھینکنا۔ وہ اپنی ذات پر اعتماد رکھنے والے متکبر لوگ ہیں، جو کہ اپنے مخالفین کی عزت نفس اور خود انحصاری کی بھی تعریف کر سکتے ہیں'۔ (اس بصیرت کے باوجود، لاجپت رائے، 1928 میں جب وہ برطانیہ کے خلاف ایک پرامن، غیر متشدد احتجاج کی قیادت کر رہے تھے، تو برطانوی پولیس سپرنٹنڈنٹ جیمز اے سکوٹ کے ڈنڈے کے سر پر پے در پے وار سے، تریسٹھ سال کی عمر میں ہلاک ہو گئے۔)

جوں ہی 1920 اور 1930 میں غیر متشدد ہندوستانی قومیت پرست تحریک میں کشش، عوامی ہمدردی اور بین الاقوامی توجہ بڑھی، اس کے ساتھ ہی گاندھی نے اپنے ستیا گرہ کے ذریعے دنیا کے متخیلہ پر اپنی گرفت قائم کر لی، اس کے برت اور سلطنت کو للکارنے والے نمک مارچ سے، برطانویوں نے خود کو مجبور پایا کہ وہ 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت خود مختار حکومت کی بہتر تدابیر منظور کریں۔ تاہم اس کے باوجود، حلقہ انتخاب، آبادی کے 10 فیصد سے بھی کم تک پھیلایا گیا اور جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہوا، ہندوستانیوں نے ایک واحد ملک کے شہری کے طور پر نہیں بلکہ مختلف مذہبی گروہوں کے ممبران کے طور پر ووٹ ڈالے، مسلمان ووٹرز ایک مخصوص فہرست سے مسلمان ممبران کو چنتے __ تقسیم کر کے حکومت کرو کی مزید توثیق ہوئی۔ جداگانہ انتخابات، مہاتما گاندھی کی عوامی سیاست میں روڑے اٹکانے کی برطانوی کوشش کا حصہ تھے، جس نے پہلی مرتبہ مشترکہ قومیتی شعور کی تشکیل نہ صرف تعلیم یافتہ اشرافیہ میں کی، جن کا ماضی میں کانگریس پر غلبہ تھا، بلکہ عام عوام میں بھی کی جنھیں بڑی کامیابی سے انھوں نے متحرک کیا تھا۔

اس وقت 'اچھوت' (آج کے دلت یا افسر شاہی کی زبان میں 'شیڈولڈ کاسٹ') کے طور پر جانی جانے والی کمیونٹی کو، باقی ہندوؤں سے ممیز کر کے ایک نئی کیٹیگری جسے 'ڈپرسڈ کلاسز' کہتے، میں شامل کر کے، جداگانہ نمائندگی کی مستحق اقلیتی کمیونٹی قرار دینے کے برطانوی فیصلے کو، ہندوستانی قومیت پرستوں نے سامراجی مفادات کی تقویت کے لیے، اکثریتی کمیونٹی کو مزید تقسیم کرنے کی چالبازی کے طور پر دیکھا۔ جواباً، دلتوں نے قوم پرست تحریک کو انھیں اعلیٰ ذاتوں کے غلبے کے طور پر دیکھا جو لمبے عرصے سے ان کے خلاف امتیازی سلوک کا برتاؤ کرتی رہی تھیں، اور دلت قائدین جیسا کہ امبیڈکر، ایک درخشاں دستوری سکالر جو فقط میرٹ

کے زور پر انتہائی نوچتی کھسوٹتی غربت سے اوپر اٹھے، نے جداگانہ انتخابات کو اپنے نمائندے چننے کے حق کے حصول کے طریقے کے طور پر قبول کیا۔

مہاتما گاندھی کی قیادت میں انڈین نیشنل کانگریس پہلے ہی مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کے لیے جداگانہ انتخابات کی مخالفت کر چکی تھی، کیونکہ یہ اس عمل کو، ایسا احساس پروان چڑھانے والے منصوبے کے طور پر دیکھتی تھی، جیسا کہ وہ علیحدہ کمیونٹیز ہیں جن کے مفادات عام ہندوستانی عوام سے کچھ مختلف ہیں۔ اس کے باوجود، کانگریس اقلیتی گروہوں کی آویزش کے خوف سے، رسمی طور پر جداگانہ انتخابات کی مخالفت نہیں کر سکتی تھی جبکہ انگریز، اگر، اور کبھی بھی ہندوستان میں خودمختار حکومت آنے کی صورت میں، ہندو غلبے سے متعلقہ اقلیتی خوف کو ہوا دینے میں مصروف تھے۔ چنانچہ کانگریس کی اپوزیشن اس اصول تک محدود تھی کہ جداگانہ انتخابات غلط اور غیر ضروری تھے، لیکن انھیں صرف اقلیتوں کی رضامندی کے ساتھ ہی ترک کیا جا سکتا تھا۔

تاہم پسماندہ جاتیوں (ڈپریسڈ کلاسز) کو علیحدہ کرنے کی برطانوی کوشش ایک مختلف جہت تھی، کیونکہ یہ پہلی دفعہ تھا کہ ایک مذہبی کمیونٹی کے اندر ہی جداگانہ انتخابات کی تجویز پیش کی گئی، ہندوستانی قومیت پرستی کو پارہ پارہ کرنے اور ہندوستانی عوام کے اولین اتحاد کو توڑنے کی حکمت عملی، کانگریسی قائدین کے سامنے واضح طور پر آشکار تھی۔ گاندھی نے مطالبہ کیا کہ ڈپریسڈ کلاسز کے نمائندگان کا چناؤ، ایک وسیع اور اگر ممکن ہو تو ہمہ گیر مشترکہ حلقہ انتخاب سے عمومی رائے دہندگان کے ذریعے کیا جائے، اور 1932 میں مرن برت رکھ لیا، جس سے قوم یکجا اور برطانوی اور دلت قائدین ہار ماننے پر مجبور ہو گئے۔ اسی سال، ایک سیاسی مفاہمت کے تحت، جسے پونا پیکٹ کے نام سے جانا جاتا ہے، ڈپریسڈ کلاسز کے لیے جداگانہ انتخابات ختم کر دیے گئے، لیکن صوبائی اور مرکزی مقننہ میں ان کے لیے اضافی نشستیں مخصوص کر دی گئیں ___ اول الذکر میں 71 سے 147 تک بڑھا دی گئیں اور مرکزی مقننہ میں 18 فیصد۔

(کافی دلچسپ ہے کہ دلتوں کے قائد ڈاکٹر بی آر امبیڈکر، جن کا اس مسئلے کو لے کر گاندھی کے ساتھ تنازعہ ہوا، نے آزادی کے بعد ہندوستانی آئین کی ڈرافٹنگ کمیٹی کے چیئرمین کے طور پر فرائض سرانجام دیے، اور یقینی بنایا کہ اس کی کمیونٹی کے لیے اس کے ملک کے پاس دنیا کا سب سے پہلا اور تکمیل تک پہنچنے والا مثبت عملی پروگرام ہو۔ اگرچہ جداگانہ انتخابات کو بہتری کے لیے ترک کیا گیا، آزاد ہندوستان کے 543 نشستوں والے دارالعوام میں شیڈول کاسٹ اور قبائل کے لیے 85 نشستیں مخصوص کی گئیں، جیسا کہ سرکاری نوکریوں

اور یونیورسٹیوں کی نشستوں میں کوٹہ ___ نہ صرف مواقع کی گارنٹی فراہم کرتا ہے بلکہ یقینی نتائج کی بھی۔)

اگر دلتوں نے جداگانہ انتخابات سے کنارہ کشی نہ کی ہوتی، تو مسلم لیگ کو شروع میں اس سے فائدہ اٹھانے میں مشکل پیش آتی۔ 'ہندو مسلم اتحاد کے سفیر' کا خطاب ایسا نہ تھا جو جناح کے لیے مستقل قائم رہتا۔ عوامی مملکت کے اصول اور گاندھی کی عوامی اپیل کی تحقیر کرتے ہوئے، جناح نے انگلینڈ میں اپنی قانون کی پریکٹس کی طرف رجوع کیا، اور ایک لمبی سیاسی آزردگی کے بعد، مصمم ارادہ کیے ہوئے قائد کے طور پر، محض اس لیے واپس پلٹے کہ مسلم لیگ کو علیحدگی پسندی کی طرف لے جانا ہے۔ جناح نے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ ہندوستان کے مسلمان بذات خود ایک قوم کی نمائندگی کرتے ہیں: انھوں نے بڑی بے لحاظی سے، اپنی تمام پرورش، کیریئر، سماجی تعلقات اور ذاتی زندگی کی تکذیب کرتے ہوئے اعلان کیا 'ہم مختلف وجود ہیں، زندگی میں کچھ بھی ایسا نہیں جو ہمیں اکٹھا جوڑتا ہو۔ ہمارے نام، کپڑے اور کھانا ___ سب مختلف ہیں؛ ہماری معاشی زندگی، ہمارے تعلیمی تصورات، خواتین کے ساتھ ہمارا برتاؤ، جانوروں کے ساتھ ہمارا رویہ.... ہر جگہ ہم ایک دوسرے کو چیلنج کرتے ہیں'۔ سوائیل روؑ کے سوٹ پہننے والے، ساسج کھانے والے، وہسکی چڑھانے والے جناح کے لیے کپڑوں اور کھانے پر بات کرنا کچھ زیادہ تھا، جیسا کہ خواتین کی عادات کا حوالہ اس شخص کی زبان سے آرہا تھا جو اپنی نوجوان بیوی کے معیوب 'بے باک' لباس کو نہایت عمدگی سے قبولتا رہا تھا۔

لیکن سیاسی انتخاب، اختلافات کو نمایاں کرنے کے لیے کیا گیا، اور یہی تھا جو مسلم لیگ کے قائد نے کرنے کی ٹھانی۔ وہ چاہتے تھے کہ لیگ کو ہندوستانی مسلمانوں کی 'واحد نمائندہ' (جماعت) تسلیم کیا جائے، لیکن مسلمان ووٹرز نے کافی تردد اور توقف کے ساتھ، دوسرے سیاسی اتحاد بشمول، سب سے ناگوار انڈین نیشنل کانگریس کے مسلمان اراکین اور اس کے ساتھ ساتھ لیگ کو ووٹ دیے۔

1937 کے الیکشن میں آٹھ صوبوں کی حکمرانی کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کامیاب ہوتی نظر آئی؛ پارٹی حیران کن طور پر مقابلہ کی گئی 739 میں سے 617 'جنرل' نشستیں جیت گئی، اور حتیٰ کہ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے مخصوص 59 نشستوں میں سے 25 بھی۔ متعدد دوسری جماعتیں اور 385 آزاد امیدوار بھی نشستیں جیت گئے۔ کانگریس سے دوسرے نمبر پر کافی دور گھسٹتی ہوئی مسلم لیگ تھی، جو کہ مسلمانوں کے لیے مخصوص نشستوں کی اکثریت حاصل کرنے میں بھی ناکام رہی، داؤ پر لگی 1585 نشستوں میں سے محض 106 جیت سکی اور کسی بھی صوبے پر حکومت بنانے میں ناکام رہی۔ ایسا لگا کہ داخلی سیاسی مقابلہ واضع طور پر شمولیت

پسند، تکثیریت کی حامی اور کثیر نسلی جماعت، کانگریس کے حق میں رہا ہے۔

لیکن جنھوں نے اسے اس زاویے سے دیکھا وہ جلد ہی بول پڑے۔ کانگریس کی فتح فیصلہ کن سے بھی زیادہ تھی۔ حالانکہ الیکشن میں تقریباً ایک کروڑ پچاس لاکھ ووٹرز شامل تھے، جو نمائندہ حکومت کی تخلیق میں کچھ پیش رفت کی علامت تھے، کلیدی اختیارات اب بھی وائسرائے کے پاس تھے، اور مرکزی حکومت میں کوئی الیکشن نہیں کروائے گئے تھے، اور اسے ابھی بھی وہی چلا رہا تھا۔ یہ دانستہ تھا: کانگریس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو خطرے کی گھنٹی سمجھتے ہوئے، برطانویوں نے اسی پر انحصار کیا جس بارے وائسرائے لارڈ لنلتھگو کا کہنا تھا کہ 'صوبائی خود مختاری کی قوت، کانگریس کی انقلابی آلے کے طور پر اثر آفرینی کو تباہ کر دے گی'۔ امید یہ تھی کہ پارٹی کے صوبائی قائدین کی ان کی قومی قیادت سے جان چھڑوانے کے لیے انھیں عہدوں کے من و سلویٰ کا مناسب ذائقہ چکھایا جائے اور برطانوی راج کے اشتراک سے ان کا ذاتی مفاد پروان چڑھایا جائے۔ زیادہ زمینداروں کو منتخب کروانے کے لیے، جن کا مفاد کانگریس کی قومی قیادت کے سوشلسٹ پروگرام سے منحرف تھا، انتخابی نظام کو بھی دیہی نمائندوں کے حق میں مرتب کیا گیا۔

خود مختار حکومت کی زیادہ تر گفتگو کھوکھلی تھی، اور اس کے کھوکھلے پن کی تصدیق اس بات سے بھی ہو گئی، جب ہندوستانی عوام کے منتخب نمائندوں کی بجائے وائسرائے نے 1939 میں ہندوستان کی جانب سے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ اس کا فوری نتیجہ، ایسے اہم امور پر مشاورت نہ کرنے کے احتجاج میں، منتخب کانگریسی وزارتوں کا استعفیٰ تھا۔ ہندوستان میں جواب دہ سیاسی اداروں کے قیام کے بکھر کو بھی پس پشت ڈال دیا گیا۔ اور جلد ہی ییٹس کے لافانی الفاظ میں، ایک اکھڑ درندہ ہندوستان کے مسلمانوں کے درمیان میں سے اٹھ کھڑا ہوا، بھدی چال چلتا ایک نیا بیت اللحم بنانے کے لیے۔

آرماگیڈن کی جانب لڑکھڑاہٹ

حمایتیوں اور نقادوں دونوں کے لیے حیرت کا باعث تھا کہ ۹ صوبوں میں کانگریس وزارتیں، برطانوی راج کے نظام حکومت میں اہل کارندوں جیسا طرز عمل روا رکھے ہوئے تھیں۔ اکثر اوقات انھوں نے برطانوی جابرانہ قوانین کی منسوخی کے لیے کچھ خاص نہیں کیا، اور بعض واقعات میں انتہا پسند موقف رکھنے والوں کی گرفتاری میں ویسے ہی پرجوش ثابت ہوئے جیسا کہ برطانوی خود تھے۔

' اسی اثنا میں، اپنی جماعت کی انتخابی ناکامی کے دوران اور جب کانگریس نے وزارتوں سے استعفے دے کر مواقع کے دریچے وا کیے، دونوں مواقع پر، محمد علی جناح، مسلم لیگ کے بتدریج غیر مصالحت پسند ہوتے ہوئے لیڈر، ایک ماہر موقع شناس ثابت ہوئے، جنھوں نے پنجاب اور بنگال کے مسلم اکثریتی صوبوں میں لیگ کی شکست کی تلافی، وہاں کے کامیاب قائدین (بالترتیب یونینسٹ پارٹی کے سر سکندر حیات خان اور کریشک پرجا پارٹی کے فضلِ حق) کو لیگ کے پلیٹ فارم میں عملی طور پر شامل کر کے کی۔ خود کانگریس میں اندرونی رسہ کشی کی وجہ سے پھوٹ پڑی ہوئی تھی۔ اس کے عہدوں کی قبولیت نے اس کے بائیں بازو کو برگشتہ کر دیا تھا نیز مسلمان اقلیت پر 'ہندو اکثریت کی حکومت' تھوپنے کے بہت حد تک نمائشی الزامات کے سامنے ناقابل مدافعت بھی بنا چھوڑا تھا۔

ستم ظریفی ملاحظہ کریں، جب جنگ شروع ہوئی، وائسرائے کو کانگریس کی بنی بنائی حمایت ملی، جس کے قائد جواہر لال نہرو اعلان کر چکے تھے کہ جمہوریت اور فاشزم کے درمیان کسی بھی کشمکش میں 'ہماری ہمدردیاں لازماً جمہوریت کی طرف ہوں گی.... میں چاہوں گا کہ ہندوستان نئے ضابطے کی جدوجہد کے لیے بھرپور کردار ادا کرے اور اپنے تمام وسائل بروئے کار لائے'۔ نہرو کی فاشزم سے نفرت اتنی زیادہ تھی کہ انھوں نے بڑی خوشی سے جمہوریتوں کی طرفداری میں آزاد ہندوستان کو جنگ میں دھکیل دیا ہوتا، بشرطیکہ یہ انتخاب ہندوستانی خود کرتے، نہ کہ برطانوی ان پر تھوپتے۔ لیکن جب 1 ستمبر 1939 کو جرمنی کی پولینڈ پر چڑھائی، برطانیہ کو جنگ کی طرف لے گئی، تو ہندوستانیوں نے ایک کمزور ملک جو وحشی طاقت کی مزاحمت کر رہا تھا کے اقتدار اعلیٰ کے تحفظ کے لیے انگریزوں کی جنگ کی مضحکہ خیزی ملاحظہ کی__ مختصر طور پر، وہی جو ہندوستانی قوم پرست برطانوی سامراج کے خلاف کر رہے تھے۔ پس برطانیہ، پولینڈ کے ساتھ روا رکھے گئے اس سلوک کی وجہ سے جرمنی کے ساتھ لڑے گا، جو وہ (خود) تقریباً دو سو سال سے ہندوستان کے ساتھ روا رکھے ہوئے تھا۔

سپین کے فاشسٹوں کے ہاتھ چلے جانے، ایتھوپیا پر اٹلی کے قبضے، اور چیکوسلواکیہ کو نازیوں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا الزام نہرو نے برطانوی بے حسی کو دیا: وہ چاہتا تھا کہ برطانوی پالیسی میں ہندوستان کی کسی قسم کی کوئی ذمہ داری نہ ہو، جسے وہ سمجھتا تھا کہ چند سامراجیوں کے محدود طبقاتی مفادات کے تحفظ کے لیے وضع کی گئی تھی۔ فاشزم اور نازیوں سے بیان کردہ بغض کے باوجود، نہرو کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی، کہ ہندوستان پر برطانوی حکمرانی قائم رکھنے کے لیے، اسی سے قربانی کی توقع کیوں کرنی چاہیے۔ ایک آزاد پولینڈ کی لیے محکوم

ہندوستان کو جنگ کے احکامات کیونکر دیے جاسکتے تھے؟ البتہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان بخوشی آزادی اور جمہوریت کے لیے لڑتا۔

اس کی ہدایات کے تحت، کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اس دعوی کے ثبوت کے لیے ایک قرارداد منظور کی (اسی اثناء میں، سابق صدر سبھاش چندر بوس کے سول نافرمانی فوری طور پر شروع کرنے کے مطالبے کو رد کرتے ہوئے)۔ نہرو نے اپنے نازی مخالف نظریات کو چھپایا نہیں؛ زیادہ سے زیادہ وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کے نقطہ نظر کی توقیر کا برطانوی حکومت اظہار کرنے تاکہ ہندوستان اور برطانیہ بخوشی 'آزادی کی جدوجہد میں ایک دوسرے کے ساتھ شامل' ہوسکیں۔ کانگریس کے قائدنے وائسرائے پر واضح کیا کہ وہ صرف یہ اعلان چاہتے ہیں کہ جنگ کے بعد، ہندوستان کو اس کے مستقبل کے تعین کا موقع دیا جائے گا۔ کانگریس کے نقطہ نظر کا بردباری کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا اور یہاں تک کہ برطانیہ کے بائیں بازو کے حلقوں نے کسی حد تک پسندیدگی بھی ظاہر کی، لیکن چونکہ انھیں صوبوں کی فاشسٹ مخالف کانگریسی حکومتوں میں اور مرکزی اسمبلی میں کانگریسی قانون سازوں کے درمیان اتحادی مل گئے تھے، لہذا لارڈ لنلتھگو نے ہندوستان کی جانب سے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کرنے سے پہلے ہندوستان کے منتخب قائدین سے مشاورت کے دکھاوے کے علاوہ کچھ خاص نہیں کیا۔ اس کی بجائے اس نے حمایت کے لیے مسلم لیگ سے رجوع کرلیا۔

درحقیقت، کانگریس کو جنگ کے معاملے پر لیگ کے ساتھ ایک مشترکہ منصوبے کی امید تھی۔ تاہم اکتوبر 1939 میں کانگریس کے نقطہ نظر کو پرزور انداز میں رد کرنے والے وائسرائے کے بیان نے، نہرو کی قیادت میں ورکنگ کمیٹی کو اکسایا کہ جنگی کوششوں میں سانجھ جاری رکھنے کی بجائے اپنی تمام صوبائی وزارتوں کو استعفیٰ کا حکم دیں، جس میں ان کے باعزت کردار سے انکار کیا گیا تھا۔ فیصلہ اصولی موقف پر لیا گیا تھا، لیکن سیاسی طور پر انتہائی فاش غلطی ثابت ہوا۔ اس سے کانگریس، برطانوی حکومت سے کام لینے کے واحد طریقہ کار سے محروم ہوگئی، اپنی انتخابی فتح کے ثمرات سے ہاتھ دھو بیٹھی، اور جناح کو سنہری موقع فراہم کردیا جنھوں نے کانگریس کے ساتھ گفت وشنید ختم کردی — کانگریس کے استعفوں کے دن کو 'یوم نجات' قرار دیا — اور اس کے برعکس وائسرائے کی طرف رجوع کیا۔

یوں بھی، 1937 کی انتخابی شکست کے بعد، دو سال کی سیاسی ابتری لیگ کو کافی بدل چکی تھی۔ بہت سے صوبوں میں کانگریس کی حکومت سے ناگہانی طور پر مسلمانوں کے خدشات بڑھ چکے تھے، بلکہ بے انتہا ہندو غلبے

والے ملک میں، جمہوری اکثریت کی حکمرانی کے مضمرات بارے خطرے کی گھنٹی بجا رہے تھے۔ بہت سے مسلمانوں نے خود کو سیاسی اور معاشی اقلیت سمجھنا شروع کر دیا تھا، اور لیگ انھی کے خدشات پر بات کرتی تھی۔ جناح اس نتیجے پر پہنچنے لگے کہ کانگریس کی سیاسی قوت کا واحد جواب علیحدگی ہو گا__ ملک کو تقسیم کر کے، شمال مغربی اور مشرقی مسلم اکثریتی علاقوں میں ایک آزاد ریاست قائم کی جائے۔ پاکستان کے قیام کی مانگ کرتے ہوئے لیگ کا یہ مطالبہ 23 مارچ 1940 کی قرارداد لاہور میں امر ہونا تھا۔ نہرو اور ان کے ساتھی کانگریسی قائدین، بیشتر لیگی ممبران کی سوچ کی تبدیلی سے غافل تھے، جس کا اظہار بڑھتی ہوئی عوامیت پسند سیاسی سٹریٹجی میں ہو رہا تھا (مثال کے طور پر، یہ 1939 میں ہوا کہ جناح نے اردو سیکھنا شروع کر دی اور منصبی فوٹوگراف کے لیے 'مسلم' اچکن زیب تن کرنے لگے، یہ سرگرمیاں ماضی کی، 1848 کی فرانسیسی شورش کی یاد دلاتی تھیں: 'میں ان کا قائد ہوں میں لازماً ان کی پیروی کروں گا۔')

اکتوبر 1939 میں، جناح نے وائسرائے لارڈ لنلیتھگو کو راغب کیا کہ لیگ کو کانگریس کے ہم پلہ ثالث اور ہندوستان میں مسلمانوں کا واحد نمائندہ متصور کیا جائے، ایسی پوزیشن جس کا استحقاق اس کے انتخابی نتائج اسے نہیں دیتے تھے۔ وائسرائے، جو جنگ کے معاملے پر کانگریس-لیگ اتحاد روکنے کے لیے متفکر تھا نے رضامندی ظاہر کر دی۔ اس کا خیال تھا، ہندوستان کی آزادی کی کسی بھی بحث میں، لیگ کی پالیسی اب سب سے اہم رکاوٹ تھی، اور اسی لیے اس کی ہمت بڑھانے کی ضرورت تھی۔ اسی اکتوبر عید کے تہوار کے موقع پر جناح کو، پہلی مرتبہ مسلمانوں کے لیے خصوصی پیغام نشر کرنے کے لیے مدعو کیا گیا؛ لیگ کے صدر کا مسلم کمیونٹی کے ترجمان کی حیثیت سے واضح اعتراف کیا گیا تھا۔ نہرو اور کانگریس نے ان دعووں کو ہٹ دھرمی پر مبنی مفروضہ اور ناجائز خیال کیا؛ تاہم انھوں نے اکثریت کی حکمرانی کے تناظر میں مسلم کمیونٹی میں بڑھتے ہوئے اعتماد کے فقدان کے حقیقی مسئلے کے حل کے لیے کچھ خاص نہیں کیا۔

کانگریس، برطانوی نظر عنایت کی امید میں، 1940 میں زیادہ تر انتظار کا کھیل کھیلتی رہی۔ چند کانگریسی اراکین اس سے کہیں آگے بڑھنے کے لیے بھی تیار تھے اور جنگی کوششوں کی براہ راست امداد کے لیے بھی، بشرطیکہ اس کی حمایت کے لیے ہندوستان میں قومی حکومت قائم کی جائے۔ لیکن لنلیتھگو بہت ہی زیادہ آہستہ رو اور غبی آدمی تھا: اس کی سوچ اکثر بنیادی ہندوستانی آرزوؤں سے بہت دور تھی۔ (اس نے 1940 میں لندن کو لکھا: 'مجھے زیادہ شوق نہیں کہ اس دور کے متعلق گفتگو کروں جس کے بعد ہندوستان میں برطانوی حکومت ختم ہو

جائے گی۔ مجھے گمان ہے کہ وہ دن بہت دور ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہم جتنا اس پر کم بات کریں اتنا ہی بہتر ہے'۔ درحقیقت یہ وہی سال تھا جس میں چرچل نے بڑے وثوق سے اس یقین کا اظہار کیا تھا کہ برطانوی سلطنت ایک ہزار سال تک قائم رہے گی۔☆) جب اگست 1940 میں حکومت کا سرکاری ردعمل سامنے آیا، تو یہ ایک مضحکہ خیز پیشکش تھی کہ چند 'ہندوستانی نمائندوں' کو وائسرائے کی بے اختیار مشاورتی کونسلوں کے ساتھ منسلک کیا جائے۔ نہرو نے اسے مکمل طور پر مسترد کر دیا۔ سول نافرمانی ہی واحد جوابی کارروائی نظر آتی تھی۔

حکومت نے فیصلہ کیا کہ نہرو جو کر سکتا ہے، اس کا انتظار نہ کیا جائے، انھوں نے اسے 30 اکتوبر 1940 کو گرفتار کر لیا اور، ایک مقدمے کے بعد جو ملزم کے گراں قدر بیان کے حوالے سے ممتاز تھا (یہ بذات خود برطانوی سلطنت ہے جس پر دنیا کی بار کے سامنے مقدمہ چل رہا ہے)، میں چار سال قید کی سزا سنائی۔ متعدد خفیف ترین اہانتوں کا نشانہ بنانے کے ساتھ، اس کی نظربندی کی شرائط غیر معمولی طور پر سخت تھیں، خاص طور پر اس کی ڈاک بھیجنے اور وصول کرنے کی استعداد کی، جس نے اسے اس دلجوئی سے بھی محروم کر دیا جو خطوط اسے سالہا سال سے مہیا کر رہے تھے۔ تاہم دسمبر 1941 میں، ونسٹن چرچل کی مخالفت کے باوجود، لندن میں جنگی کابینہ نے تمام مقید کانگریسی اراکین کی رہائی کی اجازت دے دی۔ نہرو کو بیکار ہی برطانیہ سے کسی ایسے پالیسی اعلان کی توقع تھی جو اسے اس قابل بنا دے کہ ہندوستان کو اتحادیوں کے مقصد کے ساتھ وابستہ کر سکے، لیکن معاندانہ رویے کا حامل چرچل اور نئی دہلی میں اس کے اندھے نمائندگان دوسرے راستے پر چل پڑے، جس کے ساتھ چرچل نے (جسے آزادی کے حواری کے طور پر بعد میں ملنے والی حقیقی خوشی مکمل طور پر بعید از قیاس تھی) واضح طور پر اعلان کیا تھا کہ اٹلانٹک چارٹر کے اصولوں کا اطلاق ہندوستان پر نہیں ہو گا۔ ایشیا میں برطانوی افواج کی ہزیمت کے باوجود یہ سب ناقابل توضیح تھا: سنگاپور نے فروری میں ہتھیار ڈال دیے، برما نے مارچ میں؛ جاپانی مشرق میں ہندوستان کے دروازے تک آ پہنچے، اور نیتاجی سبھاش چندر بوس، جو برطانوی ہند سے فرار ہو چکے تھے، نے 1941 کے وسط میں، جاپانیوں کے ساتھ مل کر لڑنے کے لیے، جنگی قیدیوں میں سے ایک 'آزاد ہند فوج' (انڈین نیشنل آرمی) تشکیل دے لی تھی۔ نہرو نہیں چاہتا تھا کہ ایک شہنشاہ کی جگہ دوسرے کی

☆ بریگیڈیئر اینوخ پوول (مستقبل کا رجعت پسند سیاستدان) نے مئی 1946 میں لکھا کہ 'ہندوستان کو ایک یا دوسری قسم کے برطانوی کنٹرول کی ضرورت کم از کم مزید پچاس سال تک رہے گی'۔

حکومت دیکھے؛ اس نے جاپانیوں کی مزاحمت کی تیاری کے لیے کانگریس کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ جنگی کابینہ کے ساتھ امریکی ہمدردی لیبر پارٹی کے ہم پلہ تھی۔ کلیمنٹ ایٹلی نے اپنے کولیگز کو راغب کیا کہ سوشلسٹ سر سٹیفورڈ کرپس کو 1942 کے آغاز میں اس پیشکش کے ساتھ ہندوستان بھیجا جائے کہ جنگ کے بعد، تقسیم کے امکان کے ساتھ، ڈومینین سٹیٹس دے دیا جائے گا۔

کرپس پہلے ہی برطانوی سیاست میں لیجنڈ تھا، ایک سابقہ سولیسٹر جنرل جسے رجعت پسندوں کے ساتھ متحدہ محاذ بنانے کی وکالت کرنے پر، 1939 میں لیبر پارٹی سے نکال دیا گیا تھا (جس پر یقیناً جنگ کے دوران اتفاق ہو گیا) اور جس نے زاہدانہ تقویٰ کو نمائشی انا کے ساتھ یکجا کر دیا تھا (چرچل نے اس کے متعلق کہا تھا، 'وہاں، اگرچہ، خدا کے فضل کے لیے، خدا ہی جاتا ہے')۔ کرپس جنگ شروع ہو جانے کے بعد 1939 میں ہندوستان کا دورہ کر چکا تھا اور متعدد ہندوستانی قائدین کو جانتا تھا؛ وہ نہرو کو دوست سمجھتا تھا۔ پھر بھی جناح نے کرپس مشن کو خوش آمدید کہا، لیکن کانگریس کی مخالفت کی بنیاد پر۔ مہاتما گاندھی نے اصولی مخالفت کی کیونکہ برطانوی پیشکش تقسیم کے تصور کو تسلیم کرتی تھی؛ انھوں نے یادگار طور پر اس پیشکش کو 'ایک پوسٹ ڈیٹڈ چیک' قرار دیا (تخیل سے بھرپور ایک صحافی نے گرہ لگائی، 'ایک ڈوبتے ہوئے بنک کا') اور اسے مسترد کرنے پر اصرار کیا۔ کانگریس کے صدر مولانا آزاد نے اصرار کیا کہ ہندوستان کا دفاع ہندوستانی نمائندوں کی ذمہ داری ہونا چاہیے، نہ کہ وائسرائے کی قیادت میں ہندوستان کی غیر منتخب حکومت کا، اور یہی وہ مسئلہ تھا جس کی وجہ سے نہرو نے مصالحت سے انکار کیا۔ کرپس تسلیم کرنے پر مائل تھا، اور ملک کا دفاع ایک ہندوستانی قومی حکومت کے سپرد کرنا چاہتا تھا جس کے ظاہری سربراہ کے طور پر وظائف وائسرائے سرانجام دے (برطانوی بادشاہ کی طرح)۔ لیکن وہ اپنی ہدایات سے تجاوز کر چکا تھا: چرچل ('مجھے ہندوستانیوں سے نفرت ہے۔ وہ وحشیانہ مذہب کے حامل وحشی لوگ ہیں') متعصب وائسرائے لارڈ لینلیتھگو، اور نااہل کمانڈر انچیف لارڈ آرکیبالڈ ویول کے اکسانے پر، مذاکرات سے بھاگ گیا۔

چرچل کے گاندھی بارے بہت پختہ خیالات تھے۔ مہاتما کی وائسرائے ہند کے ساتھ 1931 کی میٹنگ پر اظہار خیال کرتے ہوئے، اس نے بڑے اوچھے انداز میں اظہار کیا: 'مسٹر گاندھی، درمیانی صفات کے ایک فتنہ پرور وکیل، جو آج کل ایک فقیر کی طرح کا روپ دھارے ہوئے ہیں جس کی مشرق میں کافی شہرت ہے، کو آدھ ننگے، وائسرائے محل کی سیڑھیاں پھلانگتے دیکھنا خوفناک اور کراہت آمیز ہے، جبکہ وہ ابھی تک سول

نافرمانی کی تحریک کو منظم اور اس کی پیشوائی کر رہا ہے، تاکہ شہنشاہ کے نمائندوں کے ساتھ برابری کی سطح پر بازی لگائے'۔ (گاندھی کا فقیروں اور مسلمان روحانی راہبوں کے ساتھ کچھ بھی ایک جیسا نہیں تھا، لیکن چرچل ہندوستان کے بارے میں بمشکل ہی درست تھا۔) چرچل نے اعلان کیا کہ 'گاندھی ازم اور جس کی یہ ترجمانی کرتا ہے، کے ساتھ جلد یا بہ دیر مقابلہ کرنا ہو گا اور آخر کار اسے کچلنا ہو گا'۔ ایسے معاملات میں چرچل انگریزوں میں سب سے زیادہ معاندانہ تھا، ایسے انتہاء پسندانہ خیالات کا حامل، جن کا عذر اس دور کی عکاسی کہہ کر نہیں دیا جا سکتا: درحقیقت، چرچل کے خیالات نے اس کے بہت سے ہم عصروں کو ڈرا دیا تھا۔ حتیٰ کہ اس پر چڑھائی گئی آج کی چمک دمک ناقابل مدافعت نظر آتی ہے۔ بورس جانسن نے اپنی حالیہ چرچل کی توصیفی سوانح حیات میں لکھا 'اس نے خود کو ناقابل مصالحت رومانوی سامراجی تحریک کے سربراہ کے طور پر پیش کیا۔ راج اور گلابی جبڑے والے انگریزوں کے اس کے برآمدے میں بیٹھنے کے الوہی حق اور... ہندوستان پر قبضہ میں عظمت ہے، کا سب سے پر جوش حمایتی'۔

برطانیہ کی جانب سے انتہائی مشتعل، مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ نہرو کی اتحادیوں کی حمایتی پوزیشن سے ہندوستان کو کوئی رعایت نہیں ملی۔ حکومت کے لیے اس کا عوامی پیغام تھا 'ہندوستان کو خدا یا طوائف الملوکی (کے رحم و کرم) پر چھوڑ دو'۔ ہمیشہ کے حیرو وین انگلستان پرست، نہرو نے کروم ویل کا حوالہ دیا (حیرو وین ایمرے کی شعوری بازگشت میں، جس نے دو سال قبل، پارلیمان میں، نیوائل چیمبرلین کے بطور وزیر اعظم استعفیٰ کا مطالبہ کرتے ہوئے یہی الفاظ استعمال کیے تھے): 'جو بھی معقول کام آپ کرتے رہے ہیں اس کے لیے آپ کا قیام یہاں کافی زیادہ ہو چکا ہے۔ میں کہتا ہوں، دست بردار ہو جائیں، اور ہمیں آپ سے کنارہ کش ہونے دیں۔ خدا کے نام پر، چلے جاؤ!' 7 اگست 1942 کو بمبئی میں، آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے گاندھی کی ترغیب پر، نہرو کی طرف سے پیش کردہ، اور پٹیل کی تائید کردہ ایک قرارداد منظور کی، جس میں برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ __ ایک صحافیانہ سرخی کے الفاظ میں جو قرارداد کے حقیقی الفاظ سے زیادہ مشہور ہوئے __ 'ہندوستان چھوڑ دو!' (گاندھی کے اپنے ترجیحی الفاظ میں 'تخت یا تختہ'۔) 36 گھنٹوں کے اندر اندر کانگریس کے قائدین گرفتار ہو گئے۔

عدم تشدد کے لیے گاندھی کے تمام تر خلوص (کے باوجود)، دوسرے کانگریسی قائدین کے ساتھ اس کی جیل سے، ہندوستان چھوڑ دو تحریک، نوجوانوں اور شوریدہ سروں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ ایک زیر زمین تحریک پیدا ہو گئی، جو بڑی مستعدی سے سبوتاژ کی سرگرمیاں اختیار کرنے لگی۔ عام لوگ سرکاری عمارتوں پر

قومی جھنڈا لہرانے کے لیے بعید الفہم خطرات مول لینے لگے۔ نوجوان اخباری ہاکروں نے اپنی بکری کی آوازوں میں ہلکی پھلکی انقلابی سرگوشیاں شامل کر لیں: 'ٹائمز آف انڈیا۔ چھوڑ دو انڈیا! ٹائمز آف انڈیا. چھوڑ دو انڈیا!' گرفتاری کے ہفتوں بعد تک، کوئی دن مظاہرین اور پولیس کی جھڑپوں کی خبروں کے بغیر نہ گزرتا۔ برطانویوں نے بہیمانہ جبر کے ساتھ جواب دیا، غیر مُسلح مظاہرین پر فائرنگ کی گئی، ہر ہفتے درجنوں ہلاک ہوئے، مجرموں کو کوڑے مارے گئے، اور قومی اخبارات پر سینسر لگایا گیا (اور بند کر دیے گئے)۔ 'ہندوستان چھوڑ دو' قومی بیداری کا بِگل بن گیا، لیکن اس سے ہوا یہ کہ موجودہ قومی محکومی مزید طویل ہو گئی۔

زمانہ جنگ نے قیدیوں کی طرف برطانوی رویہ بھی مزید سخت کر دیا۔ چرچل نے کابینہ کو بتایا کہ، گاندھی کو 'محض بھوک ہڑتال کی دھمکی پر چھوڑنا نہیں چاہیے۔ اگر وہ مر گیا تو ہمیں ایک برے آدمی اور سلطنت کے دشمن سے چھٹکارا مل جائے گا'۔ وہ یہ تجویز دے کر اس عمل میں مدد فراہم کرنے کے لیے مکمل طور پر تیار تھا، کہ مہاتما کو 'ہاتھ پاؤں باندھ کر دہلی کے دروازوں تک لانا چاہیے اور وائسرائے ایک عظیم الجثہ ہاتھی کی پشت پر بیٹھے اور (مہاتما کو) خاک میں روند ڈالے'۔

کل 1040 دن یا 34 ماہ سے زیادہ، 9 اگست 1942 سے 15 جون 1945 تک، جو جیل میں نہرو کا سب سے لمبا عرصہ تھا، (کے دوران) انگریز، جناح اور مسلم لیگ کی پوزیشن مضبوط بنانے کے عملی اقدامات کرتے رہے، پارٹی کے اندر جناح کے ناقدین کو مجبور کرتے رہے کہ وہ لیگ میں اور اس کے زیر قیادت ہی رہیں۔ پاکستان کے تصور کے مخالف مسلمانوں کو روکا گیا یا 'کھڈے لائن' لگا دیا گیا۔ دوسرے جو کچھ مختلف طریقے سے اثر انداز ہو سکتے تھے (جیسا کہ پنجاب میں سر سکندر حیات خان اور سندھ میں اللہ بخش) وہ اس کے نتائج پر اثر انداز ہو سکنے سے پہلے ہی وفات پا گئے۔ لیگ نے ان صوبوں میں حکومتیں بنائیں (اکثر اوقات برطانوی ممبران اور جیل میں کانگریسی قانون سازوں کے ووٹ کے ساتھ) جہاں الیکشن میں اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا، جہاں رسمی عہدہ ممکن نہ تھا وہاں سرپرستانہ تقریروں کا لطف اٹھایا۔ اس تگ و دو میں برطانوی شریک جرم تھے: جیسا کہ جنگ عظیم دوم کے ستم رسیدہ سالوں کے دوران، برطانوی وائسرائے لارڈ لینلیتھگو نے جناح کے بارے میں تسلیم کیا 'وہ ایک اقلیت کی نمائندگی کرتا ہے، اور ایک ایسی اقلیت جو خود کو محض ہماری اعانت کے ساتھ ہی قائم رکھ سکتی ہے'۔ جوں جوں لیگ برطانوی سرپرستی کے ساتھ پروان چڑھی، اس کے اراکین کی تعداد 1941 میں ایک لاکھ بارہ ہزار سے بڑھ کر 1944 میں بیس لاکھ سے تجاوز کر گئی۔

ہندوستان چھوڑ دو تحریک، کی بے ثمریت، جو بہت کم تکمیل کے مراحل طے کر سکی، اس کے علاوہ کانگریس کی قومی معاملات سے خود ساختہ بے دخلی اور وزارتوں سے استعفیٰ دینے کی کانگریس کی حقیقی حماقت کے عناصر اکٹھے ہو گئے۔ جس سے مسلم لیگ، جو کہ جنگ سے وجود پذیر ہوئی اور جس نے طاقت اور توقیر میں بے پایاں اضافہ کر لیا تھا، کے لیے میدان خالی ہو چکا تھا۔ 1939 میں کانگریس وزارتوں سے استعفے اور 1942 میں ہندوستان چھوڑ دو تحریک دونوں دور اندیش سیاست کی بجائے جذباتی اظہار کی علامتوں میں بدل گئے۔ انھوں نے مسلم لیگ کی فتح کے لیے راستہ ہموار کیا۔

نہرو اور اس کے کانگریسی رفقاء 15 جون 1945 کو، سورج کی روشنی میں پلکیں جھپکتے ہوئے قید خانے سے باہر نکلے۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اور انھیں آزاد کیا جا چکا تھا۔ لیکن وہ ایک ایسی دنیا میں آزادی کی جانب اپنا پہلا قدم اٹھا رہے ہوں گے، جو تصور سے بڑھ کر تبدیل ہو چکی تھی۔

آخری معرکہ: الیکشن، انقلاب، تقسیم

جنگ کے دوران برطانوی اپنی عظمت کی پردہ پوشی نہیں کر سکے۔ انھوں نے ایک ایسے ملک میں فوجی آمریت رائج کر دی جس کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ جمہوریت کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ وہ انسانی تاریخ کی بدترین قحط سالیوں میں سے ایک، 1943 کی بنگال میں خشک سالی کے مہتمم بن چکے تھے، اسی دوران (چرچل کے ذاتی احکامات کی بنا پر) اشیاء خوردنی کا رخ فاقہ زدہ شہریوں سے خاطر خواہ رسد والے برطانوی فوجیوں کی طرف موڑ دیا گیا۔ (اس پر مزید بات اگلے باب میں کریں گے۔) حتیٰ کہ لارڈ ویول، جسے فوجی ناکامی پر انعام سے نوازا گیا تھا (شمالی افریقہ کے صحراؤں اور برما کے جنگلات دونوں میں) نے لارڈ لینلیتھگو کی جگہ بطور وائسرائے تخت نشین ہونے پر، ہندوستان کی جانب برطانوی حکومت کے رویے کو 'اس حد تک غیر محتاط، معاندانہ اور ذلت آمیز قرار دیا جس کا اسے اندازہ نہیں تھا'۔

برطانوی عام انتخابات میں لیبر (پارٹی کے) وائسرائے کا مطلب تھا کہ جلد ہی ناپسندیدہ چرچل کی جگہ، بطور وزیر اعظم ایٹلی لے لے گا، لیکن اس سے ہندوستان میں برطانوی صاحبان اختیار کے کانگریس مخالف رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ویول نے جون 1945 کے اواخر میں شملہ میں ایک کانفرنس منعقد کی، جس میں وائسرائے نے جناح کو بربادی کی اجازت دے دی۔ ناامیدی اور مایوسی کے اس ماحول میں، برطانیہ نے

1945 کے آخر میں ہندوستان میں، مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کی نشستوں کے لیے، الیکشن کا حکم دے دیا۔

کانگریس ان میں حصہ لینے کے لیے قابلِ رحم طور پر بے سروسامان تھی۔ 1939 میں عنانِ اقتدار سے دستبردار ہونا فاش غلطی تھی اور پھر 1942 سے اپنی قیادت اور جمعیت کو قید خانوں میں کھو دینے کا مطلب تھا کہ یہ کیمپین میں شکستہ، ناامید اور غیر منظم ہوں گے۔ دوسری طرف لیگ، جنگ کے دوران مضبوط ہو چکی تھی؛ اس کی سیاسی مشینری سرپرستی اور دھن دولت کے ساتھ مزے میں تھی، جبکہ کانگریس تعطل کے باعث زنگ آلود تھی۔ اب 1937 کی انتخابی خوش بختیاں کافی حد تک تلپٹ ہو چکی تھیں۔ صوبوں کی اکثریت اب بھی کانگریس کے پاس تھی۔ لیکن شمال مغربی سرحدی صوبے کے علاوہ، جہاں کانگریس نے مسلم لیگ کی سترہ نشستوں کے مقابلے میں انیس نشستیں جیتیں، لیگ ہر جگہ مسلمانوں کے لیے مخصوص نشستیں لے گئی، حتیٰ کہ بمبئی اور مدراس جیسے صوبوں میں بھی جو فرقہ وارانہ وباء سے مستثنیٰ نظر آتے تھے۔ وضاحت جو بھی ہو __ اور نہرو چند ایک (وضاحتیں) دے بھی سکتا تھا __ اس حقیقت سے مزید گریز نہیں ہو سکتا تھا کہ جناح اور مسلم لیگ اب ہندوستانی مسلمانوں کے لیے آواز بلند کرنے کے مقبول مینڈیٹ کا جائز دعویٰ کر سکتے تھے۔

نہرو اس پر یقین نہیں کرتا تھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تقسیم ناگزیر تھی، جسے وہ مکمل طور پر ناقابلِ عمل سمجھتا تھا۔ 1945 کے اواخر اور 1946 کے اوائل میں تقریروں، انٹرویوز اور مضامین میں، اس نے اسی یقین کا اظہار کیا کہ غیر ملکی حکمرانی سے نجات پا کر، ہندوستانی مسلمان حق جانشینی کا ہر ایک خیال ترک کر دیں گے۔ اس نے لکھا، ہندوستان کے مسلمان 'محض تکنیکی اعتبار سے اقلیت ہیں۔ ان کی تعداد کافی زیادہ ہے اور دوسرے حوالوں سے بھی مضبوط ہیں، اور یہ ضمانت شدہ ہے کہ انھیں ان کی مرضی کے خلاف مجبور نہیں کیا جا سکتا.... یہ فرقہ وارانہ سوال لازمی طور پر وابستہ مفادات کے تحفظ کا ہے، اور مذہب ہمیشہ سے اس مقصد کے لیے تن کر چلنے والا مفید گھوڑا رہا ہے'۔ اس نے یہاں تک بھی کہا کہ کانگریس کو محض مسلمانوں کے کسی بھی خوف کی شدت کم کرنے کے لیے جانشینی کا حق دینا چاہیے، اس توقع میں نہیں کہ مسلم لیگ کی حکومت والے صوبے فی الواقع اسے استعمال کریں گے۔ بلکہ اس لیے، کیونکہ بہت سے ہندوستانی تجزیہ کاروں کا یہ کہنا ہے کہ، آیا جناح واقعی ایک علیحدہ مملکت کا قیام چاہتا ہے یا کانگریس پر فوقیت حاصل کرنے کے لیے محض پاکستان کی وکالت کر رہا ہے، اس کے پیروکاروں نے بہر حال اس کے الفاظ کو سنجیدگی سے لیا تھا۔ ان کی ریاست وہی تھی جو وہ لینے کا تہیہ کر چکے تھے، اور 1946 کے موسم بہار تک نہرو کی مثالیت پسندی خطرناک حد تک سادہ لوحی ثابت ہوئی۔

المیہ یہ ہوا کہ 'تقسیم کر کے حکومت کرو' (کی پالیسی) بہت اچھے طریقے سے کام کر گئی۔ برطانوی ہند کی سالمیت کو برقرار رکھنے والی تدبیر نے، اسی سالمیت کا برطانویوں کے بغیر، برقرار رہنا ناممکن بنا دیا۔

❖

لیکن یہ واضح ہو چکا تھا کہ ہندوستان میں برطانیہ کا وقت تقریباً پورا ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ ہندوستانی فوجی اور پولیس والے، اپنے برطانوی افسران کے رد عمل کی پرواہ کیے بغیر، کھلم کھلا قوم پرست قائدین کی حمایت کا اظہار کرتے تھے، ایئر فورس اور برٹش انڈین نیوی میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ آخر الذکر، اٹھہتر جہازوں اور بیس ساحلی اسٹیبلشمنٹس، جن میں بیس ہزار بحری کارکن شامل تھے، کو متاثر کرنے کی وجہ سے کافی سنگین تھی۔ سیاسی موقعوں پر فسادات بھڑک اٹھے۔ بمبئی میں ایک واقع میں، برطانوی سپاہیوں نے برطانیہ مخالف دنگوں کو کچلنے کے لیے 233 مظاہرین کو مار ڈالا۔ آزادی کا مطالبہ تقسیم کے ہنگامے میں تقریباً دب گیا۔

ایک انتہائی ضرر رساں حرکت میں جو کہ قریب قریب کفارے کا ایک عمل بن سکتی تھی، برطانوی راج نے بڑے بے ڈھنگے پن سے بر سرپیکار دھڑوں کو اتحاد کا آخری موقع دیا۔ اس نے بوس کی آزاد ہند فوج کے بھگوڑوں پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا۔ جنگ کے اختتام پر، بوس خود ایک جلتے جہاز کے کریش میں، فورموسا (تائیوان) میں مارے جا چکے تھے، لہذا برطانوی راج اس کے لیفٹیننٹوں میں سے قربانی کے بکرے ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ غیر جانبدار نظر آنے کی خواہش میں، برطانویوں نے لال قلعہ دہلی میں مقدمہ چلانے کے لیے آئی این اے کے تین سپاہی چنے: ایک ہندو، ایک مسلمان اور ایک سکھ۔ آئی این اے کے لوگوں کی جو بھی غلطیاں اور کوتاہیاں تھیں (اور نہرو کا اعتقاد تھا کہ غیر ملکیوں کے حلیف بن کر آزادی حاصل نہیں کی جا سکتی، غیر ملکی فاشسٹوں کو تنہا چھوڑ دو)، وہ اپنی مادر وطن کے ساتھ غدار نہیں تھے۔ تینوں مدعا علیہان میں سے ہر ایک اپنی کمیونٹی کے لیے غیر ملکی تسلط سے آزادی کے لیے فاخرانہ وابستگی کی علامت بن گیا۔ کانگریس اور لیگ دونوں اس 'تگڑی' کے دفاع کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں؛ اپنے لمبے چوڑے کیریئرز میں پہلی دفعہ، نہرو اور جناح نے ایک ہی مقدمے کی وکالت قبول کی، پچیس سال بعد نہرو نے ایک بیرسٹر کا گاؤن پہنا۔

لیکن وہ ساعت گزر گئی: تین محب وطنوں کا دفاع اب حب الوطنی کی مشترکہ تعریف کی گارنٹی فراہم کرنے کے لیے کافی نہیں تھا۔ پورے ملک میں ہونے والی ہنگامہ آرائی نے مقدمے کے انجام کو غیر متعلق کر دیا۔ آخر کار مقدمات ختم کر دیے گئے، کیونکہ جس وقت یہ شروع کیے گئے تھے اس وقت تک یہ واضح ہو چلا تھا

کہ برطانوی راج سے حتمی بغاوت پر سوچ و بچار اس کے اپنے دارالحکومت میں ہو رہی تھی۔

لیبر پارٹی کے زیر حکومت، لندن جنگ سے ہلکان ہو چکا تھا، اور خود ہندوستانی سلطنت کے بوجھ سے نجات حاصل کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ فروری 1946 میں، وزیر اعظم ایٹلی نے 'ہندوستانی رائے عامہ کے قائدین کے ساتھ ہندوستانی آئین مرتب کرنے کی گفتو و شنید کے لیے' ایک کیبنٹ مشن ہندوستان کو روانہ کرنے کا اعلان کیا۔ آخری معرکہ شروع ہو چکا تھا۔

اپریل 1946 میں، نہرو کانگریس کے بلا مقابلہ صدر منتخب ہوئے، اس کے ساتھ ہی مئی میں شملہ میں کیبنٹ مشن کے ساتھ مذاکرات سے قبل ہی ہندوستان میں عبوری حکومت تشکیل دے دی گئی۔ سر سٹیفورڈ کرپس، لارڈ پیتھک لارنس اور اے وی الیگزنڈر کے اتحاد ثلاثہ، کے مشن کو نرغے میں لے لیا گیا۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ راج اپنے خاتمے کے قریب تھا، گدھ، ضیافت کے لیے اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔ مختلف غرض مند پارٹیوں کے اندر اور مابین، مذاکرات اور گفت و شنید، سازش اور جوڑ توڑ ___ انگریز، کانگریس، مسلم لیگ، ہندو مہاسبھا، شاہ کے وفادار، کیمونسٹ، افسر شاہی ___ ہر گزرتے دن کے ساتھ زیادہ تند اور ایک دوسرے کو زیادہ لپیٹنے لگے۔ ویویل کی حیران کن طور پر صاف گو ڈائریاں، ان تمام ہندوستانی سیاستدانوں جن کے ساتھ اسے معاملات کرنے تھے، کے بارے اس کی ناپسندیدگی اور ناگواری کو بیان کرتی ہیں، (اس کی نظروں میں) ہر ایک دوسرے سے زیادہ بے ایمان ثابت ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہ باقی برطانوی انتظامیہ کی اکثریت کی طرح کانگریس کے لیے معاندانہ اور ان کی حکومت کی مدد سے پروان چڑھی لیگ کے لیے ہمدردانہ جذبات رکھتا تھا، (اس کے باوجود) لیگی قائدین کی دروغ گوئی اور ان کے 'ہندوؤں کے خلاف نفرت انگیز نغمات' کے لیے شدید حقارت رکھتا تھا۔ (کسی بھی کانگریسی قائد نے وائسرائے کے سامنے مسلمانوں کے لیے نفرت کا اظہار نہیں کیا تھا)۔

حتیٰ کہ تصور پاکستان اس کے اپنے حمایتیوں کے ذہنوں میں کئی شکلیں بدلتا نظر آتا تھا، متعدد اسے متحدہ ہندوستان کے اندر ایک مسلم ریاست کے طور پر دیکھتے تھے، اور دوسرے مکمل قائم مقام اقتدار کی بجائے الگ الگ قسم کی غیر مرکزیت پسند کنفیڈریشن کی وکالت کرتے تھے۔ (امریکی صحافی فلپس ٹالبوٹ نے مجھے لیگ کے سر عبداللہ ہارون کے بارے میں بتایا، کہ 1940 میں اسے پاکستان کے لیے آٹھ علیحدہ علیحدہ منصوبے دیکھائے جو اس وقت کی لیگ کی اعلیٰ قیادت میں زیر بحث تھے) جناح ملک کے شمال مغرب اور مشرق میں علیحدہ ریاست کے مطالبے پر ثابت قدمی سے قائم تھے، لیکن قطعی جواب دینے سے احتراز برتتے تھے، کہ ایسی

ریاست کی تخلیق ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کے تحفظ کا بیان کردہ مقصد کیسے پورا کر سکتی ہے۔ اسی دوران نہرو، انگریزوں سے دستبرداری کے عمل سے کم کسی بھی چیز پر راضی نہیں تھے: انھوں نے واضح کیا کہ ہندوستان کا سیاسی انتظام، برطانوی ثالثی کے بغیر، ان کی اپنی دستور ساز اسمبلی میں طے کرنے کے لیے، ہندوستانیوں پر چھوڑ دینا چاہیے۔

اس وقت شاید مسئلہ کسی حد تک برطانیہ کے حقیقی ارادوں کے بارے میں نہرو کے انتہائی غلط اندازوں میں بھی پوشیدہ تھا، دنیاوی معاملات کی سیاسی حقیقتوں سے قید کی وجہ سے کٹا ہوا، نہرو اس یقین کے ساتھ شملہ آیا (جیسا کہ اس نے وثوق کے ساتھ فلپس ٹالبوٹ کو بتایا) کہ دغاباز البیون ہندوستانی جماعتوں کے درمیان اختلافات کو ہوا دے کر، برطانوی شاہی تاج میں ابھی بھی اس نگینے کو قبضے میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹالبوٹ نے محسوس کیا کہ نہرو بالکل بھی احساس نہیں کر سکا کہ برطانیہ ہلکان ہو چکا تھا، دیوالیہ پن کے قریب تھا، ساٹھ ہزار فوجی جو کہ لندن میں حکومت کا اندازہ تھا کہ ہندوستان پر اس کے اختیار کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے چاہیے ہوں گے بھجوانے پر نا تو رضامند تھا اور نہ ہی اس قابل۔ لندن تقسیم کرنا اور بھاگ جانا چاہتا تھا، اور اگر برطانوی اپنے پیچھے متحدہ ہندوستان نہیں چھوڑ سکتے تھے، تو وہ بھاگنے سے پہلے قطعی طور پر 'کاٹ دینے' کے لیے تیار تھے۔ نہرو ابھی بھی اپنے تسلط کو دوام دینے کی خواہش رکھنے والے ایک بڑی طاقت کے حامل دشمن کا تصور کر رہا تھا، اور بے خبر تھا کہ لیگ، ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان کس درجہ مقبول جماعت بن چکی تھی، دونوں کے ساتھ غلط بنیاد پر معاملہ کیا گیا۔ ٹالبوٹ حیرت زدہ تھا کہ 'نہرو اور اس کے رفقاء نے کتنے مختلف مذاکرات کیے ہوں گے، کیا وہ برطانیہ کی مفروضہ طاقت کے خبط میں مبتلا رہنے کی بجائے اس کی کمزوری سمجھ چکے تھے؟' یہ سوال ہماری فہم و فراست کے گرد منڈلاتا رہتا ہے۔

جب 9 مئی 1946 کو شملہ کانفرنس کا آغاز ہوا، جناح جو نہرو کے ساتھ سرد مہر لیکن مہذب تھا نے دو کانگریسی مسلمانوں آزاد یا خان عبدالغفار خان میں سے کسی ایک کے ساتھ مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا؛ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے واحد ترجمان کے طور پر نظر آنا چاہتے تھے۔ بہر کیف، جب کیبنٹ مشن نے ہندوستان کی حکمرانی کے لیے تین پرتوں پر مشتمل منصوبہ پیش کیا، ایک کمزور مرکز کے ساتھ (دفاع، خارجہ معاملات اور مواصلات تک محدود) خود مختار صوبے (پانچ سال کے بعد علیحدگی کے حق کے ساتھ) اور صوبوں کے گروپس (جن میں کم از کم ایک غالب طور پر مسلمان ہو گا) لیگ نے تجویز قبول کر لی، چاہے اس کا مطلب ایک

خود مختار پاکستان کے تصور کو ترک کرنا ہی تھا۔

وائسرائے نے، کانگریس کی اس تجویز کی رسمی قبولیت کا انتظار کیے بغیر، چودہ ہندوستانیوں کو عبوری حکومت کے طور پر خدمات ادا کرنے کے لیے مدعو کر لیا۔ اکثر ممتاز مسلم لیگی اور کانگریسی اراکین کے فہرست میں ہونے کے باوجود، ایک حیرت انگیز چوک تھی: کسی ایک بھی مسلمان کانگریسی رکن کو منصب کے لیے دعوت نہیں دی گئی۔ کانگریس نے جواب دیا کہ وہ اصولی طور پر منصوبے کو قبول کرتی ہے لیکن ایسی حکومت کو تسلیم نہیں کر سکتی جس کے مسلمان ممبران تمام کے تمام لیگ سے ہوں۔ جناح نے واضح کر دیا کہ وہ اس کے علاوہ کچھ اور قبول نہیں کر سکتے، نتیجہ میں پیدا ہونے والا تعطل بے لچک ثابت ہوا۔ کیبنٹ مشن اس منصوبے کی تصدیق کے ساتھ، پیچھے ایک نگران وائسرائے کونسل کو ملک کا انچارج بنا کر، لندن روانہ ہو گیا، لیکن یہ تنازع غیر حل شدہ ہی رہا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ، اس کا واحد ہندوستانی ممبر (سات انگریزوں کے ساتھ) ایک مسلمان سرکاری ملازم، سر اکبر حیدری تھا، جس نے تصور پاکستان کے اصول پر اپنا بنیادی اختلاف واضح کر دیا تھا۔

اس دوران، کیبنٹ مشن کی مجوزہ حکومت کا مسئلہ ابھی حل طلب تھا، کانگریس اور لیگ دونوں نے اصولی طور پر یہ منصوبہ تسلیم کر لیا تھا؛ تفصیلات پر ابھی اتفاق رائے ہونا باقی تھا۔ کانگریس کی صدارت پر حال ہی میں متمکن ہوئے، نہرو، نے ایک میٹنگ کی صدارت کی (بمبئی میں اے آئی سی سی کی، جس میں اس نے بے دھڑک کانگریس کی منصوبے کی قبولیت کی تعبیر ان معنوں میں کی کہ 'ہم کسی چیز کے بھی پابند نہیں ہیں ماسوائے اس کے کہ ہم نے قانون ساز اسمبلی میں جانے کا فیصلہ کیا ہے'۔ اس کے بیان کے مضمرات کا تجزیہ ہونا ابھی باقی تھا کہ اس نے اس کے فوری بعد ایک پریس کانفرنس میں مزید اضافہ کرتے ہوئے، یہی بات دہرائی کہ، 'ہم عمل کرنے کے لیے مطلقاً آزاد ہیں'۔ نہرو نے بالخصوص بیان کیا کہ وہ نہیں سمجھتا کہ لیگ کے لیے انتہائی اہم صوبوں کے گروپس آزادانہ ووٹ کو لازماً قائم رکھیں گے۔ مشتعل جناح کا ردعمل، کیبنٹ مشن پلان کی قبولیت سے دستبرداری تھا۔

ایک متحدہ ہندوستانی حکومت میں کانگریس-لیگ تعاون، چاہے لیگ کی اپنی شرائط پر ہی سہی، کی تھوڑی سی امید کے خاتمے کو ہوا دینے کی لاپرواہی پر نہرو کو وسیع پیمانے پر مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ لیکن اگر نہرو جولائی 1946 میں اپنی زبان پر قابو بھی رکھتا، تو پھر بھی یہ کسی طرح واضح نہیں تھا کہ کانگریس ولیگ کا مشترکہ سمجھوتہ قائم رہ پائے گا۔ (ابوالکلام) آزاد، اتحاد کے حق میں، مسلمان کانگریسی اراکین کے منصب کے دعووں سے

دستبردار ہونے پر رضامند تھے، لیکن مجموعی طور پر پارٹی جناح کی بات کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھی۔ یہ بیان کرتے ہوئے کہ صوبوں کے گروپس اٹل نہیں، نہرو منصوبے کی اگر روح نہیں تو الفاظ کی صدا دے رہا تھا۔ (لیگ کو بھی وہی کچھ کرنے کا موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا تھا جب اس نے یہ اعلان کیا کہ منصوبے نے انھیں پاکستان کے لیے کام کرنے کی بنیاد فراہم کی ہے)۔ لہٰذا ملک کے لیے، تقسیم سے گریز کے آخری موقع کو ملیامیٹ کرنے والے سرغنہ کے طور پر اسے دیکھنا، معاملے کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا ہے۔ جیسا کہ اس کا سوانح نگار ایم جے اکبر پیش کرتا ہے، 'پاکستان جناح کی ہمت اور برطانیہ کی رضامندی سے بنا'__ نہ کہ نہرو کی ہٹ دھرمی سے۔

نئے صدر کے متعین کردہ نئے چہروں کی پشت پناہی سے، (بشمول نسبتاً دو نوجوان خواتین کے، کملا دیوی چٹوپادھیائے اور راجکماری امرت کور)، 8 اگست 1946 کو، کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اعلان کیا کہ وہ کیبنٹ مشن پلان کو تفصیلی معاملات میں اپنی تعبیرات کے تحت تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن یہ جناح کو اس کھیل میں واپس لانے کے لیے کافی نہیں تھا، نہرو اُن سے (بمبئی میں جناح کے گھر پر) عبوری حکومت پر سمجھوتے کی کوشش کے لیے ملا، لیکن جناح ہٹ دھرم ثابت ہوئے: وہ پاکستان کے حصول کے لیے پرعزم تھے۔ مسلم لیگ کے قائد نے اس مطالبے کی تاکید کے لیے، 16 اگست 1946 کو 'راست اقدام کے دن' کے طور پر (منانے) کا اعلان کر دیا۔ ہزاروں مسلم لیگی تشدد، لوٹ مار اور غارتگری کی مستی میں گلیوں میں نکل آئے، اور اس کے نتیجے میں ہونے والے تصادم میں سولہ ہزار بے گناہ افراد مارے گئے، خاص طور پر کلکتہ میں۔ پولیس اور فوج لاپرواہی سے کھڑے رہے: یوں لگتا تھا کہ برطانیہ کلکتہ کو بلوائیوں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ آخر کار جب تک فوج مداخلت کرتی، تین دن کے فرقہ وارانہ فسادات نے شہر کی جگہ موت اور بربادی چھوڑی تھی۔ لیکن خونریزی اور نفرت نے، قومی نفسیات مین کچھ ایسا غیر متعین سا تھا جسے ٹکڑوں میں کاٹ ڈالا۔ مفاہمت اب ناممکن نظر آتی تھی۔

اس کے ایک ہفتہ بعد ہی، ویول اور نہرو، ہندوستان میں عبوری حکومت کی ہیت پر بات چیت کر رہے تھے، جو پانچ 'ذات والے ہندوؤں'، پانچ مسلمانوں، ایک شیڈول کاسٹ ممبر اور تین اقلیتی نمائندوں پر مشتمل ہو۔ ان کا اتفاق تھا کہ اصولی طور پر جناح اپنے نمائندے نامزد کر سکتے تھے، لیکن کانگریس کی نامزدگی میں اس کی کوئی رائے نہیں ہوگی، بشمول، ایک قوم پرست مسلمان کے۔ ہندوستان کی عبوری حکومت نامزد کر دی گئی، اور

اس کے کانگریسی ممبران نے 2 ستمبر 1946 کو حلف اٹھالیا جبکہ لیگ ابھی مشاورت کر رہی تھی کہ آیا شامل ہوا جائے۔ نہرو نے 7 ستمبر کو ایک نشریاتی پیغام میں اسے طویل جدوجہد کے نقطہ عروج کے طور پر دیکھا: 'طویل عرصے تک ہم واقعات کے مجہول تماشائی بنے رہے ہیں، دوسروں کے کھلونے۔ اب ہمارے لوگوں کے پاس عزم ہے اور ہم اپنی منتخب کردہ تاریخ بنائیں گے'۔

لیکن انگریز، لیگ اور بنگال میں اس کی حکومت، جس نے راست اقدام کے دن کی ہولناکی کا ہونا منظور کیا، کی حمایت میں رہے۔ نہرو نے کلکتہ قتل وغارت کے نتیجے میں بنگال کی صورتحال پر ویول کو برہمی سے لکھا کہ 'ہندوستان میں ہماری عبوری حکومت تشکیل دینے کا کیا فائدہ، اگر ہم محض یہی کر سکتے ہیں کہ لاچارگی سے دیکھتے رہیں اور کچھ نہ کریں جب کہ ہزاروں لوگوں کو تہہ تیغ کیا جا رہا ہو....؟' لیکن وہ، غالب مسلم اکثریتی شمال مشرقی سرحدی صوبے، جس پر اگرچہ کانگریس کی حکومت ہی تھی، کے دورے پر اصرار کرنے میں حد سے آگے بڑھ گیا۔ لیگ کے منظم مظاہروں، جن میں پتھر پھینکے گئے اور نہرو کو خراشیں آئیں، سے برطانویوں نے چشم پوشی کی۔ زیادہ اہم طور پر، خفت آمیز ناکامی یہ بتاتی تھی کہ نہرو ایک ہندو ہونے کے ناطے، صوبے کے مسلمانوں کے لیے ایک قومی لیڈر کے طور پر قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔

اس دوران، جناح کو زیادہ رعایات دلوانے کے لیے، تاکہ عبوری حکومت میں لیگ کی شمولیت کو کوئی خطرہ نہ ہو، برطانیہ نے کانگریس پر دباؤ ڈالا جس سے گاندھی اور نہرو کسی مسلمان ممبر کو نامزد کرنے کے حق سے دستبردار ہو گئے۔ جناح کے لیے یہ ایک عہد شکنی تھی، اور اب وہ نہرو کے ساتھ مذاکرات میں مصالحت پر پہنچنے کے لیے تیار نظر آتے تھے۔ لیکن ان کے مذاکرات میں پیشرفت ہونے کے بعد، جناح نے ایک دفعہ پھر اصرار کیا کہ کانگریس، ہندوستانی مسلمانوں کے واحد نمائندہ کے طور پر لیگ کو تسلیم کرے۔ نہرو نے یہ کہتے ہوئے کہ، یہ کانگریس میں موجود بہت سے نیشنلسٹ مسلمانوں کے ساتھ غداری کے مترادف ہوگا، اور اس کی ذات کے ساتھ ساتھ ملک کی عزت پر بھی داغ ہوگا، ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر وائسرائے نے کانگریس کی غیر موجودگی میں جناح کے ساتھ مذاکرات کرتے ہوئے، اس کے نامزد مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ایک شیڈولڈ کاسٹ ممبر کو بھی تسلیم کر لیا۔ 15 اکتوبر کو مسلم لیگ نے رسمی طور پر اعلان کر دیا کہ وہ عبوری حکومت میں شامل ہو گی۔

لیکن لیگ نے ایسا اس لیے کیا تاکہ اسے بھیتر سے تباہ کر سکے۔ حتیٰ کہ اس سے قبل کہ اس کے نامزدگان

26 تاریخ کو حلف اٹھاتے، انھوں نے اپنے حقیقی ارادوں کا اظہار کرتے ہوئے تقریریں کیں کہ وہ پاکستان کی تخلیق کے لیے کام کریں گے۔ ہر کیبنٹ میٹنگ سے پہلے لیگ کے اراکین نے آپس میں علیحدہ میٹنگز کیں اور کیبنٹ میں ایک حکومتی اتحادی کی بجائے ایک اپوزیشن گروپ جیسا برتاؤ کیا۔ انتہائی معمولی سے لے کر انتہائی اہم، ہر مسئلے پر، لیگ کے اراکین نے، کانگریس کی ہر تجویز اور ہر اقدام کی مخالفت کر کے، حکومت کے فرائض میں روڑے اٹکانے چاہے۔ اس دوران، جماعت نے پورے ملک میں تشدد کی ترغیب جاری رکھی؛ جیسا کہ نومبر کے آغاز میں بہار میں دنگے شروع ہو گئے (گاندھی فساد زدہ صوبے میں بحالیِ امن کے لیے گھوم رہے تھے)، جناح نے 14 نومبر کو اعلان کیا کہ جب تک پاکستان نہیں بنے گا قتل و غارتگری بند نہیں ہوگی۔ برطانویوں نے دسمبر میں، لندن میں مذاکرات کا انعقاد کیا تاکہ کانگریس پر لیگ کو مزید رعایات دینے کے لیے دباؤ ڈالا جائے، جس سے اسے قانون ساز اسمبلی کی حاضری پر مائل کیا جائے۔ اپنی بمبئی پریس کانفرنس کے ردعمل پر ابھی تک 'تپا' ہوا نہرو، اپنی صلح جوئی کی انتہاء پر تھا، لیکن جناح نے برطانوی پوزیشن کے اثبات سے اندازہ کر لیا کہ اس کی جماعت کی خوش قسمتی عروج پر ہے، اور اپنے مطالبات بڑھا دیے۔ نہرو کے مطابق ایسا لگتا تھا کہ برطانویوں نے یورپ میں 1930 کی خوش رکھنے کی پالیسی کی ناکامی سے کچھ نہیں سیکھا۔

قانون ساز اسمبلی کا اجلاس اپنے شیڈول کے مطابق، لیگ کی شمولیت کے بغیر، 9 دسمبر کو ہوا، لیکن کوئی ایسا فیصلہ لینے کے معاملے میں محتاط رہا جو جناح کو برگشتہ کر سکتا ہو۔ اس کے باوجود، 29 جنوری 1947 کو، مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کرتے ہوئے یہ قرارداد منظور کی کہ وہ اعلان کریں کہ کیبنٹ مشن پلان ناکام ہو چکا تھا، اور اسمبلی تحلیل کر دیں۔ اس کے جواب میں، عبوری حکومت کے کانگریسی اراکین نے مطالبہ کیا کہ لیگ اراکین نے چونکہ پلان رد کیا ہے لہٰذا وہ استعفےٰ دیں۔ اپنی لڑکھڑاتی ہوئی پالیسی کے درمیان میں ہی، برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ جون 1948 سے پہلے پہلے ہندوستان سے جا رہے ہیں، جو ہوتا ہے ہوتا رہے، اور اقتدار کی منتقلی کو سرانجام دینے کے لیے، ویول کو تبدیل کیا جائے گا۔

اس تعطل کے درمیان میں، جناب عزت مآب معاون امیر البحر صاحب ذی وقار لارڈ لوئس فرانسس البرٹ وکٹر نیکولس، وسکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن آف برما، کے سی جی، پی سی، جی ایم ایس آئی، جی ایم آئی ای، جی سی ایف او، کے سی بی، ڈی ایس او، رخصت ہونے والے جنوبی ایشیا کے سپریم الائیڈ کمانڈر پدھارے۔ شاہی سلسلے کا ایک عالی نسب (پیٹریسین) اشراف (ملکہ وکٹوریہ اس کی پردادی تھی لہٰذا وہ تخت نشین شہنشاہ کا کزن تھا)،

ماؤنٹ بیٹن گھمنڈی، دلکش، سطحی اور مشتعل مزاج بھی تھا۔ 'میں کبھی کسی ایسے شخص سے نہیں ملا جسے اس سے زیادہ اگلے پہیوں کی بریک کی ضرورت ہو' اس کے اپنے چیف آف سٹاف جنرل اسمئی نے تسلیم کیا۔

افسوسناک، یہی وہ بریکیں تھیں جن کی ہندوستان کو ضرورت تھی، کیونکہ اسی نے اسے سر کے بل تباہی کی طرف دھکیلا۔

دو شکستیں: برطانیہ کی دستبرداری اور کانگریس کا ہار ماننا

اب تو یہ نہرو پر بھی بتدریج عیاں ہونے لگا تھا کہ پاکستان کسی نہ کسی شکل میں بن کر رہے گا؛ لیگ کسی طور بھی ہندستان کی متحدہ حکومت میں کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔ اس کے باوجود، وہ نئے بندوبست پر مذاکرات کے لیے لیگی قائدین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی کوشش کرتا رہا، کہ اسے امید تھی، مکمل تقسیم کا حدف حاصل نہیں ہو گا۔ مارچ کے آغاز میں ہی پورے شمالی ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے، اور یہ امید بھی دھندلا گئی۔ گاندھی کے اس تناظر پر غور و فکر سے انکار کے باوجود، سردار ولبھ بھائی پٹیل اور نہرو دونوں ہی متفق تھے کہ کانگریس کے پاس پنجاب اور بنگال کی تقسیم کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی متبادل نہیں؛ ایک ڈھیلی ڈھالی انڈین یونین بشمول ایک نیم خود مختار پاکستان کے متبادل انتخاب کے، نہ تو لیگ کے لیے قابل قبول ہو گا اور نہ ہی باقی ہندوستان میں ایک نموپذیر حکومت پیدا ہونے دے گا۔ اس وقت تک، 24 مارچ 1947 کو ماؤنٹ بیٹن پہنچ گیا، یہ وہ نقطہ تھا جہاں سے واپسی ممکن نہیں تھی۔ تاہم، یہ وہی تھا، جس نے بڑی سرعت کے ساتھ اس کھیل کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔

ماؤنٹ بیٹن نے بعد میں دعوی کیا کہ اس نے اپنی شخصیت کے ساتھ حکمرانی کی، اور در حقیقت اس کے مثبت اور منفی دونوں اوصاف فیصلہ کن ثابت ہوئے۔ اپنے تقریباً تمام پیش رووں کے برعکس ایک طرف تو وہ توجہ مرکوز کرنے والا (فوکسڈ)، توانا، دلپذیر اور نسلی تعصب سے پاک تھا؛ دوسری طرف، وہ حیران کن طور پر گھمنڈی، خطرناک حد تک بے صبر، اور بڑی آسانی سے ذاتی پسند و ناپسند کے باعث ڈگمگا جانے والا تھا۔ اس کی وائسرائن ایڈوینا ایک حیات بخش رفیق تھی، جس نے ہندوستانی معاملات میں حقیقی دلچسپی لی۔ ان کی شادی بڑی انوکھی تھی، اس کی متعدد بیوفائیوں سے پر، جن سے وہ چشم پوشی کرتا، اور یہ کہا جاتا ہے کہ نہرو کے لیے اس کی الفت نے ہندوستان کی آزادی سے متعلق اس کے (اور ماؤنٹ بیٹن کے) کچھ فیصلوں میں کردار ادا کیا۔ اس

میں کوئی شک نہیں کہ نہرو اور ایڈوینا در حقیقت قریب آ چکے تھے، لیکن ایسا نہیں لگتا کہ اس کے کوئی سیاسی اثرات مرتب ہوئے ہوں گے۔

اس دوران، ہندوستان میں حکومت کا عدم استحکام بڑھتا جا رہا تھا۔ فرقہ وارانہ فساد اور قتل و غارت روز مرہ کا معمول تھا؛ اسی طور جناح کی کانگریس کے ساتھ کسی بھی بنیاد پر تعاون کرنے پر مکمل نارضامندی، ماسوائے اس کے کہ ہندوستان میں یہ (کانگریس) ہندوؤں کی اور وہ (جناح) مسلمانوں کے نمائندہ ہیں۔ اس پوزیشن کی پیروی کرنے کے لیے برطانویوں نے ان کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے لیگ کے حمایتی گورنر، سر اولاف کیروئے، لیگ کے لیے راستہ بنانے کی خاطر، اصولوں کے برخلاف، اس مسلم اکثریتی صوبے میں کانگریس کی حکومت کو دبا رہے تھے، کیونکہ اس کا تسلسل پاکستان کے قیام کو ناممکن بنائے دے رہا تھا۔

چونکہ عبوری حکومت میں تعطل جاری رہا، ماؤنٹ بیٹن اور اس کے مشیروں نے ایک 'بلکان پلان' ترتیب دیا، جو کہ مرکزی حکومت کی بجائے صوبوں کو اقتدار منتقل کرے گا، انھیں اس معاملے میں آزاد چھوڑتے ہوئے کہ وہ ایک بڑی یونین میں شامل ہوں (یا نہ ہوں)۔ برطانویوں نے نہرو کو اندھیرے میں رکھا، جبکہ بلکان پلان پر غور و فکر (اور نظرِ ثانی) لندن میں کی گئی — ایک سلطنت کے لیے یہ کتنا مضحکہ خیز تھا جو اس دعویٰ پر مائل تھی کہ اس نے ہندوستان کو متحد رکھا۔ آخر کار جب 10 مئی کی رات شملہ میں ماؤنٹ بیٹن نے اسے وہ تحریر دکھائی، تو نہرو غیظ و غضب میں پھٹ پڑا، رات کے دو بجے وہ اپنی اہانت پر چڑچڑانے کے لیے بھاگتا ہوا اپنے دوست کرشنا مینن کے کمرے میں پہنچا۔ کیا منصوبے پر عمل درآمد ہو چکا تھا، ہندوستان کا تصور، جو نہرو نے اپنی تحریروں میں بڑی ذہانت سے پیش کیا تھا، وہ زیادہ سمجھداری سے تقسیم کرتا تھا بہ نسبت جس طرح جناح تجویز کر رہا تھا۔ جیسا کہ صوبے، راجواڑے اور گوناگوں سیاسی قوتیں، راج کی روانگی پر طاقت کے حصول کے لیے باہم مقابل تھیں، تو بلکنائزیشن، بعید از قیاس پیمانے پر خانہ جنگی اور بدامنی کی راہ کھول سکتی تھی۔

نہرو کی جانب سے، ماؤنٹ بیٹن کو ایک طویل، جذباتی اور کہیں کہیں غیر مربوط احتجاجی مراسلے نے منصوبے کو ختم کر دیا۔ لیکن واحد متبادل، بٹوارہ تھا۔ مئی میں، نہرو نے ملک میں بے چینی کو 'جوالا مکھی' کے طور پر دیکھا: مشکل اور ناخوشگوار فیصلوں کا وقت آ چکا تھا، اور وہ یہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ بادل ناخواستہ، اس نے شمال مغربی سرحدی صوبے اور مسلم اکثریتی ڈسٹرکٹ سلہٹ میں ریفرنڈم کی ماؤنٹ بیٹن کی تجویز سے اتفاق کیا، سندھ کے ہندو اکثریتی ڈسٹرکٹس پر ایسے ہی لائحۂ عمل کے متعلق کانگریس کی جوابی تجویز سے دستبردار ہو گئے،

اور انتہائی حیران کن طور پر، مکمل آزادی، جس کی کانگریس طویل عرصے سے ترجمانی کرتی رہی تھی کی بجائے، برطانوی کامن ویلتھ کے اندر ہندوستان کے ڈومینین سٹیٹس پر راضی ہو گئے۔

جب تک برطانویوں نے جناح کو ہر تجویز پر ویٹو دیے رکھا، اسے یہ ناموافق لگتا، اور اب جب کہ وہ دم دینے کے قریب تھے، تو بٹوارے کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ کچھ خاص نہیں تھا جو نہرو کر سکتا تھا۔ نہ ہی اس وقت کے دوسرے اہم ہندوستانی قوم پرستوں کی تحریروں اور تاثرات میں کوئی ایسی شہادت ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس کوئی بہتر حل تھا۔ واحد استثناء مہاتما گاندھی تھے: گاندھی ماؤنٹ بیٹن کے پاس گئے اور تجویز دی کہ ہندوستان کو متحد رکھا جا سکتا ہے بشرطیکہ جناح کو پورے ملک کی قیادت کی پیشکش کی جائے۔ نہرو اور پٹیل دونوں نے اس منصوبے سے صاف صاف انکار کر دیا، اور ماؤنٹ بیٹن لگتا نہیں تھا کہ اسے سنجیدگی سے لے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ، طے شدہ تاریخ سے کہیں جلدی کا انتخاب کر کے، ماؤنٹ بیٹن، غیر موزوں عجلت میں کارروائی آگے بڑھاتا ہوا نظر آ رہا تھا__ 15 اگست، ایک تاریخ جو اس نے اچانک ذہنی ترنگ میں منتخب کی کیونکہ اس تاریخ کو اس نے شمال مشرقی ایشیا کے سپریم الائیڈ کمانڈر کے طور پر جاپانیوں کے ہتھیار ڈالنے کی منظوری دی تھی__ اور ایسا کرتے ہوئے وہ ہندوستانی قائدین کو بھی خاطر میں نہیں لایا۔ نہرو کو یقین تھا کہ جناح اس قابل ہے کہ ملک کو آگ میں جھونک دے اور قومی تحریک نے جو کام کیے ہیں انھیں تباہ کر دے: نہرو نے اپنی پارٹی کو کہا، 'ان تجاویز کی سفارش کرتے ہوئے میرے دل میں کوئی خوشی نہیں، حالانکہ میرے ذہن میں کوئی شبہ نہیں کہ یہی صحیح راستہ ہے'۔ دل و دماغ کے درمیان افتراق تلخ اور تکلیف دہ تھا۔

نہرو، جناح اور سکھ لیڈر بلدیو سنگھ نے 3 جون کو ملک کی تقسیم کی اپنی منظوری کی خبر نشر کی۔ اس موقع پر نہرو کی معقولیت پھر عیاں ہو گئی: اس نے کہا 'ہم ادنی انسان اعلیٰ مقصد کی بجا آوری کر رہے ہیں، دنیا اور ہندوستان میں آج طاقتور قوتیں مصروف کار ہیں.... (مجھے امید ہے) کہ دوسری صورت کے برعکس اس طرح ہم جلد متحدہ ہندوستان تک پہنچ جائیں گے اور یہ کہ اس کی بنیاد زیادہ مضبوط اور محفوظ ہو گی..... جغرافیہ، تاریخ اور روایت کا ہندوستان، ہمارے دل و دماغ کا ہندوستان تبدیل نہیں ہو گا'۔ لیکن یقیناً یہ تبدیل ہو سکتا تھا: جغرافیہ ٹکڑے ٹکڑے ہوا، تاریخ کی غلط تعبیر ہوئی، روایت کا انکار کیا گیا، دل اور دماغ کو نوچ کر علیحدہ کر دیا گیا۔

نہرو کا خیال تھا کہ فساد اور تشدد جس نے لیگ کے پاکستان کے مطالبے پر پورے ملک کو اذیت میں مبتلا کر

دیا تھا، اس مطالبے کے ایک دفعہ منظور ہو جانے پر، پر سکون ہو جائے گا، لیکن وہ غلط تھا۔ قتل وغارت اور عوام الناس کی ہجرت (کی صورتحال) بدتر ہوتی گئی کیونکہ لوگ انتہائی شدت کے ساتھ ان سرحدوں کے، جو برطانیہ ان کی مادر وطن پر کھینچنے لگا تھا، کے اسی طرف رہنا چاہتے تھے۔ دس لاکھ سے زائد لوگ اس بربریت میں مارے گئے، جس نے ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کو روکے رکھا؛ قریباً ایک کروڑ ستر لاکھ بے گھر ہوئے، اور انگنت پراپرٹیاں تباہ ہوئیں اور لوٹی گئیں۔ سرحدوں کا مطلب زندگی تھا۔ نہرو نے جو یہ سوچا تھا کہ ہندوستان کے بعض علاقوں میں یہ افتراق عارضی ہو گا، اس نے سنگین ہو کر دو علیحدہ اور معاندانہ ریاستوں کی تخلیق کی، جو عشروں بعد ایک دوسرے کے ساتھ چار جنگیں لڑیں گی اور نیوکلیائی ہتھیاروں میں الجھی اور دہشت گردی کے خطرے سے دوچار رہیں گی۔

گاندھی اکیلے نہیں تھے جن پر غدار سمجھ کر حملہ کیا گیا۔ کانگریسی حکومت نے شمال مغربی سرحدی صوبے میں نیشنل پارٹی سے ناامید ہو کر ریفرنڈم کا بائیکاٹ کیا جو کہ رائے دہندگان کے محض 50.49 فیصد ووٹوں سے پاس ہوا، (لیکن جنھوں نے ووٹ دیے ان کا 99 فیصد تھا)۔ ماؤنٹ بیٹن جو دونوں ممالک کی گورنر جنرل شپ اپنے پاس رکھ کر، دونوں نئی ڈومینینز کے درمیان پل کے طور پر کچھ عرصہ کام کرتا ہوا، خود کو دیکھنا چاہتا تھا، کو جناح نے خشک لہجے میں بتایا کہ لیگ کا قائد پاکستان میں یہ عہدہ خود رکھے گا۔ لہٰذا رخصت ہونے والے وائسرائے کو بذاتِ خود ہندوستان کی محض خطابی حکمرانی پر قناعت کرنا ہوگی۔

فسادات اور خونریزی کے دوران، جس نے شمالی ہندوستان کے خاصے بڑے حصے کو نگل لیا، جواہر لال نہرو نے یہ اطمینان کرنے کے لیے وقت نکالا کہ کوئی کمینگی اس لمحے کو برباد نہ کر دے: اس نے آزادی کی تقریب میں یونین جیک کے رسمی طور پر سرنگوں کرنے کو ملتوی کر دیا تاکہ برطانویوں کے جذبات مجروح نہ ہوں۔ ہندوستانی ترنگا غروب آفتاب سے ذرا پہلے بلند کیا گیا، اور جب یہ لہرایا تو جھنڈے کے پول کے پیچھے بے وقتی مون سون کی ایک قوس قزح نمودار ہوئی، آکاش سے ایک درخشاں خراج عقیدت۔ آدھی رات سے کچھ پہلے، نہرو قانون ساز اسمبلی میں، کسی ہندوستانی کی جانب سے کی گئی سب سے معروف تقریر کرنے کے لیے اٹھے۔

> سالوں پہلے ہم نے تقدیر سے ملنے کا وعدہ کیا تھا، اور اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنا عہد پورا کریں گے، مکمل یا پورے طور پر نہیں، بلکہ معقول حد تک۔ آدھی رات ہونے پر، جب دنیا سو جاتی ہے،

ہندوستان زندگی اور آزادی کے لیے جاگے گا۔ ایک لمحہ آتا ہے، آتا تو ہے، لیکن تاریخ میں شاذونادر، جب ہم فرسودگی سے نئے (عہد) میں قدم رکھتے ہیں، جب ایک دور ختم ہو جاتا ہے، اور جب ایک قوم کی کچلی ہوئی روح کو قوت اظہار ملتی ہے۔

برطانویوں کے لیے کوئی درشت الفاظ نہیں تھے، آدھی رات کو پورا (برطانوی) راج ختم ہو رہا تھا۔ اس نے مزید کہا کہ 'بغض اور دوسروں کو الزام دینے کا... یہ وقت نہیں، ہمیں آزاد ہندوستان کا عالی شان محل تعمیر کرنا پڑے گا جہاں اس کی تمام اولاد سکونت اختیار کر سکے۔'

ہندوستان سے رخصتی، پاکستان کی تخلیق

آزادی اور تقسیم کی اس آخری جنونی ناعاقبت اندیشانہ عجلت میں، انگریز بہت کم معتبریت کے ساتھ سامنے آئے۔ وہ جنگ سے پہلے، اقتدار کی منتقلی کا اتنی سرعت سے، یا بالکل بھی، ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ برطانوی راج کے آخری سالوں میں منتخب حکومت کے تجربے نے مہر ثبت کر دی کہ انگریز، ہندوستان میں ہندوستانیوں کی نمائندہ حکومت کی اعانت کے اپنے تشہیر کردہ منصوبے کے لیے کبھی بھی سنجیدہ نہیں تھے۔ جب کانگریس وزارتیں دستبردار ہوئیں، برطانویوں نے ان کی جگہ غیر منتخب لیگیوں کی تعیناتی بارے بہت کم سوچ بچار کی اور اکثر کیسوں میں ان مناصب کا اختیار بھی لے لیا جو بظاہر ہندوستانیوں کے سپرد ہو چکے تھے۔ برطانوی، جو کسی بھی جگہ مسلم نشستوں کی اکثریت جیتنے کی اہلیت نہ ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ سے مایوس ہو چکے تھے، نے اسی باعث تقسیم کرکے حکومت کرو کی قوت کم کرتے ہوئے، ان اختیارات جن سے وہ جزوی طور پر دستبردار ہو چکے تھے، کو قبول کرنے کے موقع کا خیر مقدم کیا، اور اس عمل میں انڈین نیشنل کانگریس کے بنیادی متبادل کے طور پر لیگ کو سہارا فراہم کیا۔ انھوں نے اس اثرورسوخ اور سرپرستی، جو کہ وہ اپنی انتخابی حمایت سے حاصل نہیں کر سکی تھی، کو تصرف میں لانے کے اس غیر متوقع موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے، اور ان کی حمایت بڑھانے کے لیے جبکہ ان کے اہم ترین مخالفین جیل میں نڈھال ہو رہے تھے، مسلم لیگ کی کھلم کھلا مدد کی۔

یہ سب کچھ تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کا حصہ تھا: 1940 تک برطانیہ میں کسی بھی ذمہ دار عہدے پر کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو سلطنت سے دستبرداری یا شہنشاہ کے تاج کا نگینہ، دیسی کپڑوں میں ملبوس قوم پرست ہندوستانیوں کے انبوہ کے سپرد کرنے کا کوئی ارادہ رکھتا ہو۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کی تباہی کا شاخسانہ تھا کہ جملے کا محض آدھا حصہ ہی بچ سکتا تھا: چھ سال تک خونریزی، بمباری اور انہدام کا شکار، برطانیہ تقسیم تو کر سکتا

تھالیکن مزید حکومت نہیں۔

برطانوی ـــ جرمن بمباری سے دہشت زدہ، متعدد شکستوں سے پست حوصلہ تھے اور ان کے فوجیوں کی خاصی بڑی تعداد کو قیدی بنالیا گیا تھا، ہندوستانی فوجیوں کے فرار اور ہندوستانی ملاحوں کی بغاوت سے لرزتے، 1945 اور 46 کے موسم سرما کی ریکارڈ سردی سے ٹھٹھرتے، جنگ کے بعد کوئلے کی قلت کے نتیجے میں پاور سپلائی میں کمی اور فیکٹریوں کی بندش سے عاجز ـــ ہلکان ہو چکے تھے اور ایک دور دراز سلطنت پر توجہ مرکوز کرنے کے موڈ میں نہیں تھے، جبکہ وطن میں ان کی اپنی ضروریات انتہائی توجہ کی متقاضی تھیں۔ وہ کسی نہ کسی حد تک دیوالیہ بھی ہو چکے تھے: امریکی قرضوں نے معیشت کو بے سمت کر ڈالا تھا اور ان کی ادائیگی کی اشد ضرورت تھی، اور حتیٰ کہ ہندوستان کے ذمہ بھی خاصا بڑا قرض تھا۔ سمندر پار کی ذمہ داریاں، مزید برقرار رکھنے جوگ یا بالخصوص مقبول عام نہیں تھیں۔ روانگی واحد قابل عمل انتخاب تھا: سوال یہ تھا کہ وہ پیچھے کیا چھوڑ جائیں گے ـــ ایک ہندوستان، دو یا متعدد ٹکڑے؟

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، جنگ سے پہلے اور اس کے دوران برطانیہ کی اپنی حکمت عملی ـــ کے ساتھ ساتھ کانگریس کی اپنی قدر و منزلت سے دستبرداری اور جیل جانے کی بیوقوفی کا ایسا مرکب تھا ـــ جس نے یہ یقین دہانی کی کہ جس وقت روانگی ہونے لگے، تو برطانوی رخصتی کو بچاتے ہوئے، ایک متحدہ ہندوستان کے امکانات لازماً معدوم ہو چکے ہوں۔ تقسیم کر کے حکومت کرونے خوب کام کیا: دو ہندوستان تھے جو ہو سکتے تھے۔

دو اقوام کو تقسیم کرنے کا فریضہ سر سائرل ریڈکلف کو سونپا گیا، ایک وکیل جو اس سے پہلے کبھی ہندوستان نہیں آیا اور اس کی تاریخ، سماج یا روایات کے بارے کچھ نہیں جانتا تھا۔ ریڈکلف نے، صوبوں، ضلعوں، دیہاتوں، گھروں اور دلوں کو تقسیم کرتے ہوئے، اپنے نقشے چالیس دن میں مرتب کیے ـــ اور دوبارہ ہندوستان نہ آنے کے لیے، فوری طور پر اپنے وطن برطانیہ کو بھاگ لیا۔ جیسا کہ ایلکس وون تنزیلمان نے بیان کیا 'برطانوی سلطنت زوال پذیر نہیں ہوئی، یہ بالکل زمین بوس ہو گئی'۔ برطانوی ان جانوں سے بے پرواہ تھے جو اُن کی رخصتی کی ناعاقبت اندیشانہ عجلت کے باعث ضائع ہوں گی۔

بٹوارے کے المناک انتشار پر پہلے ہی اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ وہ بیان کرنے کے لیے جس کی پہلے ہی کئی ایک قابلِ مذمت طور پر تصویر کشی کر چکے ہیں، مزید الفاظ کا اضافہ نامناسب لگتا ہے۔ فی الحال شاید برطانوی مسلم سکالر یاسمین خان کا حوالہ دینا کافی ہو، اپنی قابل قدر تاریخ مہا بٹوارہ: ہندوستان اور پاکستان کی تخلیق میں وہ

لکھتی ہیں کہ بٹوارہ 'سلطنت کی بیوقوفیوں کی سند ٹھہرا، جس نے کمیونٹی کے ارتقاء میں نفاق پیدا کیا، تاریخ کے خط پرواز کو مسخ کر ڈالا اور ان معاشرتی گروہوں کو جبری ریاستی تشکیل پر مجبور کیا جو بصورتِ دیگر مختلف اور ناقابلِ ادراک راستہ اختیار کرتے'۔

لہٰذا، اس خودستائشی پر مبنی سامراجی دلیل کو قبول کرنا مشکل ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان کو ترکے میں اس کی سیاسی وحدت اور جمہوریت دی۔

ہاں، برطانوی فتوحات اور حکمرانی کی متلون اور منافقانہ فطرت کی ضروریات کے مطابق، اور نمائندہ اداروں میں حقیقی سیاسی اختیار کو روبہ عمل میں لانے کے مواقع سے ہندوستانیوں کو محروم رکھنے کے برطانوی عزم کے ذریعے اس نے مختلف النوع ریاستوں کو ایک مشترکہ قانون اور انتظامیہ کے ماتحت اکٹھا کیا، لیکن کئی طرح سے مسخ کرنے کے بعد (پچھلے ابواب میں ان کا خاکہ بیان ہو چکا ہے)۔

ہاں، مفروضہ طور پر انھوں نے آزاد پریس متعارف کروایا، لیکن اس یقین دہانی کے ساتھ کہ یہ شدید پابندیوں تلے کام کرے، اور نمائندہ پارلیمانی اداروں کے بیج بوئے جبکہ طاقت کی اساس ہندوستانیوں سے چھینے رکھی۔

جیسا کہ بہت سے برطانوی یہ دکھاوا کرنا چاہتے ہیں، مطلق العنانی اور استبدادیت میں دھنسے ملک میں جمہوریت متعارف کروانے کے برعکس، انھوں نے ایک ایسی سرزمین کو سیاسی آزادی سے محروم کیا، جو بڑے لمبے عرصے تک اس سے لطف اندوز ہوتی رہی تھی، حتیٰ کہ بہت سے بادشاہوں کے زیر اثر بھی، یہاں تک کہ روحانیت اور حکمرانی کے اہم معاملات پر بھی، مکالمے اور اختلاف رائے کی تمدنی روایت کو سلام۔

ہاں، ہندوستان ایک ابھرتی ہوئی تکثیری جمہوریت کے طور پر ظاہر ہوا ہے، جبکہ پاکستان اور بنگلہ دیش دونوں کو ایسا کرنے میں مشکلات کا سامنا ہے، اور پاکستان، سویلین حکومتوں میں بھی اپنے غیر مسلم شہریوں کے خلاف سرکاری اور غیر جمہوری طور پر امتیازی سلوک روا رکھتا ہے۔ لیکن ہندوستان کی سات عشروں سے پروان چڑھتی جمہوریت، برطانوی حکمرانی کی تحسین نہیں۔ یہ کسی قدر آسودہ ہے، جیسا کہ میں نے آکسفورڈ میں خطاب کیا تھا، برطانویوں کا لوگوں کو دو سو سال تک کچلنا، استحصال کرنا، قید کرنا، تشدد کرنا اور اپاہج بنانا اور پھر اس حقیقت کا جشن منانا کہ اس کے اختتام پر وہ ایک جمہوریت تھے۔

آخر میں، سب سے زیادہ تکلیف دہ سوال: ہم کونسی سیاسی وحدت کا جشن مناسکتے ہیں جبکہ بٹوارے کی

دہشت،— تقسیم کرو اور حکومت کرو کی دانستہ برطانوی پالیسی کا براہ راست نتیجہ تھی جس نے سامراجی حکومت کے تسلسل کو سہولت مہیا کرنے کے لیے مذہبی منافرت کی پرورش کی؟ اگر برطانیہ کا سب سے عظیم کارنامہ، اشوک سے اکبر تک صاحب بصیرت شہنشاہوں کی تمناؤں کی تکمیل کے لیے، ایک واحد سیاسی یونٹ جسے ہندوستان کہتے ہیں کی تشکیل تھا، تو یقیناً اس کی سب سے بڑی ناکامی اس حقیقی بریگزٹ سے لڑکھڑاتے ہوئے نکلنا تھا— اس سرزمین کو کاٹنا اور وہاں سے بھاگنا جس کے متعلق ان کا دعویٰ تھا کہ اس کی فلاح کے لیے اس پر حکومت کی، اپنے پیچھے دس لاکھ لاشیں ایک کروڑ تیس لاکھ بے گھر، اربوں روپے کی تباہ شدہ املاک، اور تاراج سرزمین پر چاروں اور فرقہ وارانہ نفرت کے شدت سے بھڑکتے شعلے چھوڑے۔ المناک انداز میں اس کے انجام سے بڑھ کر، کوئی اور فرد جرم ہندوستان میں برطانوی حکومت کی ناکامیوں پر عائد نہیں ہو سکتی۔

پنجم

روشن خیال استبدادی حکومت کا افسانہ

پنجم

روشن خیال استبدادی حکومت کا افسانہ

روشن خیال استبدادی حکومت کا معاملہ ــ ضیافت و قحط: برطانوی اور 'فاقہ زدہ ہندوستان' ــ برطانوی نو آبادیاتی ہالوکاسٹ ــ قحط اور برطانوی پالیسی ــ آدم سمتھ اور مالتھیوس ــ مضطرب ضمیر، پر سکون لا تعلقی ــ لارڈ لٹن کی شفیقانہ غفلت ــ دادرسی میں ہندوستانیوں کی فعالیت ــ 'عددی فصاحت' ــ بنگال کا قحط اور چرچل کا رویہ ــ جبری ہجرت: ٹرانسپورٹیشن اور معاہداتی مشقت ــ آبنائے کی آبادکاری، ماریشیس اور دوسری جگہیں ــ معاہداتی مشقت ــ (بروٹش) حیوانیت کا راج ــ نو آبادیاتی قتل و غارت ــ جلیانوالہ باغ کی کہانی ــ جنرل ڈائیر کا دہشت راج ــ برطانویوں کا قاتل کو نوازنا

بہت سے لوگوں، بشمول متعدد انگریز نواز ہندوستانیوں کا یہ میلان رہا ہے، کہ برطانوی نو آبادیاتی حکومت کو فی الواقع مہربان سمجھیں، 'روشن خیال استبداد' کی ایک صورت جس کا امتیازی وصف اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی روشن خیالی تھا۔ اس نقطہ نظر کے مطابق، برطانوی چاہے سامراجی تھے جنھوں نے ہندوستانیوں کو جمہوریت سے محروم رکھا، لیکن انھوں نے اپنی رعایا کی بہتر بہبود کے لیے، بڑی فراخدلی اور حکمت سے حکومت کی۔ آسٹریا کے شہنشاہ جوزف دوم کا مفہوم بیان کریں، جس نے نہایت عمدگی سے کہا تھا: 'ہر چیز عوام کے لیے ہے، عوام سے کچھ نہیں'، اس پڑھنت میں، برطانویوں نے ہندوستانیوں کو شاید کچھ نہ کرنے دیا ہو، لیکن انھوں نے ان کے لیے سارا کچھ کیا۔

یہ نقطہ نظر یا تو سادہ لوحی پر مبنی ہے یا خود نمائی پر، یہ طے کرنا مشکل ہے کہ کس پر۔ اس لیے چند مثالیں کہ برطانویوں نے ہندوستان پر کیسے حکمرانی کی، دیکھنے کے قابل ہیں، کیونکہ وہ اس بیانیے کو جھوٹا قرار دیتے ہیں۔ سب سے واضح مثالیں، قحط جو برطانویوں نے پیدا کیے اور بگاڑے؛ ٹرانسپورٹیشن کے ذریعے ہندوستانیوں کی

جبری نقل مکانی اور معاہداتی مشقت کا جو نظام تھا؛ اور سفاکیت جس سے اختلاف رائے کو کچلا گیا، سے متعلقہ ہیں۔ ہم ان میں سے ہر ایک کا مختصر تجزیہ کریں گے۔

ضیافت اور قحط: برطانوی اور 'فاقہ زدہ ہندوستان'

جیسا کہ ہندوستان، برطانوی خوشحالی کے لیے بتدریج فیصلہ کن ہوتا جارہا تھا، لاکھوں ہندوستانی قحطوں میں سراسر بیکار کی موت مارے گئے۔ اس کے نتیجے میں جسے کوئی فقط برطانوی نو آبادیاتی ہالوکاسٹ ہی کہہ سکتا ہے، برطانیہ کی بڑی سفاکی سے لاگو کی گئی معاشی پالیسیوں کو سلام، کہ راج کے دوران تین سے ساڑھے تین کروڑ کے درمیان ہندوستانی ناحق فاقوں سے مارے گئے۔ حتیٰ کہ جب قحط پھیل چکا تھا، لاکھوں ٹن گندم ہندوستان سے برطانیہ برآمد کی گئی۔ جب ریلیف کیمپ بنائے گئے، تو باشندوں کو بامشکل ہی خوراک مہیا کی گئی اور تقریباً سارے ہی مارے گئے۔

یہ حیرت انگیز ہے کہ ہندوستان میں آخری بڑے پیمانے کا قحط برطانوی حکومت کے زیر سایہ وقوع پذیر ہوا؛ اس کے بعد سے کوئی بھی وقوع پذیر نہیں ہوا، کیونکہ ہندوستانی جمہوریت قحط سالی سے متاثرہ اور غربت زدہ ہندوستانیوں کی ضروریات بارے زیادہ ہمدرد رہی ہے بہ نسبت کہ برطانوی حکمران کبھی جتنے بھی تھے۔ جیسا کہ سکالر اور نوبل انعام یافتہ امرتیا سین واضح کر چکے ہیں، جمہوریت کے ساتھ آزاد پریس کے ہوتے ہوئے کبھی کوئی قحط نہیں ہوا، کیونکہ عوامی جواب دہی مؤثر ردعمل کو یقینی بناتی ہے۔ سین کی تالیفات، جو ترحم کے ساتھ ساتھ بامعنی (کوانٹیٹیٹیو ریسرچ) مقداری تحقیق سے عبارت ہیں، نے موجودہ وسیع پیمانے پر مسلّم اس نظریے کو ثابت کر دیا ہے کہ قحطوں سے تقریباً ہمیشہ ہی بچا جاسکتا ہے؛ یہ کہ وہ خوراک کی قلت کا نہیں بلکہ خوراک تک ناکافی رسائی کا نتیجہ ہوتے ہیں؛ لہٰذا یہ تقسیم ہی اس کی کنجی ہے، اور یہ جمہوریت ایک ایسا نظام حکومت ہے جو اس قابل بناتا ہے کہ اشیاء خوردنی وسیع پیمانے پر اور جائز طریقے سے تقسیم ہوں۔ بہر حال جمہوریت اور عوامی جوابدہی کا فقدان تھا جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کا بنیادی وصف تھا۔

برطانوی حکومت کے دوران بڑے قحطوں کی ایک فہرست ہیبت ناک مطالعہ کے لیے بنائی گئی ہے: بنگال کا مہا قحط (1770)، مدراس (1782 سے 83)، چالیسہ کا قحط (1783 سے 84) دہلی اور اس کے نواحی علاقوں میں، دوجی بارہ کا قحط (1791 سے 92) حیدر آباد کے گردونواح میں، آگرہ کا قحط (1837 سے 38)، اوڑیسہ کا

قحط (1866)، بہار کا قحط (1873 سے 74)، جنوبی ہندوستان کا قحط (1876 سے 77)، ہندوستان کا قحط (قریباً 1896 سے 1900 تک)، بمبئی کا قحط (1905 سے 06)، اور اس فہرست میں سب سے بدنام، بنگال کا قحط (1943 سے 44)☆، اموات کی شرح دل دہلا دینے والی ہے: بشمول انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہونے والے پانچ قحطوں میں ایک کروڑ پچاس لاکھ لوگوں کے، 1770 سے 1900 تک، اندازاً دو کروڑ پچاس لاکھ ہندوستانی قحطوں میں مارے گئے۔

بیسویں صدی کے قحط میں غالباً کل تین کروڑ پچاس لاکھ سے زائد لقمہ اجل بنے۔ ولیم ڈگبئی نے نشاندہی کی ہے کہ 1793 سے 1900 تک کے تمام 107 سالوں میں، پوری دنیا میں کل ملا کر تمام جنگوں میں ایک اندازے کے مطابق پچاس لاکھ لوگ مارے گئے، جبکہ 1891 سے 1900 کے دوران دس سالوں میں ایک کروڑ نوے لاکھ لوگ صرف قحط سالی سے مارے گئے۔ یوں تو انسانی اموات کا تقابل ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے، (برطانوی) راج کے دوران قحط اور وباؤں سے مارے گئے تین کروڑ پچاس لاکھ ان کی یاد دلاتے ہیں جو دو کروڑ پچاس لاکھ سٹالن کی اجتماعیت کی تحریک اور سیاسی تزکیہ میں مارے گئے، ان چار کروڑ پچاس لاکھ کی جو ماؤ کے تمدنی انقلاب کے دوران مارے گئے، اور ان پانچ کروڑ پچاس لاکھ کی جو جنگ عظیم دوم کے دوران پوری دنیا میں مارے گئے۔ نو آبادیاتی ہالوکاسٹ کی اموات کی شرح، موجودہ دور میں، انسان کے انسان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کی چند اذیت ناک مثالوں کے ساتھ، ابھی بھی وہیں پر ہے۔

نو آبادیاتی ہندوستان کے آخری دور میں، قحط سیاسی مقابلے کا ایک اہم میدان بن چکا تھا۔ ان کے بار بار رونما ہونے، برطانویوں کی گڈ گورننس کے وعدے پورے کرنے میں ناکامی، اور نتیجتاً عوام الناس کی فاقہ زدگی، نے ہندوستانی قوم پرست لیڈروں کو از سر نو منظم ہونے کا اچھا موقع فراہم کیا: دادا بھائی نوروجی نے اوڑیسہ کی اموات سے تحریک پانے کے بعد، اپنے مشہور 'معاشی نکاس' کے نظریے اور 'ہندوستان میں غیر برطانوی طرز حکومت' پر تحقیق شروع کی۔ اس وقت تک انھیں انگریز نواز اور برطانوی لبرلزم کے مداح کے طور پر دیکھا جاتا تھا، لیکن اس التباس کے خاتمے کو اب وہ مزید چھپا نہیں سکتے تھے۔ نوروجی نے لکھا، 'اس میں کوئی شک نہیں

☆ فہرستیں مختلف ہیں۔ اور۔ سنٹل ہیر لڈ نے فروری 1838 میں برطانوی ہند میں سات عشروں کے دوران پندرہ قحطوں کی رپورٹنگ کی: 'ہندوستان میں 1766، 1770، (جب بنگال میں آدھے باسی نابود ہو گئے) 1782، 1792، 1803، 1804، 1819، 1820، 1824، 1829، 1832، 1833، 1836، 1837، اور اب 1838 میں قحط پھیلے'۔

کہ موجودہ دور میں ہمارے پاس زندگی اور املاک کی بہتر ضمانت ہے، لیکن ایک قحط میں پندرہ لاکھ زندگیوں کا ضیاع (1866 میں اوڑیسہ میں شرح اموات)، زندگی اور املاک کی قدر و منزلت کو اس طرح مامون رکھنے کی عجیب توضیح ہے'۔

برطانویوں کا میلان تھا کہ قحطوں میں مداخلت کے ساتھ ساتھ مناسب حکومتی اقدامات سے انکار کی بنیاد تصورات کے تین سیٹوں کے اتصال پر رکھی جائے: آزاد تجارت کا اصول (مارکیٹ کی قوتوں میں مداخلت مت کرو)، مالتھیوس کا نظریہ (زمین کی استعداد سے زیادہ آبادی میں اضافے کو برداشت کرنا ناگزیر طور پر موت کی طرف لے جائے گا، یوں آبادی کا 'صحیح' تناسب دوبارہ قائم ہو جائے گا) اور مالیاتی پیش بینی (جس کا ہم نے بجٹ نہیں بنایا اس پر روپیہ مت خرچ کرو)۔ انھیں بنیادوں پر برطانیہ نے، قحط کے دوران وہاں آئرلینڈ میں زندگیاں بچانے کے لیے، یا امریکہ کی طرف نقل مکانی روکنے کے لیے مداخلت نہیں کی۔ جیسا کہ ڈینیار پٹیل نشاندہی کرتا ہے انیسویں صدی کے وسط میں، 'یہ ایک مشترکہ معاشی حکمت تھی کہ قحط سالیوں میں حکومتی مداخلت غیر ضروری بلکہ نقصان دہ تھی۔ مارکیٹ میں مناسب توازن تو دوبارہ قائم ہو جائے گا۔ مالتھیوسی اصولوں کے مطابق، متجاوز اموات، حد سے زائد آبادی پر فطرت کے رد عمل کا ایک طریقہ تھا'۔

چنانچہ بنگال کے گورنر سر سیسل بیڈن (جس نے اس علاقے کے ایک دورے کے دوران اعلان کیا، 'کارسازی کے اس طرح کے دوروں سے کوئی بھی حکومت اسے روکنے کے لیے یا کم کرنے کے لیے کچھ خاص نہیں کر سکتی)'، جب 1866 میں اوڑیسہ کی قحط سالی کے دوران اشیاء خورد و نوش کی قیمتیں کم کرنے کے لیے، کچھ نہ کرنے پر، تنقید کی گئی، تو اعلان کیا کہ 'اگر میں ایسا کرنے کی کوشش کروں گا، تو مجھے خود کو ایک ڈاکو یا چور سے بہتر نہیں سمجھنا چاہیے'۔ گورنر، آدم سمتھ کے آزاد تجارت کے اصولوں کی اطاعت اور اپنی سیاسی شہرت کو پہنچنے والے نقصان کے متعلق زیادہ فکرمند تھا، کاش اسے اڑیسہ کے لوگوں کی اموات کے المیے کی بجائے، معاشیات کے 'فطری قوانین' میں مداخلت کرتے ہوئے دیکھا گیا ہوتا۔

یہ کہنا پڑے گا، اس نے چند باضمیر انگریزوں کو مصیبت میں ڈال دیا: 1866 میں اوڑیسہ کے قحط کے دوران، ہندوستان کے سیکرٹری آف سٹیٹ مارکیز آف سیلسبری کے بارے کہا جاتا ہے کہ، جب اسے اس بحران کی شروعات بارے مطلع کیا گیا، اس کے بعد، دو ماہ تک کسی کارگزاری میں ناکامی پر روزانہ خود کو ملامت کرتا رہا؛ قحط سے متعلقہ دس لاکھ لوگوں کی اموات کا الزام اس کی بے عملی پر لگا۔ کم از کم 1860 سے ہی، برطانوی

انتظامیہ بڑی حد تک اعتراف کر رہی تھی، کہ کثیر الوقوع قحط فی النفسہ اشیاء خورد و نوش کی کمی کا نتیجہ نہیں، بلکہ لوگوں کی اشیاء خورد و نوش خریدنے کی سکت نہ ہونے کا (نتیجہ) ہے، یا ایک سکالر کے الفاظ میں، 'خشک سالی اور فصلوں کی پیداوار میں کمی کے مارکیٹ اثرات، پیچیدہ معاشی بحران کا باعث بنتے ہیں'۔ تاہم، یہ استطاعت نہ ہونے کی وجوہات اس سے بہت آگے کی ہیں جن کا برطانوی حوالہ دینا پسند کرتے تھے، اور اس کا الزام خود نوآبادیاتی حکمرانوں پر عائد ہوتا تھا۔ 1866 میں اڑیسہ کے اسی قحط کہ جس نے سیلسبری کی نیند اڑادی تھی، جبکہ پندرہ لاکھ افراد بھوک سے مارے جا چکے تھے، کے دوران برطانویوں نے بے فکری سے بیس کروڑ پاؤنڈ چاول برطانیہ کو برآمد کیے۔

ایک طرف قحطوں کے مسلسل جاری رہنے نے برطانوی بیانیے کو سہارا دیا، کیوں کہ اس دلیل کے طور پر اس کا حوالہ دیا جا سکتا تھا کہ ہندوستانیوں کو برطانوی نگرانی اور سرپرستی کی ضرورت تھی، کیونکہ درحقیقت، ہندوستانی سراسر فاقہ زدگی سے ہی مر گئے ہوتے اگر ان پر برطانوی حکومت کی برکات نہ ہوتیں۔ دوسری طرف، انگریز، قحط سے متعلق اپنی سرکاری رپورٹوں اور جائزوں میں، اپنے علاوہ ہر چیز کو قصوروار ٹھہراتے — بڑھتی ہوئی آبادی، گھٹتی ہوئی چاول کی پیداوار، آب و ہوا کا کردار اور دوسرے ناقابل کنٹرول عوامل، ٹرانسپورٹیشن کی کمی، حتیٰ کہ دیسی بود و باش۔ بطور وجوہات، ان تمام عناصر پر اصرار کیا گیا، کہ ان کے باعث، اشیاء خورد و نوش کی قلت کو روکنے کے لیے مہربان برطانوی انتظامیہ کی جانب سے کی گئیں قابلِ ستائش کوششیں بے کار ہو گئیں، ان نوآبادیاتی پالیسیوں اور کارگزاریوں کے کردار پر بہت کم توجہ مرکوز کی گئی، جنھوں نے اس صورت حال کے متشکل ہونے میں کردار ادا کیا، جو کہ ہندوستانی کسانوں کی قوت خرید کو تباہ کرتے ہوئے اور آب و ہوا کی غارت گری کی شدت کو کم کرنے میں ناکام رہتے ہوئے، اس قلت کا باعث بنیں۔

یہ صرف انیسویں صدی کا مظہر نہیں تھا، شروع سے آخر تک برطانوی نوآبادیاتی پالیسی کی خصوصیت تھی۔ 1943 میں، بنگال قحط کی رپورٹ کا آخری پیراگراف اس کی بڑی دلچسپ مثال پیش کرتا ہے: 'ہم نے قحط پر قابو پانے میں ان کی ناکامی پر بنگال حکومت پر تنقید کی۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کی قیادت کرے اور قابل گریز آفت کو روکنے کے لیے مؤثر اقدامات کرے۔ لیکن بنگال میں عوام یا کم از کم اس کے کچھ طبقات بھی اس الزام میں شریک ہیں۔ ہم نے خوف اور لالچ کی فضاء کا حوالہ دیا، جو کنٹرول کی عدم موجودگی میں، قیمتوں کی شرح تیزی سے بڑھنے کی وجوہات میں سے ایک تھی۔ قدرتی آفت سے بے اندازہ منافع بنایا گیا،

اور ان حالات میں چند ایک کے لیے منافع کا مطلب دوسروں کے لیے موت تھا۔ کمیونٹی کے ایک حصے کے پاس زندگی کی تمام آسائشیں تھیں جبکہ دوسرے فاقہ زدہ تھے، اور مصیبت کی صورتحال میں بہت زیادہ بے اعتنائی تھی۔ کرپشن پورے صوبے اور سماج کے بہت سے طبقات میں عام تھی.... سماج، اپنے تمام حصوں کے ساتھ اپنے کمزور ممبران کے تحفظ میں ناکام رہا۔ درحقیقت یہاں اخلاقی اور سماجی دیوالہ نکلنے کے ساتھ ساتھ انتظامیہ کی بھی شکست وریخت ہو چکی تھی'۔

یوں ذاتی بریت کے خلاف __ جب آپ ایک المیے پر ہر ایک کو الزام دیتے ہیں، تو آپ کسی کو الزام نہیں دیتے __ یہیں ول ڈیورانٹ کی غیر مصالحانہ ملامت ہے: 'ہندوستان میں ان تمام وحشت ناک قحطوں کے پیچھے بنیادی ماخذ کے طور پر ظالمانہ استحصال تھا، اشیاء کی اس طرح کی غیر متوازن برآمد، قحط سالی کے بالکل درمیان میں بلند شرح ٹیکسوں کی ظالمانہ وصولی، جس کا کہ مطالبہ کیا جا رہا تھا اور جو قحط زدہ کسان ادا نہیں کر سکتے تھے.... اکثر اوقات ہندوستان میں قحط سے نجات کے لیے امریکی امداد دی گئی جبکہ حکومت مرتے ہوؤں سے ٹیکس وصول کر رہی تھی'۔ رومیش چندر دت نے بالکل صحیح دلیل پیش کی کہ 'ایک سال بھی ایسا نہیں تھا جب ملک میں لوگوں کے لیے اشیاء خورد و نوش کی رسد ناکافی رہی ہو'۔ ڈیورانٹ اس نقطہ نظر کی بازگشت کے طور پر ایک امریکی الٰہیات دان ڈاکٹر چارلس ہال کا حوالہ دیتے ہوئے اضافہ کرتا ہے: 'ہندوستانی فاقہ کرتے ہیں [تاکہ] ہندوستان کے سالانہ محاصل میں سے ایک بھی ڈالر کم نہ ہو جائے۔ پوری آبادی کے اسی فیصد کو زراعت کی طرف موڑ دیا گیا تھا کیونکہ انگلینڈ کے امتیازی محصولات نے عملی طور پر دیسی دستکاری کے ہر شعبے کو تباہ کر دیا تھا۔ ہم نے اناج سے بھرے جہاز ہندوستان بھیجے، لیکن ہندوستان میں اناج وافر تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ لوگوں کو برباد کیا جا چکا تھا اس وقت تک وہ اتنے غریب ہو چکے تھے کہ کچھ خرید نہیں سکتے تھے۔

برطانویوں کے آنے سے پہلے، اشیاء خورد و نوش کی کمیابی کے وقت، ہندوستانی حکمران ٹیکس میں تخفیف، اناج کی قیمتوں کے تعین اور قحط زدہ علاقوں سے اشیاء خورد و نوش کی برآمد پر پابندی کے ذریعے لوگوں کی اعانت کرتے تھے۔ ذاتی خیرات کی ایک مضبوط روایت موجود تھی، خاص کر قلت کے زمانوں میں۔ مشکل اوقات میں، تاجروں اور زمینداروں سمیت، صاحب ثروت ہندوستانی، کام کی پیشکش کے ذریعے، خوراک دے کر، یا غلے کی قیمت گھٹا کر، مارکیٹ کی قیمت سے کم پر بیچتے ہوئے اکثر اوقات غریبوں کی مدد کرتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس قسم کے ہندوستانی دان پن پر تحفظات تھے، اسے غیر امتیازی خیرات کے طور پر موقوف کر دیا گیا؛ جو

کہ ہر کوچہ گرد غریب کو مائل کرتی تھی، ایک مصنف نے اس کے بارے کہا 'غیر امتیازی دیسی دان پن جو توہم پرستی اور نمود و نمائش سے تحریک پاتا ہے'۔ لہٰذا برطانویوں نے اعلان کیا کہ وہ جسمانی طور پر تندرست لوگوں کو ملازمت دیں گے لیکن عام عوام کو 'بلاجواز امداد' نہیں دیں گے۔

کمپنی کے حکومتی جانشین ان سے بہتر نہیں تھے۔ تمام عرصے میں، سامراجی حکمرانوں کو ان کے خوف کی نسبت ہندوستانی غریبوں کی بہبود کے متعلق بہت کم سروکار تھا __ کم از کم کسی حد تک غریبوں سے متعلقہ برطانوی قوانین کے تجربے کی بنیاد پر، جن میں 1834 میں اصلاح کی گئی، جن کے متعلق اکثر کو خدشہ تھا کہ پوپرازم کی حوصلہ افزائی کریں گے __ قحط بھی، ادارہ جاتی دادرسی اور حکومتی امداد پر انحصار کا کلچر تخلیق کریں گے۔

بہت سے برطانوی افسران نے بھی 'نادار غریبوں' اور 'مذہبی فقیروں' جنھیں وہ امداد کے لیے غیر مستحق سمجھتے تھے کے درمیان تفریق قائم کی۔ ہندوستانی عطیات کرنے والوں نے ایسی کوئی لکیریں نہیں کھینچی تھیں؛ ہزاروں سالوں سے یہ سنتوں، سادھوں، بھکشوں اور تیاگیوں کے لیے استعمال ہوتے رہے تھے، باعزت طور پر گھر گھر، گاؤں گاؤں جاتے، اس توقع پر کہ راستے میں آنے والے کنبے انھیں خوراک مہیا کریں گے۔ برطانوی شاید انھیں 'فقیر'، امداد کی غیر مستحق سماجی جونکیں سمجھتے ہوں، لیکن ہندوستانی ان کی مدد کر کے خوش تھے۔ خیرات کا ہندوستانی تصور مروجہ برطانوی اطوار سے بہت زیادہ مختلف تھا۔ خوشحال ہندوستانی ان طریقوں سے عام عوام کی مدد کرنا چاہتے تھے جو ہندوستان میں برطانویوں کے پاس فطری طور پر نہیں تھے۔ درحقیقت اٹھارویں صدی میں اور انیسویں صدی کے اوائل میں کچھ ہندوستانی برطانویوں کے بارے میں بہت نقطہ چیں ہو رہے تھے کہ، جن کا انھوں نے استحصال کیا تھا، ان لوگوں کے لیے کچھ بھی کیے بغیر، وہ کمپنی کے وافر مال و دولت کے ساتھ گھروں کو لوٹ رہے تھے، لمبے عرصے سے مروج ہندوستانی روایت میں، اپنے پیچھے کھدے ہوئے کنویں، بنائے گئے تالاب، تعمیر کردہ پل یا لگائے گئے درخت چھوڑے بغیر جا رہے تھے۔

مروجہ برطانوی پالیسی کے مطابق، وائسرائے لارڈ لٹن نے ایک قحط کے دوران اشیاء خورد و نوش کی قیمتوں میں کمی سے ممانعت کے احکامات جاری کیے۔ ضلعی افسران کو ہدایت دیتے ہوئے اس نے اعلان کیا کہ 'اشیاء خورد و نوش کی قیمتوں میں کمی کے مقصد سے حکومت کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گی، ہر ممکنہ طور پر امدادی کاموں کی حوصلہ شکنی کرے گی، محض افلاس امدادی کام شروع کرنے کے لیے مناسب وجہ نہیں'۔

مورخ پروفیسر مائیک ڈیوس تحریر کرتے ہیں کہ لٹن کے اعلانات، عدم مداخلت کے ساتھ 'سستے جذبات' کی منفرد کراہت کو وابستہ کرنے کے لیے توجہ کے قابل ہیں، بڑے عہدے پر فائز شدہ ناقابلِ جواب دہ شخص کا استحقاق جو عوامی ضروریات سے بری الذمہ تھا۔ (مضحکہ خیز طور پر، لارڈ لٹن کی بطور وائسرائے واحد اہلیت یہ تھی کہ وہ رابرٹ بلوور لٹن کے طور پر ملکہ وکٹوریہ کا پسندیدہ شاعر تھا۔)

لٹن بہت سے لوگوں کی نسبت زیادہ صاف گو تھا، اپنے برطانوی نقادوں بشمول 'انسان دوست ہسٹریا زدگان' پر الزام دھرنے میں اور انھیں دعوت دینے میں کہ اگر وہ ہندوستانی زندگیاں بچانا چاہتے ہیں تو ان کے اخراجات ادا کریں۔ مالیاتی پیش بینی اور حکومتی مصارف کم رکھنے کی حوصلہ افزائی کے عزم کے ساتھ، لٹن نے 1876-77 کے قحط کے دوران ایک عہدیدار بنام سر رچرڈ ٹیمپل کو ان ہدایات کے ساتھ مدراس روانہ کیا کہ 'انسانیت پسند مکاروں' کی باتوں پر کان نہ دھرے اور امدادی اقدامات کے مصارف کم کرے۔ یقیناً عمومی مصائب کو بہت کم خاطر میں لاتے ہوئے، اس کی تعمیل کی گئی؛ حکومتی بہی کھاتوں کی حالت زار کے سامنے خلقت کی حالت ثانوی تھی۔ جب 1866 میں اس سے پہلے والے اڑیسہ کے قحط میں ٹیمپل نے فاقہ زدہ اڑیسہ کے لیے برما سے چاول درآمد کیے، تو 'اکنامسٹ' نے ہندوستانیوں کو یہ سوچنے کی فرصت دینے پر، 'کہ یہ حکومت کا فرض ہے کہ انھیں زندہ رکھے' بڑی تلخی سے اس پر اعتراض کیا۔ 1877 کا ٹیمپل ایک مختلف آدمی تھا۔ حالانکہ برطانویوں نے قحط ریلیف کی صورت میں 'مشقت کیمپ' قائم کیے (تاکہ فاقہ زدگان روزی کمانے کے لیے مشقت کر سکیں)، سب سے اہم ورثہ جو اس عہدیدار نے اپنے پیچھے چھوڑا وہ 'ٹیمپل اجرت' تھا، جو کہ قحط کے دوران برطانوی مشقت کیمپوں میں، بقول مائیک ڈیوس کے، 'سخت مشقت کے لیے اس سے بھی قلیل غذا مہیا کرتا تھا'، جو 80 سال بعد بدنام زمانہ بچنوالڈ حراستی کیمپ کے مکین وصول کریں گے۔

دوسرے الفاظ میں، 1876-77 کے قحط کے دوران برطانویوں پر 'کچھ نہ کرنے کا نہیں، بلکہ اس کی بجائے اس کے اثرات کو بدتر بنانے کے لیے بہت کچھ کرنے کا الزام لگایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کا اناج عالمی منڈی کو برآمد کرنا اسی طرح جاری رہا، جیسے سٹالن نے 'قحطوں کو اجتماعی بنانے کے عمل' کے دوران کیا، جس نے 1930 میں روس اور یوکرائن کو نرغے میں لے لیا: جیسا کہ پروفیسر مائیک ڈیوس نے لکھا، حقیقت میں 'لندن ہندوستان کی روٹی کھا رہا تھا' جبکہ ہندوستانی قحط سے مر رہے تھے۔ زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے، برطانویوں نے کسانوں پر ٹیکس بڑھا دیے، اور جو اتنے بھوکے تھے کہ پیداوار کے قابل نہیں تھے انھیں 'مجہول' اور 'کام نہ

کرنے کے عادی' کے طعنے دیے جانے لگے۔ جب چند باضمیر انگریزوں نے اعتراض کیا اور از خود اپنے امدادی آپریشنز پر کمر بستہ ہوئے، تو برطانوی حکومت نے انھیں قید کی دھمکی دی۔ مسٹر میک من جس نے اپنے پیسوں سے فاقہ زدگان کو اناج تقسیم کیا کو 'سخت سرزنش کی گئی، ذلیل کرنے کی دھمکی دی گئی، اور فوری طور پر کام بند کرنے کا حکم دیا گیا'۔

ایک چشم دید گواہ، لیفٹینٹ کرنل رونلڈ اوسبورن نے 1877 کی وحشت کے متعلق بڑے دردناک انداز میں لکھا ہے: 'پرانے کنوؤں میں لاشیں لڑھکی پڑی تھیں، کیونکہ اموات اتنی زیادہ تھیں کہ عزیز آخری رسومات ادا نہیں کر سکتے تھے۔ ماؤں نے ایک وقت کے تھوڑے سے کھانے کے لیے اپنے بچے بیچ دیے۔ شوہروں نے اپنی بیویاں تالابوں میں پھینک دیں، تاکہ انھیں طویل بھوک کی اذیت سے مرتے ہوئے دیکھنے کے عذاب سے بچ جائیں۔ موت کے مناظر کے درمیان، حکومتِ ہند نے اپنی طمانیت اور شادمانی میں کمی نہیں ہونے دی۔ [اخبارات] خاموشی پر مائل تھے۔ سویلینز کو سخت احکامات دیے گئے کہ کسی بھی طرح کے حالات میں ایسی ڈھونگی صورت نہیں بنائیں گے کہ سویلین بھوک سے مر رہے تھے'۔

درحقیقت، 78-1877 میں جنوبی ہند کے قحط کے دوران اخراجات سختی سے روکے رکھنے کے ساتھ ساتھ، برطانوی حکومت فکر مند تھی کہ زندگیاں بچانے کے لیے خیراتی عطیات پر انحصار ظاہر نہ ہو۔ جیسا کہ جیورجینا بریوس اسے بیان کرتی ہے: 'جب اگست 1877 میں مدراس کے ممتاز شہریوں، ہندوستانی اور یورپی دونوں نے، برطانیہ میں امدادی فنڈ برائے قحط کے لیے اپیل کی، لٹن نے اسے حکم عدولی کا فعل تصور کیا اور بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر کو ایک خفیہ اشارہ جاتی ٹیلیگرام بھیجتے ہوئے، اس فنڈ کو تیزی سے بند کرنے کے لیے کاروائی کی۔ جب ہندوستانی اور بنگالی پریس میں یہ حرکت لیک ہوئی، تو اس نے شور شرابے کو دعوت دی۔ جیسا کہ اخبارات نشاندہی کرنے میں تیز تھے، لٹن کی مخالفت نے تمام عطیات دینے والوں کو غلط ثابت کر دیا، بشمول ہندوستان کی نئی نامزد شدہ ملکہ اور سابقہ گورنر جنرل کی میزبان کے جس نے برطانیہ میں چندہ کی فہرست کی صدارت کی تھی۔ دی ٹائمز میں ایک لیڈر نے انتہائی تاسف کا اظہار کیا کہ "وائسرائے کو نجی خیرات کی لہر کو کچلنے کے لیے مداخلت کرنا چاہیے تھی" اور "صرف معیشت کو ذہن میں رکھتے ہوئے" امداد برائے قحط کی پالیسی جاری رکھنے کی مذمت کرنی چاہیے تھی۔ آخر کار لارڈ لٹن امدادی فنڈ کو برقرار رکھنے پر مجبور ہو گیا اور خود بھی دس ہزار روپے (1000 پونڈ) عطیہ کیے، ایک علامت جسے اس نے نجی طور پر تسلیم کیا کہ 'بدنیتی' کے ساتھ کی۔ فنڈ جو

پوری برطانوی دنیا سے، افراد، سکولوں، گرجاگھروں اور رجمنٹوں سے لاکھوں چھوٹے چھوٹے امدادی چندے کے ذریعے جمع کیا گیا آخر کار کل 820000 پونڈ تک پہنچ گیا، تاہم، دسمبر 1877 تک، لٹن فنڈ کو 'ایک مکمل مضر شئے' کے طور پر بیان کرتا رہا اور سنگین تنبیہ کی کہ ایک غیر ذمہ دار کمیٹی تمام رقم ضائع کر دے گی۔

اس واقعہ کے بعد ہندوستان میں برطانوی حکومت نے، قواعد بناتے ہوئے اور خیراتی امداد کے مقاصد میں 'قانونی' کا تعین کرتے ہوئے امداد برائے قحط کا اختیار زیادہ رسمی طور پر اپنے ہاتھوں میں لے لیا، بین الاقوامی اپیلوں اور سمندر پار رضاکاروں کی منظوری کا اختیار اپنے پاس رکھا۔ جب اکتوبر 1896 میں ایک نیا قحط پھوٹ پڑا، یہ شکر تھا کہ لٹن عرصہ ہوا جاچکا تھا، تو حکومت نے مصیبت پر ردعمل کی بجائے خود کو قواعد پڑھنے میں مصروف کر لیا۔ یہ صرف تب ہوا جب انگلینڈ میں عوامی رائے کو مزید نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، قحط شروع ہونے اور بے شمار جانوں کے ضیاع کے چار مہینے بعد، آخر کار جنوری 1897 میں ایک بین الاقوامی اپیل کی گئی۔

حتیٰ کہ انیسویں صدی کے اواخر میں 'تہذیبی مشن' کے عروج پر بھی، انگریزوں کے قابلِ تعزیر ہونے کے حقائق، بہت قوی تھے، البتہ دور حاضر کے عذر خواہوں نے اسے خوشنما بنانا جاری رکھا ہوا ہے۔ کوئی، لارنس جیمز، ثبوتوں کو زندہ دلی سے نظر انداز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہندوستان کے برطانوی سامراجی حکمران 'شفیق انسان تھے، اور، ناکافی انتظامی مشنری اور محدود وسائل کی رکاوٹ کے باوجود 'انھوں نے 1870 اور 1890 کے قحطوں کے دوران' فاقہ زدگان کو خوراک مہیا کرنے کی پر عزم کوششیں کیں'۔ اس سلسلے میں واحد ثبوت جو وہ پیش کرتا ہے، یہ ہے کہ 1871 سے 1901 کے دورِ قحط میں، ہندوستان کی آبادی تین کروڑ بڑھ گئی۔ ہندوستان ایک بڑا ملک ہے اور قحط نے ہر جگہ کو متاثر نہیں کیا؛ جن علاقوں میں اس نے (متاثر) کیا، وہاں اثرات بھی تباہ کن تھے اور لاکھوں مارے گئے، جبکہ باقی جگہوں پر زندگی جاری وساری تھی، اور اس کے نتیجے میں ہندوستان کی کل آبادی بڑھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ جہاں قحط نے متاثر کیا وہاں لاکھوں کی تعداد میں لوگ نہیں مرے تھے۔ جیمز کی دلیل کی رو سے، ماؤ کے زیر حکومت چین اور سٹالن کے زیر حکومت سویت یونین کی آبادی میں جو اضافہ ہوا، تو ان دونوں ممالک کی عوامی فاقہ زدگی کی خونی کہانیوں پر بھی اسی طرح جھوٹ ہونے کا الزام لگنا چاہیے۔ قحط زدگی کے سالوں میں اموات اور ناکافی غذائیت بہتر اشاریے ہوتے، مگر جیمز نے ان اعداد و شمار کا ذکر کرنے سے احتراز کیا۔

برطانوی برپا کردہ قحطوں کے واحد شکار صرف انسان ہی نہیں تھے؛ مویشی بھی مرے۔ یہ حیران کن تھا کہ کھال اور چمڑے کی برآمدی تجارت 1859 میں پچاس لاکھ روپے، سے بڑھ کر 1901 میں تقریباً گیارہ کروڑ پچاس لاکھ روپے تک پہنچ گئی، ایک حیرت انگیز اضافہ، خاص طور پر ایک ایسے تمدن میں جہاں گائے کی موت تباہ کن تھی، نہ صرف مذہبی وجوہات سے بلکہ گائے کھیتی باڑی کے لیے بھی ناگزیر تھی، اور ذرائع نقل و حمل میں بھی کام آتی تھی اور دیہی معاشرت میں رتبے کی علامت تھی۔ اتنی زیادہ گائیوں کا مرنا شدید دیہی ابتلا کا پتہ دیتا ہے؛ کسان اپنے مویشیوں کی موت سے زیادہ بدتر کسی چیز سے بہ مشکل ہی واقف تھے، جو ان کے حالیہ امکانات پر کاری ضرب اور ان کے مستقبل کی امیدوں کو تاریک کر دے۔ درحقیقت، کچھ عہدیدار لوگوں سے زیادہ گائیوں کے مرنے کو بدتر سمجھتے دیکھائی دیتے تھے: قحطوں پر ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ 'زراعت پر اس کے اثرات میں [مویشیوں کی اموات] شاید رعایا کی اموات سے زیادہ حساس اور دیرپا بدبختی تھی۔ اصول کے مطابق، جو بھوک سے مرے وہ بوڑھے تھے یا بے یارومددگار، جبکہ صحتمند اور ٹھیک ٹھاک بچ گئے۔ بہر حال اگر مویشی فنا ہوتے ہیں تو کاشتکاری تقریباً ناممکن ہو جائے گی'۔

مویشیوں کے زیاں نے براہ راست زرعی پیداوار کو متاثر کیا، جسے قحط سالی سے پہلے کے لیول پر بحال کرنے کے لیے اگر عشرے نہیں تو کئی سال لگیں گے۔ غریب کسان سب سے زیادہ مصیبت میں مبتلا ہوئے، کیونکہ ان کے وجود کا انحصار ہمیشہ معاشی نمو پذیری کے آخری سرے پر ہوتا تھا، لیکن سرکاری امدادی پالیسیوں میں ان کے ڈھور ڈنگر کے نقصان کی تلافی نہیں کی گئی، جو مدد کے لیے 'صحت مند' مویشیوں کے ہدف کو ترجیح دیتی تھیں، عمومی طور پر ان کے مویشیوں کو جو انھیں بہتر خوراک مہیا کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔ حتیٰ کہ جب قحط سالی کے دوران 'مویشی کیمپ' بنائے گئے، تو مقصد یہ تھا کہ ان کے اخراجات کم سے کم رکھے جائیں اور زیادہ تر اخراجات خیراتی چندے سے حاصل کیے جائیں۔ حالانکہ 1899 سے 1900 کے قحط کے دوران بمبئی پریزیڈینسی میں نو کیمپ قائم کیے گئے، مثلاً، انھیں چلانے پر اٹھنے والی 75 فیصد لاگت حکومت نے وصول کرلی۔ مالیاتی پیش بینی مستقل طور پر 'انسان دوستی کے مکر' کا بگل بجا رہی تھی۔ ہندوستانی زیادہ فیاض ثابت ہوتے جب وہ خود قحط میں مبتلا نہ ہوتے، اور 'ملکی خیرات' عموماً مویشیوں کے بچاؤ کے لیے دستیاب ہوتی، جس میں عموماً گاؤں کے زمیندار کی امداد شامل ہوتی تھی، جو اپنے لوگوں اور ان کی گائیوں کو بچانے کے لیے جو بھی امداد دے سکتا، وہ مہیا کرنا اپنا سماجی فریضہ سمجھتا تھا۔

یہ بھی سبق آموز ہے کہ، برطانوی ہند کے دور سے پہلے درپیش چیلنجوں میں سے ایک __ اشیاء خورد و نوش کو بہتاب والے علاقوں سے قلت والے علاقوں میں لے جانے کے لیے مناسب انتظامی ڈھانچے اور ذرائع نقل و حمل کی کمی کا تھا، جس کا حوالہ فلورنس نائٹنگیل نے قحطوں کی بڑی وجوہات کے طور پر دیا تھا __ جو کہ ریلوے کی آمد کے بعد برطانوی ہند کے لیے غیر متعلق ہو چکا تھا۔ اور ہزاروں میل کی ریلوے لائن بچھانے کے بعد بھی انیسویں صدی کی بدترین قحط سالی وقوع پذیر ہوئی۔ اس سے زیادہ جھلسا دینے والا ثبوت نہیں ہو سکتا قحطوں کی ذمہ داری صاحبانِ اقتدار اور ان کی پالیسیوں پر عائد ہوتی تھی۔

حتیٰ کہ جیسے تاجِ برطانیہ نے ہندوستانیوں کو ناکام بنایا، برطانیہ میں چند حلقوں میں ہندوستان کے کشکول میں چمکتے سکے ڈال کر فیاض سرپرست نظر آنا ایک فیشن بن گیا۔ روزنامہ میل نے 1897 میں اعلان کیا کہ 'یہ ہمارے ذمے ہے کہ بھوک کی آسیب زدہ افواج سے اپنی سلطنت کا دفاع کریں... ہمارا ہتھیار بہت کھرا برطانوی روپیہ ہے'۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اسی سانس میں ہندوستانی خیرات کو رد کر دیا گیا۔ معاملہ یہ نہیں کہ برطانویوں نے کیسے اس سے سروکار رکھا، سچ تو یہ تھا، جہاں حکومت کی کوتاہی اس کی فیاضی سے عمل کرنے کی سرکاری ہچکچاہٹ کے ساتھ مرکب تھی، وہیں یہ ہندوستانی تھے جنھوں نے قحط کے دوران زیادہ تر امدادی کوششیں منظم کیں۔ بکھرے ہوئے ہندوستانیوں نے برطانوی نوآبادیات میں جمع ہونے والے چندے میں اچھی خاصی رقوم عطیہ کیں: مثلاً، مہاتما گاندھی نے 1897 اور 1900 میں ہندوستانی قحطوں کے لیے جنوبی افریقہ میں چندوں کا اہتمام کیا۔ ہندوستان میں غافل اور ناموافق برطانوی حکومت کی چھوڑی ہوئی خالی جگہ پُر کرنے کے لیے بہت سی ہندوستانی امدادی تنظیمیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ غریبوں کے لیے باورچی خانے، یتیم خانے، سستے غلے کی دکانیں، اور غریبوں کے گھر، قحط کے دوران ہندوستانی عطیہ دہندگان نے تعمیر کیے۔ متعدد غیر سرکاری تنظیموں، انجمنوں اور سبھاؤں کے ساتھ ساتھ اصلاح پسند مذہبی سوسائٹیز جیسا کہ آریا سماج، برہمو سماج اور رام کرشن مشن نے امدادی کاموں کو سیوا کا طریقہ سمجھا اور سرکاری امدادی کوششوں میں کوتاہیوں کی تلافی کے لیے عزم کے ساتھ کام کیا۔

ابتلاء کے انسانی شکاروں سے بے اعتنائی ایک طرف، ہندوستان میں امداد برائے قحط، نے نوآبادیاتی طرزِ حکومت کی ایک اور منفی خصوصیت آشکار کر دی __ اپنی ہی حدود و قیود اور بدانتظامی کو دانشمندانہ پالیسی کے روپ میں پیش کرنے کی اپنی اہلیت کو تسلیم کرنے پر رضامند نہیں تھے۔ برطانویوں کا میلان تھا کہ اپنی امدادی

کارروائیوں کی مجہولیت اور ماندگی کو شماریاتی صحت کی بہت زیادہ نمائش سے آراستہ کرتے، جیسے یہ یقین دہانی کروانا چاہتے تھے کہ اعداد کے ان کی انگلیوں کے پوروں پر ہونے سے، معاملات اچھی طرح ان کے کنٹرول میں آچکے تھے۔

ایک ایسی ہی مثال جس کے متعلق ایک محقق کہتا ہے کہ 'قحط پر مباحث میں 'اعداد و شمار کی فصاحت' کو ایک آلے کے طور پر استعمال کرنے کے حوالے سے، اس وقت کے ہندوستان کے سیکرٹری آف سٹیٹ لیوپولڈ امیرے کی ایک عرضداشت سے بھانپا جاسکتا ہے، جو (اس نے) بنگال قحط کے متعلق 1943 میں دارالعوام کے ممبران کو لکھی، جس میں اس وقت تک نفیس لارڈ امیرے کے بقول تیس لاکھ کے قریب جانیں ضائع ہوچکی تھیں۔ امیرے نے ہندوستان کی آبادی میں نمایاں اضافے کا موازنہ اشیاء خورد و نوش کی پیداواری قیمتوں میں عمومی کمی کے ساتھ کیا: 'پچھلے بارہ سالوں میں ہندوستان کی آبادی میں تقریباً چھ کروڑ کا اضافہ ہوچکا تھا، اور یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ بنگال میں پچھلے تیس سالوں میں چاول کی فی کس سالانہ پیداوار 384 پاؤنڈ سے 283 پاؤنڈ تک گر چکی تھی'۔ برطانویوں نے اپنی بھرپور کوشش کی لیکن مالتھیوسین بلائے ناگہانی کو ٹال نہیں سکے۔ امیرے دارالعوام میں اکثر اوقات اعداد و شمار سے رجوع کرتا تھا؛ ایک مرتبہ دسمبر میں ہسپتال میں داخلوں اور اموات کے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے، اس انتباہ کا اضافہ کیا کہ چند اموات شاید فاقہ زدگی کی وجہ سے نہ ہوئی ہوں۔ اکثر و بیشتر، حکومت کے پیش کردہ اعداد و شمار کی صحت اور قیاس کردہ ذمہ لیے گئے امدادی اقدامات کے مؤثر ہونے کے درمیان، ایک نسبت معکوس (انورس کوریلیشن) ہوتی۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، جس وقت تک یہ ختم ہوا، تقریباً چالیس لاکھ بنگالی 1943 کے قحط میں فاقہ زدگی سے مارے جاچکے تھے۔ ونسٹن چرچل کے مکروہ کردار کے لیے کوئی بھی عذر نہیں ہوسکتا، جس نے اشیاء خوردنی کا رُخ، فاقہ زدہ ہندوستانی سویلینز سے بہتر رسد کے حامل برطانوی فوجیوں کی طرف موڑنے اور حتیٰ کہ یونان اور دوسری جگہوں پر یورپی ذخیروں کو بھرنے کا دانستہ حکم دیا۔ اس نے دلیل دی 'بہرحال بھوک کے شکار بنگالیوں کی فاقہ زدگی کم سنگین تھی' بہ نسبت ان 'قوی الجثہ یونانیوں' کے۔ برطانیہ میں، ٹامیوں کے لیے اناج، وطن میں کھپت کے لیے روٹی (دو کروڑ ستر لاکھ ٹن درآمد کردہ اناج، وحشیانہ طور پر حد سے بڑھی ہوئی مقدار)، اور یورپ میں وافر فاضل سٹاک (اُس یونان اور یوگوسلاویہ کے لیے جنھوں نے ابھی آزاد ہونا تھا،) چرچل کی یہ ترجیحات تھیں، نہ کہ اس کی ہندوستانی رعایا کی زندگی یا موت۔ جب اسے اس کی بھینٹ چڑھنے والوں کی مصیبت بارے

یاد دلایا گیا تو اس کا ردِ عمل بالکل چرچیلین تھا: اس نے کہا، قحط ان کی اپنی غلطی ہے، 'خرگوش کی طرح اپنی نسل بڑھاتے ہیں'۔ جب باضمیر افسران نے وزیرِاعظم کے نام، اس کے فیصلے کے باعث ہونے والے المیہ کی شدت کی نشاندہی ایک ٹیلگرام میں کی، تو چرچل کا واحد ردِ عمل تند خوئی کے ساتھ یہ پوچھنا تھا: 'گاندھی ابھی تک کیوں نہیں مرا؟'

جیسا کہ مدھوسری مکھرجی کی بنگال قحط بارے بڑی جامعیت سے لکھی ہوئی سرگزشت یہ ظاہر کرتی ہے، ہندوستان کا اپنا فاضل اناج سیلون کو برآمد کیا گیا؛ آسٹریلوی گندم ہندوستان کے شہروں کے قریب سے تیزی سے جہازوں کے ذریعے گزار کر (جہاں فاقہ زدگی سے مرنے والوں کی لاشیں گلیوں میں بکھری پڑی تھیں) میڈیٹرینین اور بلکان کے ذخیرہ گوداموں میں لے جائی گئی، آئندہ کے ذخائر بنانے کے لیے جو مابعد جنگ برطانیہ کے اوپر دباؤ کم کر سکیں اور اشیائے خوردنی کی امریکی اور کینیڈین پیشکش ٹھکرا دی گئی۔ نوآبادی کو خالص اپنے ذخائر استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، یا درحقیقت اشیائے خوردنی درآمد کرنے کے لیے اپنے جہاز استعمال کرنے کی۔ حتیٰ کہ طلب و رسد کا قانون بھی کوئی مدد نہیں کر سکا: کسی بھی جگہ اپنے فوجی دستوں کی رسد کو یقینی بنانے کے لیے، برطانوی حکومت نے ہندوستانی اوپن مارکیٹ میں اناج کے لیے زیادہ قیمتیں ادا کیں، یوں عام ہندوستانیوں کے لیے اسے ناقابلِ استطاعت بنا دیا۔

بنگال قحط کے دوران برطانوی عہدیداروں اور وزیروں کے کردار سے، ایک تصویر تشکیل پاتی ہے جو کہ سلطنت کے اخلاقی جواز کے لیے آخری چیتھڑا بھی اتار پھینکتی ہے۔ زمانہ جنگ میں برطانیہ کے کیے گئے مالیاتی انتظامات اور جنگی کوششوں کے لیے ہندوستانی رسد نے جس طرح سے قحط کے حالات پیدا کیے؛ سیکرٹری آف سٹیٹ امیرے اور خود پسند چرچل، جس کا جنگی جنون نوآبادیاتی معیشت جیسے افسردہ معاملات پر چھا چکا تھا، کے درمیان مراسلت، چرچل کے قابلِ تقصیر ماتحت، پے ماسٹر-جنرل، لارڈ چرول کی اخلاق سے عاری نسل پرستی، جس نے ہندوستان کو امداد برائے قحط سے محروم رکھا اور اکثر ایسے لاجسٹک فیصلوں کی سفارش کی جن سے بہت سی جانوں کا نقصان ہوا ___ یہ سب دو صدیوں کے نوآبادیاتی مظالم کا نقطۂ عروج تھا۔ واحد فرق یہ تھا کہ، اس سے پہلے ہونے والے درجنوں بے ڈھب قحطوں کی نسبت، 1943 میں برطانوی بے رحمی اور نسل پرستی کی شہادت کہیں بہتر طریقے سے دستاویزی شکل میں محفوظ کی گئی۔

میں نے قحطوں پر اتنی طویل بات اس لیے کی ہے کیونکہ یہ برطانوی نوآبادیاتی ناجائز رویے کی انتہائی

نمایاں مثال پیش کرتے ہیں۔ کسی ایسی وبائی بیماری کا حوالہ بھی دیا جا سکتا تھا، جس نے ہندوستانیوں کو مسلسل برطانوی حکمرانی کے ماتحت ارزاں کیے رکھا جبکہ صاحبان اختیار لاچاری سے ساتھ کھڑے رہے۔ بیسویں صدی کے صرف پہلے چار سال لے لیں، جیسا کہ ڈیورانٹ نے کیا؛ 1901 میں دو لاکھ بہتر ہزار طاعون سے مارے گئے، 1902 میں پانچ لاکھ، 1903 میں آٹھ لاکھ اور 1904 میں دس لاکھ، شرحِ اموات ہر سال بڑھتی گئی۔ 1918 میں سپین میں انفلوئنزا وباء کے دوران بارہ کروڑ پچاس لاکھ فلو کے کیس ریکارڈ ہوئے (آبادی کے تیسرے حصے سے زیادہ) اور ہندوستان کی شرح اموات کسی بھی مغربی ملک سے زیادہ تھی: ایک کروڑ پچیس لاکھ لوگ مارے گئے۔ جیسا کہ امریکی سیاستدان (اور تین دفعہ ڈیموکریٹک صدارتی امیدوار) ولیم جیننگز بریان نے نشاندہی کی، بہت سے برطانوی طاعون کے باعث ہونے والی اموات کو 'گنجان آبادی کے لیے معجزانہ علاج' کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ بریان نے کہا، یہ مضحکہ خیز تھا کہ برطانوی حکمرانی کا جواز ان بنیادوں پر تراشا جا رہا تھا کہ 'یہ لوگوں کو ایک دوسرے کو قتل کرنے سے روکتی ہے، اور طاعون کی مدح سرائی کی جا رہی تھی کیونکہ یہ انھیں ختم کر رہا تھا جنھیں حکومت نے کشت و خون سے بچایا تھا!'۔

دلیل کے طور پر، وبائیں نوآبادیاتی دور سے پہلے بھی موجود تھیں، اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نوآبادیاتی پالیسی کی وجہ سے ہوئیں یا (اس وجہ سے) بدتر ہوئیں؛ لہٰذا، میری دلیل کے منشاء کے مطابق، وہ قحطوں کے ساتھ قابل موازنہ نہیں ہیں۔ لیکن ان کا مستقل رہنا، اور المناک انداز میں بڑھی ہوئی انسانی شرح جس کا وہ تقاضا کرتی تھیں، اب بھی ہندوستانیوں کی ابتلاء سے اغماض برتنے پر برطانوی راج کو چلانے والوں پر کڑی فرد جرم عائد کرتی ہیں۔ یہ سب حرف بہ حرف درست ہے کیونکہ 'سرکاری شعبہ صحت میں قلمبند کی گئی اصلاحات' کا حوالہ عام طور پر ہندوستان میں برطانوی راج کے حامیوں کی جانب سے دیا جاتا ہے۔ اس دعویٰ کے لیے کوئی خاص شہادت فراہم نہیں کی گئی، اس کی زیادہ تر بنیاد ملیریا کے علاج کی دوا کونین (حالانکہ اس کا بنیادی استعمال اس ٹانک کے ساتھ تھا جس میں برطانوی جنگلوں میں اپنی چوکیوں میں غرق رہتے اور اپنی 'جن' کا جواز تراشتے)، چیچک کے لیے ویکسینیشن کے سرکاری پروگرامز (اتنے ناکافی تھے کہ یہ آزادی کے فوری بعد ہوا کہ آزاد ہندوستان نے اس آفت کا ملک سے قلع قمع کیا)، اور پانی کی سپلائی میں بہتری (درحقیقت، اتنے بے مصرف طریقے سے کیا گیا، کہ ہیضہ اور پانی سے وابستہ دوسری بیماریاں راج کے پورے دور کے دوران مسلسل موجود رہیں) متعارف کروانے پر رکھی جاتی ہے۔ یہ تکلیف دہ تھا کہ پورے ملک میں کہیں بھی راج کے قائم کردہ بڑے

ہسپتال نہیں تھے: حیران کن طور پر، برطانوی ہند کا ہر ایک اہم جدید میڈیکل ادارہ ہندوستانی عطیات دینے والوں کی فیاضی سے قائم ہوا، اگرچہ، قابلِ فہم وجوہات کی بنا پر، اکثر ہندوستانی عطیات دہندگان اپنے ہسپتالوں کو بھی برطانوی نوآبادیاتی منصب داروں کا نام دیتے۔

جبری ہجرت: ٹرانسپورٹیشن اور معاہداتی مشقت

برطانوی سلطنت میں، عقوبتی نوآبادیات کو بھجوانا ایک ترجیحی طریقہ بن گیا، جس سے انگلینڈ کے پرہجوم قید خانوں کے ساتھ نمٹنے کے ساتھ ساتھ کم گنجان آباد نوآبادیات کو افرادی قوت کی سپلائی یقینی بنائی جاتی رہی۔ حکومت کی طرف سے انتظام کردہ، مجرم مزدوروں کا بہاؤ، جلد ہی جزائر غرب الہند اور امریکی نوآبادیات میں معاہداتی مزدوروں کی نجی طور پر کنٹرول کردہ تجارت میں ضم ہو گیا۔ اس پالیسی کا اطلاق ہندوستان پر بھی ہوتا تھا۔

ہندوستانی مجرموں کو 1787 سے ہی منتقل کیا جاتا تھا، شروع میں جنوب مشرقی ایشیا کی عقوبتی نوآبادیات کو، خاص طور پر سماٹرا میں بینکولن کو (1787 سے 1825، جب برطانویوں اور ولندیزیوں نے بینکولن کا ملاکا کے ساتھ ادل بدل کیا تاکہ بالترتیب ملائشیا اور انڈونیشیا پر قبضے کو یکجان کر لیں) پینَنگ، بصورت دیگر پرنس آف ویلز کے جزیرے کے طور پر جانا جاتا تھا (1790 سے 1860)، ماریشیس (1815 سے 53)، ملاکا اور سنگاپور (1825 سے 60)، اور اراکان کا برمی صوبہ اور تیناسرم (1828 سے 62)۔ اس وقت تک وہ زیادہ تر انفراسٹرکچر کی تعمیر کے منصوبوں پر کام کر رہے تھے، ہندوستانی مجرموں کی طلب بہت زیادہ تھی، خاص طور پر، آبنائے کی آبادکاریوں میں سب سے زیادہ تیزی سے ترقی کرتے ہوئے سنگاپور میں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ترنگ میں انھیں 'ہندوستانی نباتات کے مطالعے کی کھاڑی' کہا جاتا۔ ہندوستانی سزایافتہ مزدور، تمام سرکاری منصوبوں میں کم اجرت مزدوروں کے طور پر کام کرتے تھے، پینَنگ کی کامیاب نوآبادیت کے لیے وہ انتہائی اہم تھے۔ 1852 اور 1854 کے دوران، جب خطے میں مزدوری کی لاگت میں ایک اندازے کے مطابق 30 فیصد اضافہ ہو گیا، تو کمپنی کی حکومت نے کھاڑی کی آبادکاری میں، سرکاری تعمیراتی کاموں کے لیے تقریباً مکمل طور پر ہندوستانی مجرم مزدوروں پر انحصار کیا۔ 1825 سے 1872 کے دوران، سنگاپور میں تمام تعمیرات عامہ کے منصوبوں کے لیے افرادی قوت کا زیادہ تر حصہ ہندوستانی مجرموں پر مشتمل تھا۔

ہندوستانی سزا یافتہ ___ اور اس اصطلاح میں معمولی جرائم، چوری سے لے کر قرض داری تک میں ملوث (افراد) کو بھی شامل کیا گیا تھا ___ جنھیں ماریشیس منتقل کیا گیا، جب ایک دفعہ نپولیائی (نیپولینیک) جنگوں میں برطانویوں نے فرانسیسیوں سے جزیرہ لے لیا، اگرچہ 1829 میں ان کا ابتدائی ٹاکرا کامیاب نہیں تھا۔ ماریشیس کی شجرکاری کی معیشت زیادہ تر غلامی پر چلتی تھی، لیکن مزدوری کا بحران جو غلامی کے خاتمے کے فوری بعد آیا، ہندوستان سے مزدوروں کی طلب کا باعث بنا، اور برطانویوں نے 1834 میں از سر نو انھیں جہازوں میں بھر کر لانا شروع کر دیا۔ 1838 تک پچیس ہزار ہندوستانی پہنچ چکے تھے؛ غلامی مخالف تحریک چلانے والوں کی وجہ سے، ایک مختصر پابندی لگی، 1839 سے 42 تک ہندوستان سے نقل مکانی رک گئی، لیکن یہ ختم کر دی گئی، اور 1843 میں عہدیداروں نے رپورٹ کیا کہ 30218 مرد اور 4307 عورتیں، معاہداتی تارکین وطن کے طور پر ماریشیس میں داخل ہوئے ہیں۔ اپنی معاہداتی غلامی کی مدت کے بعد وہیں رہنے کے لیے، مزدوروں کی ہمت بڑھانے کے لیے عورتوں کو ضروری سمجھا جاتا تھا۔ 1868 تک، قوانین نے خواتین تارکین وطن کے حصے میں اضافہ کر دیا، کم از کم سو مردوں کے مقابل چالیس عورتیں۔

تقریباً پانچ لاکھ مزدوروں کو اقرار نامے کے نظام کے تحت معاہداتی مشقت کے لیے، ہندوستان سے ماریشیس منتقل کیا گیا؛ بہت سے سزا یافتہ تھے، لیکن دوسرے رضاکارانہ طور پر آئے تھے، اگرچہ ان کی مرضی بعض اوقات جبر کے ذریعے حاصل کی جاتی تھی۔ ایک محقق کے الفاظ میں، 'اگرچہ مزدور غالب طور پر غلام، شاگرد یا معاہداتی تھے، لیکن محبوس رکھنا ایک وسیع عمل کا حصہ تھا جس کے ذریعے نو آبادیاتی افرادی قوت کے ضوابط، نجی حلقے سے لے کر سرکاری حلقے میں شامل کر دیے گئے'۔

ہندوستانی سرزمین کے قریب انڈمان جزائر میں ایک عقوبتی کالونی بنانے کی کوشش شروع کی گئی، لیکن پہلی کوشش کامیاب نہ ہو پائی اور 1796 میں سات سو سزا یافتہ لوگوں کو انڈمان کے عقوبتی بندوبست سے پینَنگ منتقل کر دیا گیا۔ ایک دفعہ جب 1860 میں آبنائے کی آبادکاری کو برطانوی ہند سے علیحدہ کر دیا گیا، اگر انگریز ہندوستانی مجرموں کی منتقلی جاری رکھنا چاہتے تھے تو ان کے پاس کوئی دوسری صورت نہیں تھی، ماسوائے کہ عقوبتی بندوبست کو دوبارہ ترقی دی جائے، جو وہ 1858 کے بعد کر پائے، جلد ہی انڈمان ان ہندوستانیوں کے لیے ترجیحی مقام بن گیا جنھیں برطانوی سیاسی طور پر شر انگیز سمجھتے تھے۔

آبنائے کی آبادکاری اور ماریشیس سے ہٹ کر، مفلوک الحال ہندوستانیوں کو معاہداتی مشقت کاروں کے

طور پر پوری دنیا میں دوسری برطانوی نوآبادیات میں بھی بذریعہ بحری جہاز بھجوایا جاتا تھا، گایانا اور جزائر غرب الہند سے لے کر جنوبی افریقہ اور بحرالکاہل میں فجی تک۔ تقریباً انیس لاکھ سے پینتیس لاکھ ہندوستانی (مختلف ماخذوں میں تعداد مختلف ہے، جس کا انحصار اس پر ہے کہ شمار کون کر رہا ہے) پوری دنیا میں دور دراز ممالک تک گئے، زیادہ تر بغیر کسی قصد کے، نوآبادیاتی منصوبے کے تحت۔

انھوں نے سامراجی مشینری کی گراریوں کے دندانے کے طور پر کردار ادا کیا، گنے کی کاشت، سڑکیں اور عمارتیں بنانے اور جنگل صاف کرنے پر جانفشانی سے محنت کی۔ بعض بربادی کے سفر میں بڑے ہولناک طریقے سے متاثر ہوئے، اور کچھ سفر کے دوران مارے گئے؛ اور دوسروں نے مفلسی جھیلی۔ پروفیسر چارلس اینڈرسن کی حالیہ تصنیف نے دہشت کی شدت کو ثابت کیا ہے: صرف ایک سال میں 1856 سے 1857، اور ایک روٹ، کلکتہ سے ٹرینیڈاڈ پر، ٹرانسپورٹی جہازوں پر معاہداتی مزدوروں کی اموات کی فی صد شرح ہولناک حد تک پہنچ گئی تھی: تمام مردوں میں 12.3 فیصد، عورتوں میں 18.5 فیصد، لڑکوں میں 18 فیصد اور لڑکیوں میں 36 فیصد مارے گئے، جب کہ الم ناک انداز میں شیر خوار بچوں میں 55 فیصد۔ مسلمہ طور پر تکلیف دہ موازنہ کرنے کے لیے، بدنام زمانہ 'درمیانی راستے (مڈل پیسیج)' پر غلاموں کی اموات ایک اندازے کے مطابق 12.5 فیصد تھی۔ برطانوی جہازوں پر جزائر غرب الہند کو لائے گئے ہندوستانی معاہداتی مزدور ہونے کے لیے زندگی اور موت کی لاٹری میں شامل ہونا پڑتا تھا جس میں آپ کے بچنے کے مواقع بیڑیوں میں بندھے افریقی غلاموں سے بھی بدتر تھے۔

گو کہ اس المناک تجربے کا تمدنی نتیجہ، غلامی پر آمادہ اور معاہداتی مزدوروں کے مابین ایک مشترکہ دلگیر تعلق کی تخلیق تھا۔ 'کشتی کا بھائی چارہ' شاعری، مشترکہ فوک کہانیوں اور سب سے بڑھ کر موسیقی کا موضوع بنا، جو آج تک موجود ہے۔

یہاں تک کہ وہ تمام لوگ جنھیں منتقل کیا گیا، ہندوستان واپسی، یا اپنے خاندان جنھیں وہ پیچھے گھروں میں چھوڑ کر آئے تھے سے رابطے کی امید کھو بیٹھے۔ حالانکہ بہت سے معاہداتی مزدوروں کو پانچ سال کی کفیلی مزدوری (بانڈڈ لیبر) کے بعد گھر واپسی کا حق حاصل تھا، لیکن یہ زیادہ تر تھیوریٹیکل تھا اور اگر تھا بھی تو محض چند ایک کو یہ حق استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ (ضوابط میں شاطرانہ چالیں تھیں، جیسا کہ اگر اصل معاہدے کے ختم ہونے کے چھ ماہ کے اندر دعویٰ نہ کیا گیا، تو حق ضبط کر لیا جائے گا، یا ایک کڑا اور ناقابل استطاعت کرایہ سفر

کے لیے لیا جائے گا، بہت سوں کی حوصلہ شکنی بھی کی جاتی۔) چند ایک __ منتقل ہونے والے ہندوستانیوں کی ایک چھوٹی سی اقلیت __ بارے کہا جا سکتا ہے کہ کامیابی سے لوٹ آئی، لیکن 1868 میں جزائر غرب الہند میں سینٹ کروئیکس کے جزیرے کو جانے والے بد قسمتوں سے بھرے ہوئے جہاز سے مٹھی بھر بچ کر ہندوستان لوٹنے والوں کے صرف ایک ہی کیس سے میں واقف ہوں، ان کی اکثریت جہاز پر ہی ماری گئی۔

ایک اندازے کے مطابق 1519 سے 1939 کے عرصے میں، ترپن لاکھ لوگ، جنھیں محققین نفاست کے ساتھ 'غیر آزاد تارکین وطن' کا لقب دیتے ہیں، کو برطانوی جہازوں پر لے جایا گیا، جن میں سے اٹھاون فیصد غلام، جو زیادہ تر افریقہ سے تھے، چھتیس فیصد معاہداتی مزدور، جو زیادہ تر ہندوستان سے تھے، اور چھ فیصد سزا یافتہ منتقل کیے گئے لوگ، جو ہندوستان اور دوسری نوآبادیات دونوں سے تھے۔ اگر کچھ اور نہیں، تو یہ برطانوی دوڑ دھوپ بھی، ہمیشہ کی طرح، نوآبادیاتی پراجیکٹ کی سادہ ہنگامی ضرورتوں سے تحریک پاتی تھی، جس نے در جنوں ممالک کی آبادی کے اعداد و شمار (ڈیمو گرافی) کی ہیئت کے ساتھ نتائج بھی بدل ڈالے، جن کا مشاہدہ آج بھی کیا جا سکتا ہے۔

سزا یافتہ اور دوسرے جنھیں منتقل کیا گیا ان سے ہٹ کر، بہت سے رضا کارانہ نوکری کرنے والوں نے بھی کمپنی کی حکومت کے زیر اثر اپنی معاشی بد حالی کے نتیجے میں معاہداتی بیگار پر دستخط کیے؛ ہزاروں ہندوستانی کسانوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا اور افیون کی کاشت کے لیے ان کی زرخیز زمینوں پر قبضہ کر کے انھیں نقل مکانی پر مجبور کیا گیا۔ 1857 کے غدر کے نتیجے میں، برطانوی سنگدلانہ انتقامی کارروائیوں سے بھاگے ہوئے کچھ سابقہ سپاہی اور رنگروٹ تھے۔ (برطانویوں کو اس سے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا تھا، ان کے لیے باغی، 'مجرم' اور وہ جو غربت سے بچنا چاہتے تھے، سب یکساں تھے۔) نیل فرگوسن نے اس انتہائی تکلیف دہ اور انتشار انگیز نقل مکانی کو 'سستے اور ممکنہ طور پر کم روزگار کے حامل ایشیائی مزدور طبقے کو ربڑ اگانے اور سونا نکالنے کے لیے متحرک کرنے کے عمل' کے طور پر رد کیا ہے۔ شاید ایک زیادہ انسانی نقطہ نظر ہندوستانی ناولسٹ امیتاو گھوش نے پیش کیا ہے، جس نے لکھا کہ گنگا کے میدانوں سے کسانوں کی نقل مکانی 'ایسے تھی جیسے تقدیر نے زمین کے زندہ گوشت کے ذریعے گھونسہ رسید کیا ہو تاکہ اپنے گھائل دل کا ایک ٹکڑا کاٹ ڈالے'۔ بربادی اور ناامیدی کے مناظر کے درمیان لوگوں کو ان کے گھروں سے اچانک علیحدہ کرنا ایک ایسا جرم تھا جو آنے والی نسلوں کے لیے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی تاریخ پر منڈلاتا رہے گا۔

(برو ٹش) حیوانیت کا راج

برطانوی سامراج نے لمبے عرصے تک اس مکر کے ساتھ یہ عذر پیش کیا کہ یہ روشن خیال استبدادی حکومت ہے، جو محکوم لوگوں کے مفاد کے لیے بنائی گئی تھی۔ 1943 کے موسم گرما اور خزاں میں چرچل کے غیر انسانی رویے نے اس داستان کو جھوٹ ثابت کر دیا۔ لیکن دو صدیوں تک یہ پہلے ہی لگاتار ضربیں لگاتا رہا تھا: برطانوی سامراج بڑے پیمانے پر صرف فتوحات اور دھوکے سے غالب نہیں آیا تھا بلکہ، جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، اختلاف رائے کو سنگدلی سے کچل کر، باغیوں اور فرار ہونے والوں کو سولی چڑھا کر، اور ماہر جولاہوں کے انگوٹھے کاٹ کر تاکہ وہ عمدہ کپڑا نہ بنا سکیں جس سے برطانوی صنعتکاروں کا بے ڈھنگا پن ظاہر ہوتا تھا۔ 1857 کی بغاوت کا انسداد انتہائی درندگی کے ساتھ کیا گیا، سینکڑوں باغیوں کو توپ کے دھانے سے ٹکڑوں میں اڑا دیا گیا یا سرعام سولی پر لٹکا دیا گیا، عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا (بدلے میں ہوئے برطانوی عورتوں اور بچوں کے قتل کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا) اور ایک لاکھ سے زائد زندگیاں ضائع ہوئیں۔

بہت سے لوگوں کو 'برطانوی درندگی' تضاد بیانی لگے گی: بہر حال، انگریز، مروت، معاملے کی شدت کی کم بیانی اور استہزاء کے لیے ضرب المثل تھے۔ انھوں نے ذہانت سے فتح کیا، نہ کہ بندوق سے۔ یقیناً انھوں نے ہندوستان کے ساتھ ویسا سلوک نہیں کیا جیسا خونخوار بیلجیئم والوں نے کانگو کے ساتھ کیا؟

انھوں نے کیا۔ ہر وقت نہیں، کنگ لیوپولڈ کے اخلاق سے عاری قاتلوں کی تسلسل سے مرتب کردہ جھیلی جانے والی اور غیر انسانی درندگی کے ساتھ نہ سہی، لیکن وہ اس بنیادی اصول سے مستثنٰی نہیں تھے کہ سامراج خود کو وحشیانہ طاقت کے ذریعے پھیلاتا ہے۔ مورخ جان ولسن کا کہنا ہے کہ 'اکثر اوقات، برطانوی سامراجی انتظامیہ کی سرگرمیاں سوچے سمجھے منصوبوں کی بجائے ناقابل فہم جذبات کے ذریعے طے کی جاتی تھیں۔ طاقت شاذو نادر ہی مؤثر ہوتی تھی۔ پُر تشدد طاقت پر اصرار عموماً کسی خاص تجارتی یا سیاسی مفاد کا تقاضا بڑھا دیتا تھا'۔

درندگی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملٹری مہم جوئیوں کی ابتدائی خصوصیت تھی۔ مؤرخین برطانویوں کی ابتدائی بدطینتی کو 'مقامی سماج کے ساتھ مضبوط تعلقات کی غیر موجودگی میں، ان کے عدم تحفظ اور اپنا راستہ بنانے کی عدم صلاحیت، اور تذلیل کی پیچ حرکتوں کے ذریعے طاقت منوانے' سے منسوب کرتے ہیں۔ (ایسی بدسلوکی 1721 کے انجینگو قتل عام پر منتج ہوئی، جب نئر جنگجوؤں نے، اپنی عزت پر بار بار کے حملوں کے بعد، مشتعل ہو

کر، متعدد برطانوی سپاہی اور کمپنی کے افراد کو قتل کر دیا۔) ارتکاب جرم کرنے والوں کو سزا دی گئی، اور برطانویوں نے اپنی برتر تشدد کی طاقت کو دوگنا کر دیا۔ مستقل مالیخولیا (پیرانویا) نے مذاکرات کی جگہ طاقت کو ترجیح دینے پر اکسایا، ہر طرح کے حالات میں جواز گھڑنا چاہا۔ 1790 میں انگریز افسران میں سے ایک نے تجنور کے راجہ کے خلاف مہم کے دوران کمپنی کونسل کو رپورٹ پیش کی: 'میں صرف انتقامی کارروائی کے ذریعے [مزاحمت پر قابو پا] سکتا ہوں، جو مجھے مجبور کرے گی کہ لوٹ مار اور دیہاتوں کو جلاؤں، ان میں موجود ہر شخص کو قتل کروں، اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالوں۔ یہ وہ کارروائیاں ہیں جو اس نوعیت کی جنگ کا تقاضا ہوں گی'۔

جب 1806 میں ویلور بغاوت ہوئی، جو کمپنی کے ہندوستانی سپاہیوں کی یونیفارم کی تبدیلی سے بھڑکی، جو کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے لیے ناگوار تھی، برطانویوں نے اسے بے رحم درندگی کے ساتھ کچل ڈالا۔ تین سو (کچھ نسخوں کے مطابق تین سو پچاس) باغیوں کو اکٹھا باندھ کر، اور فائیوز کورٹ کی دیوار کے سامنے کھڑا کر کے، تیس گز کے فاصلے سے گولی مار دی گئی؛ اور حتیٰ کہ یہ کسی سمری ٹرائل یا انھیں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیے بغیر ہوا۔ باقیوں کے ایک رسمی کورٹ مارشل کے بعد، چھ باغیوں کو توپ کے دھانے سے اڑا دیا گیا، پانچ کو فائرنگ سکواڈ نے گولی مار دی، آٹھ کو پھانسی دے دی گئی، اور پانچ کو عقوبتی نوآبادی میں بھجوا دیا گیا۔

ہزاروں باغیوں کو 1857 کے انقلاب کے دوران انھیں طریقوں سے مار دیا گیا، جس طرح دونوں جنسوں کے سویلینز کی ایک بڑی تعداد کو۔ جنرل جیمز جارج سمتھ نیئل، خاص طور پر الہ آباد اور کانپور میں خون کے پیاسے تھے، جیسا کہ سر ہوغ روز، جھانسی میں، جہاں پانچ ہزار کے قریب سویلینز کو قتل کیا گیا، شجاع رانی لکشمی بائی کے باغی شہر کے باشندوں کے لیے کوئی 'اشکبار ترحم' نہیں دکھایا گیا۔ جب دہلی پر دوبارہ قبضہ کیا گیا، سفاکیت بے رحم تھی: صرف ایک نواحی علاقے، کوچہ چیلاں میں، تقریباً چودہ سو غیر مُسلح شہریوں کو قتل کیا گیا۔ ایک نوجوان آفیسر نے تحریر کیا، 'ہر ذی روح کو گولی مارنے کے احکامات جاری کیے گئے، یہ قطعی طور پر قتل تھا'۔ اتنے زیادہ سویلینز کو مارا گیا کہ ایک چشم دید گواہ نے رپورٹ کیا 'ہر گلی میں لاشیں، جلتے سورج کے سامنے گل سڑ رہی تھیں'۔ مساجد میں پناہ لینے والے پناہ گزینوں کو گھسیٹ کر نکالا گیا اور سولی پر چڑھا دیا گیا۔ اجتماعی پھانسی عام دستور تھا۔ پانچ لاکھ باشندوں کے ایک دولت مند اور چہل پہل والے شہر، مغل دارالحکومت، دہلی کو اجاڑ کھنڈر بنا دیا گیا۔

ناگہانی قتل بمشکل ہی نامانوس تھا کیونکہ برطانوی، ہندوستانیوں کو سزا سے استثناء کے ساتھ قتل کرتے

تھے۔ ڈینیس جوڈ ایک واقعہ تفصیل سے بیان کرتا ہے، جس میں ایک برطانوی فوجی نے چھکڑے پر بیٹھے دو ہندوستانیوں کو کانپور، جو 1857 کے انقلاب کی وحشیانہ لڑائیوں میں سے ایک مقام تھا، کے بارے بات چیت کرتے ہوئے اتفاقاً سن لیا۔ فوجی کے اپنے الفاظ میں: 'میں جان گیا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ لہٰذا میں ٹام واکر کو لے کر آیا، اور اس نے انھیں "کانپور" کہتے سنا، اور وہ جانتا تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ اس لیے ہم نے دونوں کو ختم کر ڈالا'۔

اگر جنگی اشتعال، خاص طور پر بغاوت کچلنے کو عذر نہ بنایا جائے، تو ان میں سے قتل کے کچھ واقعات شاید وضاحت کے متقاضی ہیں۔ لیکن کچھ انتقامی کارروائیاں سرد مہری سے کی گئیں۔ حالانکہ مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے کنبے نے پرامن طریقے سے دہلی پر قبضہ کرنے والی برطانوی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے، ان میں سے کافی افراد کو بہیمانہ طریقے سے قتل کیا گیا۔ اس کے سولہ بیٹوں میں سے زیادہ تر پر مقدمہ چلا اور پھانسی دے دی گئی جبکہ کئی ایک کو، پہلے ان سے ان کے ہتھیار، اور یقیناً ان کے زیورات چھیننے کے بعد، سرد مہری سے گولی مار دی گئی۔ سویلین حکومت کے تحت، سرکاری احکامات پر، سویلین مظلوموں کے خلاف بھی بربریت وقوع پذیر ہوتی رہی۔ 1872 میں، ملیر کوٹلا پنجاب میں، تقریباً پینسٹھ نمداری سکھوں کو توپ کے دھانے سے ٹکڑوں میں اڑادیا گیا؛ 1930 میں قصہ خوانی بازار پشاور میں، چار سو ہندوستانیوں کو قتل کر دیا گیا؛ اور جرائم کی ایک مختلف النوع فہرست کے لیے ہندوستانیوں کو زدو کوب کرنے، کوڑے مارنے، نسلی دشنام اور حملے کرنے، گولی مارنے، سولی چڑھانے اور ٹرانسپورٹیشن کے ان گنت چھوٹے چھوٹے واقعات، برطانوی نوآبادیت کی خونریز تاریخ کو (مزید) داغدار کرتے ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور سے یا تاج کی حکمرانی کے ابتدائی دنوں سے، درندگی کی ایسی مثالیں، انھیں اس دفاع کا آغاز کرنے پر مائل کرتی ہیں کہ وہ ایک مختلف زمانہ تھا، جب دوسرے طور طریقے برتے گئے۔ لیکن یہاں تک کہ انھوں نے بیسویں صدی میں بھی ایسا ہی کیا۔ 1942 میں ہندوستان چھوڑ دو تحریک کو کچلنے کے لیے سفاکانہ طاقت استعمال کرتے ہوئے ایسی تدابیر اختیار کی گئیں، جو ایک برطانوی گورنر کے الفاظ میں، اگر 'انھیں [دن] کی سر درو شنی میں منظر عام پر لایا جائے، تو کوئی بھی دفاع نہیں کر سکتا'۔ پولیس کا اجتماعی زیادتی میں ملوث ہونا شاذ نہیں تھا: پولیس نے ستیاگرہوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے ایک ہی اقدام میں تہتر عورتوں کی حرمت پامال کی، قیدیوں کو بزور طاقت برف کے بلاکوں پر ننگا کر کے اس وقت تک لٹایا جاتا جب تک وہ بے ہوش

نہ ہو جاتے، اور ہزاروں کو جیل میں زد و کوب کیا گیا۔ حتیٰ کہ احتجاج کرنے والے سویلینز پر ہوائی حملے کا اختیار دیا گیا تھا۔ صدی کے آغاز میں، رسکن نے اقرار کیا کہ 'تمام بغاوتیں، تمام خطرات، تمام خدشات اور تمام جرائم، جو ہماری ہندوستانی قانون سازی کے تحت وقوع پذیر ہو رہے تھے یا اسے مفلوج کر رہے تھے، براہ راست ہندوستانی لوٹ مار پر زندہ رہنے کی ہماری قومی خواہش سے پیدا ہو رہے تھے'۔ اس نے نشاندہی کی، لگاتار برطانوی استحصال کو چیلنج کرنے والے ہندوستانیوں کے خلاف انتقامی کارروائیوں کی کوئی اخلاقی بنیاد نہیں تھی۔ ان کی جبری وصولی ابھی تک جاری تھی۔

میرے بیان کردہ اہم نقطے کی وضاحت کے لیے بیسویں صدی کے برطانوی نو آبادیاتی کردار کی ایک مثال تفصیلی تذکرے کی مستحق ہے۔ یہ واقعہ جنگ عظیم اول کے اختتام کے فوری بعد پیش آیا (ووڈرو ولسن کے اس غیر مبہم فقرے میں کہ 'دنیا کو جمہوریت کے لیے محفوظ بنانے کے لیے' جنگ)۔ میں یقیناً جلیانوالہ باغ کا حوالہ دوں گا۔

یہ 1919 تھا۔ عثمانی اور آسٹرو-ہنگرین سلطنتیں بکھر چکی تھیں؛ نئی اقوام اپنے کھنڈرات سے نمودار ہو رہی تھیں؛ حقِ خود ارادیت پر ہر طرف بحث ہو رہی تھی۔ انگنت قربانیوں اور برطانوی جنگی کوششوں کے لیے افرادی اور مادی، خونی اور مالی طور پر خاطر خواہ شرکت کے بعد ہندوستان جنگ عظیم سے ابھی نکلا تھا، اس توقع پر کہ اس کا صلہ کسی حد تک خود مختاری کے طور پر ملے گا۔ جیسا کہ باب دوم میں وضاحت کی گئی تھی، ان امیدوں کو جھٹلا دیا گیا؛ ہندوستان کا واحد صلہ بد دیانتی پر مبنی مونٹیگیو-چیلمسفورڈ اصلاحات اور تعزیری رولٹ ایکٹ تھے۔

مارچ اور اپریل 1919 میں، ہندوستانیوں نے پورے پنجاب میں رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کے لیے ریلیاں نکالیں؛ انھوں نے بہت سے شہروں میں، بشمول امرتسر کے، 30 مارچ اور 6 اپریل کو ہڑتال کے ذریعے نارمل تجارت بند کر دی، برطانوی دھوکہ دہی پر لوگوں کی بے اطمینانی کا، خالی گلیوں اور کواڑ بند دکانوں کے ذریعے مظاہرہ کیا گیا۔ یہ گاندھی کی اہنسا و عدم تعاون کی ایک شکل تھی؛ ہڑتالوں کے دوران کوئی تشدد یا بدامنی رپورٹ نہیں ہوئی۔ لیکن 9 اپریل کو بغیر کسی وجہ اشتعال کے، برطانوی حکومت نے پنجاب میں دو قوم پرست لیڈروں، ڈاکٹر سیف الدین کیچلو اور ڈاکٹر ستیاپال، جو احتجاجی جلسوں سے خطاب کر رہے تھے، کو گرفتار کر لیا۔ جیسے ہی خبر پھیلی، امرتسر کے عوام گلیوں میں نکل آئے اور گرفتاریوں کے خلاف احتجاج کے لیے پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف چل پڑے۔ پولیس نے ان کا راستہ روکا، کچھ مشتعل سویلینز نے چند پتھر پھینکے، اور پولیس نے

فائر کھول کر بدلہ لیا، جس میں دس مظاہرین مارے گئے۔ اس سے ہجوم مشتعل ہو گیا، جنھوں نے پولیس کے کیے گئے قتل کے رد عمل میں، اپنا غصہ برطانوی سلطنت کی ہر مرئی علامت پر نکالا۔ نتیجے میں جو فسادات رونما ہوئے ان میں، پانچ انگریز مارے گئے اور ایک مشنری عورت پر حملہ ہوا (تاہم اسے ہندوستانیوں نے بچایا اور حفاظت میں لے لیا)۔

برطانویوں نے فوری طور پر امن کی بحالی کے لیے فوجی دستے امرتسر کو روانہ کر دیئے؛ 11 اپریل تک، چھ سو فوجی پہنچ گئے، اگلے دن ان کا کمانڈر بریگیڈیر جنرل ریجینالڈ ڈائیر بھی آ پہنچا۔ تب تک شہر پر سکون ہو چکا تھا، اور جو بھی مظاہرے اور احتجاجی جلسے ہو رہے تھے، مکمل پر امن تھے۔ اس کے باوجود، ڈائیر نے اپنے اختیارات جتانے کے لیے متعدد گرفتاریاں کیں، اور 13 تاریخ کو اس نے لوگوں کو پاس کے بغیر شہر چھوڑ کر جانے سے، مظاہرے یا جلوس کا اہتمام کرنے سے، یا حتیٰ کہ تین سے زائد کے گروپ میں جمع ہونے سے، روکنے کا ایک اعلامیہ جاری کیا۔ ان پابندیوں کے زیر اثر شہر اشتعال زدہ تھا، لیکن کوئی مظاہرین نہیں تھے۔ اسی اثنا میں، اعلامیے سے لاعلم، باہر کے اضلاع سے، تقریباً دس سے پندرہ ہزار لوگ، اسی دن بیساکھی کا اہم مذہبی تہوار منانے کے لیے شہر میں جمع ہو گئے۔ وہ ایک چار دیواری کے احاطہ بند باغ، جلیانوالہ باغ، جو کہ امرتسر میں عوامی تقریبات کے لیے ایک مقبول مقام تھا، میں اکٹھے ہو گئے، لیکن اس میں پہنچنے کے لیے صرف تنگ سے پانچ راستے ہی تھے۔

جب ڈائیر کو اس جلسے کا پتہ چلا تو اس نے یہ پتا نہیں کرنا چاہا کہ یہ کس کے متعلق ہے، کیا شرکت کرنے والے اعلانیہ نافرمانی کی وجہ سے وہاں پر ہیں یا محض اس کے احکامات سے لاعلمی کی بنا پر۔ اس نے فوری طور پر مشین گنوں سے لیس، بکتر بند گاڑیوں میں ایک فوجی دستہ لیا اور اپنی گاڑیاں باغ کے دروازے کے سامنے لے جا کر کھڑی کر دیں۔ ہجوم کو منتشر ہونے کا حکم یا ایسی کوئی وارننگ جاری کیے بغیر ــــ اور حالانکہ یہ واضح تھا کہ یہ غیر مُسلح سویلینز کا پر امن اجتماع تھا ــــ ڈائیر نے، اینٹوں کی دیوار کے پیچھے کھڑے، باغ کو گھیرے میں لیے، اپنے فوجی دستوں کو تقریباً ڈیڑھ سو گز کی دوری سے فائر کھولنے کا حکم دیا۔ ہزاروں غیر مُسلح اور غیر متشدد مردوں، عورتوں اور بچوں کے ایک محدود جگہ کے اندر پر امن طور پر مجتمع ہجوم نے چیخنا چلانا شروع کر دیا اور دہشت کے مارے بند دروازوں کو مخالف سمت سے دھکیلنے لگے، لیکن ڈائیر نے اپنے آدمیوں کو اس وقت تک فائرنگ جاری رکھنے کا حکم دیا جب تک ایمیونیشن ختم نہ ہو جائے۔ جب فوجی دستوں نے فائرنگ بند کی، تو

وہ 1650 راؤنڈ استعمال کر کے کم از کم 379 لوگوں کو مار چکے تھے (اعداد و شمار جو برطانویوں نے تسلیم کرنے کے لیے تیار کیے تھے) __ اور 1137 زخمی ہوئے۔☆ ڈائیر نے اطمینان سے ملاحظہ کیا، بمشکل ہی کوئی گولی ضائع ہوئی تھی۔

کوئی وارننگ نہیں تھی، کوئی اعلان نہیں تھا کہ اجتماع غیر قانونی تھا اور اسے منتشر ہونا پڑے گا، پر امن طور پر چلے جانے کی کوئی ہدایات نہیں تھیں: بالکل نہیں۔ ڈائیر نے اپنے آدمیوں کو ہوائی یا اپنے ٹارگٹ کے پاؤں پر فائر کرنے کا حکم نہیں دیا۔ انھوں نے اس کے احکامات پر غیر مسلح اور بے یار و مددگار ہجوم کے سینوں، چہروں اور کوکھ پر فائر کیے۔

تاریخ اس واقعہ کو جلیانوالہ باغ قتلام کے طور پر جانتی ہے۔ یہ سرنامہ کشت و خون کی حدت و تپش، ہتھیاروں میں برتر، مخالفین کے خون کے پیاسے جنگجوؤں کے ہاتھوں خونریزی، پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن جلیانوالا باغ میں ایسا کچھ نہیں تھا۔ ڈائیر کے فوجی سکون سے لائن میں کھڑے تھے تقریباً معمول کے مطابق؛ نہ انھیں ہجوم نے دھمکایا نہ ان پر حملہ آور ہوئے؛ یہ بالکل ایک اور دن کا معمول تھا، لیکن کسی بھی دوسرے دن کے برعکس۔ انھوں نے اپنی رائفلیں بھریں اور سرد مہری، سے، بری طرح مسلتے ہوئے، جلدی یا جذبات کے یا پسینہ بہائے یا غصے کے بغیر فائر کھول دیا، چیختے اور واویلا کرتے ہوئے، بھگدڑ مچاتے ہجوم پر، تربیت یافتہ درستگی کے ساتھ، اپنے میگزین خالی کر دیے۔ جیسے ہی لوگ دہشت سے بچنے کے لیے واحد خارجی راستے کی طرف جاتے، وہ بندوقوں کی خونی باڑ میں پھنس جاتے۔ اس دن غیر مُسلح مجمع پر سولہ سو پچاس گولیاں چلائی گئیں، اور جب کام ختم ہوا، اس کے دس منٹ بعد، سینکڑوں لوگ مردہ پڑے تھے، اور اس سے زیادہ، ہزاروں کی تعداد میں زخمی پڑے ہوئے تھے، بہت سے، بھدے طریقے سے زندگی بھر کے لیے اپاہج ہو چکے تھے۔

جلیانوالہ باغ قتلام، کوئی دیوانگی کا باؤلا پن نہیں تھا بلکہ نوآبادیاتی ریاست کے حکم کا شعوری، دانستہ نفاذ

☆ غیر سرکاری ہندوستانی اعداد و شمار زیادہ ہیں: مارے جانے والوں پر زیادہ اتفاق رائے 1499 کے عدد پر ہے۔ تاہم 1650 راؤنڈز کے استعمال اور 1137 زخمیوں کے اعداد و شمار پر اختلاف نہیں۔ اموات کے بارے میں صداقت شاید کہیں درمیان میں ہے؛ 379 سرکاری اعداد و شمار قلیل ترین ہیں۔ حتیٰ کہ اگر سرکاری اعداد و شمار درست بھی تھے، اس کے باوجود، 1650 گولیوں سے 1516 ہلاکتیں، ڈائیر کی کارروائی کا کتنا سادہ اور وحشیانہ معیار ہے۔

تھا۔ ڈائیر ایک خبطی دیوانے کی بجائے کارگر قاتل تھا؛ وہ محض بے تخیل شیطان تھا، ملٹری بیوروکریٹ کی درندگی تھا۔ لیکن اس بیساکھی کے دن اس کی کاروائی، اس نظام کی بدی کی علامت بن گئی، جس کے لیے اور جس کے دفاع کی خاطر وہ کروائی کر رہا تھا۔ تمام شعبہ ہائے زندگی کے ہندوستانیوں کے لیے اس سچائی کے خوفناک ادراک میں، جلیانوالا باغ قتلام کی اصل اہمیت، پوشیدہ ہے۔ اسنے اس بدترین کی نمائندگی کی، جو کہ نوآبادیت ہو سکتی تھی، اور اسے ہونے دینے میں، برطانویوں نے وہ ناقابل واپسی مقام عبور کر لیا جو کہ لوگوں کے صرف ذہنوں میں موجود تھا__ ایسا مقام جسے غیر مساوی تعلق میں، آقا و غلام دونوں کو لازماً جبلی طور پر عزت دینا ہوتی ہے، اگر اپنے تعلق کو قائم رکھنا ہو۔

قتلام نے ان لاکھوں لوگوں کو ہندوستانی بنا دیا، جنھوں نے اس ہیبت ناک اتوار سے پہلے شعوری طور پر اپنی سیاسی شناخت بارے نہیں سوچا تھا۔ اس نے وفاداروں کو قوم پرست اور آئین پسندوں کو فعالیت پسند بنا ڈالا، نوبل انعام یافتہ شاعر رابندرناتھ ٹیگور کو اپنا خطاب، بادشاہ کو واپس کرنے اور برطانوی عہدوں پر متمکن ہندوستانیوں کے انبوہ کو اپنے کمیشن (واپس) حوالے کرنے، پر مائل کیا۔ اور سب سے بڑھ کر اس نے مہاتما گاندھی میں ہندوستان کی آزادی کے مقصد کی اخلاقی سچائی کے پختہ اور غیر متزلزل ایمان کو اور گہرا کر دیا۔ اب وہ آزادی کو سچائی کے ساتھ غیر منقسم سمجھتے تھے، اور ایک سلطنت جسے وہ ناقابل علاج بدی حتیٰ کہ شیطان کے طور پر دیکھتے تھے، سے ہندوستان کو نجات دلانے کے عزم سے وہ کبھی متزلزل نہیں ہوئے۔ مورخ اے جے پی ٹائیلر، قتلام بارے کہتا ہے 'فیصلہ کن لمحہ جب ہندوستانی، برطانوی حکمرانی سے برگشتہ ہو گئے'۔ قانون اور امن کے نام پر کسی بھی اور 'سزا' میں اتنی اموات نہیں ہوئیں: 'پیٹرلو قتلِ عام میں تقریباً گیارہ جانوں کا نقصان ہوا۔ او قیانوس میں، برطانوی فوجیوں نے بوسٹن کے عوام پر مشتعل ہو کر فائرنگ کی جس سے پانچ افراد مارے گئے، ان پر دانستہ قتل عام کا الزام لگا۔ ڈبلن میں 1916 میں خود مشتہر کردہ ایسٹر بغاوت کے رد عمل میں، انگریزوں نے سولہ آئرستانی باشندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا'۔ جلیانوالہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ انگریز، ہندوستانی جانوں کو کتنی کم اہمیت دیتے تھے۔

سرکاری ہنٹر انکوائری کمیشن کو اپنی کارروائیوں کا بتاتے ہوئے، ڈائیر نے ہلکے سے تاسف یا خود تشکیکی کا بھی اظہار نہیں کیا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ یہ ایک 'باغیوں کا جلسہ' تھا، اس کے اختیارات کی اعلانیہ نافرمانی کا عمل

تھا جسے سزا دینا ضروری تھا۔ 'اب یہ سوال محض ہجوم کو منتشر کرنے کا نہیں رہ گیا تھا' بلکہ ہندوستانیوں کی اطاعت کو یقینی بنانے کے لیے، 'اخلاقی اثرات' پیدا کرنے کا تھا۔ ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے محض ہوا میں گولی چلانا کافی نہ ہوتا، کیونکہ لوگ 'تمام کے تمام واپس آ جاتے اور مجھ پر ہنستے'۔ اس نے بیان کیا کہ اس نے ذاتی طور پر خارجی راستوں کی طرف فائرنگ کی ہدایات دیں (مرکزی دروازے اور پانچ تنگ ذیلی راستے) کیونکہ وہی (جگہ) تھی جہاں ہجوم زیادہ گنجان تھا: اس نے اقرار کیا 'ٹارگٹس معقول تھے'۔ قتلِ عام دس منٹ تک جاری رہا، اور ٹرکی پر نشانہ بازی کے مقابلے کی طرح، گنتی غیر معمولی شرح قتل تک جا پہنچی۔ جب یہ ختم ہوا اور لاشے اور زخمی خون کے تالاب میں پڑے ہوئے، زمین پر آہ وزاری کر رہے تھے، تو ڈائیر نے اپنے فوجیوں کو زخمیوں کی کسی قسم کی مدد کرنے سے منع کر دیا۔ زخمیوں کے لیے، جو زمین پر شدید تکلیف سے تڑپتے ہوئے مدد کے لیے پکار رہے تھے، رشتہ داروں اور دوستوں کو ایک کپ پانی کا لانے سے باز رکھنے کے لیے، اس نے تمام ہندوستانیوں کو چوبیس گھنٹوں کے لیے امرتسر کی گلیوں سے دور رہنے کے احکامات جاری کیے۔

نوآبادیاتی دہشت کا راج تعاقب میں تھا۔ سلمان رشدی کا کہنا ہے کہ، خاتون مشنری پر حملے کے بعد، 'اس بہتان.... کہ نازک انگریز گلاب، ہیجانِ شہوت (میں مبتلا) رنگدار جلد والوں (ووگ wogs) کی طرف سے مسلسل جنسی خطرے کا شکار تھے' نے بھی شاید جنرل ڈائیر کے ذہن میں ایک کردار ادا کیا ہو۔ اسے یوں ہی رہنے دیں جیسا کہ یہ ہے، اور کیونکہ کسی ہندوستانی کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اس قتلِ عام اور اس کے عواقب پر معروضی انداز میں لکھ سکے، لہٰذا مجھے بھیانک تفصیلات کے حصول کے لیے امریکی ول ڈیورنٹ سے رجوع کرنے دیں۔

> جنرل ڈائیر نے ایک حکم جاری کیا کہ جس گلی میں مشنری عورت کو زد و کوب کیا گیا وہاں سے گزرنے والے ہندو پیٹ کے بل رینگ کر جائیں گے؛ اگر وہ چاروں ہاتھوں پاؤں پر اٹھنے کی کوشش کرتے، تو انھیں فوجیوں کی بندوقوں کے بٹ مارے جاتے۔ اس نے پانچ سو پروفیسروں اور طلباء کو گرفتار کر لیا اور طلباء کو مجبور کیا کہ روزانہ حاضری کے لیے خود کو پیش کریں، حالانکہ ایسا کرنے کے لیے ان میں سے اکثر کو ایک دن میں سولہ میل چل کر آنا پڑتا۔ اس نے سینکڑوں شہریوں اور کچھ سکول کے طلباء، جو کسی بھی جرم کے لیے بالکل معصوم تھے، کو عام چوراہوں پر کوڑے مارے۔ اس نے گرفتار افراد کو قید کرنے کے لیے، ایک کشادہ پنجرہ بنایا، جو سورج سے غیر محفوظ تھا؛ دوسرے

قیدیوں کو اس نے ایک رسے کے ساتھ آپس میں باندھ دیا، اور پندرہ گھنٹوں تک کھلے ٹرکوں میں رکھا۔ اس نے سادھوؤں (درویشوں) کے ننگے جسموں پر لیموں بہایا، اور پھر انھیں سورج کی کرنوں کے سامنے کھلا چھوڑ دیا، کہ لیموں شاید سخت ہو جائے اور ان کی جلد پھٹ جائے۔ اس نے ہندوستانی گھروں کی بجلی اور پانی کی سپلائی منقطع کروادی اور حکم دیا کے [ہندوستانیوں کے] قبضے میں جتنے بھی الیکٹرک پنکھے ہیں وہ حوالے کر دیے جائیں، اور بلا دام برطانویوں کو دے دیے جائیں۔ آخر میں، اس نے کھیتوں میں کام کرتے مردوں اور عورتوں پر بم گرانے کے لیے ہوائی جہاز بھیجے۔

چونکہ سرکاری انکوائری کمیشن نے زیادہ تر ڈائیر کے طرز عمل پر پردہ ڈال دیا، موتی لال نہرو کو کانگریس نے سفاکی کی عوامی انکوائری کا سربراہ مقرر کیا، اور اس نے اپنے بیٹے جواہر لال نہرو کو حقائق جاننے کے لیے امرتسر بھیجا۔ جواہر لال نہرو کی ڈائری میں اس کے نتائج کا بڑی باریک بینی سے اندراج کیا گیا ہے؛ ایک مقام پر اس نے ایک دیوار کے حصے پر سڑسٹھ گولیوں کے نشانات گنے۔ اس نے اس گلی کا دورہ بھی کیا جہاں برطانویوں نے ہندوستانیوں کو اپنے پیٹ کے بل رینگنے کا حکم دیا تھا اور پریس میں نشاندہی کی کہ رینگنا حتیٰ کہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل بھی نہیں تھا بلکہ 'سانپوں اور کیچوؤں کے انداز' میں، مکمل طور پر زمین پر تھا۔ دہلی کی طرف بذریعہ ٹرین سفر پر، اس نے خود کو، ڈائیر اور برطانوی ملٹری افسران کے ایک گروپ کے ساتھ ایک ہی کمپارٹمنٹ میں سانجھ کرتے ہوئے پایا۔ نہرو کے اپنے بیان کے مطابق، ڈائیر ڈینگیں مار رہا تھا، 'پورا شہر اس کے رحم و کرم پر تھا اور اسے لگا جیسے باغی شہر کو راکھ کے ڈھیر میں بدلنے والا تھا، لیکن اس نے اس پر رحم کھایا اور باز رہا... میں اس کی گفتگو سن کر اور اس کے بے حس انداز کا مشاہدہ کر کے حیران رہ گیا'۔

کوئی شک نہیں کہ چند نیک صفت انگریز کہیں گے کہ بریگیڈیر جنرل ریجنالڈ ڈائیر دماغی خلل (کا نام) تھا، ان ملٹری سادیت پسندوں میں سے ایک، جنھیں ہر فوج کسی نہ کسی وقت نکال باہر کرتی ہے، اور عام طور پر راج کی خدمات بجالانے والے، وردی میں ملبوس روشن خیال افراد کا نمونہ نہیں تھا۔ اس حیلے سے بریت نہیں ہو گی۔ جو دل چاہے کرنے کی، نہ صرف ڈائیر کو بلا روک ٹوک آزادی دی گئی، بلکہ اس کی بربریت کی خبر برطانویوں نے چھ ماہ تک دبائے رکھی، اور جب اس کی زیادتیوں کی رپورٹوں پر غیض و غضب بڑھا، تو سرکاری انکوائری کمیشن، ہنٹر کمیشن کے ذریعے اس کے گناہوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی، جس نے اسے صرف 'سنگین غلطی' کا مرتکب ٹھہرایا۔ جو کچھ ہو چکا تھا، اسے برطانویوں نے تب تسلیم کیا جب انڈین نیشنل کانگریس کی تفتیشی ٹیم نے مکمل

طور پر دستاویزی رپورٹ تیار کرلی۔ ڈائیر کو اس کی کمانڈ سے سبکدوش اور دارالعوام کی طرف سے ملامت کیا گیا، لیکن فوری طور پر دارالامرا اسے بری الذمہ قرار دے دیا گیا اور اچھی خاصی پنشن پر ریٹائر کرنے کی اجازت دی گئی۔ ادب کے نوبل انعام یافتہ اور برطانوی سامراج کی شاعرانہ آواز، ردیارڈ کپلنگ، نے اس کی تعریف یوں کی 'وہ شخص جس نے ہندوستان کو بچالیا'۔

حتیٰ کہ ہندوستان میں اس کے رفقاء کو بھی قتل عام کے اس کے متکبر فعل کی مناسب تلافی کا خیال نہیں آیا۔ انھوں نے اس کی بربریت کی توقیر کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کی تحریک چلائی، اور 26317 پونڈ، 1 شیلنگ اور 10 پینیز کی خاصی بڑی رقم اکٹھی کی، ان دنوں خاصی حیران کن رقم اور جو آج کے حساب سے اڑھائی لاکھ پونڈ سے زیادہ بنتی ہے۔ یہ اسے ایک ہیرے جڑی تعظیمی تلوار (سورڈ آف آنر) کے ساتھ پیش کی گئی۔ اس کے برعکس، انصاف کے لیے کئی مہینوں کی لڑائی کے بعد، جلیانوالہ باغ قتلام کی بھینٹ چڑھنے والوں کے خاندانوں کو حکومت کی طرف سے پانچ سو روپے فی کس زر تلافی کے طور پر دیے گئے __ مروجہ شرح مبادلہ پر، تقریباً سینتیس پونڈ (اور آج کی رقم میں تقریباً چودہ سو پچاس پونڈ) ایک انسانی جان کے لیے۔

جواہر لال نہرو کی نظر میں، انگریزوں کا قتلام پر ردعمل __ اور ڈائیر کا عوامی جشن __ تقریباً اتنا ہی برا تھا جتنا فی النفسہ قتل عام۔ اس نے بعد میں لکھا، 'اس عمل کی سرد مہرانہ توصیف نے مجھے سخت صدمہ پہنچایا۔ یہ مطلق غیر اخلاقی، ناشائستہ معلوم ہوتا تھا۔ سرکاری سکول کی زبان استعمال کرنا، یہ برے برتاؤ کی انتہاء تھی۔ پھر مجھے واضح طور پر احساس ہوا، جو مجھے اس سے پہلے نہیں ہوا تھا، کہ سامراج کتنا ظالم اور اخلاق سے عاری تھا اور کیسے یہ برطانوی طبقہ اعلیٰ کی روحوں کو نگل گیا'۔

مزید یہ دعویٰ کرنا ممکن نہیں تھا کہ ڈائیر ہندوستان میں برطانویوں کی نمائندگی نہیں کرتا: وہ دعویٰ کر چکے تھے کہ وہ ان کے اپنوں میں سے ایک ہے __ ان کا نجات دہندہ۔

❖

قحط، جبری نقل مکانی اور درندگی: تین مثالیں ہیں کہ کیوں ہندوستان پر برطانوی حکمرانی، استبدادیت یا کچھ بھی اور تھی لیکن روشن خیالی نہیں تھی۔ لیکن کوئی حیران کیوں ہو؟ وزیراعظم سٹینلے بالڈون کی رجعت پسند حکومت میں وزیر داخلہ، سر ولیم ہیکس، نے 1928 میں معاملے کو واشگاف طور پر بیان کیا: 'میں جانتا ہوں، مشنری اجلاسوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم نے ہندوستانیوں کا معیار (زندگی) بہتر کرنے کے لیے ہندوستان فتح

کیا۔ یہ ریاکاری ہے۔ ہم نے برطانوی اشیاء کے لیے ایک دکان (آؤٹ لیٹ) کے طور پر ہندوستان فتح کیا۔ ہم نے تلوار کے ذریعے ہندوستان فتح کیا، اور تلوار کے ذریعے ہی ہم اسے قابو میں رکھیں گے۔ میں ایسا منافق نہیں کہ یہ کہوں کہ ہم نے ہندوستان پر ہندوستانیوں کے لیے قبضہ کیا۔ ہم ایک ہاتھ میں لمبی چھڑی اور دوسرے میں تلوار لے کر گئے، اور مؤخر الذکر کے ساتھ ہم نے انھیں لاچار بنائے رکھنا جاری رکھا جب کہ اوّل الذکر کو ہم نے بزور قوت ان کے حلق میں اتار دیا'۔

ڈائیر کے کیس میں، تلوار ہیرے جڑی تھی؛ لمبی چھڑی (گز) سے برطانوی خزانے کے بہی کھاتوں کی پیمائش کی گئی۔ کسی کو حکومت پر، اس کے عالی مرتبت نمائندگان کی غیر جانبداری کے لیے الزام عائد نہیں کرنا چاہیے۔

ششم

سلطنت کا باقی ماندہ کیس

ششم

سلطنت کا باقی ماندہ کیس

برطانوی منافع جات، انڈین ٹیکسز__ نجی انٹر پرائز اور خطرے کا امکان عوام کے لیے__ مفادات برطانیہ کے لیے__ ہندوستانی مسافروں کا استحصال__ ملازمتوں میں امتیازی برتاؤ__ عظیم الشان انڈین ریلوے کا انوکھا کردار__ ریلوے کا پیدا کردہ معاشی بگاڑ__ برطانوی تعلیمی پالیسی__ ہندوستانی تعلیم کی تباہی__ پاٹھ شالا، مدارس، مکتب__ تعلیم اور انگریزی زبان__ تعلیم پر میکالے کی یادداشت__ مل کا فلسفہ افادیت پسندی__ مستشرقین بمقابلہ ماہر زبان انگریزی__ ہندوستانی یونیورسٹیوں کی حدود و قیود__ ہندوستانیوں کو ڈی نیشنلائز کرنا (قومی خصوصیات کو زائل کرنا)__ نصابی ہراس__ برطانوی تاریخ__ انگریزی ادب__ مغربی تصورات کا اثر__ ذات پات اور تعلیم__ ہندوستانی ذہن کو نوآبادی بنانا__ ووڈی ہاؤس، نوآبادیت اور انگریزی زبان__ بغیر ہمدردی کے چائے__ شجر کار کمیروں کا استحصال__ ہندوستانیوں تک چائے کا پھیلاؤ__ کرکٹ کا ہندوستانی کھیل__ کرکٹ اور سماجی مرتبہ__ رانجی__ کرکٹ اور قوم پرستی۔

پھر ہندوستان میں برطانوی سلطنت کا کیس رہ کیا جاتا ہے؟ ایلکس تنزیلمان نے اپنی کتاب 'ہندوستانی موسم گرما' کے باکمال آغاز سے، میرے اس نقطے کو زیادہ اثر انگیز بنا دیا ہے: آغاز میں وہاں دو قومیں تھیں۔ ایک تھی، وسیع، طاقتور اور عظیم الشان سلطنت، بڑی ذہانت سے منظم کی ہوئی اور تمدنی طور پر متحد، جس کا قبضہ زمین پر اناج کی بالیوں کے سب سے بڑے ڈھیر پر تھا۔ دوسری تھی غیر ترقی یافتہ، نیم جاگیر دارانہ مملکت، مذہبی دھڑے بندیوں سے ٹکڑے ٹکڑے اور بمشکل اس قابل کے اپنے جاہل، بیمار اور بدبودار عوام کی پرورش کر سکے۔ پہلی قوم تھی ہندوستان۔ دوسری تھی انگلینڈ۔

اس کے برعکس برطانوی مؤرخ اینڈریو رابرٹس نے، یہ پس منظر پیش کرتے ہوئے، دم بخود کرنے والا دعویٰ کیا تھا، کہ برطانوی حکمرانی نے 'جدیدیت، ترقی، تحفظ، زرعی پیش قدمی، لسانی وحدت اور بالآخر برصغیر کو

جمہوری بنانے کے عمل' کی جانب رہنمائی کی۔ اس تصور سے ہم پہلے ہی بحث کر چکے ہیں کہ اپنی سیاسی وحدت اور جمہوریت کے لیے ہندوستان، برطانیہ کا احسان مند ہے؛ ہم، ملک میں قانون کی بالادستی کے برطانوی نفاذ کی شدید معذوری دکھا چکے ہیں؛ ہم ہندوستان کے معاشی استحصال اور اس کی زمین کی لوٹ کھسوٹ کو ننگا کر چکے ہیں، جو رابرٹس کے 'جدیدیت، ترقی اور زرعی پیش قدمی' کے دعووں کو جھوٹا ثابت کرتے ہیں؛ ہم اس تصور کو بھی رد کر چکے ہیں کہ ہندوستان میں برطانوی استبدادیت سے متعلق کچھ شفیق اور روشن خیال بھی تھا۔

لیکن یہ تصور کہ یہ جدیدیت برطانوی سامراجی حکمرانی کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہو سکتی تھی، خاص طور پر باعث کوفت ہے۔ ہندوستان، جس نے اپنی پوری تاریخ کے دوران چند عظیم ترین (اور اپنے دور کی جدید ترین) تہذیبیں، جو دنیا نے آج تک دیکھیں، پیدا کیں، وہ ہی کیوں، آج کی ترقی یافتہ اور جدید اقوام کے لوازمات حاصل نہیں کر پائے گا، کیا اسے ایسا کرنے کے لیے آزاد چھوڑا گیا تھا؟ اس کی کئی ہزار سال پرانی تہذیبی تاریخ کے مختلف ادوار میں، عظیم الشان تعلیمی اداروں، پر شکوہ شہروں جو پوری دنیا میں اس دور کی شہری آبادیوں سے سبقت لیے ہوئے تھے کی افراط تھی، ایجادات میں متقدم، عالمی معیار کی دستکاری اور صنعت، بحیثیت مجموعی ایک اعلیٰ معیارِ زندگی، معاشی پالیسیاں جو خوشحالی سے بہرہ مند کرتیں اور فراواں آسودگی — مختصر طور پر، آج کی کامیاب 'جدیدیت' کے تمام اشاریے — اور کوئی زمینی وجہ نہیں تھی کہ ایسا معاملہ دوبارہ کیوں نہیں ہو سکتا تھا، اگر اس کے پاس ایسا کرنے کے وسائل ہوتے جنھیں اس کی بجائے برطانویوں نے نکال لیا۔ 1907 میں ایک انگریز نے یورپی سماجی جمہوریت پسند قارئین کے لیے لکھتے ہوئے واضح طور پر اظہار کیا: 'جہاں کہیں بھی انھیں ایک آزاد دکان کی اجازت دی گئی انھوں [ہندوستانیوں] نے اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا؛ اس پر مباحثہ کرنا لغو ہے کہ عظیم الشان ریاستیں جنھوں نے ہزاروں سالوں تک پوری اہلیت کے ساتھ اپنے معاملات سرانجام دیے، ایسے حملوں اور تباہی کے باوجود قائم رہیں اور دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئیں، جو شاید کم مضبوط ممالک کو کچل ڈالتے، کیا وہ اپنے معاملات کامیابی سے کنٹرول کرنے سے قاصر رہتیں اگر مٹھی بھر بے حس غیر ملکیوں کو ان کے بیچ میں سے ہٹا دیا جاتا، یا نکال دیا جاتا'۔

مباحثہ ختم کرنے والا ثبوت، بالآخر، اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ، گہرے سماجی-معاشی حوض، جس میں نوآبادیت نے ملک کو غوطہ دیا تھا، سے نکل آنے کے باوجود، اور آزادی کے بعد کے سالوں میں خود غلطیاں کرنے کے باوجود، برطانیہ کے چھوڑ کر جانے کے بعد سے، سات عشروں سے کم وقت میں، ہندوستان دنیا کی

تیسری بڑی معیشت بن چکا ہے، اور موجودہ دور میں اس کی ترقی کی رفتار تیز ترین ہے: یہ 'جدید' اعزازات کی ایک دم بخود کر دینے والی فہرست کا بھی حامل ہو چکا ہے، بشمول اس کے کہ دنیا کا پہلا ملک ہے جس نے کامیابی کے ساتھ پہلی کوشش میں مریخ کے مدار میں ایک خلائی جہاز بھیجا (ایک کارنامہ جو امریکہ بھی سرانجام نہیں دے سکا اور ایسا کرنے کی کوشش میں چین اور جاپان بھی ناکام ہو گئے)۔ ہندوستان نے کتنا بہتر کیا ہوتا، اگر اس کے ساتھ بیس عشروں تک بندھی ہوئی برطانوی سلطنت کا یہ آسیب نہ ہوتا؟

سلطنت کے عذر خواہ متعدد دوسرے فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے برطانیہ نے ہندوستان کو: سب سے بڑھ کر، ریلوے؛ انگریزی زبان؛ نظامِ تعلیم اور حتیٰ کہ منظم کھیل، خاص طور پر کرکٹ، ایک ایسا کھیل جس میں، حالیہ سالوں کے دوران ہندوستان دو مرتبہ عالمی چیمپئن رہا ہے، کے ساتھ چھوڑا۔ اس لیے ہم انھیں کا تجزیہ کرتے ہیں۔

عظیم الشان انڈین ریلوے کا انوکھا کردار

سلطنت کے عذر خواہوں کی جانب سے اکثر یہ اشارہ کیا جاتا ہے کہ انڈین ریلویز کی تعمیر ان طریقوں میں سے ایک ہے جس سے برطانوی نو آبادیت نے برصغیر کو فائدہ پہنچایا، اس یقینی حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ بہت سے ممالک نے بھی، بنا مصیبت مول لیے اور ایسا کرنے کے لیے نو آبادی بننے کے اخراجات اٹھائے بغیر، ریلوے تعمیر کی۔ لیکن حقائق اس سے بھی زیادہ تلخ ہیں۔

ریلویز کا خیال سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کو سوجھا، دوسری ہر چیز کی طرح اس میں بھی کمپنی کا حساب کتاب اس کے اپنے فائدے کے لیے تھا۔ گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ نے 1843 میں یہ دلیل پیش کی کہ ریلویز 'ملک کے تجارتی، حکومتی اور ملٹری کنٹرول کے لیے' فائدہ مند ہو گی۔ دس سال بعد، اس کے جانشین لارڈ ڈلہوزی نے 'ہندوستان بطور مارکیٹ برطانوی صنعتکاروں کے لیے اور بطور زرعی خام مال فراہم کرنے والے کی حیثیت سے، جو اہم کردار ادا کر سکتا ہے' اسے نمایاں کیا۔ در حقیقت، ریلویز کے ذریعے ہندوستان کا وسیع اندرونی حصہ بطور مارکیٹ کھولا جا سکتا تھا، جہاں نئے کاروبار میں ضرورت ہوتی وہاں کے لیے اور وہاں سے مزدوروں کی نقل و حمل کی جا سکتی تھی، اور انگلینڈ کی 'شیطانی ملوں' کا پیٹ بھرنے کے لیے اس کے کھیتوں اور کانوں سے انھیں مال بھجوا کر، استفادہ حاصل کیا جا سکتا تھا۔

اس کے ہر تصور اور تعمیر میں، انڈین ریلوے ایک بہت بڑا برطانوی نوآبادیاتی جھانسہ تھا۔ برطانوی شیئر ہولڈرز نے ریلویز میں سرمایہ کاری کر کے خلاف معمول روپیہ کمایا، جہاں حکومت نے اصل زر پر پانچ فیصد سالانہ منافع کی گارنٹی دی تھی، جو کسی بھی دوسری محفوظ سرمایہ کاری میں دستیاب نہ تھی۔ یہ ان دنوں حد سے متجاوز شرح منافع تھی؛ ممکن ہے صرف اس لیے کہ حکومت نے اپنے محاصل کی کمی کو پورا کیا ہو، ادائیگیاں جو یقیناً ہندوستانیوں کے ٹیکسوں سے ہوتی تھیں، نہ کہ برطانویوں کے۔ حد سے بڑھی ہوئی گارنٹیوں نے ریلوے کی تعمیر کے لیے کفایت شعاری کرنے والی نجی کمپنیوں کے انسینٹیو (incentive) ختم کر دیے — جتنا زیادہ ان کا اصل زر خرچ ہو گا، اتنا ہی زیادہ اور محفوظ شرح سود پر ان کا گارنٹی شدہ منافع زیادہ ہو گا۔ اس کے نتیجے میں، 1850 اور 1860 کے عشروں میں ایک میل انڈین ریلوے کی تعمیر پر اوسطاً اٹھارہ ہزار پونڈ لاگت آئی، اس کے برخلاف اسی وقت امریکہ میں ڈالر میں دوہزار پونڈ کے مساوی رہی۔ اس صورتِ حال میں، اس سے پہلے کہ ابتدائی لائنیں اپنے زرِ اصل کے مصارف کا پانچ فیصد کماتیں، بیس سال یا اس سے زیادہ ہو چلے تھے، حتیٰ کہ 1880 میں ریلوے کی تعمیر حکومتی ہاتھوں میں لینے کے بعد بھی، بہر حال نجی برطانوی فرموں کی ہوس کو سلام جن سے اس کام کا معاہدہ کیا گیا، چنانچہ انڈین ریلوے کے ایک میل کی لاگت، کینیڈا اور آسٹریلیا کے کم گنجان آباد اور مساوی دشوار گزار میدانوں کے ایک جتنے فاصلے سے دوگنا سے بھی زیادہ تھی۔

ہندوستانی ٹیکس دہندگان کے علاوہ، ہر ایک کے لیے یہ کھلے کا پیسہ تھا۔ محفوظ منافع کے حوالے سے، برطانوی حکومت کے اپنے سٹاک کی نسبت، انڈین ریلوے کے شیئرز کی دوگنا پیشکش کی جاتی۔ انڈین ریلوے کے گارنٹی شدہ شئیرز نے، 1870 تک بیس سالوں میں برطانوی سرمایہ کاری کے مالیاتی اثاثوں کا پانچواں حصہ جذب کر لیا — پہلی لائن 1853 میں شروع ہوئی تھی — لیکن اس کا صرف ایک فیصد ہندوستان میں اختراع کیا گیا۔ برطانویوں نے پیسے بنائے، ٹیکنالوجی کو کنٹرول کیا اور تمام ساز و سامان سپلائی کیا، جس کا مطلب پھر یہی تھا کہ منافع اپنے ملک بھیجا گیا۔ یہ ایک ایسا منصوبہ تھا جسے اس وقت یوں بیان کیا گیا 'عوامی رِسک کی بنیاد پر نجی انٹرپرائز'۔ تمام نقصانات ہندوستانی عوام کو برداشت کرنا تھے، تمام نفع برطانوی تاجر کی جیب میں جانا تھا — حتیٰ کہ وہ ریل کے ذریعے ہندوستانی معیشت کے اندر تک سرایت کر گیا۔ انگلینڈ میں سٹیل کی صنعت کو اپنی مہنگی مصنوعات کے لیے انتہادرجہ مطلوب دکان ہندوستان میں مل گئی، کیونکہ ریلوے کو درکار تقریباً ہر چیز انگلینڈ سے آتی: سٹیل کی ریل پٹڑی، انجن، ریل ویگنیں، مشینری اور پلانٹس۔ اس قضیے کی حمایت کرنے کی بجائے کہ

برطانیہ نے ہندوستان کے لیے بہتر کیا، ریلویز اس نقطہ نظر کی شہادت ہے۔ برطانیہ اپنی سب سے شاندار نوآبادی میں سے، اس سے بہت زیادہ نکال لے گیا جتنا کہ اس نے اسے دیا۔

وہاں کچھ خاص بچے کھچے فوائد تو ہندوستانیوں کے لیے تھے نہیں۔ ریلویز کا بنیادی مقصود کشید کردہ وسائل، کوئلہ، خام لوہا اور سوت وغیرہ کو برطانویوں کے لیے بندرگاہوں تک منتقل کرنا تھا، تاکہ اپنی فیکٹریوں کے استعمال کے لیے جہازوں میں وطن کو بھجوا دیں۔ لوگوں کی نقل و حرکت اتفاقی ہوتی، ماسوائے اس کے جب نوآبادیاتی مفادات کے لیے ضرورت در پیش ہوتی؛ اور لکڑی کے بنچوں اور سہولیات کی عدم دستیابی کے ساتھ تیسرے درجے کے ڈبے، جن میں ہندوستانیوں کو ریوڑ کی صورت جمع کر دیا جاتا؛ اور حتیٰ کہ اس وقت بھی دہلا دینے والے فقرے کسے جاتے۔ (اور بے اختیار مقننہ میں سوالات بھی تھے: 1921 سے 1941 کے دوران ہر سال قانون ساز اسمبلی میں اس مسئلے پر چودہ سوالات تھے، اور ریاستی مجلس میں ہر سال اٹھارہ مزید۔ جوں جوں حالات بدتر ہوتے گئے، فکر مندی بڑھتی گئی: 1937 اور 1941 کی سالانہ اوسط بالترتیب سولہ اور پچیس تھی۔ مہاتما گاندھی کی ہندوستان واپسی پر پہلی جنگ تیسرے درجے کے مسافروں کی خاطر تھی۔) ابھی تک تیسرے درجے کے مسافر ریلوے کے لیے منافع کا ذریعہ تھے، اس لیے ہندوستان میں برطانوی تاجروں نے یہ یقین دہانی کی کہ کرایہ کی شرح کم رکھی جائے (درحقیقت، دنیا میں سب سے کم) جبکہ تیسرے درجے کے مسافروں کا کرایہ، ریلوے کمپنیوں کے لیے منافع کا بنیادی سرچشمہ تھا۔ مقبول ٹرانسپورٹ کی طلب اور رسد کو مساوی رکھنے کے لیے، ریلوے لائنیں بچھانے کے لیے، کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

اور یقیناً، نسل پرستی کی عملداری تھی؛ حالانکہ گوروں کے لیے وقف ڈبے جلد ہی معاشی حوالے سے قابل عمل ہونے کی بنیاد پر منسوخ کر دیے گئے، ہندوستانیوں کو دستیاب سستی جگہ ان کی تعداد کے حساب سے انتہائی ناکافی لگ رہی تھی۔ (آزادی کے بعد ایک انوکھے کارٹون نے اس صورتحال کو پوری طرح گرفت میں لیا: اس میں ایک پرہجوم ٹرین دکھائی گئی، جس میں لوگ لٹکے ہوئے ہیں، کھڑکیوں کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں، خطرناک طریقے سے چھت پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں، اور اپنے تیسرے درجے کے ڈبے سے باہر نکلے پڑ رہے ہیں، جبکہ سولا ہیٹ پہنے دو برطانوی ایک درجہ اول کے ڈبے میں بیٹھے ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں، 'میرے پیارے رفیق، اس ٹرین پر کوئی بھی نہیں!')

جیسا کہ ڈیورانٹ نے نشاندہی کی تھی، ریلوے، بہر حال، 'برطانوی فوج اور برطانوی تجارت کے مقاصد'

کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔... 'انھیں سب سے زیادہ جو آمدن ہوتی تھی، وہ امریکہ کی طرح مصنوعات کی ترسیل سے نہیں (کیونکہ برطانوی تاجر ریٹ کنٹرول کرتے تھے) بلکہ تیسرے درجے کے مسافروں سے ہوتی تھی__ ہندوؤں سے؛ لیکن ان مسافروں کو تقریباً چٹیل گاڑیوں میں ذبح کیے جانے والے جانوروں کی طرح غول میں اکٹھا کیا جاتا، ایک ڈبے میں بیس یا اس سے زیادہ۔۔۔۔'

نہ ہی ہندوستانیوں کو ریلویز میں بھرتی کیا جاتا۔ انڈین ریلویز میں امتیازی بھرتی کے دستور کا مطلب تھا کہ کلیدی صنعتی مہارتیں ہندوستانی لوگوں کو مؤثر انداز میں منتقل نہیں کی جائیں گی، چاہے ان سے کوئی فائدہ ہی ہوتا ہو۔ مروجہ نقطہ نظر یہ تھا کہ 'سرمایہ کاری کے تحفظ' کے لیے ریلویز میں تقریباً بلا شرکت غیرے یورپیوں کو بطور عملہ بھرتی کرنا ہوگا۔ یہ خاص طور پر سگنل دینے والے ملازمین کے بارے میں درست تھا، اور ان کے حوالے سے جو دخانی ٹرین چلاتے اور مرمت کرتے، لیکن پالیسی کو بیہودگی کی اس حد تک پھیلا دیا گیا، کہ بیسویں صدی کے اوائل میں بھی، ریلوے بورڈ کے ڈائریکٹران سے لے کر ٹکٹ کلکٹر تک، تمام کلیدی ملازمین گورے تھے__ جن کی تنخواہیں اور وظائف ہندوستانی نہیں بلکہ یورپی معیار پر ادا کیے جاتے اور بڑی حد تک پیچھے انگلینڈ بھجوا دیے جاتے۔ مزید یہ کہ جب پالیسی میں نرمی کی گئی اور مہنگے یورپی محنت کشوں کو کم کیا گیا، تو بھی 'بالکل برطانویوں جیسے' محنت کشوں کی ایک مسلسل تلاش رہی۔ تب ریلوے ملازمتوں کے ساتھ طویل عرصے سے قائم اینگلو انڈین کمیونٹی کی شناخت کی باری آئی، اس وقت آغاز میں فوجی یتیم خانوں سے یہی یوریشیائی تھے، برطانوی 'دوجے رینکس' اور مقامی ہندوستانی عورتوں کے درمیان تعلقات کی پیداوار، جو ان نوکریوں کے کرنے کے لیے تربیت یافتہ تھے، جن کے بارے میں قیاس کیا جاتا تھا کہ ماضی میں صرف یورپی ہی کرنے کے اہل تھے۔ (انسانی نسلوں کی برتری کے علم [یوجینکس] کے برطانوی تصور کو مد نظر رکھتے ہوئے، اور چونکہ اینگلو انڈین کوئی بہت بڑی کمیونٹی نہیں تھی، اس کے بعد 'جنگجو سکھوں' اور پیلی جلد والے پارسیوں کو بھی بھرتی کیا گیا، اگرچہ انھیں صرف سٹیشن احاطے کے اندر انجن چلانے کی ذمہ داری سونپی گئی اور کم ٹریفک والے سٹیشنوں پر ملازمت دی گئی۔)

ریلوے کے معاملات پر برطانوی نسل پرستانہ نظریات پورے عروج پر تھے: یہ یقین کیا جاتا تھا کہ، ایمرجنسی سے نمٹنے کے لیے، ہندوستانی 'قوت فیصلہ اور اوسان بحال رکھنے کی طاقت' نہیں رکھتے، اور یہ کہ ریلوے قوانین کی 'ہوبہو پیروی پر عملدرآمد کے لیے ان کے پاس شاذ ہی مناسب کردار ہے'۔ جب 1870 میں

معاشی وجوہات کی بنا پر انڈینائزیشن کی کوشش کی گئی، تو ریلوے عہدیداروں نے دلیل پیش کی کہ ایک یورپی کا کام کرنے کے لیے تین ہندوستانی چاہیے ہوں گے۔ ہندوستانی ملازمین کے خلاف نسل پرستانہ مزاحمت اتنی شدید تھی کہ ڈرائیوروں کی ٹریننگ کا منصوبہ تین سال کی کوشش کے بعد ترک کر دیا گیا، اور ڈرائیور جنھیں ٹریننگ دی جا چکی تھی کو دوبارہ احاطے میں کام تک محدود کر دیا گیا۔

1861 کے کونا گر اور بیلی کے درمیان ڈاک گاڑی اور مال گاڑی کے ٹکراؤ کی طرح، یہاں بھی، پیچھے بیان کردہ برطانوی نوآبادیاتی انصاف کے دہرے معیار، کا کافی ثبوت دستیاب تھا۔ مال گاڑی کا یورپی ڈرائیور اور گارڈ دونوں نشے میں دھت تھے اور سو گئے، سوتے وقت فائرمین (کوئلہ جھونکنے والے) کو ٹرین کا انچارج بنا دیا۔ غریب آدمی اپنا کام کرتا رہا__ کوئلہ جھونکتا رہا__ اور اس کی ٹرین جیسا کہ ہونا تھا ایک ڈاک گاڑی کے ساتھ جا ٹکرائی۔ جب حادثے کی تفتیش کی گئی، تو الزام اس مدہوش یورپی کے طرزِ عمل کی بجائے، بنگالی سٹیشن ماسٹر کی غیر حاضری پر لگا دیا گیا۔

دوسرے الفاظ میں دہرا معیار جیت گیا: جبکہ برطانیہ میں یہ عمومی دستور تھا کہ فائرمین سے لے کر ڈرائیور تک یا چھوٹے دیہی سٹیشن سے لے کر بڑے سٹیشن کے سٹیشن-ماسٹر تک کی ترقی کو میرٹ کی بنیاد پر یقینی بنایا جائے، ہندوستان میں یہ نہیں ہوا کیونکہ ان جونیئر عہدوں پر ہندوستانیوں کا قبضہ تھا، ان کی ترقی ان عہدوں پر ہونی تھی جن پر بہر صورت یورپیوں کا قبضہ تھا۔ 1900 تک، تنخواہ، ترقی اور نوکری کی اہلیت کے ضوابط، یا جسے ہم آج ہیومن ریسورس مینجمنٹ کے قوانین کے طور پر بیان کریں گے، میں ملازمین کو 'یورپی، یوریشیائی، خالص یا مکس نیگرو سلسلہ نسب کے مغربی ہندوستانی، غیر ہندوستانی ایشیائی، یا ہندوستانی' میں مزید تقسیم کیا گیا تھا۔ ملازمت پر مقامی میڈیکل آفیسر، امیدوار کی نسل اور ذات پات کی شناخت کی تصدیق کرے گا اور اس کی ہسٹری شیٹ پر یہ لکھے گا__ یوں اس کی آئندہ کی تنخواہ، چھٹیاں، الاؤنسز، اور ممکنہ ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے باقی ماندہ کیریئر کے لیے ریلوے کے سلسلہ مراتب میں اس کے رتبے کا تعین کرے گا۔

ہندوستان کے لیے انجینئرز پیدا کرنے کے لیے 1872 میں، لندن کے قریب کوپر ہل میں رائل انڈین انجینئرنگ کالج قائم کیا گیا، جس میں صرف انھی امیدواروں کو قبول کیا جاتا جو حساب، سائنس، لاطینی، یونانی، جرمن، انگریزی ادب اور تاریخ کے مضامین میں پاس ہونے کی اہلیت رکھتے__ قواعد و ضوابط ہندوستانی امیدواروں کی اکثریت کو باہر رکھنے کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ ان قوانین سے مطلوبہ نتیجہ حاصل ہوا: 1886

میں، پبلک ورک ڈیپارٹمنٹ (پی-ڈبلیو-ڈی) کے 1015 انجینئروں میں سے صرف 86 ہندوستانی تھے۔

نسل پرستی، برطانوی معاشی مفادات کے ساتھ یکجا ہو کر قابلیت کو برباد کر رہی تھی۔ ٹرینوں کی دیکھ بھال کے لیے، جیمل پور بنگال میں اور اجمیر راجپوتانہ میں ریلوے ورکشاپس 1862 میں قائم ہوئیں، لیکن ان کے ہندوستانی مکینک اتنے مشاق ہو گئے کہ 1878 میں انھوں نے اپنے خود کے ریل انجن ڈیزائن کرنے اور بنانے شروع کر دیے۔ ان کی کامیابی نے برطانویوں کے لیے بتدریج خطرے کی گھنٹی بجائی، کیونکہ ہندوستانی ریل انجن اتنے ہی اچھے تھے، اور ان کی نسبت بہت حد تک سستے بھی، جو برطانیہ میں بنائے گئے تھے۔ چنانچہ 1912 میں، برطانویوں نے پارلیمنٹ سے ایک قانون پاس کروایا، واضح طور پر ہندوستانی ورکشاپس کے لیے ریل انجن (لوکوموٹیوز) ڈیزائن کرنا اور بنانا، ناممکن بنا دیا۔ قانون نے ہندوستانی فیکٹریوں کو وہ کام کرنے سے روک دیا جو وہ تین عشروں تک کامیابی سے سرانجام دے چکی تھیں؛ اس کی بجائے، انھیں برطانیہ اور صنعتی دنیا سے درآمد کردہ ریل انجنوں کی صرف دیکھ بھال کی اجازت دی گئی۔ 1854 اور 1947 کے دوران، ہندوستان نے تقریباً چودہ ہزار چار سو ریل انجن انگلینڈ سے درآمد کیے (برطانوی ریل انجنوں کی تمام پیداوار کا قریب دس فیصد)، اور مزید تین ہزار کینیڈا، امریکہ اور جرمنی سے، لیکن 1912 کے بعد ہندوستان میں کوئی نہیں بنایا گیا۔ آزادی کے بعد، پینتیس سال گزر چکنے پر، ہندوستان پرانا تکنیکی علم اس حد تک بھول گیا کہ ہندوستان ریلوے کو عاجزی کے ساتھ برطانیہ کے پاس جانا پڑا کہ دوبارہ انھیں ہندوستان میں ریل انجن تیار کرنے کی (لوکوموٹیو) فیکٹری بنانے میں رہنمائی کرے۔

تاہم، اس داستان کے بعد ایک موزوں ضمیمہ بھی تھا۔ برطانوی ریلویز کے لیے ٹیکنالوجی کی حقیقی مشیر (کنسلٹنٹ)، لندن کی رینڈل پالمر اور ٹریٹن، اب تقریباً مکمل طور پر ہندوستانی تکنیکی مہارت پر انحصار کرتی ہے، جو انھیں انڈین ریلویز کا ایک ذیلی ادارہ رائٹس (آر۔ آئی۔ ٹی۔ ای۔ ایس) مہیا کرتا ہے۔

یہ اکیسویں صدی کے تبصرہ نگار کے اطمینان بخش زاویہ نظر سے عہدِ ماضی پر کی گئی تنقید سے بہت مختلف ہے۔ اس کے برعکس، انیسویں صدی کے ہندوستانی اس وقت کے بے حس استحصال میں ریلویز کے مکروہ کردار سے پوری طرح باخبر تھے۔ بنگالی اخبار سماچار نے 30 اپریل 1884 کو لکھا، ہندوستان کے لیے 'لوہے کی سڑکوں کا مطلب لوہے کی زنجیریں ہیں' ___ اس نے دلیل پیش کی، مقامی ہندوستانی صنعت کو ختم اور ہندوستانی غربت میں اضافہ کرتے ہوئے، بدیسی اشیاء زیادہ آسانی سے گردش کر سکیں گی۔ 1890 میں، جی وی جوشی، جے ایس آئیر،

گوپال کرشنا گوکھلے اور دادابھائی نوروجی جیسی قوم پرست آوازیں عوامی سطح پر بلند کی گئیں، جنھوں نے یہ نشاندہی کی کہ ہندوستان کے لیے ریلوے کے فوائد کتنے محدود تھے، کیسے تمام منافع باہر غیر ملکیوں کے پاس چلا گیا، اور ہندوستانی محکمہ مالیات پر کتنا بڑا بوجھ تھا۔ انھوں نے یقینی طور پر نشاندہی کی، کہ رقم جو ہر سال انگلینڈ کو بطور سود بھیجی گئی، وہ ہندوستانی صنعت، تعمیراتی ڈھانچے (انفراسٹرکچر) کے کاموں جیسا کہ آبپاشی، (خاص طور پر آبپاشی، جس سے ہندوستانی کسان کی مدد ہو جاتی، اور جس پر ریلوے پر ہونے والے اخراجات کا صرف نواں حصہ حکومتی فنڈز خرچ ہوتے) میں پیداواری سرمایہ کاری کے طور پر استعمال کی جا سکتی تھی، یا مقامی معیشت کو تقویت دینے کے لیے محض ہندوستان میں خرچ کی جا سکتی تھی۔ گوکھلے نے اعلان کیا کہ 'ہندوستانی عوام محسوس کرتے ہیں کہ، بنیادی طور پر انگریز بیوپاری اور سرمایہ دار طبقے کے مفادات کے لیے [ریلوے] کی تعمیر کا بیڑا اٹھایا گیا ہے، اور یہ ہمارے وسائل کے مزید استحصال میں مدد فراہم کرتی ہے'۔ ہندوستانیوں نے اس وقت مزید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ یہ دلیل ایک فراڈ ہے کہ ریلوے قحط سالی سے مقابلے کا ایک وسیلہ ہو گی، اور عوام کی عمومی معاشی حالت کو بہتر بنائے گی؛ در حقیقت، ریلوے کے باوجود، جس نے صرف اناج اور دوسری زرعی اجناس کی برآمد کو آسان بنایا، قحط مسلسل موجود رہے، جس سے فقط فاضل اشیاء خوردنی کو مؤثر انداز میں منتقل کیا گیا، جو شاید قحط کے خلاف ایک مدافعتی پشتے (ذخیرے) کا کردار ادا کرتیں۔

اس کے علاوہ بھی تنقیدی تبصرے تھے۔ گاندھی نے سوراج میں دلیل پیش کی کہ ریلویز نے گلٹی والا طاعون پھیلایا ہے۔ ریلوے کی تعمیر کے ماحولیاتی اثرات نے اس وقت بھی اندیشوں کو جنم دیا تھا۔ بنگال ڈیلٹا میں سارا-سراج گنج لائن کی تعمیر میں، پلوں اور سیلن کے اثرات پر اٹھنے والے مصارف کو کم کرنے کی خاطر، پانی کی گزرگاہوں کو روکنے کے لیے زمینی پشتے کھڑے کیے گئے۔ ایسا کرتے ہوئے، شمال مغرب کے بہت وسیع قابل کاشت رقبے کو پانی میں غرق کر کے، ان کے زرعی امکان کو برباد کرتے ہوئے، انھیں ناقابل استعمال بنا دیا گیا۔ 1918 کے سیلاب کے دوران ریلوے کے پشتے، پانی کی قدرتی گزرگاہوں میں رکاوٹ پیدا کر کے، قیامت خیز سیلاب کا باعث بنے۔

ریلوے کی ترقی کے ساتھ مارکیٹ میں بھی بگاڑ پیدا ہوا۔ مثال کے طور پر، چاول کی قیمت میں تیزی سے اضافے کے لیے، ریلوے ذمہ دار تھی۔ ریلویز کے آنے سے پہلے، پانی میں چلنے والی کم رفتار ٹرانسپورٹ، فاضل (پیداوار) کو اضلاع کے اطراف پھیلاتی تھی، یوں کسی بھی طے شدہ علاقے میں قیمتیں کم رہتیں۔ لیکن

ریلوے نے بڑی صفائی کے ساتھ فاضل پیداوار کا نکاس ہونے دیا، چاول کے پیداواری علاقے کے کسانوں کو (اور غیر روایتی معیشت میں شرکت کرنے والوں کو)، فی الحقیقت شہری ہندوستانیوں اور چاول کے برآمد کنندگان کے ساتھ براہ راست مسابقت میں ڈال دیا۔ یہی مچھلی منڈی کے بارے میں بھی درست تھا۔

اور یہ دیکھانے کے لیے دوسری مثالیں بھی ہیں کہ ریلوے کی کارروائیوں کے لیے ہندوستانیوں کا مفاد، کیسے کبھی ایک عنصر نہیں رہا: پہلی جنگ عظیم کے دوران، متعدد ریلوے لائنیں اکھاڑی گئیں اور بحری جہازوں میں بھر کر، میسوپوٹامیا میں اتحادی افواج کی امداد کے لیے ملک سے باہر لے جائی گئیں!

لہٰذا، مجموعی طور پر، ممتاز مؤرخ بیپن چندر کا فیصلہ برقرار رہتا ہے۔ اس نے لکھا، ہندوستان میں ریلویز کی تعمیر کے برطانوی محرکات 'خسیس اور خود غرضانہ تھے.... ہندوستانی محاصل کے رِسک اور اخراجات کی بنیاد پر... برطانوی تاجروں، صنعتکاروں اور سرمایہ کاروں کے مفادات کا فروغ'؛ ان کا 'بنیادی مقصد ہندوستان کے قدرتی وسائل کی لوٹ مار میں برطانوی انٹرپرائز کو معاونت فراہم کرنا تھا'۔

میں نے ثابت کر دیا، جس کی میں کوشش کر رہا تھا Quod erat demonstrandum

تعلیم اور انگریزی زبان

میری آکسفورڈ کی تقریر کے جواب میں ایک برطانوی بلاگر نے ایک ہندوستانی نوجوانوں کی ویب سائٹ پر لکھا، 'برطانیہ نے ہندوستان کو آزادی کے ضروری لوازمات مہیا کیے'۔ جدید جمہوریت، ایک دستور کے حامل خود مختار ملک کا تصور اور مدنی حقوق کی ضمانت، ہندوستان میں بدیس کے پڑھے لکھے ہندوستانی لے کر آئے، جس کی سب سے معروف مثال بیرسٹر موہن داس کرم چند گاندھی کی ہے، جن کی آزادی کے لیے خدمات بے معنی نہیں۔ انگریزی زبان کو مت بھولیں، جس کے بغیر ہندوستان بھر میں احتجاج اور بعد میں ابلاغ اور ثقافت ناقابل تصور تھے۔

یہ کیس عموماً نیک نیت افراد بناتے ہیں، اور شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مہاتما گاندھی کا جمہوریت اور مدنی حقوق کا تصور برطانوی حکمرانی کے خلاف مزاحمت سے پیدا ہوا، نہ کہ اس کی حمایت سے۔ پھر بھی انگریزی زبان کی سوغات سے انکار نہیں کیا جاسکتا __ بہرحال، جیسا کہ میں لکھتے ہوئے اسے استعمال کر رہا ہوں __ اور نہ ہی نظامِ تعلیم سے، جس سے ایک بار پھر، میں نے استفادہ حاصل کیا ہے۔ لہٰذا ہم ان دونوں کو بنظر غائر دیکھتے ہیں۔

برطانوی سولہ فیصد شرح خواندگی، اور آٹھ فیصد خواتین میں شرحِ خواندگی کے ساتھ ہندوستان چھوڑ کر گئے__ 1947 میں بارہ میں سے ایک ہندوستانی عورت پڑھ اور لکھ سکتی تھی۔ یہ کوئی بہت درخشاں ریکارڈ نہیں ہے، بلکہ عوام کو تعلیم دینا برطانوی ترجیح نہیں تھی۔ جیسا کہ ول ڈیورانٹ نشاندہی کرتا ہے، 'جب برطانوی آئے، تو پورے ہندوستان میں اجتماعی سکولوں کا نظام تھا، جس کا انتظام دیہی کمیونٹیاں کرتی تھیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹوں نے ان دیہی کمیونٹیوں کو برباد کر دیا، اور سکولوں کی بحالی کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے؛ حتیٰ کہ آج [1930]... وہ اپنے سو سال پہلے کے ہند سے چھیاسٹھ فیصد پر کھڑے ہیں۔ ہندوستان میں اس وقت سات لاکھ تیس ہزار دیہات ہیں، اور صرف ایک لاکھ باسٹھ ہزار پندرہ پرائمری سکول۔ صرف سات فیصد لڑکے اور ایک فیصد لڑکیاں سکول جاتے ہیں، یعنی کل چار فیصد۔ حکومت کے ایسے قائم کردہ سکول مفت میں نہیں تھے، بلکہ ایک ٹیوشن فیس لیتے تھے جو... ہمیشہ فاقہ کشی کے کنارے پر منڈلاتے ہوئے خاندانوں کے لیے بہت بڑی نظر آتی ہے'۔

دوسرے الفاظ میں، برطانوی تعلیمی پالیسی، میں ایسا کچھ خاص نہیں جس کی توصیف کی جائے۔ اس نے بھرپور ہندوستانی روایت کی بیخ کنی کی اور اسے برطرف کر کے اس کی جگہ لے لی: گرو-شیشیا پرمپرا کا روایتی طریقہ (جس میں طلباء اپنے اساتذہ کے ساتھ رہتے اور غور فکر کے ایک پورے نظام کو جذب کرتے تھے) جو ہندوستان میں فروغ پا چکا تھا، جیسا کہ بہت سی خانقاہیں جو تعلیم کے اہم مراکز بنتی رہی تھیں، جن میں دور دراز کے ممالک سے طلباء آتے تھے، خاص طور پر ہمارے ساحلوں سے اتنی دور سے جتنے چین اور ترکی۔ خاص طور پر، پالا مملکت کے دور میں (آٹھویں اور بارہویں صدی عیسوی کے دوران)، متعدد خانقاہیں وہاں پیدا ہوئیں جسے آج موجودہ بنگال اور بہار کہا جاتا ہے، ان میں سے پانچ__ وکرماشیلا، نالندہ، سوماپورہ مہاویر، اودنتاپوری اور جگادالا__ اعلیٰ درجے کے تعلیمی ادارے تھے جنھوں نے ہندوستانی حکمرانوں کے زیرِ اہتمام اپنے درمیان ایک مربوط تعلق قائم کیا۔

نالندہ یونیورسٹی، جس نے بین الاقوامی شہرت کا لطف تب اٹھایا جب آکسفورڈ اور کیمبرج کی جھلک بھی ابھی ان کے بانیوں کی آنکھوں میں نہیں پڑی تھی، ایک قابلِ ذکر کیمپس جس کی خصوصیت نو منزلہ لائبریری تھی، میں دو ہزار اساتذہ نوکری کرتے تھے اور دس ہزار طلباء رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بھکشو مسودات اور کتابوں کی تحریری نقول تیار کرتے جو بعد میں اس اکیلے متعلم کے نجی ذخیرہ (کتب) کا حصہ بن جاتیں۔

یونیورسٹی کے دروازے مشرق میں کوریا، جاپان، چین، تبت اور انڈونیشیا سے لے کر مغرب میں فارس اور ترکی تک کے ممالک کے طلباء کے لیے کھلے ہوئے تھے، پڑھائے جانے والے مضامین میں فنونِ لطیفہ، طب، ریاضی، علم ہیئت، سیاسیات اور فنون حرب شامل تھے۔ ساتویں صدی میں، ان میں بہت سے مشہور چینی علماء تھے جنھوں نے نالندہ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی اور وہاں پڑھایا۔ ہو آن سانگ (تانگ سلطنت سے چو آن زانگ) نے یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور پھر پانچ سال تک وہاں پڑھایا، اس دوران نالندہ میں گزارے اپنے وقت کی تفصیلی روداد بھی چھوڑی۔

مسلم حکمرانی کے دور میں، مدارس، جو مذہبی تعلیم کے لیے خاص طور پر مسلمانوں کے لیے کھولے گئے تھے، ان کے علاوہ مکتب بھی تھے، جو ہندوستانی طلباء کو ایرانی اسلامی تعلیم سے بہرہ مند کرتے تھے، عام طور پر اردو زبان میں (حالانکہ عربی اور / یا فارسی بھی پڑھائی جاتی تھی)۔ برطانویوں کے قبضہ کرنے سے پہلے، مغلوں کی درباری زبان فارسی تھی اور آبادی کے مسلمان حصے میں اردو مستعمل تھی ــ فارسی، عربی اور سنسکرت کا مرکب۔ شمالی ہند کے بہت سے ہندو بھی اردو اور فارسی میں اکتساب علم کرتے تھے۔ (جنوب میں، بہت سی علاقائی زبانوں کا غلبہ تھا۔) 1850 سے پہلے، مکتب ایک ابتدائی تعلیم (اور بعض میں ثانوی) کا ادارہ تھا، جو سیکولر تعلیم کے لیے استعمال ہوتا تھا: جو مضامین پڑھائے جاتے ان میں پبلک ایڈمنسٹریشن، تجارت اور دانشورانہ و ثقافتی مشاغل جیسے کہ شاعری، شامل تھے۔ مکتب، طبقہ اشرافیہ کے ممبران کے لیے کھلے تھے، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے (بعض جگہوں میں، اول الذکر مؤخر الذکر سے زیادہ ہوتے تھے)۔ بہت سے مکاتب انیسویں صدی کے وسط میں بند ہو گئے، کیونکہ ان کے اشراف طلباء، اپنی تعلیم کے بعد، ترقی کے بہتر مواقع کی امید پر، نو آبادیاتی سکولوں کی طرف راغب ہو گئے تھے۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر / انیسویں صدی کے اوائل تک، راجہ رام موہن رائے، جن کی، ترقی پسند اور جدید ذہن کے مصلح کے طور پر انگریز بھی تعریف کرتے رہے تھے، نے اپنی رسمی تعلیم ایک دیہاتی سکول یا پاٹھ شالا سے شروع کی، جہاں انھوں نے بنگالی، کچھ سنسکرت اور فارسی سیکھی؛ بعد میں نو سال کی عمر میں، پٹنہ میں ایک مدرسے میں فارسی اور عربی پڑھی، اور دو سال بعد، سنسکرت اور ہندو مقدس کتب، خاص طور پر وید اور اپنشد کی تعلیم کے لیے بنارس (کاشی) چلے گئے۔ اسی وقت انھوں نے انگریزی سیکھی اور ہندوستان میں برطانوی نظام تعلیم کی مطابقت اختیار کی، جس میں فضیلت حاصل کی۔ لیکن روایتی ہندوستانی علم و ہنر میں اس قسم کی

جامع بنیاد سازی، اور اس کے پیچھے پیچھے انگریزی تعلیم، پہلے ہی بالکل ناپید ہوتی جارہی تھی۔

خانقاہوں اور رسمی تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ، غیر رسمی ادارے اور تعلیمی طریقے بھی ہندوستان میں پروان چڑھ رہے تھے۔ ہندوستانی ثقافت میں زبانی تعلیم نے ہمیشہ ایک ممتاز مقام کا لطف اٹھایا ہے۔ قابل ذکر طور پر، گاندھی نے، ٹیکسٹ بکس پر مروجہ اصرار کی بجائے زبانی تعلیم کی وکالت کی: انھوں نے کہا 'ٹیکسٹ بکس کی میں نے کبھی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ شاگرد کے لیے حقیقی ٹیکسٹ بک اس کا استاد ہے'۔ اور اسی لیے اپنے چھوٹے سے آشرم 'جو انھوں نے ٹالسٹائی فارم کے نام سے جنوبی افریقہ میں بنایا' میں اپنے خیالات کے ابلاغ کے لیے، انھوں نے رسمی قلمی تالیفات کی ضرورت کو نظر انداز کرتے ہوئے، زبانی طریقے اختیار کیے۔ گاندھی کو یوں تحریک ملی کہ ویدوں اور رامائن و مہابھارت جیسی دوسری بنیادی ہندو تحریروں کا علم بھی ایک نسل سے دوسری کو زبانی منتقل ہوا تھا۔ زبانی روایت، نسلوں تک قایم رہی، اسی نے اس قدیم علم کو زندہ رکھا۔

لیکن جبکہ ان روایات نے ہندوستانی تعلیم کو ہماری ثقافت میں پیوست کر دیا، تو اس سادہ حقیقت سے کوئی فرار نہیں کہ جدید ہندوستان، برطانوی حکمرانی کے زیر اثر، اس میں سے کافی کچھ کھو چکا ہے، آزادی صرف سولہ فیصد شرح خواندگی کے ساتھ حاصل کی، اور ابھی تک اپنی آبادی کے بڑے حصے کو تعلیم دینے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ اکیسویں صدی کی گلوبلائزڈ دنیا کے عطا کردہ مواقع سے فائدہ اٹھا سکے۔ کم از کم، اس کے لیے کچھ قصور اس نظام تعلیم کا بھی بنتا ہے، جس کا نفاذ برطانویوں نے کیا۔ میسور اور مراٹھا جنگوں کے ہیرو، ممتاز میجر جنرل سر تھامس منرو، نے بھی، نشاندہی کی تھی کہ، 'ایک نظام کی پیروی میں، جس کا رجحان تمام لوگوں کے کردار کو پنچ بنانا ہو، تو ہمیں اس کردار کو تعلیم کے ذریعے بہتر کرنے کے بارے میں حد درجہ متفکر ہونے کا دعویٰ کرنا پڑے گا'۔ لفظ 'دعویٰ' کا استعمال، کمپنی کے ارادوں کے خلوص بارے اس ممتاز فوجی کے، اپنے شکوک کی نشاندہی کرتا تھا۔

یقیناً برطانیہ نے ہندوستان کو انگریزی زبان دی، جس کے فوائد آج تک موجود ہیں۔ یا کیا وہی (لوگ) تھے؟ انگریزی زبان ہندوستان کو دانستہ تحفہ نہیں تھا، بلکہ نو آبادیت کا ایک اور آلہ تھا، جو صرف انگریزوں کے کاموں کو سہل بنانے کے لیے ہندوستانیوں کو عطا کیا گیا۔ 1835 میں اپنی بدنام زمانہ تعلیمی یادداشت میں، لارڈ میکالے نے انگریزی تعلیم کے لیے اولین دلائل کا واضح اظہار کیا تھا، لیکن صرف ہندوستانیوں کی ایک چھوٹی سی اقلیت کے لیے: 'ہم لازماً ایک ایسا طبقہ پیدا کرنے کے لیے اپنی مقدور بھر کوشش کریں گے جو ہمارے اور

ان لاکھوں، جن پر ہم حکومت کرتے ہیں، کے درمیان، ترجمان ہو گا؛ افراد کا ایسا طبقہ، جو خون اور رنگ میں تو ہندوستانی ہو، لیکن ذوق، رائے، چال چلن اور فراست میں انگریز ہو'۔ حاکم اور محکوم کے درمیان وچولے کی خدمات کے لیے چند ایک کو زبان سکھائی گئی۔ ان ہندوستانیوں نے انگریزی زبان پر گرفت مضبوط کی اور اسے برطانیہ کے خلاف قوم پرستانہ جذبات کے اظہار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ___ ہماری اپنی آزادی کے آلے میں بدل دیا۔ جیسا کہ آر. سی. دت، ڈنشاہ واچا اور دادا بھائی نوروجی نے انیسویں صدی میں کیا اور جواہر لال نہرو نے بیسویں صدی میں ___ اس کا سہرا ان کے سر تھا، نہ کہ کسی برطانوی منصوبے کے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1792 میں، کمپنی کے ایک مسیحی مبلغ چارلس گرانٹ کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد، ہندوستانی تعلیم میں، دلچسپی لینا شروع کی، جس کا 'ماننا تھا کہ مغربی تعلیم اور عیسائیت، اخلاقی طور پر انحطاط پذیر سماج کی کایا کلپ کر دیں گے'۔ مشنری سکولوں کو قیام کے بعد، نظر ثانی شدہ چارٹر ایکٹ 1813 کے تحت قانونی شکل دی گئی، کمپنی کے کورٹ آف ڈائریکٹرز نے بنگال حکومت کو ایک مراسلے میں اس قانون کے نفاذ پر رہنمائی کی پیشکش کرتے ہوئے، یہ بھی نوٹ کیا کہ انگریزی 'یورپیوں اور مقامیوں کے درمیان ابلاغ کو بہتر بنائے' گی اور 'مروت اور احترام کے وہ دوطرفہ احساسات پیدا کرے گی جو ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے مستقل مفادات کے لیے ضروری ہیں'۔ دوسرے الفاظ میں، یہ محض عیسائی مشنری ولولے سے متعلقہ نہیں تھا؛ اسے کمپنی کے مفادات کے نقطہ نظر سے بھی دیکھنا پڑے گا۔ مقامیوں کی ترجیحات کو صرف تبھی مد نظر رکھا جائے، جب کبھی ہماری ریاستوں کی حفاظت کے لیے ایسا کیا جا سکے۔

عیسائی مبلغین انگریزی تعلیم کو 'ہندو اور مسلم تدریس' دونوں کے فاسد اثرات کے خاتمے کے وسیلے کے طور پر دیکھتے تھے، جبکہ، فلسفی جیمز مل اور اس کے پیروکار ہندوستان میں مغربی سائنس اور تعلیم کی ترویج کو افادیت پسند نقطہ نظر کے حوالے سے دیکھتے تھے۔ تاہم، مل یہ رائے نہیں رکھتا تھا کہ انگریزی ہی وہ زبان تھی جو اس کا اثر زائل کرے گی؛ اس کی بجائے وہ ترجیح دیتا تھا کہ متون کا مقامی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔ اس کے لیے وہ 1813 کے چارٹر سے بھی حمایت تلاش کر سکتا تھا، جو 'ادب کے احیاء اور ترقی، اور فاضل مقامی ہندوستانیوں کی حوصلہ افزائی' کے لیے بھی تجاویز فراہم کرتا تھا۔

ان بظاہر متناقض مقاصد کے درمیان تصفیہ نہیں ہو سکتا تھا، تاہم، ہندوستانی معاملات جن کے سپرد تھے، ان پر بہت جلد یہ واضح ہو گیا، کہ ایک یا دوسرا کرنا پڑے گا۔ دونوں مکاتب فکر میں ایک بحث شروع ہو گئی، لیکن

اس میں کوئی ابہام نظر نہیں آتا تھا کہ کمپنی کس کی طرفدار تھی۔ ہندوستانیوں کو سنسکرت یا عربی پڑھانا کمپنی کے معاملات کے لیے عملی طور پر کوئی خاص فائدہ مند ہونے والا نہیں تھا، لیکن وہ ہندوستانی جو انگریزی پڑھ اور لکھ سکتے تھے، چاہے کتنی ہی بری طرح بولتے ہوں، درحقیقت برطانویوں کے لیے سودمند ہو سکتے تھے۔

مستشرقین اور انگریزی دانوں کی اس بحث میں انگریزی دان غالب رہے __ عام طور پر یہی یقین کیا جاتا ہے، ان کے مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے لارڈ میکالے کو سلام پیش کیا گیا، جسے عوامی تدریس کی کمیٹی کا سربراہ تعینات کیا گیا تھا۔ کچھ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے نظامِ تعلیم میں میکالے کے کردار کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا تھا، اور یہ کہ جن قوتوں کی وہ نمائندگی کرتا تھا، وہ شاید کسی بھی طرح کامیاب ہو ہی جاتیں۔ گورنر جنرل ولیم بینٹنک، انگریزی زبان دانوں کے مقصد کا کھلم کھلا حامی تھا، اور کمپنی کے زیر تسلط ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی پالیسی کا نفاذ شروع کر چکا تھا، ان کا کہنا تھا کہ میکالے کا کام مروجہ پالیسی کا جواز تراشنا تھا نہ کہ کوئی نئی (پالیسی) مرتب کرنا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا انگریزی زبان دانوں کے مقصد کو مربوط بنانا، تعلیم کے میدان میں نوآبادیاتی عزائم کی سب سے واضح اور دوررس اثرات کی حامل عرضداشت رہی ہے، مشرقی تدریس کے برملا حقارت آمیز رد کے لیے ہندوستان میں بدنام ترین، اور اس پوری انٹرپرائز کے نقادوں کی جانب سے، سب سے زیادہ حوالہ اور غلط حوالہ کی مستوجب۔ (آج تک عموماً غیر انگریزی زدہ نقاد، انگریزی بولنے والے ہندوستانیوں کو 'میکالے کے پتر' یا 'میکالے کے بیٹے' کے طور پر یقیناً انگریزی میں ہی، ملامت کرتے ہیں۔)

میکالے، اپنی 'تعلیم پر یادداشت' (منٹس آن ایجوکیشن)☆ میں غیر مصالحت پسند رہا، اور بہت سے (لوگ) تکبر سے کہیں گے، اس معاملے میں اس کا رویہ نسل پرستانہ تھا۔ اس کا نقطہ نظر، جو اصلاح پسند گورنر جنرل کے (نقطہ نظر کے) ساتھ رائج ہوا، یہ تھا کہ 'لوگوں کے وہ طبقات، جن کے پاس اعلیٰ تعلیم تک رسائی کے وسائل ہیں، کی دانشورانہ اصلاح، موجودہ حالات میں صرف کسی ایسی زبان کے ذریعے ممکن ہو سکتی ہے، جو ان کے لیے مقامی زبان نہ ہو'۔ مشرق کے بارے میں اپنی جہالت کے باعث اس نے اپنی خوداعتمادی کو زائل نہیں ہونے دیا۔ اس نے انگشت نمائی کرتے ہوئے اعلان کیا، 'ایک اچھی یورپی لائبریری کی ایک الماری کی قدروقیمت ہندوستان اور عرب کے سارے علمی خزانے کے برابر تھی'، جبکہ اس نے تسلیم کیا کہ جسے وہ رد کر رہا

☆ ایک ہندوستانی ٹھٹھے باز نے قافیے کی موزونیت کے ساتھ 'میکالے کی طفلانہ یادداشت' کا خطاب دیا۔

تھا اس علمی خزانے میں سے کوئی ایک تصنیف بھی اس نے نہیں پڑھی۔ 'ہمیں ایک ایسی قوم کو تعلیم دینا پڑے گی جسے موجودہ حالات میں ان کی مادری زبان میں تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ ہمیں لازماً انھیں کوئی غیر ملکی زبان سکھانا پڑے گی۔ ہماری اپنی زبان کے دعوؤں کو دہرانے کی ضرورت بمشکل ہی ہے۔ حتیٰ کہ مغرب کی زبانوں میں بھی یہ برتر درجے پر فائز ہے۔ ہندوستان میں انگریزی، حکمران طبقے کی بولی ہے۔ یہ حکومتی عہدوں پر مقامی طبقہ اعلیٰ کے لوگ بولتے ہیں...... تمام غیر ملکی زبانوں میں سے، انگریزی وہ زبان ہے جو ہماری دیسی رعایا کے لیے سب سے زیادہ کارآمد ہو گی...... جیسا کہ یونانی اور لاطینی ہم عصر موروں اور اسکاٹ کے لیے تھیں، ہماری زبان ہندوستان کے لوگوں کے لیے ہے...... مغربی یورپ کی زبانوں نے روس کو مہذب بنایا۔ مجھے کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ یہ ہندوؤں کے لیے وہی کریں گی جو انھوں نے تاتاریوں کے لیے کیا۔۔۔۔۔'

کسی ایسی غیر ملکی آبادی پر حکومت کے عملی قانونی پہلوؤں کے بارے میں کیا خیال ہے، جس کی کثیر تعداد اپنی رسوم و قوانین کی پیروی کرتی ہو؟ 'اس حقیقت پر بہت زور دیا گیا کہ ہندو قانون بالخصوص سنسکرت کی کتابوں سے سیکھنا پڑے گا اور محمدن قانون عربی کتابوں سے، لیکن لگتا ہے سوال پر بالکل بھی توجہ نہیں دی گئی۔ ہندوستانی قوانین کی تحقیق اور ان کی تالیف کا حکم ہمیں پارلیمان دیتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں لاء کمیشن کی اعانت مہیا کی گئی ہے۔ جیسے ہی [نیا برطانوی تیار کردہ قانونی] ضابطہ نافذ العمل ہو جائے گا، تو شاستر اور ہدایہ، منصف یا صدر امین کے لیے بیکار ہو جائیں گے۔ میں امید کرتا ہوں اور مجھے بھروسہ ہے کہ، لڑکے جو آج مدارس اور سنسکرت کالجوں میں داخل ہو رہے ہیں ان کی تعلیم مکمل ہونے سے پہلے، یہ عظیم کام پایہ تکمیل تک پہنچ جائے گا۔ بدیہی طور پر، پروان چڑھتی نسلیں، جن کے بارے میں ہمارا ارادہ ہے کہ ان کے جوانی میں قدم رکھنے سے پہلے تعلیمی نظام بدل دیں گے، کو موجودہ تناظر میں اس نقطۂ نظر کے ساتھ تعلیم دینا ناقابل فہم ہو گا'۔ (روایتی تعلیم کو کالعدم قرار دینے کا جواز مضحکہ خیز ہے: میکالے کے 1830 میں تیار کردہ تعزیراتی مسودے، کو برطانوی ایک نسل کے بعد ہی، 1861 میں قانون بنا پائے۔)

ان کے سر سہرا یہی تھا، کہ انگریزی زبان دانوں نے مقامی زبانوں کو مکمل طور پر رد نہیں کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ یورپی سائنسی اور ادبی علم، انگریزی بولنے والے ہندوستانیوں کے اعلیٰ طبقے کی وساطت سے نیچے عوام تک سرایت کرنا چاہیے۔ میکالے نشاندہی کر چکا تھا کہ 'ہمارے محدود وسائل کے ساتھ، ہمارے لیے یہ ممکن نہیں، کہ عوام کی جمعیت کو تعلیم دینے کی کوشش کریں'۔ لہٰذا، اس کے تعبیر کنندہ اعلیٰ طبقہ کو 'ہم ملک کی مقامی بولیوں

کو شستہ بنانے، مغربی فرہنگ سے 'مغربی' کی سائنسی اصطلاحات سے ان بولیوں کو زرخیز بنانے کی فرصت مہیا کر سکتے ہیں، اور آبادی کے بڑے حصے کو ترسیل علم کے لیے انھیں موزوں وچولے کی سند عطا کر سکتے ہیں'۔ ایک دوسرے انگریزی زبان دان نے 'مکمل طور پر یہ تسلیم کیا کہ عوام کے بڑے حصے کو ان کی اپنی زبانوں کے وسیلے کے ذریعے تعلیم دینی چاہیے، اور یہ کہ انھیں زرخیز اور بہتر بنانا چاہیے، تاکہ تمام تصورات اور علوم کا گراں قدر خزانہ ان کے سپرد کیا جائے، جو کہ پہلا اہم مقصد ہے'۔ بڑے پیمانے پر انگریزی تعلیم کبھی بھی برطانوی پالیسی نہیں تھی، اس لیے، ہندوستانیوں کو 'یورپی' سائنسی تعلیم سے بہرہ ور کرنا بھی ضروری نہیں تھا؛ تعلیم یافتہ ہندوستانی یہ کام اپنی زبانوں میں کریں گے۔

کسی حد تک، ایسا ہوا۔ 1825 میں، دہلی کالج، زیرِ غور مقصد کے ساتھ جزواً قائم ہوا؛ 1840 میں وہاں مقامی زبانوں کی ایک ترجمہ سوسائٹی قائم کی گئی، جس نے، مغربی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں اور کالج کے دوسرے عہدیداران کی مدد سے، تاریخ، قانون، سائنس اور طب کی انگریزی نصابی کتب کا اردو ترجمہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ 'جدید' مضامین پر ابتدائی نصابی کتب میں سے چند ایک تھیں، جو تازہ ترین مغربی نصاب کے پراپیگنڈا کے لیے لکھی گئیں، اور 1840 اور 1850 کے عشرے میں شمال مغربی صوبوں اور پنجاب میں مقامی زبانوں کی تعلیمی نصابی کتب کی ضرورت پوری کرتی تھیں۔ تاہم، یہ استدلال کرنا مشکل ہے کہ اس تعلیم کو بھی وہی رسائی اور رسوخ حاصل ہوا، جو ہندوستان میں انگریزی تعلیم کو ملا، جسے آج تک ہندوستانی سماج میں کامیابی اور اثر و رسوخ کا پاسپورٹ سمجھا جاتا ہے۔ انگریزی میں تعلیم یافتہ اکثر ہندوستانیوں نے اس زبان کو اپنے کیریئر میں ذاتی ترقی کے لیے استعمال کیا، نا کہ علمی مترجمین یا عوام کے لیے معلمین کے طور پر خدمات سرانجام دینے کے لیے؛ اور مقامی زبانوں میں تعلیم ایک یتیم شعبہ ہی رہا، ان بدنصیبوں کے لیے مخصوص رہا، جن کی اپنی انگریزی ان شعبوں، کے لیے کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی، جن میں نو آبادیت پسندوں کی زبان درکار تھی۔ 'انگریزی زبان دانوں' کا مقصد پورا نہیں ہوا، لیکن آپ حیران ہوں گے، کیا ان حالات میں، ایسا کبھی ہو سکتا تھا۔

برطانویوں کے زیر انتظام، یونیورسٹیاں بڑے پیمانے پر امتحان منعقد کرنے والے ادارے ہی رہے، جبکہ حقیقی اعلیٰ تعلیم الحاق شدہ کالجوں میں مکمل ہوتی، جو دو سالہ بی اے کا کورس آفر کرتے (ہائی سکول کے بعد ایک سالہ انٹرمیڈیٹ تعلیم کے تسلسل میں)۔ ہندوستان میں سکولوں کی طرح، کالج اسباق ازبر کرنے پر برطانوی بہت زیادہ زور دیتے، اس کا اگلنا ہی تھا جس کی امتحان میں آزمائش کی جاتی۔ امتحان میں فیل ہونا اتنا عام تھا کہ بہت

سے ہندوستانی، یہ دیکھانے کے لیے کہ وہ اس درجہ تک پہنچے، اپنے ناموں کے بعد 'بی اے (ایف)' کی سند کے طور پر بڑے فخر سے نمائش کرتے ('ایف'، فیل کا 'مخفف' تھا)۔ تعلیم ترک کرنے والوں کی شرح بہت زیادہ تھی، اور بی اے کی ڈگری کامیابی سے مکمل کرنے پر ایک کمیاب اور قابلِ ذکر اعزاز کے طور پر وسیع پیمانے پر مبارکباد پیش کی جاتی۔

ابھی تک، برطانوی اعلیٰ تعلیم کے نظام نے تجزیاتی استعداد یا تخلیقی سوچ کے فروغ کے لیے کچھ خاص نہیں کیا تھا اور یقیناً سوچنے کی آزادی بالکل بھی نہیں تھی۔ اس نے انگریزی کے بنیادی، سے تھوڑے زیادہ علم کا حامل گریجویٹ گروہ پیدا کیا، نوے فیصد کیسوں میں، کسی انگریز کے ساتھ مسابقت کے حوالے سے نااہل، لیکن سرکاری ملازمت کے نچلے زینے پر کلرک کے عہدے یا سرکاری سکول میں استاد کی نوکری حاصل کرنے کے لیے مناسب۔ (دوسرے دس فیصد، نظام کی حدود و قیود کے باوجود سبقت لے جاتے اور یا تو مختلف قسم کی ذاتی قابلیتوں میں بازی لے جاتے یا پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر انگلینڈ چلے جاتے۔) یہ اگرچہ بدتر تھا، فرد کو گریجویٹ بنا کر چھوڑ دیا__ ان میں سے ہر ایک__ اتنا زیادہ مغرب زدہ ہو گیا کہ اپنی ہندوستانی ثقافتی جڑوں سے بیگانہ ہو گیا۔ ایک سنئیر سرکاری عہدیدار نے 1913 میں کہا، ہندوستانی اس نظام کے زیرِ اہتمام تعلیم حاصل کرتے ہوئے 'ایک قسم کے دوغلے بن گئے۔ یہ ان کے انگریز آقاؤں کی وجہ سے تھا، جنھیں اس تصور کا خبط تھا کہ کسی کو 'تعلیم' دینے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسے لیپاپوتی کر کے انگریز بنا دیا جائے'۔

پورے برطانوی دور حکومت میں مسئلہ موجود رہا۔ لندن میں 1915 میں شائع ہونے والی ایک کتاب میں، ایک ہندوستانی قوم پرست گروہ نے اعلان کیا:

> تمام ہندوستانی آرزوؤں اور مضبوط کردار کے ارتقاء کو کچلا جا چکا ہے۔ ہندوستانی ذہن کو کسی بھی تخلیقی قوت کے لیے بانجھ بنایا جا چکا ہے، اور دانستہ جہالت میں رکھا گیا ہے... لوگوں کو برطانوی کنٹرول میں زیادہ مطیع رکھنے کے لیے، ایک التباس کے زیرِ اثر رکھا گیا ہے. عوامی کردار کو دانستہ بگاڑا گیا ہے، ان کے ذہنوں کو ڈی نیشنلائز کیا گیا و دائمی جہالت میں رکھا گیا اور انگلینڈ کی عظمت اور دنیا میں 'مشن' کی کہانیوں کی غذا فراہم کی گئی۔-----

جیسا کہ پنکھج مشرا نے بیان کیا:

> یورپ کے سامنے ایشیا کی محکومیت محض معاشی سیاسی اور عسکری نہیں تھی۔ یہ ذہنی، اخلاقی

اور روحانی بھی تھی: اس سے پہلے جن فتوحات کی شہادت ملتی ہے ان کی نسبت ایک بالکل مختلف قسم کی فتح تھی، جو اپنے شکار کو آزردہ کر چھوڑتی، لیکن جو اپنے فاتحین پر رشک بھی کرتے اور، بالآخر، ان کے جادوئی طاقت جیسے بھید سے آشنا ہونے کے متمنی ہوتے۔

ہندوستانی ذہن کو کامیابی سے نو آبادی بنانے کے عمل کی ایک دلچسپ مثال، رسوائے زمانہ انگریز نواز، بنگالی دانشور اور ہاتھوں ہاتھ بکنے والی، ایک انجان ہندوستانی کی خود نوشت (1951)، کے مصنف، نیراد - سی - چوہدری کی ہے، اس کا خجالت بھرا انتساب ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے نام کیا گیا:

ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے حافظے کے نام،

جس نے ہمیں محکومیت عطا کی،

لیکن شہریت سے محروم رکھا

ہنوز جس پر ہم میں سے ہر ایک چنوتی دیتا ہے:

'میں ایک برطانوی شہری ہوں'

کیونکہ جو کچھ اچھا تھا اور ہمارے بھیتر زندہ ہے

جسے بنایا گیا، صورت گری کی گئی اور جان ڈالی گئی

اسی برطانوی حکومت کی جانب سے

ایک براؤن آدمی کی روحانی پستی کے اس تماشے کے ساتھ ساتھ نو آبادیاتی جوتڑوں کو سونگھنے سے، چوہدری اس محققانہ مطالعہ کے لیے اشتہار پر چھپا بچہ بن گیا، کہ سلطنت، اپنی ثقافت اور سماج سے برگشتہ بلکہ نفرت کرتا ہوا، 'مقامی مخبر' کیسے بناتی ہے۔ چوہدری کی برطانوی سلطنت کی مدح اسے ہندوستانیوں کے سرعام رفع حاجت سے روکنے کی داد دینے تک لے گئی __ درحقیقت، ایک ایسا عمل، جسے بلاشبہ روکنا تو درکنار، کنٹرول کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہوئے، ماسوائے چند بڑے شہروں کے عوامی علاقوں کے۔ اس سے اپنے جسم کی ناپسندیدگی اور غیر ملکی حکومت کی آرزو کے مابین ایک متجسس باہمی تعلق کا اظہار ہوتا ہے: محقق آئین آلمنڈ بیان کرتا ہے، 'اپنی ذات کو دو جا بنانے کے دو طریقے، بگھی میں گھوڑوں کو آگے پیچھے جوتنے کا عمل استبداد زدہ (کلونائیزڈ) اور استبداد کار (کلونائیزر) کے درمیان حتمی فاصلے کی عکاسی کرتا ہے، بابو اور دیسی، ذہن اور جسم'۔ نو آبادیاتی تعلیم کے نتائج میں سے ایک چوہدری کا غیر ملکیوں کی پوجا کرنا تھا، جس کی جڑیں اس اعتقاد میں تھیں

کہ وہ 'ایک تارک وطن یورپی / آرین تھا، جو اپنے اجداد کی غلط سمت میں آوارہ گردی اور غیر موزوں آب وہوا میں آباد کاری کے باعث آج تک اذیت میں مبتلا تھا'۔ چوہدری نے تہتر سال کی عمر میں، بوریا بستر اٹھایا اور آکسفورڈ منتقل ہو گیا، وہاں سو سال تک زندگی گزارنے کے لیے۔ یقیناً اس کے ذہن میں تھا کہ اسے ہمیشہ وہیں رہنا ہے۔

چوہدری نے اپنی تبحر علمی بہت بیہودہ انداز میں ظاہر کی، یونانی اور لاطینی حوالے دے کر اور ایسی تلمیحات کو ایسے انداز میں انڈیل کر جو سولا ٹوپی کے ساتھ کب کی متروک ہو چکی تھیں۔ (اس میں کوئی شک نہیں کہ، رنگدار جلد والوں کی کچھ خاصیتیں ترجمہ نہیں ہو پاتیں۔) یہ اپنی ہی نوعیت کا تھا، کہ ہندوستانی ثقافت و تہذیب کے تمام قلعوں پر بے رحم حملوں کو ساحرہ کے برِاعظم (سرس)☆ کا عنوان دیا: حتیٰ کہ اسے اپنے بنیادی استعارے کے لیے بھی یونانی دیومالا سے رجوع کرنا پڑ رہا تھا۔ حالانکہ چوہدری نے ہندوستان کی اکثر برطانوی تاریخی کتب کو 'استعماری شیخی' سے کچھ بہتر کے طور پر رد کر دیا تھا، وہ برطانوی راج کے باعث بہکا رہا، حتیٰ کہ کلائیو کی غارتگری اور لوٹ مار میں عظیم استعماری پراجیکٹ کی 'شان و شوکت میں مساوی توازن' کے قیام کو دیکھتا رہا۔ محقق ڈیوڈ لیلیولڈ نے ایک موزوں تبصرے میں لکھا کہ 'نیراد چوہدری ایک فکشن ہے جسے اسی نام کے ہندوستانی مصنف نے تخلیق کیا___ استعماری ادب کے پیوند لگے کردار کی، بے سروپا، غضبناک اور جادوئی کایا کلپ، بنگالی بابو'۔ لیکن جب ہندوستان میں برطانوی، اپنی ہی طرز کے بابو کی، اپنے نوآبادیاتی آقاؤں کی ہمسری کی جزوی کامیاب کوششوں پر ہنستے، تو نیراد بابو مابعد استعماری برطانیہ پر یہ ثابت کرنا چاہتا کہ اس کا ٹھٹھا اڑانا ناممکن تھا۔ اس مرجھائی ہوئی صورت کی دید کے متعلق شاید کچھ ہلکا سا ٹھٹھول ہو، اس کی بے داغ بنگالی دھوتی، برطانوی تہذیب کے زوال پر آکسفورڈ گریہ وزاری کے متعلق رعونت، سے لگتا نہیں تھا اس کے ساتھ ایسا کچھ ہو چکا ہے۔

لیکن انگریز پرست کی مرہم پر ابھی ایک اور مہلک مکّھی موجود تھا۔ حتیٰ کہ نیراد چوہدری کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ برطانوی نسل پرستی، نخوت اور خلوت پسندی ('ہند-برطانوی نجی تعلقات کی تمام تر غلیظ تاریخ') نے سلطنت کے زوال میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ اس نے بڑی تلخی کے ساتھ، برطانوی رویے سے ہندوستانیوں

☆ Circe: (سرس) جڑی بوٹیوں اور عرقیات کے علم کی یونانی دیوی جو اپنی ادویات اور سحر کی مدد سے انسانوں کو مختلف جانوروں کا روپ دینے پر قادر تھی۔ اوڈیسی میں اوڈیسیس کی بھی اس دیوی سے ملاقات اس کے جزیرے پر ہوئی تھی جس میں وہ اس کے مذکورہ سحر سے بمشکل بچ پایا تھا (مترجم)۔

کی 'ناقابل برداشت رسوائی' اور 'قومی اور نجی ذلت' کے بارے میں لکھا۔ آئین آلمنڈ نے نشاندہی کی، نسل پرستی کی پے در پے ذاتی مثالوں میں، 'نمائندہ دانشور اپنے اقرار نامے کی معین حدود دریافت کرتا ہے' — سلطنت کی مفروضہ خیر اندیشی جس کا وہ اپنی تحریروں میں جشن مناتا ہے، کے ساتھ برطانوی ڈنڈے اور گوروں کی استہزائیہ مسکراہٹ کی بہت سادہ سی حقیقت کی مڈھ بھیڑ ہو جاتی ہے۔

نصابی ہراس

بنگال میں برطانوی حکومت نے 1859-60 میں تعلیم پر دس لاکھ بتیس ہزار اکیس روپے مختص کیے، جو تقریباً اتنی رقم تھی جتنی اس سال فوجی بیرکوں کی تعمیرِ نو کے لیے خرچ ہوئی۔ تعلیم کے لیے فنڈنگ پورے برطانوی دور حکومت میں ادنیٰ ترجیح ہی رہی۔ ول ڈیورانٹ نے 1930 میں بیان کیا کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت تعلیم کے لیے مقررہ محدود وسائل کو 'یونیورسٹیوں کے لیے' مختص کرتی 'جہاں مستعمل زبان انگریزی تھی، تاریخ، ادب، رسوم و اخلاقیات انگریزی میں پڑھائے جاتے، اور نوجوان [ہندوستانیوں]... کو پتا چلتا کہ انھوں نے محض ایک بے رحمانہ عمل کے لیے خود کو داخل ہونے دیا، جس کا مقصد انھیں ڈی نیشنلائز اور ڈی انڈینائز کرنا تھا، اور جو انھیں انگریزوں کے سوانگ میں ڈھال دے گا'۔ یہ قلیل ترین وسائل میں کیا گیا: ڈیورانٹ کا مشاہدہ تھا کہ ہندوستان میں تعلیم پر کل اخراجات (1930 میں) اکیلی نیویارک سٹیٹ کے آدھے (اخراجات) سے بھی کم تھے۔ 1882 اور 1897 کے دوران کا، پندرہ سالہ دور پوری دنیا میں سرکاری تعلیم کے غیر معمولی پھیلاؤ سے عبارت تھا، ہندوستان میں فوج کے لیے مختص کردہ حصے میں اضافہ تعلیم میں اضافے کی نسبت ساڑھے اکیس گنا زیادہ تھا۔ ڈیورانٹ نے نتیجہ نکالا، 'ہندوستان کی ناخواندگی کے لیے برطانیہ کا ذمہ دار ہونا، شک وشبہ سے بالاتر نظر آتا ہے'۔

ابھی بھی، برطانوی اپروچ کا ہندوستانی تعلیم کو ایک نادانستہ فائدہ تھا۔ چونکہ ہندوستانیوں کو تعلیم سے بہرہ ور کرنا کوئی خاص برطانوی ترجیح نہیں تھی، اس نے ممتاز برطانویوں کو مائل نہیں کیا، اور بیسویں صدی کے آغاز سے ہی، اکیڈیمیا ہندوستانی ترقی کے لیے دستیاب شاہراہ بن گیا۔ چند مستثنیات کے ساتھ، 1890 کے بعد، اہم سرکاری یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرز ہندوستانی تھے، اگرچہ ناگزیر طور پر اکثر برطانوی سامراجی حکومت کے کٹر حامی تھے۔

جب انگریزی طریقہ تدریس کو غالب مقام حاصل ہو گیا، اگرچہ ایک مختصر مگر اعلیٰ مقام کی حامل اشرافیہ کے لیے، تو ہندوستانیوں کو پڑھائے جانے والے دوسرے مضامین کی انگریزی کے ذریعے تدریس کا ایک برطانوی تناظر رائج کر دیا گیا__ خاص طور پر تاریخ کا۔ برطانوی ما قبل نو آبادیاتی مغل تاریخ کو سیاق و سباق اور تجزیہ کے بغیر خط مستقیم کے بیانیے پر مشتمل واقعات کے طور پر دیکھتے تھے؛ جیسا کہ ما قبل مغل تحریروں کو، جان سٹیورٹ مل نے انھیں 'دیومالائی تاریخیں... جن میں حکایت حقائق کے آگے آ کھڑی ہوتی ہے' قرار دے کر رد کر دیا۔ ان تعبیرات کو بدل دینے کے لیے، برطانویوں نے ہندوستانی تاریخ نویسی میں، منظم یورپی انداز میں، سیاق و سباق کے تجزیے کا مزید اضافہ کرتے ہوئے 'مبنی بر حقیقت' احوال کو از سر نو تشکیل دیا__ لیکن ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کے جواز کے غائیتی مقصد کی بجا آوری کے لیے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ہندوستان کی انگریزی تاریخ اور نظری تشکیل سے ہندوستان کے ماضی کی مذہبی 'ادوار میں تقسیم' کے ذریعے نہ صرف تقسیم کر کے حکومت کرو کی ترویج کی گئی، بلکہ ایک ایسی قوم کی تصویر کشی کی گئی جو مہذب بنانے والی برطانوی حکومت کی آمد کی منتظر تھی۔ تاریخی متون کا 'انحصار حقائق پر ہونا چاہیے اور سیکولر نصاب مستعمل ہونا چاہیے'، یہ دلیل پیش کرتے ہوئے، وہ مذہبی اور دیومالائی متون کی تدریس سے دور ہٹتے چلے گئے، بشمول ہندوستان کے لافانی رزمیہ، مہابھارت اور رامائن کے، جو کم از کم ہندوستانی سکولوں میں وہی مقام حاصل کر سکتیں تھیں، جو الیڈ اور اوڈیسی نے برطانوی سکولوں میں حاصل کیا۔ آزاد ہندوستان نے کلاسیکس سے سیکولر بے اعتنائی کی اس روایت کو برقرار رکھا، جس کے لیے اس پر حال ہی میں ایک نئی ہندو شاونسٹ حکومت کی جانب سے الزام عائد کیا گیا، جو برطانیہ اور اس کے ہندوستانی میکالے پتروں پر ہندوستانی بچوں کی دانشورانہ اور تہذیبی اجنبیت کی ترویج کا الزام عائد کرتی ہے۔

اگر تاریخ کی تعلیم نے ایک واضح مقصد کو پورا کیا، تو ادب نے وہی نتائج زیادہ متجاوز طریقے سے حاصل کیے۔ پروفیسر گوری وشواناتھ، نو آبادیاتی ہندوستان میں، انیسویں صدی کے اوائل میں، ہندوستانی اشرافیہ کی سماجی کایا کلپ اور انھیں جذب کرنے میں انگریزی ادب کی تعلیم کے کردار پر ابتدائی کام کر چکی ہیں۔ وہ دلیل دیتی ہیں کہ در حقیقت، بطور ایک تدریسی مضمون کے انگریزی ادب کا یہ تصور ہندوستان میں برطانویوں نے اپنے نو آبادیاتی مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے اختراع کیا۔ نہ صرف یہ تھا کہ انگریز سمجھتے تھے کہ ان کا ادب استبداد زدہ (کالونائیزڈ) ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں برطانوی تہذیب کے لیے ڈرامائی رعب اور احترام (پیدا

کرنے) کا ایک طریقہ کار ہوگا؛ بلکہ یہ بھی تھا کہ برطانوی نو آبادکار ہندوستانی ادب کی بہت سی عظیم تالیفات کو 'پرلے درجے کے فسق و فجور اور غلاظت سے بھرا' ہوا سمجھتے تھے ___ اور اس میں کالی داس کی شکنتلا شامل تھی، جسے انیسویں صدی کے سنسکرت کے ممتاز محقق، حوریس ولسن نے 'ہندوستانی ادب کا نگینہ' قرار دیا، لیکن ہندوستانی سکولوں اور برطانوی ہند کے کالجوں میں تدریس کے لیے موزوں نصاب کے طور پر رد کیا۔

یوں، برطانوی ماہرین تعلیم محض میکالے اور اس کی قبیل کے لوگوں کے تعصبات کی صدائے بازگشت تھے، جنھوں نے انگریزی ادب کی برتری کے حوالے سے اپنے اعتقاد کی نیک نیتی ثابت نہیں کی تھی۔ میکالے نے بہر حال اپنی یادداشت میں دلیل پیش کی تھی کہ 'ادب جو اب تک [انگریزی] میں محفوظ ہوا ہے اس کی وقعت اس تمام ادب سے زیادہ ہے جو تین سو سال پہلے تک پوری دنیا کی تمام زبانوں میں موجود تھا... قدیم کلاسیکی کی نسبت اب انگلینڈ کے ادب کی زیادہ وقعت ہے'۔ چارلس ٹریولین نے 1838 کی اپنی کتاب ہندوستانی عوام کی تعلیم میں تسلیم کیا کہ انگریزی زبان کے ذریعے انگریزی ادب کا پراپیگنڈا کرنے کے لیے پیش کیے گئے دلائل کسی سائنسی تصور پر مبنی نہیں تھے بلکہ اس سادہ میکالین تعصب پر مبنی تھے کہ بدیہی طور پر یورپی علم، مشرقی علم سے 'برتر' تھا۔ بہر حال اس نے کام کیا، چونکہ ہندوستانیوں کو انگریزی ادب کے مطالعہ کے ذریعے، سماجی طور پر ڈھالا گیا، وہ لاچار تھے کہ زیادہ ستائشی انداز میں انگریزی خواں بنیں اور اس طرح برطانوی تسلط میں شریک جرم بننے پر زیادہ رضامند ہوں۔

مطالعہ تاریخ نہ صرف اینگلو سینٹرک (Anglo Centric) تھا، یہ طلباء پر ان تمام چیزوں کی برتری کا رعب جمانے کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا، جو برطانوی تھیں، اور ایک وسیع سلطنت، کی رعایا بننے کے امتیازات، جس کے سرخ دھبے دنیا کے نقشے پر پھیلے ہوئے تھے، جہاں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔ (برطانوی سلطنت پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا، ایک ہندوستانی قوم پرست نے بعد میں تمسخر کے ساتھ نقرہ چست کیا، کیونکہ خدا بھی اندھیرے میں انگریز پر اعتبار نہیں کر سکتا۔)

انگریزی ادب کے مطالعے نے یہی مقصد پورا کیا۔ رتھر سٹینلے کے انگریزی حب الوطنی کے نغمات کا مجموعہ، لارڈ بشپ کلکتہ کے تعارف، اور اس شعر کی خوبیوں کی ستائش کے ساتھ مطلوبہ نصاب میں شامل تھا (وہ مدبرانہ انداز میں گنگناتا ہے، 'اسی لیے ایک سلطنت محض روٹی پر قائم نہیں رہ سکتی') اور ٹینیسن کے مشہور مصرع سے آغاز کرتے ہوئے 'گیت جو کسی قوم کے دل کو تقویت بہم پہنچاتا ہے / بذات خود ایک کارہائے نمایاں

ہے'۔ یقیناً، تمام نظمیں برطانوی سلطنت کی عظمت کی وقعت بڑھانے کی نیت سے تھیں۔ شاعر جی۔ فلاول ہیورڈ نے 'عظمت یا موت، صادق دل اور سورما کے لیے / قدر و منزلت پاؤ زندگی میں، یا مرقد میں کرو آرام'۔ انگریزی 'انصاف پر مبنی برتاؤ' کا ولولہ نیوبولٹ کے 'اور کھیلو! اور کھیلو! اور کھیلو کھیل' میں پھونکا گیا، اور کپلنگ کی گورے کی تہذیب پھیلانے کی ذمہ داری کے قصائد، یقیناً بے دینوں کو نوآبادیاتی راج کے لیے بوٹوں کی چھاپ، کے لیے مناسب طور پر ممنونیت کا احساس دلائیں گے۔ (مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب / اور یہ دونوں نہیں ملیں گے کبھی، میں نے کالج میں اس نظم کے انکشاف کے بعد بڑی تلخی سے لکھا، 'یقیناً بجز اس کے جب تم خود کچلے جاؤ / برطانیہ کے پاؤں تلے!')

ٹیلیوژن سے قبل کے ان دنوں میں، پاپولر فکشن نے بھی بے چین انگریزی تعلیم یافتہ قاری کو، نوآبادیت کی خوبیاں جذب کرنے میں مدد دی۔ جی-اے-حینٹی، ایچ-رائڈر ہیگارڈ اور خود کپلنگ کی ان نامور بیسٹ سیلرز میں سامراجیوں کے جان پر کھیل جانے کی کہانیاں بیان کی جاتیں جن میں شجاع انگریز ہمیشہ جاہل، ناقابل اعتبار وحشیوں پر فتح حاصل کرلیتا۔ کپلنگ کے رسوائے زمانہ مصرعے میں انگریزوں کو بتایا گیا (اور امریکیوں کو بھی جو فلپائن کو فتح کر رہے تھے) کہ 'گوروں کی تہذیب پھیلانے کی ذمہ داری کریں قبول، روانہ کریں اپنے بہترین نسلی بچوں کو / جاؤ اور اپنے بیٹوں کو بن باس کے لیے کرو پابند، تاکہ کریں پوری اپنے اسیروں کی ضروریات، جو بت پرستوں کی احسان فراموشی کے باوجود حکمرانی کر رہے تھے؛ 'اپنے سابقہ صلے' کے باوجود گوروں کو اپنی تہذیب پھیلانے کی ذمہ داری جھیلنی تھی: / الزام ان کا تمھارے لیے اچھا ہے، / نفرت ان کی تمھارا تحفظ کرے گی'۔ اور اسے یہی کرنا تھا، مصرعوں سے، آزردہ خاطر، 'بد مزاج عوام، آدھے شیطان، اور آدھے بچوں' کی ضروریات کے لیے منافقانہ پدریت کی بساند اٹھ رہی تھی۔ (شاعری میں ہی، ایک زیرک معاصر کا ترکی بہ ترکی جواب 'براؤن آدمی کی تہذیب پھیلانے کی ذمہ داری' لبرل ایم پی اور تھیٹر کے ناظم تفریحات (امپریساریو / Impresario)، ہنری لیبوچیری کی جانب سے آیا، جو اس قابل ہے کہ اسے بہتر طور پر سمجھا جائے۔ چنانچہ میں نے اس باب میں آگے تفصیل کے ساتھ اسے از سر نو پیش کیا ہے۔)

انیسویں صدی کے پہلے ربع میں، بلی بنٹر، سٹیپل آف بوائز کی خصوصیات والی پلپ میگزین فکشن کی حد درجہ مقبول بچوں کی کہانیوں میں ایک ہندوستانی کردار کی شمولیت، نے نوآبادیت پسندوں کو ساز باز کے بیانیے کی طرف بڑے تخلیقی انداز میں ورغلانا چاہا۔ لڑکا یقیناً اشرافیہ کا رکن تھا، خلاف توقع نام ہری جمسیت رام سنگھ تھا،

اس کے شاہی نسب میں (اس کے نامور ہم وطن رجنی کی طرح) کرکٹ کے ٹیلینٹ کی آمیزش تھی۔ ابھی تک، اس کے انگریز ہم جماعت اسے 'ان کی' کے طور پر جانتے تھے، اور توضیحات میں اسے ہمیشہ ان سے زیادہ گہرے رنگوں کے متعدد شیڈز دیکھائے جاتے؛ اور اسے عموماً بنٹر کہانیوں، جن کے اصلی ہیرو ابھی تک انگریز لڑکے تھے، کے بالکل قریب پہنچنے پر، نکال باہر کیا جاتا۔

سلمان رشدی، ایڈورڈ سعید کی نئے در واہ کرنے والی (کتاب) شرق شناسی (Orientalism) کے نتائج کی توثیق کرتے ہوئے، 'سنگدلانہ تیور والے شہزادوں اور مٹیالے پتلے کولھوں والی مٹیاروں، بے دینی، آگ اور تلوار والے خود ساختہ مشرق' کی تخلیق کے متعلق لکھ چکا ہے، 'کہ اس طرح کی بے بنیاد عکاسی کرنے کا مقصد استعمار اور اس کو تقویت دینے والی آئیڈیالوجی، جو کہ کاکیشیئن کی ایشیئن پر نسلی برتری سے متعلق تھی، کے لیے اخلاقی، ثقافتی اور فنکارانہ جواز پیدا کرنا تھا'۔ رشدی کے مطابق، اس طرح کی تصویر کشی صرف استعماری ماضی سے تعلق نہیں رکھتی تھی؛ 'راج کی ترمیم پسندی کا شدت پکڑنا، ایسی فکشن کی عظیم کامیابیوں کے باعث مثال بن جانا، جدید برطانیہ میں رجعت پسند نظریات میں شدت کا فنکارانہ دوسرا پہلو ہے'۔

مستشرقین کی کوششوں اور ان کے برطانوی استعمار کے بدیسی پن کو مسحور کن بنانے کے باوجود، ایک مسئلہ پھر بھی تھا: ایک مرتبہ جب ایک ہندوستانی پڑھنا، غور و فکر کرنا اور تفہیم کرنا سیکھ لیتا، تو یہ پابندی لگانا ناممکن تھا کہ اس کا ذہن اسے کہاں لے جائے گا۔ ولیم ہووٹ نے 1839 میں غیب دانی سے مشاہدہ کر لیا کہ 'انگریزی زبان کو مقامی زبان بنانا ناممکن ہے، جب تک کہ انتہائی محیر العقول اخلاقی انقلاب، جس کا ابھی دنیا کو مشاہدہ کرنا ہے، پیدا نہ کیا جائے۔ انگریزی تصورات، انگریزی ذوق، انگریزی ادب اور مذہب کی پیروی ایک اٹل نتیجے کے طور پر ہونی چاہیے... ' اور یقیناً، انگریزی سیاسی تصورات کی بھی اگرچہ اس نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ 1908 تک، سلطنت کا بدنام زمانہ عذر خواہ جے. ڈی. ریس شکایت کر رہا تھا کہ، 'ہمارے سکولوں میں شاگرد اپنے روزانہ کے اسباق کے ساتھ بغاوت ذہن نشین کرتے ہیں: ان کی اشتہاء کو روسو، میکالے اور فلسفیوں کی تالیفات کے ساتھ پورا کیا جاتا ہے، جو کہ آکسفورڈ میں بھی طلباء کے اذہان کو اشتراکی اور غیر عملی خوابوں کی جانب گمراہی پر مائل کر دیں، اور ہندوستان میں فطری طور پر مابعد طبعیاتی اذہان کے حامل نوجوانوں کی کہیں بڑی قوت کے ساتھ کام کرنا، جو عموماً رٹے کے ذریعے سیکھنے میں بہت تیز ہیں، اکثر اوقات کنگلے، اور اسی لیے روزی کمانے کے لیے نااہل دکھائی دیتے ہیں، ماسوائے اس کے کہ حکمرانوں کے ماتحت کلرک کی حیثیت کی نوکری حاصل کریں، جنھیں وہ

بطور جابر حکمران تب تک ملامت کرتے ہیں جب تک ان کے ہاتھوں میں تنخواہ نہ آ جائے۔ اس نظام کے تخلیق کردہ سرکار بیزار لوگوں میں نہ تو ہندوستانی حکومت کی عزت ہے اور نہ خوف۔ کیا یہ حیران کن نہیں، کہ ہمارے سکولوں میں جس ادب پر ان کی پرورش کی گئی ہے، وہ کسی بھی ایسے نظام حکومت جو استبداد (اتھارٹی) پر مبنی ہو کی مخالفانہ تنقید سے معمور ہے...' ریس نے دلیل پیش کی کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کو نیم پختہ ہوئے بیچلر آف آرٹس اور مکمل شورش پسندوں کی پیداوار پر سبسڈی سے انکار کی لارڈ کرزن کی جرات مندانہ قیادت کی پیروی کرنا ہوگی۔ میرا خیال ہے، کہ ماہرین انگریزی کے حق میں فیصلے سے رجوع کیے ہوئے، کافی دیر ہو چکی، لیکن کیا کوئی خاص وجہ ہے کہ ہندوستانی نظام میں مثال کے طور پر ہربرٹ سپنسر کو ہی کیوں اتنی ممتاز جگہ دی گئی؟ کیا کوئی ضرورت ہے کہ ہندوستانی طلباء کو فلسفے سے لبریز کیا جائے، جس کا مطالعہ آکسفورڈ میں بھی، بے مقصد فرضی خواب اور اشتراکی سوفسطائیت کے قابل افسوس رجحان کی طرف راغب کرتا ہے؟'

انیسویں صدی کے اواخر تک، انگریزی تعلیم فی الحقیقت ہندوستانی انگریزی زدگان کا ایک طبقہ پیدا کر چکی تھی، جو برطانوی ادب، فلسفے اور سیاسی تصورات سے کافی آگہی رکھتا تھا؛ لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، جب انھوں نے حقوق اور ان عہدوں تک رسائی کی دہائی دینا شروع کی جن کے بارے میں انھیں یقین تھا کہ ان کی تعلیم انھیں ان کا اہل بنا چکی تھی، تو انھیں کڑی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

یقیناً، ایسے لوگ ہمیشہ تھے، جو دلیل دیتے تھے کہ حقیقی رکاوٹ ہندوستانی رویے تھے، خاص طور پر ذات پات سے متعلقہ، مختلف ذاتوں کے پس منظر والے طلباء کے جماعتوں میں اختلاط نے ہندوستانی روایت پرستوں کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس دلیل پر — کہ ذاتوں کا سکولوں میں اختلاط نہیں ہوگا — ڈیورانٹ نشاندہی کرتا ہے کہ وہ پہلے ہی بلاامتیاز مخلوط تھیں 'ریلوے کے ڈبوں میں، ٹرام کاروں اور فیکٹریوں میں' اور یہ کہ 'ذات پات کو شکست دینے کا بہترین طریقہ سکولوں کے ذریعے ہو سکتا تھا'۔ لیکن برطانویوں نے روایت پسندوں کے قیاسی اعتراضات کے پیچھے پناہ لینا پسند کیا، کیونکہ ان کے لیے بھی یہی موافق تھا کہ تعلیم پر زیادہ خرچ نہ کرنا پڑے۔

ہنوز، چند قابل ذکر مستثنیات تھیں۔ ابتدائی دلت مصلح جیوتی با پھولے، باغبانوں اور پھول فروشوں کی ایک 'نچلی' جاتی میں پیدا ہوئے، ایک طالب علم کیسے ایک انگریزی سکول میں براہمن اور دوسری اونچی جات کے دوستوں کے ساتھ پڑھ سکتا ہے، کی متاثر کن مثال بنے، پوری دنیا کے ادب سے اپنی دانش کو توانا کیا اور تقویت دی، اور سماج کی کایا پلٹنے کی بنیاد اسی پر رکھی۔ مہاتما پھولے، جیسا کہ بہت سے لوگ اسے پکارتے تھے، نہ صرف

دلتوں کے ادھیکار اور عورتوں کی تعلیم کا ابتدائی رہنما، بلکہ عالمی تحریکوں اور مساوات کے تصورات کی آواز بھی بنا۔ اس نے اپنی کتاب غلام گیری ('سلیوری' Slavery/ 1873) کا انتساب، غلاموں کو آزاد کرنے کی وجہ سے 'امریکہ کے شفیق عوام' کے نام کیا۔ چند عشروں بعد، ڈاکٹر بی. آر. امبیڈکر انھی کے نقش قدم پر چلے، اگرچہ ہندوستان میں سکول کی تعلیم کے بعد، انھوں نے اپنی تمام تر اعلیٰ تعلیم باہر، برطانیہ اور امریکہ دونوں ممالک میں، حاصل کی۔

یہ دلیل پیش کی جاتی رہی ہے کہ برطانوی امتیاز کرنے والے نہیں تھے، اور کم از کم نظری اعتبار سے تمام جاتیوں کی تعلیم کی حمایت کرتے تھے، نہ کہ صرف اونچی جاتیوں کی، جبکہ ہندوستان کے اپنے قائدین منقسم تھے کہ جدید تعلیم کیا سب تک پہنچنی چاہیے۔ فی الحقیقت، 'اعتدال پسند' کانگریسی لیڈر گوپال کرشنا گوکھلے نے 1911 میں گورنر جنرل کی قانون ساز کونسل میں عمومی لازمی پرائمری تعلیم کا بل، اور اسی مجلس میں وِیتھل بھائی پٹیل نے 1916 میں ایک دوسرا، بل پیش کیا، لیکن دونوں ہی، برطانوی اور حکومت کے متعین کردہ ممبران کے ووٹوں کی وجہ سے ناکامی سے دوچار ہوئے۔ تاہم، جس کے بارے میں کم جانتے ہیں، یہ ہے کہ مہاتما گاندھی اور سریندر ناتھ بنرجی جیسوں نے بھی بلوں کی مخالفت کی، دونوں ہی پرجوش قوم پرست۔ گاندھی جی نے ہند سوراج میں لکھا: 'تعلیم کے عمومی معنی حروف کا علم ہے۔ لڑکوں کو پڑھنا، لکھنا اور حساب کا علم سکھانا، پرائمری تعلیم کہلاتا ہے۔ ایک کسان ایمانداری سے اپنی روزی کماتا ہے۔ اس کے پاس دنیا کا عمومی علم ہے۔ لیکن وہ اپنا نام نہیں لکھ سکتا۔ اسے حروف کا علم دے کر آپ کیا تجویز کرتے ہیں؟ کیا آپ اس کی شادمانی میں ایک انچ کا بھی اضافہ کریں گے؟ اس تعلیم کو لازمی قرار دینا ضروری نہیں۔ ہمارا قدیم نظامِ سکول کافی ہے۔ ہم آپ کے جدید سکول کو بےکار سمجھتے ہیں'۔

خوش قسمتی سے، اس معاملے پر، گاندھی کے کسی حد تک انحرافی خیالات رائج نہ ہو پائے۔ لیکن ان کا حقیقی اعتراض شاید فی نفسہٖ خواندگی اور تعلیم پر نہیں تھا، بلکہ بالخصوص برطانوی تعلیم پر تھا۔ 1937 میں، جب آٹھ صوبوں میں کانگریس وزارتیں منتخب ہوئیں، اور پہلی دفعہ تعلیم پر کنٹرول تصرف میں آیا، تو گاندھی نے تعلیم کے لیے واردھا سکیم کے نام سے ایک منصوبہ پیش کیا، جو دیہی بچوں کے لیے سات سالہ بنیادی تعلیم، بشمول دیہی دستکاریوں میں پیشہ ورانہ تربیت، کا تصور پیش کرتا تھا۔ یہ مکمل طور پر نافذ نہیں ہوا، لیکن یقیناً اس نے بنیادیں مہیا کی ہوں گی، بشمول مادری زبان میں تعلیم، ریاضی، سائنس، تاریخ، جسمانی تربیت و حفظانِ صحت

کے ساتھ ساتھ دستکاریاں بھی۔ اس قضیے کے خلاف دلیل دینا مشکل ہے کہ دیہی ہندوستان میں جو تھوڑی بہت نوآبادیاتی تعلیم دستیاب تھی، واردھا سکیم اس پر زبردست سدھار ثابت ہوتی۔

جیسا کہ ہم نیراد چودھری کے ساتھ دیکھ چکے ہیں، نوآبادیاتی تعلیم کے نتائج میں سے ایک، مغرب کی ہماری زندگیوں میں متعارف کردہ، زبان، ماڈلز اور تفہیمی نظام کے ذریعے سے، ہندوستانیوں کے ذہن کی نوآبادیت تھی۔ ہندوستانی اپنے معاشروں کو بہت سے طریقوں سے مغربی فہم و جمالیات کے معیارات کے مطابق جانچتے تھے (اشیش نندے نے واضح انداز میں لکھا ہے کہ کیسے تیسری دنیا والوں نے 'ایک غیر مغرب تشکیل دیا' جو کہ فی نفسہ مغرب کی ہی تشکیل تھا')۔ رعایا کے لوگ جس انداز سے اپنی تاریخ اور حتیٰ کہ اپنی ثقافتی خود متعین کردہ تعریف کو دیکھتے تھے، نوآبادیت ان اطوار میں تصرف بے جا کی مرتکب ہوئی اور اسے ازسرنو تشکیل دیا۔ اس کے ردعمل میں، قوم پرست، اپنے سماج کی ثقافتی شناخت کو ترویج دینا، اسے قابل فہم بنانے میں مدد کرنا اور اسے تاثرات دینا چاہتے تھے، لیکن لامحالہ طور پر، اپنی نوآبادیاتی تعلیم کے اثر کے باعث، انھوں نے اسے بہت زیادہ رنگ برنگا بنا ڈالا۔ یہ فقط ہندوستان کے آزادی سے ظہور میں آنے کے بعد ہوا، نوآبادیت کے بھیانک خواب سے بیدار ہو کر، ہندوستانیوں کو احساس ہوا کہ کیسے اکثر اوقات استعماری حکمرانی بھی متعدد طریقوں سے ان کی ثقافتی خود-شناسی کو شکستہ اور مسخ کر چکی تھی۔ یہ کئی عشروں سے بتدریج تبدیل ہو رہی ہے، چونکہ ہندوستانی سمجھتے ہیں کہ شناخت کا اعادہ کیے بغیر ترقی نہیں ہو گی: یہی ہے، جو ہم ہیں، اسی پر ہمیں فخر ہے، یہی ہم بننا چاہتے ہیں۔ ہندوستانی قوم پرستوں کا کام اپنے ثقافتی اظہار کے نئے طریقے تلاش کرنا ہے (اور پرانے طریقوں کا احیاء)، جس طرح نوآبادیت کے خاتمے پر، اس کا معاشرہ بقا اور وجود پذیری کے نئے طریقے تلاش کرنے کی، جدوجہد کرتا ہے۔

انگریزی زبان، اتنا برطانوی استعماریت کی وجہ سے نہیں، جتنا کہ بیسویں صدی میں امریکی غلبے کے باعث، عالمگیر (زبان) بن گئی، جس کے ثمرات ہندوستان کو بھی حاصل ہو رہے ہیں۔ لیکن گو کہ انگریزی کے عالمگیر انتخاب نے 'یقیناً عالمی مبادلہ اور کاروباری لین دین میں ہر کہیں انگریزی بولنے والوں کو زیادہ سہولت بہم پہنچائی'، بشمول ہندوستان کے، جیسا کہ اڈرین لیسٹر بیان کرتا ہے، 'اس نے صرف انگریزی نہ بولنے والی رعایا کے اکثر لوگوں کو اور عورتوں کو قرض اور سیاسی سرمایہ تک، رسائی سے مزید منہا کرنے کا مقصد پورا کیا، جو کہ انگریزی بولنے والے عالمی نیٹ ورک کے ذریعے گردش کرتا تھا'۔

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہندوستانی زبانوں میں، ہندوستان کا روایتی طریقہ تعلیم، ہندوستان کو خواندہ بنانے اور باقی دنیا کے ساتھ مسابقت کے چیلنج سے نبرد آزما کر سکتا تھا۔ یقیناً یہ ہندوستان کو ایک بنیادی استعداد اور خود اعتمادی اور نالندہ طرز کے سکولوں اور کالجوں کے قیام کی بنیاد دے سکتا تھا، جو کہ جاپان جیسی ثقافتوں نے خود کو اپنی قومی زبانوں میں تعلیم دے کر حاصل کی؛ نو آبادیت کی ابتلاء کے بغیر ایک ترقی یافتہ اور توانا ہندوستان، باقی عالمی دنیا کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے کے لیے، ہمیشہ بہترین ماہرین تعلیم، ٹیکنالوجی کے سسٹم اور انگریزی اساتذہ، جہاں کہیں بھی ہوتے درآمد کر سکتا تھا۔ کم از کم، اگر دو صدیوں تک برطانیہ ہماری قومی دولت غصب نہ کرتا، ہمارے پاس ایسا کرنے کے وسائل ہوتے۔

برطانوی حکمرانی کے افسوسناک نتائج میں سے ایک یہ تھا کہ کس طرح نو آبادیت نے، چاہے غفلت یا منصوبہ بندی کے تحت، ہندوستان کے سائنسی تحقیق کے روایتی جذبے کے احیاء کے کسی بھی امکان کا گلہ گھونٹ ڈالا۔ پارچہ بافی اور سٹیل کی صنعتوں کی بربادی کا ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے، لیکن یہ حیرت انگیز ہے کہ جس تہذیب نے صفر اختراع کیا، جس نے آریابھاٹا (جس نے کئی صدیاں پہلے انتہائی صراحت کے ساتھ، گلیلیو، کوپرنیکس اور کیپلر کی پیش بندی کی) اور سسروتا (جدید سرجری کا بانی) پیدا کیے، کے پاس ہندوستانی سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلقہ ایجادات کے توسط سے دیکھانے کے لیے بہت کم تھا، حتیٰ کہ مفروضہ مہربان اور مستحکم برطانوی دور امن (پاکس بریٹینیکا/Pax Britannica) کے زیر اثر بھی۔ ریاضی سے متعلقہ فطین رامانجن کو اپنی فطانت منوانے کے لیے کیمبرج جانا پڑا، اور اگرچہ سی. وی. رامن نے 1930 میں فزکس کا نوبل انعام جیتا اور ایس. این بوس کو بھی ملنا چاہیے تھا (باوجود اس پارٹیکل کی دریافت کے جسے اس کا نام بوسن دیا گیا، 2013 کا انعام دوسرے دونوں کو دے دیا گیا)، اور بوس کا ہم نام اور گرو، جگدیش چندر بوس، جس نے حیران کن راستے پر بطور ماہر طبعیات، ماہر حیاتیات، ماہر حیاتی طبعیات، ماہر نباتیات اور ماہر آثار قدیمہ، شہرت پائی، (اس کے ساتھ ساتھ ابتدائی سائنس فکشن کے مصنف کی)، اس کے علاوہ برطانوی نو آبادیاتی حکمرانی کی دو صدیوں میں سائنسی کمال کے حوالے سے جشن منانے کے لیے کچھ خاص نہیں تھا۔ حیران کن طور پر، برطانوی خود انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل میں انھیں میدانوں میں پروان چڑھے تھے، جبکہ ہندوستان میں کسی بھی بڑے ادارے کی مالی معاونت نہیں کی، اور ہندوستانی اذہان کے سائنس اور ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرنے کے بے پناہ امکان کو نظر انداز کیا۔ ہندوستان کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں آگے بڑھنے میں تھوڑا عرصہ درکار ہوتا (اگر) ان شعبوں

میں ملک کے لیے اختراعات کرنے کی جگہ چھوڑی جاتی۔ وطن میں سہولیات کے فقدان نے ایک طرح کی مہاجرت کو جنم دیا؛ بہت سے ہندوستانی مہارت حاصل کرنے کے لیے غیر ملکی اداروں میں چلے گئے، تین نے تو غیر ملکی پرچم کے زیر سایہ نوبل جیتا، جبکہ ہندوستان میں غیر کامل نمو پذیر اور نوخیز تحقیقاتی ادارے ابھی تک قابل ہندوستانی اذہان کے لیے خود کو قابل قدر مسکن، ثابت کرنے کے متمنی تھے۔(اگرچہ، ایسی علامات ہیں کہ سائنسی تعلیم بہتر ہو رہی ہے، جیسا کہ خلائی اور میزائل ٹیکنالوجی میں قابلِ ذکر ایجادات سے پتا چلتا ہے؛ اس میں کچھ بھی نوآبادیاتی دور کا رہین منت نہیں بلکہ آزاد ہندوستان کی اپنی کوششوں کا ثمر ہے۔)

آج تلک، مجھے اس بات کا شعور ہے کہ میرے جیسے انگریزی بولنے والے ہندوستانیوں کے ساتھ کچھ مضحکہ خیز ہے، جنھوں نے ہندوستانیوں کو اپنی انگریزی تعلیم سے بہرہ مند کرنے کے لیے، انگریزوں پر انگریزی زبان میں دھاوا بولے رکھا۔ ہاں مضحکہ خیز، لیکن صرف ایک نقطے کی حد تک۔ میں نے انگریزی کی ابتدائی تعلیم ہندوستان میں حاصل کی، اور میں نے، اسے میری نثر کو پرکھنے والے انگریز کے سائے کے بغیر سیکھا۔ میں اس کی اپنی شرائط پر اس کے سحر میں مبتلا ہوا، نوآبادیاتی استبداد کی علامت کے طور پر نہیں، بلکہ آج پورے ہندوستان کی ایک زبان کے طور پر۔ اکثر انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانی، بشمول میرے کسی بھی صورت میں، شیکسپیئر اور پی. جی. وڈ ہاؤس کو چھوڑ نہیں سکتے: ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا، ہم انگریزی زبان کے بغیر ان کے شاہکاروں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ لیکن کیا انگریزی نے ہمیں نوآبادی نہیں بنایا تھا، اور ہمارے لسانی تنوع کے باوجود ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے فارسی اور اردو مستعمل رکھی جا سکتی تھی، انگریزی تند نوآبادیاتی دور کے ماسٹر سارجنٹس کی بجائے ہمیں ہمہ وقت مرغوب وی ایس اوز کا مکمل گلدستہ بھیج سکتی تھی، اور در حقیقت جیسی زبان ہم نے سیکھی، شاید اس سے زیادہ بہتر طور پر سیکھی ہوتی۔

مجھے ایک برطانوی ہندوستانی دوست نے بتایا کہ 2015 میں لندن میں، میرے آکسفورڈ کے خیالات کے گنوں یا بصورت دیگر، پر ایک عوامی پرجوش مباحثے میں، ایک سے زائد مقررین نے میری غیر موجودگی میں مجھے ان بنیادوں پر نامعتبر ٹھہرانا چاہا (میں ہندوستان میں تھا) کہ میں وڈ ہاؤس اور انگریزی زبان کا ایک جانا پہچانا عقیدت مند ہوں، جس نے حتیٰ کہ سینٹ سٹیفن کالج کی، پوری دنیا میں اپنی نوعیت کی پہلی وڈ ہاؤس سوسائٹی کا احیاء بھی کیا تھا، اور آج تک لندن میں ہیڈ کوارٹر رکھنے والی (عالمی) وڈ ہاؤس سوسائٹی کے سرپرست کے طور پر خدمات انجام دے رہا ہوں۔ اس کے مضمرات یہ تھے کہ آپ بیک وقت برطانوی استعمار کو الزام اور انگریزی

مزاح نگاروں کے سرخیل کو سراہ نہیں سکتے۔

میرے نقاد اس سے زیادہ غلط نہیں ہو سکتے تھے۔ہاں، کچھ لوگ، وڈی ہاؤس کی مقبولیت میں (برطانوی) راج، ہندوستان میں برطانوی سلطنت، کے لیے ایک طویل ناسٹیلجیا دیکھ چکے ہیں۔ 1988 میں لکھتے ہوئے، صحافی رچرڈ ویسٹ کا خیال تھا، ہندوستان کے وڈی ہاؤس بھگت وہ ہیں جو پچاس سال پہلے انگلینڈ کے پیچھے مسلسل بے قرار تھے (جیسا کہ 1930 کے عشرے میں): 'یہ وہ دور تھا جب انگریز خود اپنی زبان سے محبت کرتے تھے اور اسے زرخیز بنا رہے تھے' جب سکول کے بچے شیکسپیئر، ورڈزورتھ اور حتیٰ کہ ردیارڈ کپلنگ کو پڑھتے تھے... یہ میلکولم مگریج تھا جس نے کہا کہ ہندوستانی اب آخری انگریز ہیں۔ شاید اسی لیے وہ ایک ایسے چنیدہ نمائندہ انگریزی مصنف سے محبت کرتے ہیں'۔

یقیناً، یہ سطریں کسی حد تک زیادہ غیر معقول ہیں، بہ نسبت اس کے جو وڈی ہاؤس نے بذات خود کبھی لکھی ہوتیں۔ وڈی ہاؤس سے وہ ہندوستانی پیار کرتے ہیں جو کپلنگ سے گھن کھاتے اور راج اور اس کی تمام سرگرمیوں سے نفرت کرتے ہیں۔ درحقیقت ہانگ کانگ میں ایک مختصر مقررہ کام کے علاوہ، وڈی ہاؤس کی بذات خود کوئی نوآبادیاتی وابستگی نہیں، اور راج اس کی کتابوں میں بڑی حد تک موجود بھی نہیں۔ (1935 کے ایک افسانے، 'ایک سنگترے کا رس'، کی ایک قابل ذکر استثناء ہے، جو میں یاد کر سکتا ہوں: 'ہندوستان میں بدامنی کیوں ہے؟ کیونکہ اس کے باشندے محض کبھی کبھار ہی مٹھی بھر چاول کھاتے ہیں۔ اس دن جب مہاتما گاندھی ایک عمدہ رس بھرے گوشت کے قتلے اور اس کے بعد ایک روغنی پڈنگ اور مرغن (نیلے) پنیر کے لیے بیٹھے گا، تم اس سول نافرمانی کی تمام بیہودگی کو ختم ہوتے ہوئے دیکھ لوگے'۔) لیکن ہندوستانی جانتے تھے کہ جملے کا مقصود قہقہہ پیدا کرنا تھا نہ کہ رضامندی۔

(خود مہاتما گاندھی بعض اوقات مزاحیہ شرارت کا شکار ہوئے، جب 1947 میں، گوشت کے قتلے کے لیے بیٹھنے کی بجائے، انھوں نے بادشاہ کے کزن اور آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو انکار کر دیا، اور اسے گھر میں بنے بکری کے دہی کا پیالہ پیش کیا__ شاید اسی بکری کا جسے وہ انگلینڈ لے کر گئے تھے جب وہ بادشاہ کو لنگوٹ میں ملنے کے لیے گئے! میں نے اپنے استہزائیہ، 'عظیم ہندوستانی ناول' میں اس لمحے کو دوبارہ تخلیق کیا ہے، دہی کے عوض صرف ایک آم۔)

وڈی ہاؤس ایک ایسا برطانوی مصنف تھا، جسے ہندوستانی قوم پرست، کسی بھی طور پر، سیاسی مغالطے کے

خوف کے بغیر سراہ سکتے تھے۔ ایک ممتاز ہندوستانی قوم پرست سیاستدان کی بیٹی، سروج مکھرجی نئے کا ٹجو، 1948 میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وڈی ہاؤس کی تصانیف سے متعارف کروانے کے بارے میں یاد کرتی ہے؛ یہ اپنی ہی طرز کا تھا کہ برطانوی سلطنت کی علامت نے تو 'انگریزی کے سرخیل' کو نہیں پڑھا ہوا تھا جبکہ ہندوستانی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والوں نے پڑھا ہوا تھا۔

درحقیقت، بے کم و کاست وڈی ہاؤس کی تحریروں میں سیاست کا، یا درحقیقت کسی بھی دوسرے سماجی یا فلسفیانہ مواد کا، تقریباً نہ ہونا تھا، جس نے اسے بقول واغ کے 'دلکش نظم کی دنیا' بنا دیا، انگریزیت، برگزیدگی یا کسی بھی اور جھانسے سے بالکل پاک۔ جبکہ دوسرے انگریزی ناول نگاروں نے اپنے کرداروں کی اختصاصی زندگیوں اور حالات کا بار اپنے قارئین پر ڈالا، وڈی ہاؤس کا وجود خوابوں کی دنیا میں ہے جو اس کے انگریز قارئین کے لیے بھی اتنی ہی غیر حقیقی ہے جتنی ہندوستانیوں کے لیے۔ ہندوستانی قاری اطاعت کی تشویش میں مبتلا ہوئے بغیر وڈی ہاؤس سے لطف اندوز ہونے کا اہل ہے؛ اس کی تمام مضحکہ خیز جزئیات کے ساتھ، جو دنیا اس نے تخلیق کی، لندن کے ڈرونز کلب سے لے کر میچیم سکریچنگ کے گاؤں تک، ایک تصوراتی دنیا تھی، جس کے لیے ہندوستانیوں کو کسی ویزے کی ضرورت نہیں تھی۔

لیکن انھیں ایک پاسپورٹ چاہیے تھا، اور وہ تھا انگریزی زبان۔ بلا شبہ انگریزی ہندوستان کے لیے برطانیہ کی سب سے قابلِ قدر اور دیرپا میراث تھی، اور ہفت زبان کے طور پر مشہور لوگوں، تعلیم یافتہ ہندوستانیوں، نے بڑی سرعت سے اسے سیکھا اور اس سے لطف اندوز ہونے لگے ___ فی نفسہ اسی کے لیے اور مختلف مقاصد کے ذرائع کے طور پر بھی۔ یہ مقاصد دونوں تھے، سیاسی (ہندوستانیوں کے لیے جنھوں نے استعمار پسندوں کی زبان کو قوم پرستی کی زبان میں بدل دیا) اور کیف آور (کیونکہ زبان نے تصورات اور تفریحات کی ایک وسیع دنیا تک رسائی مہیا کی)۔ یہ بالکل فطری تھا کہ ہندوستانی اس مصنف سے لطف اندوز ہوں گے جو زبان کا استعمال اس طرح کرے گا جیسے وڈی ہاؤس نے کیا ___ کلاسیکی اسناد کے وافر ذخیرہ معلومات کو برتتے ہوئے، عین انھی ضابطوں کو تضحیک سے تہ و بالا کرتے ہوئے، جنھیں نو آبادیت نے ہندوستانیوں کو سکھایا تھا کہ وہ قابلِ حرمت تھے (ایک ملک جس میں برطانوی اشرافیہ کے غیر ضروری بھائی بندوں نے دو صدیوں کے بیشتر حصے میں حکمرانی کی، کوئی بھی اس جیسی سطروں سے حظ اٹھا سکتا تھا: 'نر کاڈ مچھلی جسے، اچانک پتہ چلتا ہے کہ وہ پینتیس لاکھ ننھی کاڈ مچھلیوں کا باپ ہے، ان سب سے پیار کے اظہار کے لیے خوشی سے ان کے گرد چکریاں لگاتا ہے،

کے برعکس، برطانوی اشرافیہ اپنے نوعمر بچوں کو کسی قدر یرقان زدہ آنکھ کے ساتھ دیکھنے پر مائل ہے'۔)

دوسرے الفاظ میں، جو کیف انگریزی زبان نے مجھے عطا کیا، اس کے لیے تو میں ممنون ہوں، لیکن میرے ہم وطنوں کے ساتھ اس کے حصول کے سنگ ہونے والے استحصال، تحریف اور اپنے تمدن کے ساتھ اجنبیت کے لیے نہیں۔

چائے بغیر ہمدردی کے

دو عظیم نوآبادیاتی ورثوں، چائے اور کرکٹ، کے متعلق بھی شاید اس سے ملتا جلتا کچھ کہا جا سکتا ہے (کہ اب تک ہم جمہوریت، 'قانون کی بالادستی' اور ریلویز کو معتبر برطانوی دعوے کے طور پر جھٹلا چکے ہیں)۔ میں آزادانہ طور پر اعتراف کرتا ہوں میں دونوں کی لت میں مبتلا ہوں، نوآبادیت کی میراث کو ایک ذاتی خراجِ عقیدت۔

امریکی کانگریس کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے 1985 میں، ہندوستانی وزیراعظم آنجہانی راجیو گاندھی نے آنکھوں میں چمک کے ساتھ، امریکی انقلاب اور ہندوستانی نوآبادیاتی تجربے کے مابین عظیم الشان تعلق کی یاد کو تازہ کیا۔ کارنیوالس یارک ٹاؤن میں ہتھیار ڈالنے کے بعد بنگال میں فتح یاب ہو گیا۔ (راجیو) گاندھی نے شرارت سے اضافہ کیا، اور پھر، 'ہندوستانی چائے نے آپ کے انقلابی جوش کو تحریک دی'۔

اس کی بوسٹن ٹی پارٹی کی رمز پر کھل کر قہقہہ لگا۔ لیکن وہ غلط تھا۔ 1773 میں، کوئی ہندوستانی چائے نہیں تھی، کم از کم کوئی ایسی نہیں تھی جو باقاعدہ طور پر کاشت کی جاتی تھی اور جس کا بیوپار کیا جاتا تھا۔ چائے پر چین کی اجارہ داری تھی، اور ٹیکس والی چائے جسے نوآبادیت پسندوں نے خلیج بوسٹن میں آموے سے آتی تھی نہ کہ آسام سے۔ اگر یہ ہندوستانی چائے ہوتی، تو امریکی انقلابی شاید احتجاج کا کم فضول خرچ طریقہ سوچتے۔

یہ برطانوی تھے جنھوں نے ہندوستانی چائے کی، کاشت کی جانے والی جنس، کے طور پر نیو رکھی۔ کہانی دلچسپ ہے، اور ایک دفعہ پھر کھیل میں تجارتی محرکات در آئے۔ برطانویوں نے ہندوستان پر حکمرانی کی لیکن چین پر نہیں: انھوں نے سوچا، چینیوں پر اچھی خاصی رقم خرچ کرنے کی بجائے، ہندوستان میں چائے کیوں نہ کاشت کی جائے؟ چینی چائے پر اپنے انحصار کو ختم کرنے کی ان کی خواہش، برطانویوں کو دوسرے ملک میں زرعی جاسوسی کی اختراع کی جانب لے گئی، کافی حد تک بعید الفہم، رابرٹ فارچیون نام کا شخص، خفیہ ایجنٹ کے طور پر،

افیون جنگ کے سالوں کے خلفشار اور ابتری کے دوران، 1840 کے اوائل میں چین میں داخل ہوا، تاکہ ہندوستانی ہمالیہ میں پیوندکاری کے لیے چائے کے پودے حاصل کرے۔ لیکن برطانوی ہند کو بھیجے گئے اس کے ہزاروں نمونوں میں سے اکثر مرجھا گئے، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹران مجموعی طور پر اپنے سر کھجاتے رہ گئے۔ حل حادثاتی طور پر ملا__ جب مٹر گشت کرتے ہوئے ایک برطانوی نے آسام میں ہندوستانی نوع کی خودرو اُگی ہوئی چائے دریافت کی، ابلتے ہوئے پانی میں اس کی جانچ کی، ماحصل کو چکھا اور احساس ہوا کہ اس نے سونا پا لیا ہے: وہ چائے بنا چکا تھا۔

یوں ہندوستان میں برطانویوں کو اپنی چائے کی صنعت ملی۔ آسام کی چائے چین سے درآمد کردہ کی نسبت اعلیٰ اور برطانوی گرہستنوں کے لیے زیادہ خوش ذائقہ ثابت ہوئی۔ 1830 میں، ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک سال میں، تقریباً تین کروڑ پندرہ لاکھ پونڈ (ایک کروڑ چالیس لاکھ کلوگرام) چینی چائے کی تجارت کی؛ آجکل اکیلا ہندوستان تقریباً تیس کروڑ کلوگرام پیدا کرتا ہے۔ لیکن چائے کو بھی نوآبادیاتی استحصال سے استثناء حاصل نہیں تھی: مزدور ایک حقیر سے روزینہ کے لیے ہولناک حالات میں مشقت کرتے، جبکہ یقیناً، تمام منافع برطانوی فرموں کو چلا جاتا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں، ممتاز سامراج دشمن سر والٹر سٹرک لینڈ نے، آج کل ناشر سے عدم دستیاب، اپنی کتاب "مشرق میں کالا دھبہ" کے دیباچے میں بڑی تلخی سے لکھا: 'انگریز جو اپنے وطن میں یہ پڑھیں، انھیں سوچنے دیں کہ، جب وہ اپنے شاہ بلوط کی چھال کے مضر جوشاندے کی چسکیاں لیتے ہیں... تو وہ بھی اپنی حد تک، انسانی گوشت اور خون سے شکم پروری کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ صرف چائے نہیں ہے، بلکہ زندگی اور قوت کے سرخ تخم سے عاری، غلاموں کا افلاس زدہ خون ہے، جو تم پی رہے ہو'۔

برطانویوں نے ہندوستان میں چائے اپنے لیے کاشت کی، نہ کہ مقامیوں کے لیے: لطیف، معطر دارجلنگ، توانا آسام، نشیلی نیلجیرس چائے، یہ تمام ہندوستان کے متعلقہ علاقوں کی مٹی، آب وہوا اور جغرافیہ پر دلالت کرتی ہیں، جس کے لیے انھیں نام دیے گئے، لیکن اسے سکاٹ لینڈ کے شجرکاروں نے کاشت کیا تھا (اور افسوسناک حد تک کم اجرت پانے والے ہندوستانی مزدوروں نے چنا تھا) جہازوں میں لاد کر اپنی مادرِ وطن لے جانے کے لیے، جہاں طلب بہت زیادہ تھی۔ ہندوستان میں برطانویوں کو بیچنے کے لیے ایک معقول مقدار رکھ لی جاتی تھی؛ ہندوستانی خود اپنی پیدا کردہ چائے نہیں پیتے تھے۔ یہ صرف 1930 کی عظیم کساد بازاری کے دوران ہوا تھا__ جب برطانیہ میں طلب کم ہو گئی اور برطانوی تاجروں کو اپنا سٹاک اتارنا پڑا__ جس پر انھوں نے اپنی پیداوار کو

ہندوستانیوں کو بیچنے کا سوچا جنھیں انھوں نے ایک صدی سے نظر انداز کر رکھا تھا۔ ہندوستانی عوام خوشی سے چائے کی طرف راغب ہوئے، اور اس کا ذوق کساد بازاری اور جنگ کے سالوں کے دوران بڑھتا گیا۔ آج، چائے ہندوستان کے دور دراز کے گاؤں میں بھی مل سکتی ہے، اور ہندوستانی باقی ساری مشترکہ دنیا کی نسبت کالی چائے زیادہ پیتے ہیں۔

اس لیے، اس کا تمام سہرا برطانویوں کے سر ہے۔ اس مرتبہ بخشنا مشکل ہے کہ نوآبادیت کے بغیر کوئی بھی بڑے پیمانے پر چائے کاشت کر سکتا تھا اور اس جنس کے لیے وسیع منڈی پا سکتا تھا: یقیناً ہندوستانیوں نے برطانویوں سے پہلے یہ کبھی بھی نہیں کیا۔ حتیٰ کہ نام بھی نوآبادیاتی ورثہ ہے۔ لفظ 'چائے (ٹی)' اکثر یورپی زبانوں میں مشترک ہے، جو آموئے کے لہجے سے آیا، جہاں سے برطانیہ کی زیادہ تر چائے جہازوں کے ذریعے بھیجی جاتی تھی؛ لیکن جو اپنی چائے کینٹون سے حاصل کرتے تھے، جیسا کہ پرتگیزی، اور خشکی کے راستے لے جاتے تھے، جیسا کہ ہندوستانی اور عرب، وہ اسے کینٹونی لفظ 'چاء' پکارتے تھے۔ تقریباً تمام ہندوستانی زبانوں میں 'چاء' کے متغیرات استعمال ہوتے ہیں، بشمول 'چائے' اور 'چایا'؛ یہ صرف انگریزی زدہ ہندوستانی ہیں جو 'ٹی' کہتے ہیں۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں چائے پر یہ باب ختم کروں، ایک چھوٹا سا جملہ معترضہ ہے۔ جب انھوں نے ہمیں چائے دی، اسی وقت برطانوی کچھ اور تباہ بھی کر رہے تھے۔ برطانویوں نے، منافع کے لیے بے رحمانہ انداز میں زمین کا استحصال کیا، اس اثنا میں اسے تباہ کر کے اور اس میں سلامتی سے رہنے والی جنگلی حیات کو ختم کر کے۔ استعمار کے زیرِ حکومت ہندوستانی جنگلات اور جنگلی حیات کی تباہی انتہائی تیز رفتاری سے وقوع پذیر ہوئی۔ جنگلات کو تین بنیادی وجوہات کی بنا پر تباہ کیا گیا: زمین کو تجارتی شجرکاری میں بدلنے کے لیے، خاص طور پر چائے کی کاشت کے لیے؛ ریلوے کے سلیپر زبنانے کے لیے؛ اور انگلینڈ میں گھروں اور فرنیچر کی تعمیر کے واسطے لکڑی انگلینڈ برآمد کرنے کے لیے۔

برطانویوں نے چائے کاشت کرنے کے لیے نیلجیرس اور آسام کے جنگلات کاٹ ڈالے، اور کافی کی کاشت کے لیے کورگ کے جنگلات برباد کر دیے۔ نیلجیرس کی ماحولیاتی تباہی میں چائے ہی واحد ولن نہیں تھی؛ انگریز، ریشم جو کہ کپڑا بنانے کے لیے برطانیہ بھجوائی جاتی، پیدا کرنے کے لیے، مختلف بدیسی انواع جیسا کہ یوکلپٹس، صنوبر اور واٹل، بھی لائے۔ بدقسمتی سے، یوکلپٹس جیسے پودے پیاس کے باعث زمینی پانی پی جاتے؛ ان کی شجرکاری کو سلام، برطانویوں نے نیلجیرس کے ماضی کے سرسبز گرم مرطوب بارشی جنگلات کو پانی کی کمی

والے علاقوں میں بدل دیا۔

جب برطانویوں نے افیون کشید کرنے کے لیے ہندوستانی کسانوں کو پوست کی کاشت پر مجبور کیا، تو یہی مظہر وقوع پذیر ہوا، جس کے لیے شمالی ہندوستان کے کچھ علاقوں میں جنگلات کے وسیع رقبے کو کاٹنا بھی شامل تھا۔ مثال کے طور پر آسام میں، انیسویں صدی کے وسط تک، خاصی بڑی تعداد میں درخت کاٹ دیے گئے، کیونکہ ان کے سائے میں افیون کا ڈوڈہ پک نہیں سکتا تھا اور اس کا پھول کھل نہیں سکتا تھا۔ پوست کے ڈوڈے کو بچانے کے لیے درختوں کی تیزی سے کٹائی کے عمل نے بالواسطہ طور پر ہندوستان کے گراں قدر شکاری درندوں کو تقریباً ختم کر دیا۔ برطانوی تجارتی فصلوں کے لیے مزید زمین چاہتے تھے، جو انھیں مزید محاصل مہیا کرتی، لہٰذا انھوں نے ہر شکاری درندے کے سر پر انعام رکھتے ہوئے، ہندوستان کے وسیع علاقوں سے باگھ، چیتے، تیندوے اور ببر شیر کا کامیابی سے صفایا کر دیا۔ باگھ اور تیندوہ بچ تو گئے، البتہ کم تعداد میں، کیونکہ وہ جنگل میں چھپ گئے۔ لیکن ببر شیر جسے وسیع کھلی جگہ درکار تھی، وہ اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا تھا __ ماسوائے گجرات میں، ملک کے ایک گوشے میں، جہاں ایک ہندوستانی شہزادے، جوناگڑھ کے نواب نے ایک نجی سینکچوری قائم کر رکھی تھی جہاں شکار کی اجازت صرف اس کے مدعو کردہ لوگوں کو تھی۔ اس نے کسی حد تک ایشیائی ببر شیر کو بچائے رکھا __ لیکن یہ پرشکوہ جانور، جو برطانویوں کے ہندوستان آنے سے پہلے ہزاروں کی تعداد میں پروان چڑھتے تھے، سلطنت کے خاتمے پر سو سے بھی کم رہ گئے تھے۔

جنگلوں کو تباہ کر کے، برطانویوں نے ان قدیم دیسی باشندوں یا 'قبائلیوں' کی روح کو بھی تباہ کر ڈالا، جو جنگلات کے قدرتی ذرائع پر زندہ رہتے اور انھیں استعمال کرتے تھے۔ بدقسمتی سے، جنگلات کی زمینوں پر ان کی ملکیت دستاویزی کی بجائے روایتی تھی؛ لہٰذا وہ اس طرح ملکیت کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے جیسا کہ برطانوی تسلیم کرتے تھے، انھیں بے دخل اور بے گھر کر دیا گیا، شکاری-اجتماعی طرزِ زندگی کو قائم رکھنے کی ان کی کوششوں کے نتیجے میں، ان کے ساتھ ناجائز شکاریوں اور اسی وجہ سے مجرموں جیسا سلوک روا رکھا گیا۔

برطانوی، اسی دوران، گوروں 'ور اختیارات کی حامل ہندوستانی اشرافیہ کے لیے، جنگلی جانور مارنے کو ایک اعلیٰ رتبے والے کھیل کا درجہ دینے کے قابل ہوئے، اور ایک ایسی سرگرمی جس کا گلیمر، مؤخر الذکر (طبقے) کو برطانوی حکمران حلقوں میں اس سے حاصل ہونے والی رسائی کے ذریعے بڑھایا گیا (غالباً اسی طرح جیسے شاید آج گولف کرتی ہو)۔ برطانوی دور میں شکار ایک بھیانک کھیل بن گیا؛ انگنت جانور مارے گئے، ناقابل تلافی

انداز میں، بہت سے علاقوں کے ماحولیات کو تبدیل کر ڈالا گیا۔ مثال کے طور پر، مدراس کو کبھی پلیور کہا جاتا تھا، جس کا مطلب شیروں اور تیندووں کا شہر تھا (تامل لفظ 'پلی' شیر اور تیندوے دونوں کے لیے مستعمل تھا)۔ برطانویوں نے اس علاقے میں ہر ایک شیر اور تیندوے کو مار ڈالا، نتیجتاً، مدراس اور تامل ناڈو کے میدانوں میں ایک بھی نہیں بچا۔ پلیور کی اصطلاح اپنے معنی کھو بیٹھی، اور اب بڑی حد تک فراموش ہو چکی ہے۔

پلیور میں شاید اب شیر نہیں ہیں، جو برصغیر میں خطرناک حد تک ہر جگہ پائے جاتے تھے، لیکن برطانوی ابھی بھی ہندوستانی چائے پیتے ہیں۔ ایک سے زائد طریقوں سے: ٹاٹا، ہندوستانی بزنس کا انضمام، اب قابلِ ستائش برطانوی چائے کی فرم، ٹیٹلے کا مالک ہے۔ لہٰذا حسبِ امکان، ملک میں دودھ اور شکر والے چائے کے کپ میں، چائے کا حوالہ بلا روک ٹوک ہر جگہ دستیاب ہے، جو ہندوستانی ہر آنے جانے والے کو پیش کرتے ہیں، یہ ہم ہی ہیں جنھوں نے اس نو آبادیاتی ورثے کو موزوں کیا اور اپنا لیا۔

کہانی مزید پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ چائے کو، دوسری اجناس کی طرح، قیمتوں میں کمی کا مسئلہ درپیش رہا ہے، اور برآمدات بتدریج گھٹتی جا رہی ہیں؛ بہت سی چائے کی کھیتیوں کا، بڑھتی ہوئی اجرت اور گرتے ہوئے منافع کے آگے بند ہو جانے کا خدشہ ہے۔ سب سے مہنگی ہندوستانی چائے، کاسٹلیٹن 1991 میں، فی کلو چھ ہزار روپے سے زائد میں بکتی تھی (اس وقت مروجہ شرح مبادلہ کے تحت 231 ڈالر میں)؛ خریدار جاپانی تھے۔ 2012 میں نیا ریکارڈ قائم ہوا، جب فی کلو قیمت سات ہزار دو سو تک جا پہنچی (لیکن اس کا مطلب تھا کہ یہ کم ہو کر 120 ڈالر ہو گئی، کیونکہ روپے کی قدر کم ہوئی تھی)۔ کاسٹلیٹن چائے کی شیمپین ہے: دوسری ہندوستانی چائے اس کی کسر اعشاریہ تک بھی نہیں پہنچتی۔ ہندوستانی چائے، بین الاقوامی سطح پر، برآمداتی منڈیوں کے لیے، مشتبہ ذرائع جیسا کہ ارجنٹائن، کینیا اور ملاوی سے حاصل ہونے والی کمتر چائے کے ساتھ مسابقت کر رہی ہے۔ لیکن پھر وہی — کہ اگر ارجنٹائن، پہلے برطانیہ کی نو آبادی بنے بغیر، چائے کاشت کر سکتا تھا تو کیا ہندوستان بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا؟

لہٰذا جب پہلے ایسے ہندوستانی وزیر اعظم، نریندر مودی، جس نے چائے والے کے طور پر بھی کام کیا تھا (ایک ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اپنے والد کی چائے بیچنے میں مدد کر کے)، نے 2016 میں امریکی کانگریس کو خطاب کیا، تو اس نے اپنی تقریر میں ظرافت کے چھینٹے اڑائے، لیکن اکتیس سال پہلے کے اپنے پیش رو کے برعکس، چائے کے بارے ایک لفظ نہیں کہا۔ ایک ایسے وقت میں جب دنیا میں اشیاء کی منڈیاں مندے کا شکار ہیں اور ہندوستانی چائے پیدا کرنے والے دادرسی کے لیے فریاد کر رہے ہیں، تو ہندوستانی وزیر اعظم کو یہ

Scanned with CamScanner

احساس کرنا چاہیے تھا کہ چائے اب مزید ہنسی ٹھٹھے کا معاملہ نہیں ہے۔

کرکٹ کا ہندوستانی کھیل

یقیناً، کرکٹ دنیا میں واحد کھیل ہے جو چائے کا وقفہ کرتا ہے (اور بہت سے شائقین کے لیے چائے تجربے کو نمایاں کرتی ہے)۔ میں اکثر سوچتا ہوں، ماہر عمرانیات اشیش نندے کے الفاظ میں، کرکٹ در حقیقت ایک ہندوستانی کھیل تھا جو انگریزوں نے حادثاتی طور پر دریافت کیا۔ اس کھیل کی ہر چیز یوں لگتا ہے ہندوستانی قومی کردار سے میل کھاتی ہے: اس کی انتہائی پیچیدگی، لامحدود امکانات اور ہر ڈلیوری کے ساتھ ممکنہ تغیرات، آؤٹ ہونے کے درجنوں مختلف طریقے، تمام تر کسی قدر ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کی طرح ہیں، جس میں بنیادی قوانین طے کر دیے جاتے ہیں لیکن ادائیگی کرنے والا پھر بھی بڑی شان سے موسیقی برجستہ موزوں کرتا ہے، کسی بھی طرح کی دنیاوی پابندیوں سے یوں آزاد جیسے لکھا ہوا اسکور۔ کھیل کے عظیم الشان غیر یقینی پن میں قدیم ہندوستانی افکار کی بازگشت ہے: ہندوستانی تقدیر پرست جبلی طور پر سمجھتے ہیں کہ یہ بالکل ایسے ہی ہے جب آپ اچھی طرح گیند کو دیکھ رہے ہوں اور بلے کے عین درمیان رکھ کر چوکا لگانے کے لیے وقت کا تعین کر رہے ہوں کہ نہ کھیلا جا سکنے والا کھلاڑی سامنے آئے اور گیند پھینکے۔ جیسا کہ پہلے مشاہدے میں آ چکا ہے، یہ تقریباً تفریحی مشغلہ ہے، جس میں ایک وکٹورین انگریزی اخلاقی ڈرامے کے اسلوب میں بھگوت گیتا کا کھیل پیش کیا جاتا ہے۔

ایک ملک جس کی اکثریت آج بھی جوتشیوں سے رجوع کرتی ہو اور اجرام فلکی کے بد اثرات پر یقین رکھتی ہو ایک ایسے کھیل کی کھل کر داد دے سکتی ہے جس میں بے موقع برسات، ایک برے طریقے سے تیار کردہ پچ، ایک سکے سے ہارا گیا ٹاس یا فیلڈر کی آنکھوں میں پڑنے والا سورج، کھیل کا نتیجہ بدل سکتا ہے۔ حتیٰ کہ مشوش، سنسنی خیز، سرگرمی سے مقابلہ کرتے ہوئے اور کبھی کبھار چکرا دینے والے کرکٹ کے پانچ دن کسی بھی وقت برابری پر ختم ہو سکتے ہیں، یوں لگتا ہے یہ ہندوستانی فلسفے سے اخذ کیا گیا تھا، جو نہایت عمیق طور پر یہ تسلیم کرتا ہے کہ زندگی میں سفر بھی اتنا ہی اہم ہے جتنی کہ منزل۔

اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ کرکٹ نے جس طرح ہندوستان کے قومی تخیل کو اپنی گرفت میں لیا کوئی بھی اور کھیل اس طرح نہیں لے سکا۔ ہمارے کرکٹرز دیوتاؤں کے مندر میں اس استھان پر براجمان ہیں جس کے حریف، دیوتا اور بالی وڈ کے ستارے ہیں۔ کسی سیاسی بحران کی نسبت ہمارے ہیروز کی کارکردگی کا

تجزیہ کہیں زیادہ جوش کے ساتھ کیا جاتا ہے؛ انتخاب کے عمل سے متعلقہ ارتکاب اور فروگزاشت کے گناہ، بالخصوص مؤخر الذکر، بھرے پرے شہروں کو اذیت ناک ٹھہراؤ میں لے جاسکتے ہیں۔ میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں، کسی بھی اور ملک میں، ایک کھیل، اہم اخبارات کے صفحہ اول کو، اکثر و بیشتر تصرف میں نہیں لاتا۔ اور کیوں نہ ہو؟ ایک خداداد بلے باز کی سنسنی خیز کوشش یا ایک گُنی سپنر کی جادوئی چال سے زیادہ اہم کیا ہو سکتا ہے، ہر ایک اپنا دھرم نبھا رہا ہوتا ہے، ایک ٹیم والے کھیل میں ہر فرد اپنا فرض ادا کر رہا ہوتا ہے، بالکل ویسے ہی جیسا کہ زندگی میں ایک ہندوستانی اجتماع کی تقدیر کے اندر اپنے نصیب کی تکمیل کرتا ہے؟

کرکٹ، ہندوستان میں پہلی مرتبہ کاہلی سے اپنی فرصت کے لمحات کو تلاشتے ہوئے مہذب انگریز شرفاء کے ساتھ آیا؛ 'مقامیوں' کو یہ کھیل سیکھنے میں تقریباً ایک صدی لگی، اور پھر انھوں نے اسے انتہائی غیر انگریزی طریقوں سے کھیلا۔ مجھے یاد ہے جب میرے والد 1963 میں بمبئی میں، مجھے میرے سب سے پہلے ٹیسٹ میچ کے لیے لے کر گئے، جب حالیہ کی نسبت اس وقت کا انتہائی کمزور انگریزی فریق دورہ کر رہا تھا۔ میں ہندوستانی اوپننگ بیٹسمین اور وکٹ کیپر بدھی کندرن کو دیکھنے کا وہ فرحت بخش احساس نہیں بھول پاؤں گا۔ (جب) مڈ وکٹ پر لمبا چھکا مارا، اور اس کے فوراً بعد ایک اور ضرب لگائی جو رسہ پار کرنے سے ذرا پہلے ناکام ہو گئی، اور پھر مڈ اون پر بہت بڑا دائرہ بناتی ہوئی اونچی لمبی شاٹ۔ جیسے ہی اس نے اوپر کی طرف دائرہ بنایا کندرن نے بھاگنا شروع کیا؛ جب گیند ایک انگریز فیلڈر نے پکڑ لیا، تو اس نے بلا زور سے ہوا میں پھینکا، بھاگنا جاری رکھتے ہوئے، جیسے ہی یہ نیچے آیا اسے پکڑا، اور پویلین کی طرف بھاگ گیا۔ میں ساری زندگی اسی کے سحر میں گرفتار رہا۔

ہندوستان کے پاس ہمیشہ اس کے کندرنز تھے، لیکن اس کے پاس اس کے انتہائی باریک بین پیوندکار، اس کے جفاکش، اس کے انارکسٹ اور اس کے بیراگی بھی تھے: ایک سماج جو یہ تسلیم کرتا ہے کہ ہر قسم کے لوگوں کا اپنا مقام ہے، وہ اپنی کرکٹ ٹیم میں تنوع کی قدر بھی جانتا ہے۔ کرکٹ ہندوستان کے تنوع کو ظاہر کرتا اور فوقیت دیتا ہے: تمام اہم عقیدوں سے متعلقہ کپتان، ہندو، مسلم، پارسی، عیسائی اور رنگارنگ سکھ، ہندوستانی ٹیم کی قیادت کرتے رہے ہیں۔ ایک سرزمین جو ذات پات، عقیدے، رنگ، ثقافت، فن طباخی، رواج ولباس پر تقسیم تھی، وہ ایک یقین واثق کے ساتھ متحد تھی: کرکٹ۔

جی ہاں، برطانوی اسے ہمارے پاس لائے۔ لیکن انھوں نے یہ توقع نہیں کی تھی کہ ایک دن ہم انھی کے کھیل میں انھیں ہرائیں گے، یا یہ کہ انیسویں صدی کے ایک افسانوی میچ میں، نوآبادیاتی حاکمین سے بہتر

کارکردگی دیکھانے والے گنوار دیہاتیوں کے ایک بو قلموں جھنڈ کی بعید از قیاس کہانی پر ہمارے فلمساز آسکر نامزدگی جیت جائیں گے (لگان 2003)۔ برطانوی استعمار کے لیے کھیل نے ایک اہم کردار ادا کیا، کیونکہ اس نے توانا عیسائیت، عہد شباب کی توانائی و دور دراز کے ممالک میں جان پر کھیل جانے کے مسلک، اور ایٹون کے کھیل کے میدانوں میں سیکھے گئے قوانین کے نفاذ کے ذریعے منہ زور مشرق میں امن اور تہذیب لانے کے پوشیدہ مشن کے وکٹورین تصورات کو یکجا کر دیا تھا۔ اگر سلطنت ایک کھیل کا میدان تھی، تو پھر استبداد زدہ (کلونائیزڈ) کے لیے قوانین سیکھنا اور اپنے آقاؤں کو انھی کے کھیل میں شکست دینے کی کوشش کرنا، قومی احساسات کا ایک ناگزیر اظہار بن گیا۔ محققین بیان کر چکے ہیں کہ کرکٹ نے 1880 اور 1947 کے دوران بنگالی سماج کو اپنی لپیٹ میں کیونکر لے لیا، اس کی وجوہات میں سے ایک، بنگالی مردوں کے خلاف نامردی کے الزام سے بریت کے ایک طریقے کے طور پر، انگریزوں کو انھی کے کھیل میں ہرانا تھا۔ بنگال کا پڑھا لکھا درمیانہ طبقہ، بھدرالوک، اپنے نو آبادیاتی آقاؤں سے قدر شناسی کے حصول کے ذریعے کے طور پر، کرکٹ کو بنگالی سماجی زندگی کا حصہ بنانے کے لیے، مہاراجہ ناٹورے، کوچ بہار، مائمن سنگھ اور دوسری مقامی ریاستوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اسی وقت، برطانوی، جو کرکٹ کو راج کے تہذیبی مشن کے لیے مفید آلے کے طور پر دیکھتے تھے، نے صوبے کے تعلیمی اداروں میں کھیل کی ترویج کی۔ کسی حد تک مختلف طریقے سے، بمبئی میں پارسی کرکٹرز نے نو آبادیاتی حلقوں میں سماجی نقل و حرکت کے مقصد سے اس کھیل کو اختیار کیا۔ اشیش نندے نشاندہی کرتا ہے، مہاراجوں، طبقہ امراء اور انگریزی زدہ ہندوستانیوں نے 'کرکٹ کو سماجی رتبے کی شناخت اور راج کی طاقتور اشرافیہ تک رسائی کے ذریعے کے طور پر دیکھا۔ ہندوستانی معیار کے مطابق کرکٹ ایک مہنگا کھیل تھا، اس حقیقت نے بھی حتیٰ کہ ان روابط کو مضبوط کیا'۔

بنظر غائر دیکھیں، پورے ملک میں اسی نمونے کو دہرایا گیا، نہ صرف برطانوی پریزیڈینسیز میں بلکہ راجواڑوں میں بھی، جن میں سے بہت سوں نے، مقامی حکمرانوں کی جانب سے اچھی طرح فنانس کردہ، ایسی ٹیمیں بنائیں جو نظر انداز کرنے والی نہیں تھیں۔ ان میں سے چند ایک شرفاء نے مہارت کے اعلیٰ درجے تک بذات خود یہ کھیل کھیلا؛ ایک رنجیت سنہاجی (عالمی طور پر 'رنجی' اور حاسدانہ طور پر 'رن-جٹ-سن-جی' کے طور پر مشہور ہوئے) 1895 میں انگلینڈ کی جانب سے آسٹریلیا کے خلاف کھیلنے کے لیے چنے گئے، اور آغاز میں ہی سینچری سکور کیا، جس نے اسے ہندوستانی عوام کا ہیرو بنا دیا۔ یہ مسحور کن ہے کہ کیسے رانجی، آسکر وائلڈ اور

بنجمن ڈزرائیلی کی طرح، بذات خود معقول حد تک انگریز ہوئے بغیر، ایک انگریز ہیرو بن گیا۔ (جیسا کہ ایک انگریز مداح نے یقین نہ کرنے والے انداز میں کہا 'اس نے زندگی بھر کر سچین سٹروک نہیں کھیلا')۔ رانجی خود کو 'ایک انگریز کرکٹر اور ایک ہندوستانی شہزادہ' بتلاتا تھا، لیکن جیسا کہ بروما نے بیان کیا: 'ایک انگریز کرکٹر کے طور پر وہ ایک ہندوستانی شہزادے کا سا برتاؤ کرتا اور ایک ہندوستانی شہزادے کے طور پر ایک انگریز کرکٹر کا سا'۔

رانجی __ کرکٹ کا نابغہ، بے دھڑک اصراف کرنے والا، بے حیا انگریزی زدہ __ ایک شریف آدمی اور شہزادے، دونوں کی خوبیوں اور خامیوں کا ایک غیر معمولی امتزاج تھا۔ اس کے بھتیجے کے. ایس. دلیپ سنگھ جی اور ایک اور شہزادے نواب آف پٹودی، دونوں نے بالترتیب 1930 اور 1933 میں رانجی کی ہمسری کرنے کی کوشش کی، اگرچہ تب تک ہندوستانی یہ کہنے لگے تھے کہ وہ اپنی نوخیز ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے لیے کھیلنے کی بجائے، اپنا ٹیلنٹ دوسرے فریق کو کیوں دیں۔ (1946 میں پٹودی نے کیا، لیکن تب تک وہ اپنا جوبن بتا چکا تھا۔) جب کبھی کبھار کھیل جیتنے کے لیے، ہندوستانی کرکٹ میں کافی مشاق ہو گئے، تو برطانویوں نے انھیں تقسیم کرنے کا اہتمام کر لیا، 'چہار فریقی ٹورنامنٹ' کا انتظام کرتے ہوئے، ہندوؤں، مسلمانوں، پارسیوں اور 'باقیوں' کی ٹیموں کو ایک دوسرے سے بھڑا دیا، تاکہ کھیل کے میدان میں بھی، ہندوستانی اپنے مابین ان اختلافات کو یاد رکھیں، جن کی ترویج نو آبادیاتی حکمرانی نے پوری تن دہی سے کی تھی۔

ماہر عمرانیات رچرڈ کیشمین لکھتا ہے کہ ثقافتی حوالے سے ہندوستانی قوم پرستی آئرستانی قوم پرستی سے کم انتہاء پسند تھی۔ آئرستان میں، قوم پرستوں اور داخلی خود مختاری کے شورش پسندوں نے کرکٹ اور دوسرے برطانوی کھیلوں کو نو آبادیاتی ثقافت کے قابلِ اعتراض عناصر قرار دیتے ہوئے (ان پر) حملہ کیا، اور ان کی بجائے 'گیلک کھیلوں'☆ کی سرپرستی کی تھی۔ دوسری جانب، ہندوستانی قوم پرست قائدین نے 'برطانوی استعمار کے سیاسی اور معاشی پہلوؤں پر حملہ کیا لیکن انگریزی ثقافت کے چند پہلوؤں سے لگاؤ قائم رکھا'۔ جبکہ کبڈی کی طرح کے روایتی ہندوستانی کھیل نو آبادیاتی دور میں پژمردہ ہو گئے، اور خاص طور پر برطانویوں اور ہندوستانی اشرافیہ کے ایک محدود حلقے کے لیے ایک کھیل کے طور پر پولو کا احیاء ہوا، کرکٹ کو کھیل کے طور پر، وہیں اس مقام پر دیکھا گیا جہاں انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی اپنی گرفت قائم ہو سکتی تھی۔ (اس سے شاید وضاحت ہو سکے کہ کیوں ابھی تک آئرلینڈ کے پاس ایک واجبی سی کرکٹ ٹیم ہے جسے ابھی بھی 'ٹیسٹ' کا درجہ حاصل کرنا ہے،

☆ آئرلینڈ اور سکاٹ لینڈ سے متعلقہ کھیل (مترجم)

جبکہ اکیسویں صدی میں ہندوستان عالمی کھیل کے مہان قد و قامت والوں میں سے ایک ہے۔)

اس کرکٹ کا 1910 میں بنگال کی قومی تحریک کے ساتھ جڑنا، کلکتہ میں ہندوستانیوں کی اعلیٰ تعلیم کے مقدم انگریزی زبان کے ادارے، پریزیڈینسی کالج، کی کھیلوں کی تاریخ سے ثابت ہے، جہاں برطانوی 'مردانگی' اور بنگالی نسوانیت کے برطانوی نوآبادیاتی سٹریوٹائپ کے رد عمل میں بنگالی لڑکوں کی جسمانی نشوونما کے لیے (جیسا کہ ہم کچھ دیر پہلے بیان کر چکے ہیں)، جمناسٹک اور کرکٹ جیسے کھیل کو لازمی قرار دیا گیا تھا۔ جب بنگال میں قومی مزاحمت زور پکڑ رہی تھی، تو پریزیڈینسی کالج 1914 میں لامارٹنئیر کالج کی تمام یورپیوں کی ٹیم سے ایک کرکٹ میچ ہار گیا، ایک بے شرم نوآبادیاتی ادارہ، جس کے طلباء چرنوک اور میکالے جیسے ناموں والے 'گھروں' میں منقسم تھے۔ اس کے باعث کافی زیادہ سینہ کوبی اور خود تازیانہ زنی ہوئی۔ ٹیم کے کھلاڑیوں پر کھلم کھلا تنقید کی گئی: پریزیڈینسی کالج کے میگزین نے اعلان کیا 'لامارٹنئیر کالج کے ہاتھوں کالج کی اتنی بڑی شکست کو معاف نہیں کیا جا سکتا'۔☆

ایک محقق لکھتا ہے، 'نوآبادکاروں (کلونائزر) کی ہمسری کرنے کی کوشش، ہندوستانی کرکٹ کے ماخذ کی وضاحت کرنے والی کنجی ہے، یہ دلیل بنگال میں اس کھیل کی نمو کی کامیاب وضاحت پیش کرنے میں ناکام رہتی ہے'۔ لہٰذا کرکٹ میں بھی قوم پرستی کی رمزیں موجود ہیں، اور جبکہ کوئی بھی تسلیم کرے گا کہ یہ ہمیں برطانویوں نے عنایت کیا، آج ہم ان کے ساتھ، اور کسی بھی دوسرے کے، جو یہ کھیل کھیل رہا ہے، سے زیادہ خود اس پر گرفت رکھ سکتے ہیں۔

☆ یقیناً، فٹبال کا شیدائی میرا بیٹا کانیشک مجھے یقین دلاتا ہے کہ نوآبادیاتی دور میں برطانیہ کے خلاف کھیل میں ہندوستانی فتح کے عظیم الشان لمحے کو فٹ بال میں ڈھونڈنا ہوگا، نہ کہ کرکٹ میں: موہن باگن ٹیم جس نے 1911 میں آئی ایف اے شیلڈ جیتنے کے لیے، ایسٹ یارکشائر رجمنٹ کو، ننگے پاؤں، شکست دی!

ہفتم

The (IM) Balance Sheet: A Coda

آمدن و خرچ کا (نا) گوشوارہ (ام) بیلنس شیٹ: کوڈا

ہفتم

The (IM) Balance Sheet: A Coda

آمدن و خرچ کا(نا) گوشوارہ (ام) بیلنس شیٹ: کوڈا

(ام) بیلنس شیٹ: کوڈا [ایک صوتی حرکت کا اختتامی حصہ] __ مثبت اور منفی __ استعماری دعوے، نوآبادیاتی نتائج __ قابلیت اور بے توجہی بمقابل استحصال __ سلطنت کے دوران اور بعد میں ہندوستان کی تقابلی کارکردگی __ برطانوی سرمایہ داری سے ہندوستان کا انکار __ برطانوی پالیسیوں کے مثبت ضمنی اثرات __ اخلاقی رکاوٹ __ افیون پر برطانوی پالیسی __ ہم عصر مذمت __ معاشرتی اصلاح خصوصاً ہندوستانیوں کی جانب سے __ مسلمان حکمرانوں کے برعکس، برطانوی غیر ملکی ہی رہے __ 'براؤن آدمی کی نام نہاد ذمہ داری'

چونکہ میں اپنے دلائل مکمل کرنے کے لیے تیار ہوں، تو میں اس باب میں، مختصر طور پر، ان کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اس سے پہلے کہ میں ایسا کروں میں یہ واضح کرنا چاہوں گا، میرا یہ ارادہ نہیں کہ برطانیہ کے ہندوستان میں کیے گئے ہر کام میں اسے نامعتبر ٹھہراؤں۔ جیسا کہ تمام انسانی انٹرپرائزز میں ہوتا ہے، نوآبادیت مثبت کے ساتھ ساتھ منفیت بھی لے کر آئی۔ ہندوستان میں ہر برطانوی عہدیدار کلائیو کی طرح لٹیرا، میکالے کی طرح حقارت آمیز رویہ رکھنے والا، کرزن کی طرح متکبر پھوٹ ڈالنے والا، ڈائر کی طرح ظالم، یا چرچل کی طرح نسل پرست نہیں تھا۔ اپنے دور کے تعصبات سے بلند ہو کر ہندوستانیوں سے دردمندی، شوقِ تحقیق اور احترام کا سلوک کرنے والے نیک طینت آدمی بھی تھے؛ انسان صفت جج، باضمیر عہدیدار، بصیرت افروز وائسرائے اور گورنرز، انگریز جنھوں نے رنگ کی رکاوٹ سے بالاتر ہو کر حقیقی معنوں میں ہندوستانیوں کے ساتھ دوستی کی؛ ؛ دررراج کے پورے دور میں ایسے آدمی (موجود) تھے جنھوں نے ہندوستان میں خدمات

سرانجام دینے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کیں ___ اپنے ملک اور اس کے نو آبادیاتی اداروں کی خدمات کے لیے، یہ بھی کہنا پڑے گا، کہ بہر حال عام لوگوں کی مدد کرنے کے لیے بھی جس سے اس عمل کے دوران بہتر زندگی گزارنے کی طرف راہنمائی ہوتی ہو۔ ان کے نیک کاموں کو ہندوستانیوں نے آج بھی یاد رکھا ہوا ہے جن کی زندگیاں انھوں نے تبدیل کیں۔ مثال کے طور پر، سر آرتھر کاٹن، نے گوداوری پر ڈیم تعمیر کیا، جس نے جنوبی ہند کی سابقہ پندرہ لاکھ ایکڑ بنجر زمین کو سیراب کیا، اور آج تک آندھرا پردیش کے ان دو اضلاع میں، احسان مند کسان کمیونٹیز تقریباً تین ہزار مجسمے لگا کر ان کی یاد مناتے ہیں، حتیٰ کہ وزیر اعلیٰ کے ساتھ ان کی سالگرہ کی یادگاری تقریبات میں شرکت کرتے ہیں۔ یہ تمام شخصیات موجود تھیں؛ لیکن انھوں نے اس وحشت انگیز جرم، جس نے ان کا وجود باقی رکھا، یعنی 'مضبوط برطانوی بوٹ' کی بھاری بھرکم ایڑی کے نیچے عوام کو کچلنے کے جرم، کو جائز قرار دینے کی بجائے اس میں محض تخفیف کی۔

چند ایک ابھی تک دعویٰ کرتے ہیں، جیسا کہ لارڈ کرزن نے کیا کہ، 'برطانوی سلطنت زیر نگرانی مخلوقات کی بھلائی کا عظیم ترین آلہ ہے جو دنیا نے دیکھا'؛ یہ لکھتے ہوئے (یا بغیر کسی ہلکی سی طنز کی رمق کے، ایسا اعلان کرتے ہوئے) 'تاریخ کا سب سے بے غرض پن.... ہمیں فساد ملا اور ہم نے امن قائم کیا'۔ اس نے اضافہ کیا کہ برطانیہ نے 'نوعِ انسانی کے لاکھوں لوگوں کے دیرپا مفاد کے لیے' ہندوستان پر حکومت کی۔

میں نے کہا تھا، کچھ دعویٰ کرتے ہیں جبکہ چند ایک کر گزرتے ہیں۔ فرگوسن کی طرح ابھی بھی سلطنت کے عذر خواہ ہیں اور کم مشہور اور حیران کن طور پر کامیاب لارنس جیمز، جو (اس کی ادبی معرفت کا حوالہ دیں تو) استعمار کے بیڑہ اٹھانے کے عمل کی تصویر کشی 'مہربان مطلق العنانی کے نفاذ اور ایثاریت کے ایک تجربے' کے طور پر کرتا ہے۔ یہ بعید از قیاس لگتا ہے کہ آج کوئی بھی ممکنہ طور پر اس ہرزہ سرائی پر یقین کر سکے گا کہ اس حد تک کاغذی پتیوں جیسی آزاد تجارت کی مہربان نعمتوں کو پھیلا کر، مُسلح جنگی جہازوں کے ذریعے مغربی حکمرانی کے تصورات متعارف کروا کر اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے بے غرض بیج بو کر، برطانوی سلطنت نے حقیقی معنوں میں شب گرفتہ بت پرستوں پر ان کے مفاد کے لیے حکمرانی کی، لیکن ابھی بھی ایسے نوسٹلجیائی، سادہ لوحوں کے لیے ایسی دلیل دینے کو تیار ہیں، اور انھیں مسترد کیا جانا چاہیے، جیسا کہ میں نے پوری کتاب میں کوشش کی ہے۔

استعماری دعوے، نو آبادیاتی نتائج

فاضل پاؤل گلروے جسے 'مابعد نو آبادیاتی مالیخولیا' کہتا تھا، حالیہ سالوں میں، اس میں اضافہ دیکھنے میں آیا ہے، سلطنت کی عظمت کی آرزو، جس کا اظہار ایسی مسرت میں ہوا جیسا کہ 'پرانی نو آبادیت' کہلانے والا ایک برگر، لندن کی ایک بار جسے دی پلانٹیشن (The Plantation) کا نام دیا گیا، اور ایک آکسفورڈ کا کٹیل جسے کلونئیل کم بیک (Colonial Come Back) کا نام دیا گیا (جو کہ کفارہ پر مباحثہ، کے دوران مشتہر کی گئی، جس میں میں نے گفتگو کی تھی)۔ 2014 کے ایک یو گو وپول نے منکشف کیا کہ ترپن فیصد جواب دہندہ یہ سمجھتے تھے کہ برطانوی سلطنت 'کچھ ایسی تھی جس پر فخر ہونا چاہیے' اور صرف انیس فیصد اس کی بداعمالیوں پر 'شرمندہ' تھے؛ تقریباً آدھے جواب دہندہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ نو آبادی بن کر ممالک 'مالی طور پر مضبوط اور مستحکم' ہوئے۔ حیران کن طور پر چونتیس فیصد کی رائے تھی کہ 'انھیں خوشی ہوتی اگر برطانیہ آج بھی ایک سلطنت ہوتی'۔

مثلاً فرگوسن دلیل پیش کرتا ہے کہ برطانوی سلطنت نے 'دنیا میں محنت، سرمایہ اور اجناس کی بہترین تقسیم' کی ترویج کی، 'تاریخ میں کسی بھی اور نظام نے اجناس، سرمایہ اور محنت کی آزادانہ نقل و حرکت کی ترویج کے لیے اس سے زیادہ نہیں کیا، جتنا کہ برطانوی سلطنت نے انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں کیا۔ اور کسی بھی اور بندوبست نے پوری دنیا میں مغربی قانون، امن اور حکمرانی کی اقدار کے نفاذ کے لیے اس سے زیادہ نہیں کیا۔ اپنی زیادہ تر تاریخ میں (یقیناً اگرچہ تمام تر میں نہیں)، برطانوی سلطنت نسبتاً غیر بدعنوان حکومت کے لیے ایک ایجنسی کے طور پر سرگرم عمل رہی۔ لہذا بادی النظر میں، یہ ایک معقول معاملہ نظر آتا ہے کہ سلطنت نے عالمی فلاح و بہبود میں اضافہ کیا ___ دوسرے الفاظ میں، [کہ یہ] ایک کارآمد چیز تھی'۔

اکیسویں صدی کے آغاز میں گلوبلائزیشن کے عروج پر اس 'کارآمد چیز' کا بہت ڈھنڈورا پیٹا گیا، جب فرگوسن کے لیے خوش آئند تھا کہ برطانوی سلطنت کو عالمی معاشی مظہر پر خوب اترانے والے ہراول کے طور پر، اس کی فتوحات کو سمندر پار سرمایہ کاری اور اس کی طمع کو آزاد تجارت کے طور پر پیش کرے ___ یہی عناصر جن کے بارے میں گلوبلائزرز دعویٰ کرتے تھے کہ ہر ایک کی خوشحالی کا معیار بڑھائیں گے۔ یقیناً، اس طرح کی دلیل انتہائی قابلِ عذر ہے، کیونکہ وسائل کی 'بہترین تقسیم' جس کا فرگوسن جشن مناتا ہے، کا مطلب اس کے نو آبادیاتی شکار بننے والوں کے لیے، بے زمینی، بے روزگاری، جہالت، غربت، بیماری، جلاوطنی اور محکومی تھا۔ اس

اثنا میں اگر قرنوں سے نہیں تو صدیوں سے جاری، زمینی اور سمندری دونوں ذرائع سے ہونے والی، ہندوستانیوں کی آزاد تجارت کو تباہ کرتے ہوئے، برطانویوں نے آزاد تجارت کی خوبیوں کا دعویٰ کیا۔ یقیناً، آزاد تجارت، نعرے کے طور پر برطانویوں کو راس آئی، کیونکہ انیسویں صدی میں اس سے مستفید ہونے کے لیے وہی بہترین طریقے سے آراستہ تھے، اور ان کی توپیں اور قوانین ہمیشہ اس معمولی مسابقت کا دم گھونٹ سکتے تھے جس کو بڑھانے کی مقامی لوگ کوشش کر سکتے تھے۔ مساوی فریقین کی گلوبلائزیشن کا جشن بہتر طور پر منایا جاسکتا تھا، لیکن سلطنت کی گلوبلائزیشن کا انتظام استبداد کار (کلونائزرز) نے کیا اور سب سے بڑھ کر اپنے لیے کیا، نہ کہ استبداد زدہ (کلونائزڈ) کے مفاد میں۔

فرگوسن کا خیال ہے کہ، بالآخر برطانوی استعماریت کے شکار ہی اس سے استفادہ حاصل کرنے والے ثابت ہوئے، کیونکہ سلطنت نے مستقبل کی گلابلائزڈ دنیا میں ان کی حتمی کامیابی کے لیے بنیادیں قائم کی تھیں۔ لیکن انسان لمبے عرصے کے لیے نہیں جیتے؛ وہ زمانہ حال میں جیتے اور جھیلتے ہیں، اور ہندوستان میں نوآبادیاتی حکمرانی کے عمل کا مطلب تھا، معاشی استحصال اور لاکھوں (لوگوں) کی بربادی، ترقی پذیر صنعتوں کی تباہی، مسابقت کے مواقع سے منظم انکار، حکمرانی کے مقامی اداروں کا خاتمہ، طرزِ زندگی اور زیست کے سانچے کی قلب ماہیت جو کہ عہد عتیق سے پروان چڑھتا رہا تھا، اور استبداد زدہ (کلونائزڈ) کی سب سے قیمتی متاع، ان کی شناخت اور عزتِ نفس کو مسخ کرنا۔

ستم ظریفی کہ، اس میں فرگوسن کی طرح کی باتیں کوئی اور نہیں بلکہ اس کا پیشرو کارل مارکس کر رہا تھا:

> ہندوستانی سماج کی کوئی تاریخ ہے ہی نہیں، کم از کم کوئی تسلیم شدہ تاریخ۔ جسے ہم اس کی تاریخ کہتے ہیں، وہ محض یکے بعد دیگرے حملہ آوروں کی تاریخ ہے جنھوں نے اس غیر مزاحم اور غیر متبدل سماج کی مجہول بنیادوں پر اپنی سلطنتیں قائم کیں۔ لہٰذا سوال یہ نہیں کہ کیا انگریزوں کو ہندوستان فتح کرنے کا حق حاصل ہے، بلکہ کیا ہم ترجیح دیتے ہیں کہ برطانیہ کے ہندوستان کو فتح کرنے کی بجائے ہندوستان کو پسماندہ ترک، پسماندہ ایرانی، روسی فتح کریں.... انگلینڈ کو ہندوستان میں دوہرا مشن مکمل کرنا پڑے گا: ایک تخریبی، دوسرا قدیم ایشیائی سماج کی نیستی کا احیاء کرنا، اور ایشیا میں مغربی سماج کی بنیادیں رکھنا۔

عمومی طور پر برطانوی راج کے ہمدرد، لیکن اس کی استحصالی فطرت پر ملمع کاری کیے بغیر، استعماری حکمرانی

کا ایک زیادہ متوازن بیان، شاید ڈینیس جیوڈ کی مختصر بر شیر اور شیر میں مل جائے — اختتام کرتے ہوئے کہتا ہے کہ 'آیا یہ سب بہتری کے لیے تھا یا بدتر کے لیے، یہ کہنا تقریباً ناممکن ہے'۔ جان ولسن اپنی حالیہ ہندوستان فتح ہو گیا میں، عظیم استعماری مقصد کے جھوٹے دعووں کو، کسی بھی طور پر رد کرتا ہے۔ وہ دلیل دیتا ہے 'اس کی کاروائی اس کے محدود مفادات اور انتڑیوں کے ہیجان کی بجائے، زیادہ اہم طور پر اس کے اپنے مفاد کے لیے ہندوستان میں برطانوی مقتدر اداروں کو قائم رکھنے کی خواہش سے، عمل میں آئی'۔ دوسرے الفاظ میں، اپنے دوام کے علاوہ سلطنت کا کوئی اور بڑا مقصد نہیں تھا۔ پس کوئی حیرت نہیں کہ اس نے ہندوستان کے ساتھ بمشکل ہی کچھ اچھا کیا۔

نو آبادیت کی دو صدیوں کے بعد جن حالات میں ہم نے اپنے ملک کو پایا، ہندوستانی انھیں بھولنا گوارا نہیں کر سکتے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کیسے جو کبھی دنیا کی سب سے امیر اور صنعتی معیشت تھی، جو بشمول چین کے، 1750 میں دنیا کے صنعتی ماحصل کا تقریباً پچھتر فیصد شمار کی جاتی تھی، کو استعماری حکمرانی کے عمل کے ذریعے، 1947 میں ہماری آزادی کے وقت تک، روئے زمین پر غریب ترین، انتہائی پسماندہ، جاہل اور بیمار سماج میں بدل دیا گیا۔ 1600 میں، جب ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی، برطانیہ دنیا کے جی ڈی پی کا محض 1.8 فیصد پیدا کرتا تھا، جبکہ ہندوستان تقریباً 23 فیصد پیدا کر رہا تھا۔ 1940 تک، راج کے تقریباً دو صدیوں بعد، برطانیہ قریباً عالمی جی ڈی پی کا دس فیصد شمار کیا جاتا تھا، جبکہ ہندوستان کو ایک غریب 'تیسری دنیا' کے ملک، مفلس و فاقہ زدہ، غربت اور قحط سالی کے عالمی پوسٹر چائلڈ کی سطح پر گرایا جا چکا تھا۔ فرگوسن تسلیم کرتا ہے کہ '1775 اور 1900 کے دوران برطانیہ کی پر کیپیٹا گروس ڈومیسٹک پراڈکٹ (فی کس جی ڈی پی) حقیقی معنوں میں 347 فیصد بڑھی، ہندوستان کی محض 14 فیصد سے'۔ حتیٰ کہ یہ اعداد و شمار راج کی بتدریج بدتر ہوتی کارکردگی پر پردہ ڈالتے ہیں: 1900 سے 1947 کے دوران ہندوستانی معیشت میں نمو کی شرح ایک فیصد سے کم تھی، جبکہ آبادی بتدریج 3.5 فیصد سے زیادہ بڑھی، جو اطفال اور بچوں کی بلند شرح اموات سے محض معتدل ہوئی، جس نے حقیقی شرح نمو کو صفر کے قریب رکھتے ہوئے، آبادی میں اضافے کی اصل شرح کو معاشی نمو کے برابر سکیڑ دیا۔

برطانیہ سے آزادی نے ہندوستان کے لیے ان اعداد و شمار کا رخ پلٹ دیا۔ 1900 اور 1950 کے دوران حقیقی فی کس آمدنی میں اضافہ صفر تھا (0.8 فیصد معاشی نمو نفی اُسی درجے کا آبادی میں حقیقی اضافہ) لیکن یہ 1950 سے 1980 کے دوران 1.3 فیصد بڑھی (شرح نمو 3.5 فیصد منفی آبادی میں اضافہ 2.2 فیصد)، 1981

سے 1990 کے دوران 3.5 فیصد اور 1991 سے 2000 کے دوران 4.4 فیصد، آنے والے عشروں میں اس سے بھی زیادہ کے حصول سے پہلے، دو مرتبہ 9 فیصد عبور کرتے ہوئے اور 2001 سے 2010 کے دوران اوسطاً 7.8 فیصد۔ ان کے علاوہ، (یہ لکھتے وقت) آزادی کے تحت محض سات عشروں کے بعد دوسرے بنیادی اعشاریے بھی غیر معمولی طور پر اچھے تھے، بمقابلہ برطانوی حکومت کے بیس عشروں کے جو اس سے پہلے گزر چکے تھے۔

سولہ فیصد شرح خواندگی، 27 سال کی متوقع عمر، عملی طور پر بغیر ملکی انڈسٹری کے اور جسے آج ہم غربت کی لکیر کہیں گے 90 فیصد اس سے نیچے زندگی بسر کرتے ہوؤں کے ساتھ، برطانویوں نے ایک معاشرے کو چھوڑا۔ آج، شرح خواندگی 72 فیصد پر ہے، اوسط متوقع عمر بائبل کے تین سکور اور دس کے قریب ہو چلی ہے، اور بیسویں صدی میں اٹھائیس کروڑ لوگوں کو غربت سے نکالا جا چکا ہے۔

ہندوستان میں برطانوی استعماری حکومت کی مفروضہ نعمتوں میں سے ایک، بجلی کی سادہ سی مثال لے لیں: 1890 میں بجلی کی پہلی سپلائی آنے کے بعد برطانیہ نے ہندوستان پر پانچ عشروں تک حکومت کی۔ جبکہ 1947 میں آزادی تک ان پچاس سالوں میں، پورے برطانیہ کے ساتھ ساتھ باقی یورپ اور امریکہ میں بجلی پہنچ گئی تھی، توراج نے انڈیا کے 640000 دیہاتوں میں سے صرف 1500 کو الیکٹرک گرڈ کے ساتھ منسلک کیا۔ تاہم، آزادی کے بعد، 1947 سے 1991 کے دوران، ہندوستانی حکومت اندازاً 320 گنا زیادہ دیہاتوں میں بجلی لائی بہ نسبت اسی عرصے میں جتنا اہتمام برطانوی استعمار نے کیا۔

وجوہات واضح تھیں: برطانوی نو آبادیاتی حکمرانوں کو ہندوستانی عوام کی بہبود سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہندوستان وہی تھا جیسا محققین اسیموگلو اور روبنس نے اپنے اولین کام قومیں ناکام کیوں ہوتی ہیں میں کہا 'رس کشید کی جانے والی نو آبادی'۔ برطانوی استعمار کو سلام، ہندوستانی ریاست اور اس کے سائنسی، تکنیکی، صنعتی اور مدنی اداروں کی نامیاتی ترقی و توسیع پذیر نہیں ہو سکی، جیسا کہ سولہویں اور اٹھارہویں صدیوں کے دوران یورپ میں ہوئی۔ اس کی بجائے نو آبادیاتی استحصال ہوا۔

رسوا کن آدھی صدی کے بعد، جس میں ہندوستان کی فی کس آمدن میں بالکل کوئی اضافہ نظر نہیں آیا، برطانیہ کے اپنی حکومت کے خاتمے سے عشروں پہلے، دنیا اس شرمناک استعماری ریکارڈ سے آگاہ تھی۔ امریکی سیاستدان ولیم جیننگز بریان 1906 میں لکھتے ہوئے ایک کلکتہ میگزین، انڈین ورلڈ، کے مدیر کا حوالہ دیتا ہے:

'جب انگریز ہندوستان میں آئے، یہ ملک ایشیائی تہذیب کا قائد اور ایشیائی دنیا میں علم کا غیر متنازع مرکز تھا۔ جاپان کسی کھاتے میں نہیں تھا۔ اب پچاس سالوں میں، جاپان ترقی کے جدید فنون کی مدد سے اپنی تاریخ کا انقلاب برپا کر چکا ہے، اور ہندوستان نے، برطانوی حکمرانی کے ایک سو پچاس سالوں کے ساتھ، ابھی تک اس سرپرستی کو ملامت کیا ہے'۔ جاپان نے میجی بحالی کے بعد چالیس سال میں نوے فیصد شرح خواندگی حاصل کی ہے، جبکہ ہندوستان برطانوی حکمرانی کے 150 سال بعد دس فیصد پر اضمحلال کا شکار تھا۔ دوسرے تمام اہم سماجی-اقتصادی عشاریے ہندوستان کو ضرر پہنچانے پر کمربستہ تھے۔

جان ولسن دلیل دیتا ہے کہ، دنیا کو تونگر کرنے کی بجائے، برطانوی سلطنت نے اسے کنگال کیا۔ 'سلطنت سستے پر چلتی تھی۔ جن ممالک پر انھوں نے حکومت کی، ان کی ترقی پر خرچ کرنے کی بجائے، اپنی حکمرانی کو کم قیمت پر قائم رکھنے کے لیے مقامی اشرافیہ کے ساتھ ملی بھگت کر کے برطانویوں نے اپنا وجود برقرار رکھا... ہندوستانی ریاست بہار میں دیہاتیوں کا کشت وخون کرنے والے جاگیرداروں کی تخلیق، برطانیہ کی اراضی پالیسی کی بدولت ہوئی'۔

یہ مشکل ہے کہ برطانوی راج کی اس فرومایہ کارکردگی پر لارنس جیمز کے جشن منانے پر بھڑکا نہ جائے: 'دنیا کے سٹیج پر اس کی عظمت کے لمحات کے بدلے میں، راج نے ہندوستان کو برطانوی شرائط پر تخلیق نو کی پیشکش کی۔ یہ اُس بات کا انتہائی مکمل اظہار تھا، جسے برطانیہ من حیث المجموع انسانیت کی طرف اپنا فرض خیال کرتا تھا۔ اس کی رہنمائی کرنے والے نصب العین اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل کی اناجیلی روشن خیالی سے پھوٹے تھے، جس نے دنیا کو عیسائیت اور تعقل کے ذریعے بہتر شکل دینے کے خواب دیکھے۔ اول الذکر ہندوستان میں بہت کم پیش رفت کر پائی، لیکن مؤخر الذکر، نے مغربی تعلیم اور سائنس کے اطلاق کی شکل میں (پیش رفت) کی'۔

ویدوں اور اپنشدوں کی سرزمین، 'مدلل ہندوستانیوں کے وطن'، اکبر کے دربار میں عالمانہ الٰہیاتی مباحث کے ملک، ہندوستان کو کیا واقعی 'تعقل' کے ذریعے 'احیاء نو' کی خاطر برطانوی نوآبادیت کی ضرورت تھی؟ دعویٰ اپنے مفروضے میں دم بخود کرنے والا ہے. فرگوسن کے دلائل کو ساتھ رکھتے ہوئے، کہ استعماری حکمرانی سے معاشی فوائد کا دھارا بہہ نکلا، راج کے یہ عذر خواہ اس (عمل) کے مجرم ہیں جسے شاید ایک دانشورانہ ہندوستانی رسے کے شعبدے کے طور پر بیان کیا جا سکے: وہ اپنے ہی قضیے پر سوار ہو گئے۔ جیسا کہ پروفیسر رچرڈ پورٹر کہتا

ہے: 'مثال کے طور پر، کسی کو کیوں فرض کرنا چاہیے کہ اٹھارویں صدی کا ہندوستان، اپنی اشرافیہ کی نظروں میں، سرمائے، محنت اور اجناس کی "بہترین" تقسیم کے ساتھ اپنے اقتصادی راستے کے ارتقائی مراحل طے نہیں کر سکتا تھا، باوجود کہ وہ لبرل مغربی سیاسی معاشیات کے ماہرین کی جانچ کے معیارات سے مختلف ہی ہو؟' پورٹر مؤرخین اور محققین کے تفصیلی کام کا حوالہ دیتے ہوئے، ہندوستانی 'پسماندگی' کے فہم پر سوال اٹھاتا ہے، جسے انھوں نے پروان چڑھایا جو جدیدیت کو مغرب کے تحفے کے طور پر دیکھتے تھے۔

بالآخر یہ نہیں بھولنا چاہیے، کہ برطانوی جس ہندوستان میں داخل ہوئے وہ ایک دولتمند، پھلتا پھولتا اور تجارت پر قائم معاشرہ تھا: اسی وجہ سے، ایسٹ انڈیا کمپنی نے ابتدا ہی سے اس میں دلچسپی لی۔ پرتگیزی سیاح واسکوڈے گاما، جس نے کیپ آف گڈ ہوپ کے گرد چکر کاٹتے ہوئے کالی کٹ (کوزہیکوڈے) کا اپنا راستہ تلاش کیا، نے پرتگال کے بادشاہ مینوئل اول کو قدرے ہانپتے ہوئے، بڑے شہروں، فراخ عمارتوں و دریاؤں، اور عظیم اور خوشحال آبادیوں کے (ملک) کے متعلق بتایا۔ اس نے مصالحہ جات، جواہرات، قیمتی پتھروں اور 'سونے کی کانوں' بارے ستائشی انداز میں بات کی۔ معمولی زیورات جو اس نے ہندوستانی بادشاہ، کالی کٹ کے زمورین کو تحفتاً پیش کیے، انھیں بے وقعت سمجھا گیا؛ ڈی گاما کی اجناس کا تاجروں اور درباریوں نے کھلم کھلا ٹھٹھا اُڑایا اور تضحیک کی، جو کہ ان سے کہیں زیادہ اعلیٰ معیار کی اشیاء کے عادی تھے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ہونے کے برخلاف، قبل از نوآبادیاتی ہندوستان اعلیٰ معیار کی صنعتی اشیاء برآمد کرتا تھا، جو برطانوی فیشن ایبل سوسائٹی کے لیے انتہائی مرغوب تھیں۔ برطانوی اشراف ہندوستانی سوت اور ریشم پہنتے تھے، اپنے گھروں کی آرائش ہندوستانی چھینٹ اور زیبائشی پارچہ جات سے کرتے تھے، اور ہندوستانی مصالحہ جات اور چٹ پٹے ذائقوں کے طالب تھے۔ (درحقیقت، سترہویں صدی میں اپنے گاہکوں کو خریداری پر لبھانے کے لیے، ادنیٰ معیار کی برِطانوی ساختہ نقول کے سامان تجارت کو 'ہندوستانی' کے طور پر قبول کروانے کی کوشش کرنے والے برطانوی صنعتکاروں کی کہانیاں موجود ہیں۔) مغل شہنشاہ اورنگزیب (1618-1707) کے محاصل انتہائی کثیر تھے۔ درحقیقت، ٹیکس محاصل ایک طرف، جن کا ذکر میں کتاب میں پہلے کر چکا ہوں، کہا جاتا ہے کہ اس وقت اس کی کل آمدن کا تخمینہ پینتالیس کروڑ ڈالر تھا، (اس کے ہم عصر) لوئیس XIV سے دس گنا سے بھی زیادہ۔

ہندوستان کے انتہائی ترقی یافتہ بینکنگ کے نظام اور قوت سے بھرپور تجارتی سرمائے، کے ساتھ اس کے

گماشتوں، دلالوں اور وچولوں کا مستحکم نیٹ ورک اور برآمدات اور تجارتی قرضے میں سرمایہ کاری کی اہلیت، اس نفیس مالیاتی نیٹ ورک کی خصوصیات تھیں، جیسا کہ جگت سیٹھ، جنوب میں چھیتیار اور مغرب میں گجراتی بنئے۔ بنکنگ کا یہ نظام اتنا وسیع اور پھیلا ہوا تھا اور اتنے سرمائے کے ساتھ لین دین کرتا تھا جتنا کہ بنک آف انگلینڈ۔

یہ وہ ملک تھا جسے برطانوی فتح نے غریب بنایا۔ برطانوی حکمرانی سے مغلوب ہونے والے ہندوستان نے بے اندازہ فاضل سرمایے سے لطف اٹھایا، ہنرمند دستکار طبقے کو صف آراء کیا، بہت زیادہ عالمی طلب پر اعلیٰ معیار کی اجناس برآمد کیں، وافر قابلِ کاشت زمین کا انصرام کیا، ترقی کرتی ہوئی زراعتی بنیاد موجود تھی، اور غربت یا زمین کی بے ملکیتی کے بغیر تقریباً دس سے پندرہ کروڑ (لوگوں) کی اعانت کی۔ یہ سب برطانوی حکمرانی کے باعث تباہ ہو گیا۔ جیسا کہ ولسن نشاندہی کرتا ہے: '1750 میں، ہندوستانیوں کا معیار زندگی برطانوی عوام جیسا تھا۔ اب، جہاں تک حقیقی قوت خرید کا تعلق ہے، اوسط ہندوستانی آمدن برطانوی معیار کا بمشکل دسواں حصہ ہے۔ یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ برطانوی حکمرانی کے دو سو سال اسی درمیانی مدت میں وقوع پذیر ہوئے'۔

جیسا کہ میں اپنی کتاب کے کورس میں ایک سے زائد مرتبہ کہہ چکا ہوں، کہ یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ، اسے اس کے اپنے وجود پر چھوڑا ہوتا، تو ہندوستان انیسویں اور بیسویں صدی میں زیادہ خوشحال، متحد اور جدید طرز میں ڈھلتی قوت کے ارتقائی مراحل طے کر سکتا تھا۔ بہت سے ماہرین اقتصادیات، راج کے زیر اثر ہندوستان کی معاشی ناکامی کے لیے برطانوی بغض کی بجائے تکنیکی پسماندگی کو الزام دیتے ہیں۔ لیکن اگر ٹیکنالوجی کی کمی ہی ہندوستانی معیشت کی واحد سب سے بڑی ناکامی تھی، تو اس کے باوجود ایک آزاد ہندوستان ہمیشہ ٹیکنالوجی درآمد کر سکتا تھا جس کی اسے ضرورت ہوتی، جیسا کہ مثال کے طور پر جاپان نے کیا تھا۔ بیسویں صدی تک مناسب طور پر، برطانویوں نے ہندوستانیوں کو ایسا کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ایک ملک، جو صدیوں سے، فنکاروں اور مورخوں کو ایران سے مجسمہ سازوں اور ماہرین تعمیرات کو وسط ایشیا سے اور فوجیوں کو مشرقی افریقہ سے درآمد کرنے پر آمادہ رہا تھا، (اس کے لیے) کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ریلویز سے لے کر صنعتی ٹیکنالوجی (جیسا کہ چین آجکل کر رہا ہے) تک، جدیدیت کا آرائشی ساز وسامان یورپ سے درآمد نہ کرتا۔

ہندوستانی تہذیب کی قوت محرکہ کا رخ پوری تاریخ میں عظمت کی طرف رہا، بلاشبہ پسپائی اور کشمکش حائل تھی، لیکن ان سے کون سا ملک مستثنیٰ ہے؟ تجارت، نہ کہ فتح، نے ہندوستان کو بھی بدل دیا ہوتا۔ برطانوی حکمرانی کے بھیانک خواب کے بغیر، میجی کے احیاء جیسا کچھ ہندوستان میں بھی بآسانی وقوع پذیر ہو سکتا تھا۔ یہ

دلیل کم از کم معقول تو ہے کہ ہندوستان ہر جگہ سے اور اپنی ضروریات کے موافق بہترین مستعار شدہ (اور قیمتاً/ عاریتاً لیے ہوئے) دستور العمل کو استعمال کر کے جدید ہو گیا ہوتا، بہ نسبت اس دعویٰ کے کہ اسے اس مقام پر پہنچنے کے لیے جہاں سے اسے اب شروع کرنا تھا، یورپی محکومیت اور تحقیر کی ضرورت تھی۔

ناول نگار جوزف کونرڈ، جو بذات خود انتہاء پسندی کی جانب مائل نہیں تھا، نے نو آبادیت پسندی کو 'ایک ڈھیلی ڈھالی، ریاکاری، غارتگری اور بے رحم حماقت کے کمزور نظر شیطان' کے طور پر بیان کیا. جیسا کہ کونرڈ نے 1902 میں لکھا، 'زمین کی فتح، جس کا عام طور پر مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے ان سے ہتھیا لیا جائے جن کی جلد کا رنگ مختلف ہے یا ہماری نسبت جو تھوڑے پھینے ہیں، جب آپ اسے بنظر غائر دیکھتے ہیں تو یہ زیادہ خوشگوار بات نہیں ہے'۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے 1930 میں نیویارک میں یورپی سامعین کے سامنے اسے بڑی ملائمت کے ساتھ پیش کیا: 'دنیا کا ایک بہت بڑا حصہ آپ کی تہذیب کی وجہ سے مصیبت میں مبتلا ہوا ہے'۔ مہاتما گاندھی زیادہ صاف گو تھے: پوچھنے پر کہ وہ مغربی تہذیب کے بارے میں کیا سوچتے ہیں، انھوں نے جواب دیا، 'یہ ایک اچھا تصور ہوتا'۔

نیل فرگوسن اپنی سلطنت کے دفاع میں لکھتا ہے، 'سوال یہ نہیں کہ کیا برطانوی استعمار بے عیب تھا۔ ایسا نہیں تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا جدیدیت کی جانب اس سے کم خونریز راستہ ہو سکتا تھا'۔ جیسا کہ ہم پچھلے ابواب میں مرتب کردہ، راج کے کیے گئے قتلام اور سفاکیت کے خون آشام ریکارڈ دیکھ چکے ہیں، تو اس کے سوال کا جواب صرف ہاں ہو سکتا ہے۔ گرچرن داس، جو انگریزوں کو شک کا فائدہ دینے کی جانب مائل ہے، ان کی حکمت عملی میں کوئی دانستہ بغض نہیں دیکھتا، لیکن برطانوی ہند کی صنعتی ناکامی کی وجوہات کے متعلق اس کا جائزہ، در حقیقت، برطانوی نو آبادیاتی حکومت نے معیشت کے ساتھ جو سلوک کیا، اس کی تباہ کن تلخیص تک جا پہنچتا ہے: 'صنعتی انقلاب رونما نہیں ہوا کیونکہ (اوّل)، ہندوستانی زراعت غیر متحرک تھی، اور آپ زراعتی فاضل پیداوار یا تیزی سے بڑھتی شہری آبادی کی غذائی ضروریات کے وسائل کے بغیر، صنعتی انقلاب پیدا نہیں کر سکتے؛ دوم یہ کہ، جنگ عظیم اول، اور اس کے پیچھے پیچھے ڈیپریشن، کے بعد بین الاقوامی تجارتی صورتحال، ملکی مصنوعات کے تحفظ کے معاشی نظام کے لیے معاندانہ ہو چکی تھی؛ سوم، جاپانی ریاست کے برعکس، نو آبادیاتی حکومت نے عوام کو تعلیم نہیں دی؛ آخری یہ کہ، نو آبادیاتی ذہنیت ہندوستانی درمیانے طبقے میں سرائیت کر گئی تھی۔ حتیٰ کہ سخت جان امکانات کے حامل انٹرپرینیور (entrepreneur) میں بھی اعتماد کم ہو جاتا ہے، جب

اسے سیاسی طور پر غلام بنا لیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں، داس کی چار اہم وجوہات میں سے تین، برطانوی نوآبادیاتی زرعی پالیسی، ہندوستان میں اس کی تعلیمی پالیسی اور اس کی ہندوستانیوں کی نسلی محکومیت نے، زیر بحث دور میں ہندوستان کی پسماندگی میں کردار ادا کیا؛ اور چہارم، جنگ عظیم اور اس کے نتائج نے ہندوستان کو فقط اتنا ہی متاثر کیا جتنا کہ اس نے کیا، کیونکہ ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں تھا۔

یہ استدلال کیا جا سکتا تھا کہ انگریزوں کے قبیح جرم کو زیادہ غیر جانبدارانہ طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس دلیل کا تذکرہ کیا جاتا ہے، کہ نقاد، نوآبادیاتی دور میں مغرب کے تصور کو گڈمڈ کر دیتے ہیں، کیونکہ ہم دو بالکل علیحدہ کناروں کو، جو اس تصور کے عناصر ترکیبی ہیں، خلط ملط کر دیتے ہیں: پہلا جدید ریاستی مشینری پر مشتمل ہے (افواج، مردم شماری، افسر شاہی، ریل کی پٹری، ہسپتال، ٹیلیگراف لائینیں، تعلیمی اور سائنسی ادارے وغیرہ وغیرہ) اور دوسرا لبرل اقدار ہیں (انفرادی حقوق؛ سوچ، تقریر، فن اور سیاسی اظہار کی آزادی؛ قانونی مساوات؛ اور سیاسی جمہوریت)۔ بدیہی طور پر ایک، دوسرے کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ (بہر صورت، آج چین کو دیکھیں، جہاں اول الذکر، مؤخر الذکر کے بغیر پروان چڑھا ہے)۔ پس، انگریزوں کو ما قبل نوآبادیاتی دور کے حکمرانوں سے جو چیز الگ کرتی ہے، وہ یہ نہیں کہ وہ لوگ زیادہ غارتگر یا اخلاق سے زیادہ عاری تھے، بلکہ سادہ انداز میں یہ کہ، اسی اثناء میں، اپنی لبرل اقدار سے بہرہ مند کرنے کے حوالے سے لاپرواہ یا غیر مخلص رہتے ہوئے ایک ریاست بنانے میں ان کی قابلیت زیادہ تھی۔ لیکن برطانیہ بھی لبرلزم کی روشن خیال روایت کی تجسیم تھا، اور ہم انھی بنیادوں پر ان کی تخلیق کردہ 'ریاست' کو درشتی سے پرکھتے ہیں۔ کیا یہ ایک معتبر دلیل ہے، پس چونکہ، مراٹھوں، انڈین پر نسیپیلٹیز یا حتیٰ کہ تباہ ہوتی مغل ریاست جس کے ساتھ انگریزوں کی مڈھ بھیڑ ہوئی پر صریحاً اس کی اپنی شرائط پر اس (دلیل) کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا؟ مراٹھا پیشوا کو بل اور پٹ کے معیار پر کون رکھ رہا تھا؟

یہ ایک دلچسپ دلیل ہے، لیکن قطعی طور پر ایسی نہیں جس سے ترغیب حاصل کی جائے۔ جیسا کہ میں پہلے نشاندہی کر چکا ہوں، در حقیقت، انگریزوں کے لیے ہندوستان میں ریاست، محض انسانی حقوق سے لاپرواہ ایک غیر جانبدار مؤثر نظام کی بجائے، ایک مکمل طور پر غیر اخلاقی، غارتگر استعماری مشین تھی جو منافع کی غرض سے ہندوستانیوں کی محکومیت کی آرزو مند تھی۔ اور اس کی محکومیت کا نتیجہ برطانیہ کے ہندوستان کی دولت کو غصب کرنے کی صورت میں نکلا، ایک ایسے وسائل والے سماج سے نکاسی کرتے ہوئے جو عام حالات میں اپنی

طبعی نمو اور معاشی ترقی کو آگے بڑھاتا۔ ہاں، ماقبل نو آبادیاتی ہندوستان میں قحط اور وبائیں شاید رہی ہوں گی، لیکن ہندوستانی ان کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے بہتر طریقوں کا اکتساب کر رہے تھے، جو وہ برطانوی حکمرانی کے زیر اثر کرنے سے قاصر تھے، کیونکہ برطانوی انھیں غربت میں دھکیل چکے تھے اور کھیتی باڑی پر ناقابل برداشت انداز میں گزر اوقات کرنے والوں کے علاوہ ان کی روزی کے ذرائع تباہ کر چکے تھے___ اس کے علاوہ وکٹورین برطانیہ کی 'غیر امتیازی' عطیات کی نظریاتی مخالفت نے کئی لاکھ ہندوستانیوں کو دادرسی سے محروم کر دیا، جس سے (شاید) ان کی زندگیاں بچ گئی ہوتیں۔

برطانوی حکمرانی کی میری توصیف کا، کرکٹ، چائے اور انگریزی زبان تک محدود رہنا شاید بے وقعت لگے۔ میرا مطلب دوسری کامیابیوں کے کردار کو گھٹانا نہیں۔ مثال کے طور، برطانوی تجارتی مفادات کی خاطر ہندوستان کے استحصال اور لوٹ کا احاطہ کرتے ہوئے، مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ اس عمل میں برطانیہ نے ہندوستان کو جوائنٹ سٹاک کمپنی، تجارتی سرگرمیوں اور بین الاقوامی تجارت کا طویل تجربہ عطا کیا، اور ایشیا کی سب سے پرانی سٹاک ایکسچینج 1875 میں بمبئی میں قائم ہوئی۔ ہندوستانیوں کی بین الاقوامی تجارت اور سٹاک مارکیٹ سے شناسائی گلوبلائزڈ دنیا میں ایک منفرد فوقیت ثابت ہوئی؛ ہندوستانی کاروباری تنظیم سازی (انٹرپرینیوریل entrepreneurial) کا سرمایہ اور انتظامی مہارتیں، آج کے ترقی یافتہ مغرب کی نفیس مالیاتی منڈیوں میں، اثاثہ جات کو کنٹرول کرنے اور ان کا انتظام کرنے کی مکمل طور پر اہل ہیں، جیسا کہ کئی سالوں میں پہلی مرتبہ جیگوار کو منافع بخش بنا کر، ٹاٹاز، برطانیہ میں مظاہرہ کر چکے ہیں، اور ہندوستانی تاجر اور مینیجرز پابندیوں سے آزاد اور گلوبل ہوتی ہوئی دنیا میں اکیسویں صدی کی معیشت کو چلانے کے لیے جو نظام درکار ہیں ان سے آگاہ ہیں۔

اور ابھی بھی یقیناً آپ اس گلفام تصور کی شرائط پر پورا اتریں گے___ برطانوی نو آبادیت کو سلام، کہ دنیا کی معیشت پر قبضہ کرنے کے لیے اسے رسی سے کھینچ رہے، ہنرمندوں، تجربہ کاروں اور انگریزی بولنے والے تاجروں کے ساتھ، ہندوستان اس سیارے پر غلبہ پانے میں مصروف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ، قابلِ فہم طور پر، نو آبادیاتی تجارتی استحصال پر ابتدائی ہندوستانی ردعمل اس کے برعکس تھا___ اتباع نہیں بلکہ دھتکار۔ نو آبادیاتی حکمرانی سے آزادی کے لیے لڑائی میں غیر ملکی حکمرانوں اور غیر ملکی سرمایہ داروں دونوں کو مغلوب کرنا شامل تھا (حالانکہ چند قوم پرست ہی فرق بتا سکتے تھے)۔ استعماریت کا شکریہ، ہندوستانی قوم پرستی کے عظیم قائدین نے سرمایہ داری کو غلامی کے ساتھ جوڑا: اس حقیقت نے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کے لیے آئی اور حکمرانی کرنے

کے لیے ٹھہر گئی، اسے نئے سامراجی مبخ کے چھدرے سرے کے طور پر چشم تصور میں لاتے ہوئے، ہمارے قوم پرست قائدین کو بریف کیس والے ہر غیر ملکی بارے شکی بنادیا۔

لہٰذا ہندوستان کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام میں سمونے کی بجائے، جیسا کہ سنگاپور کی طرح بعض مابعد نوآبادیاتی ممالک نے بڑے مؤثر انداز میں کیا، ہندوستان کے قائدین اس بات کے قائل تھے کہ جس سیاسی آزادی کے لیے انھوں نے جدوجہد کی اس کی واحد ضمانت معاشی آزادی ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خود انحصاری بنیادی نعرہ بن گیا، ملکی صنعت کے تحفظ کے حامیوں کی رکاوٹیں بڑھ گئیں، اور ہندوستان نے معیشت میں اختیارات کی بلندیوں پر تاجروں کی بجائے افسر شاہی کے ساتھ پینتالیس سال گزارے، آزادی کے بعد شروع کے پینتالیس سالوں کا زیادہ تر حصہ غیر پیداواریت کو سبسڈائز کرنے، جمود کو دستور العمل میں لانے اور غربت کو منقسم کرنے کی کوشش میں گزرا۔ برطانوی حکمرانی کے ردعمل میں ہندوستانیوں نے بذاتِ خود جو کچھ چُنا، اس کا الزام آپ انگریزوں پر عائد نہیں کر سکتے، لیکن اس سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ کے اسباق میں سے ایک سبق جو آپ سیکھتے ہیں، یہ ہے کہ تاریخ بعض اوقات غلط اسباق سکھاتی ہے۔ برطانوی نوآبادیت اور اس کے اسلوب کے ابتدائی الہامی استرداد کے بعد، ہماری موجودہ معاشی ترقی اور عالمی سطح پر موجودگی کا احساس، ہمارے نئے حق انتخاب کے استعمال کا نتیجہ ہے۔

ہندوستان میں انگریزوں کے اپنے مفادات کے لیے قائم کیے گئے اور چلائے گئے اداروں سے ہندوستانیوں کے لیے اگر کوئی ضمنی مثبت نتائج برآمد ہوئے تھے، تو مجھے ان کا اعتراف کرتے ہوئے خوشی ہوگی، لیکن صرف ضمنی نتیجے کے طور پر، نہ کہ اس لیے کہ ہندوستانیوں کے فائدے کے لیے ان کا قصد کیا گیا۔ ریلویز تعمیر سے لے کر تکمیل تک، مکمل طور پر برطانوی فائدے کے لیے قائم کی گئی، لیکن آج ہندوستانی اس کے بغیر نہیں رہ سکتے؛ ہندوستانی اتھارٹیز نے برطانوی پالیسیوں کو الٹ دیا، اور ریلویز کو بنیادی طور پر لوگوں کی نقل و حمل کے لیے استعمال کیا، مسافروں کو سبسڈی دینے کے لیے بار برداری کا کرایہ ہمیشہ سے زیادہ رکھا (برطانوی چلن کے بالکل مخالف)۔ اسی طرح انگریزوں کے کیے گئے کے کاموں کو ان کے ناکافی پن کی وجہ سے ہندوستانی قوم پرستوں نے تنقید کا نشانہ بنایا__ چونکہ ان پر ہونے والے اخراجات ریلویز پر ہونے والے (اخراجات) کا محض نواں حصہ تھے__ اور امریکی سیاستدان ولیم جیننگز بریان نے نشاندہی کی تھی کہ، 'فوج کے اخراجات کا صرف دس فیصد آبپاشی پر صرف کیا جاتا تو پانچ سال کے اندر نظام مکمل ہو چکا ہوتا، لیکن فوجی

اخراجات کم کرنے کی بجائے، فوج کا حصہ بڑھا دیا گیا'۔ تاہم آبپاشی میں پھر بھی تقریباً دو کروڑ ایکڑ شامل ہوئے، ملک کے قابلِ کاشت رقبے میں فرانس کے برابر رقبہ (حیف، تقریباً یہ تمام آج کے پاکستان میں ہے)۔ یہ دکھاوا کرنا بیکار ہوگا کہ اس سے کچھ بھی بہتر نہیں ہوا۔ لیکن آخر میں جب بیلنس شیٹ مرتب کی جاتی ہے، تو ترازو کا پلڑا نوآبادکاروں کے خلاف ہوتا ہے۔

ہندوستانی فوج کو بسا اوقات ایک قابلِ قدر برطانوی ورثے کے طور پر یاد کیا جاتا ہے، رفاقت و شجاعت کی مضبوط روایت کے ذریعے متحد، ایک پروفیشنل جنگجو لشکر، جو اعلیٰ قابلیت کی بنیاد پر قائم اور سیاست سے کنارہ کش رہی۔ یہ قابلِ بحث ہے کہ اس آخری کامیابی کا سہرا کس حد تک انگریزوں کو جاتا ہے: آخر کار، پاکستانی فوج بھی اس نوآبادیاتی ورثے کی اسی قدر وارث ہے، لیکن اس نے تین دفعہ ملک پر قبضہ کیا، مزید برآں، جب اقتدار پر منتخب حکومتیں براجمان تھیں تب بھی عنانِ اقتدار مضبوطی سے سنبھالے رکھی۔ یقیناً، اہم نقطہ یہ ہے کہ انڈین فوج کو ہندوستان کے مفاد میں نہیں، بلکہ یہاں اور بدیس دونوں میں، برطانیہ کے (مفادات) کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ ہندوستانی فوجی محض ایک تابعدار آلہ تھی: ہندوستانی سپاہی کا ایک ہم عصر نے 'اعتدال پسند، مؤدب، بردبار، ماتحت، اور وفادار' کے طور پر نقشہ کھینچا تھا۔ یہ سکوت 1857 کے انقلاب کے ساتھ ختم ہوا، لیکن انگریزوں نے نظم و ضبط کی بحالی کا اہتمام کر لیا اور برطانوی ہند فوج نے اگلے نوے سال کے لیے وفاداری اور حمیت کے تصورات پر اپنی تجدید کی۔

پھر انگریزوں نے بٹوارے کے ذریعے اس کے حصے بخرے کر دیے۔ دہلی آرمی میس میں نئے ملک پاکستان کے لیے جانے والوں کو دیے گئے ایک الوداعی عشائیے میں 'جانے کہاں گئے وہ دن (آولڈ لینگ سائن /Auld Lang Syne)' گاتے ہندو اور مسلمان افسران کی دلخراش کہانیاں بیان کی گئیں۔ ان میں سے بہت سے افسران، اس عقیدے، جس میں وہ پیدا ہوئے اور ایک سیاسی مقصد کے لیے جو انھوں نے نہیں چنا تھا، کے نام پر، سالوں کی رفاقت، ناقابل تلافی طور پر گنوا بیٹھے۔

بڑی حد تک غیر تنقیدی، درحقیقت رومانی انداز کی برطانوی ہند فوج اور اس کی سرگزشت، کہ کیسے چند ہزار برطانوی فوجیوں نے بیس کروڑ باشندوں کے ایک برصغیر کو زیرِ تسلط رکھا، فلپ میسن بیان کرتا ہے، جو وکٹورین منتظم کا حوالہ دیتا ہے: 'ہماری فوج نے اپنی حقیقی استعداد کے مطابق اتنا نہیں کیا جتنا کہ اس نے تاثر پیدا کیا'۔

آج کی لاکھوں گنا مضبوط، ہندوستانی فوج، نے برطانوی روایات میں سے بہترین کو قائم رکھا جبکہ اس تحریص سے اجتناب کیا، جس کا شکار اس کے پاکستانی اور بنگلہ دیشی کاؤنٹر پارٹ ہوئے، یقیناً اس کا سہرا اس کے اپنے افسروں اور جوانوں کے، ساتھ ساتھ ہندوستانی جمہوریت کے شمولیت پسند اور کثرت پسند مزاج کے سر زیادہ ہے۔

برطانوی موجودگی کی مادی شہادت بارے چند نکات __ عمارتیں، بندرگاہیں، ٹرینیں اور ادارے __ ایک دیرپا شراکت کی شہادت کے طور پر۔ یہ حقیقت کہ، اس دوران مقامی آبادی کی سرکشی پر نگرانی رکھتے ہوئے، انگریزوں نے ہندوستانی دولت کا زیادہ سے زیادہ استحصال کرنے کے لیے کم سے کم رقم صرف کی۔ ان میں سے بعض اشیاء کسی بھی سماج کے لیے بنیادی ہوتی تھیں؛ لیکن زیادہ تر انگریزوں کو فائدہ دینے کے لیے اختراع کی گئیں، چاہے ہندوستان میں ہوں یا انگلینڈ میں۔ نیل فرگوسن دلیل پیش کرتا ہے کہ انگریزوں نے 'مفید' اشیاء تعمیر کیں __ اپنے لیے پرشکوہ محلات اور معاہداتی مشقت کے لیے بحری جہاز، بلاشبہ، اس کی عمدہ مثالیں ہیں __ جبکہ ہندوستانیوں نے اپنے وسائل 'نمود و نمائش کے اخراجات' پر اڑا دیے۔ برآمدات کے لیے موزوں ململ بنانا؟ اپنے ہندی فولاد کے ساتھ عالمی دھات سازی کے معیارات قائم کرنا؟ عالیشان شہر اور مندر تعمیر کرنا؟ یا شاید فرگوسن سوچتا ہے کہ تاج محل ایک شاندار اور نمائشی ضیاع تھا؟

کہانی بیان کی گئی ہے __ میں ماخذ کی نشاندہی نہیں کر سکتا __ کہ جب پرنس آف ویلز، مستقبل کے ایڈورڈ ہشتم، نے 1921 میں ہندوستان کا دورہ کیا، تو انھوں نے چند عالیشان عمارتوں، کاروں اور بجلی کی تنصیبات کی طرف اشارہ کیا اور اپنی رفاقت میں چلتے ایک ہندوستانی سے کہا، 'ہم آپ کو یہاں ہندوستان میں ہر چیز مہیا کر چکے ہیں! کیا ہے جو آپ کے پاس نہیں؟' اور احقر ہندوستانی نے ملائمت سے جواب دیا، 'عزتِ نفس، جناب'۔

یہ بھی استعماریت نے چھین لی: عزت نفس جو اس آگہی سے آتی ہے کہ آپ اپنی قسمت کے مالک ہیں، آپ کے مسائل آپ کی اپنی کوتاہیوں کے باعث ہیں اور یہ کہ ان کے حل کا انحصار بنیادی طور پر آپ پر ہے نہ کہ دور دراز ملک میں رہنے والے کسی انجان شخص پر۔ سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ آزادی نے اس میں دروغ گوئی کی ہے، جمہوری حقوق کی ترویج اور اختیار کی حامل شہریت کے مشترکہ تصور میں، جس میں ہر شہری یا کسی قوم کے ذیلی گروہ اپنے حقوق کی ترویج اور یہ اطمینان کر سکتے ہیں کہ ان کی آواز سنی جائے گی۔ نوآبادیاتی محکومیت کے ذریعے اسے ہمیشہ ہندوستانیوں سے دور رکھا گیا تھا، یہی وہ سب کچھ تھا جو برطانوی انھیں عطا کرنے

پر رضا مند تھے۔

اخلاقی رکاوٹ

ایک مرتبہ جواہر لال نہرو نے، برطانوی ہند کا نقشہ ایک عظیم الشان حویلی کے طور پر کھینچا جس میں انگریز اشراف تھے جو بہترین حصوں میں، (جبکہ) ان کے ساتھ، ملازمین والے ہال میں ہندوستانی رہائش پذیر تھے: 'جیسا کہ ہر مناسب حویلی کے زیریں حصوں میں ایک متعین شدہ حفظِ مراتب کا سلسلہ ہوتا تھا__ خانساماں، منتظم خانہ، باورچی، پیش خدمت، کنیز، پیادہ وغیرہ__ اور ان کے مابین تقدم کا سختی سے خیال رکھا جاتا تھا۔ لیکن اس حویلی کے بالائی اور زیریں حصوں کے درمیان، ناقابلِ عبور سماجی اور سیاسی بندش ہوتی تھی'۔

یہ بندش محض سماجی یا نسلی نہیں تھی: یہ نیت اور مفاد کی ایک اخلاقی رکاوٹ بھی تھی، ایک دعویٰ جو وثوق سے نہیں کیا جا سکتا، یہ ہے کہ برطانوی عہدیداروں نے کبھی بھی، کسی بھی معاملے میں، ہندوستانی عوام کے مفادات کو اپنے مفادات سے فائق سمجھا تھا یا مصیبت میں مبتلا واحد ہندوستانی عورت کی ضروریات کو تجارتی منافع کی طلب جو اس کی مصیبت کا باعث بنی، سے فائق رکھا تھا۔ مختصراً یہی ہے کہ اس کی کوئی مثال نہیں، جبکہ اس کے برعکس لاتعداد مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر، کاشتکاری اور افیون کی فروخت پر برطانوی پالیسی کو لے لیں۔ چین میں، منافع کی جستجو میں، اس کے عوام کو منشیات کے خمار میں مبتلا کرنے کی خواہش، افیون کی دو عدد جنگوں تک بھی لے گئی؛ ہندوستان میں یہ محض عوام کے استحصال کی ایک اور شکل بن گئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے یقین دہانی کیے رکھی کہ افیون کی کاشت اور اس کی فروخت دونوں پر برطانوی حکومت کی اجارہ داری رہے۔ 1838 کی ایک روداد میں حقائق پیش کیے گئے تھے:

> کمپنی کی عملداری میں تمام علاقوں میں پوست کی کاشت، منشیات کی تیاری، اور اس کا لین دین [....] سخت اجارہ داری کے زیر اثر ہیں.... افیون کی کاشت رعیتی زمینوں کے حصوں پر لازم تھی۔ حکومت اپنے مقامی گماشتوں کے ذریعے پیشگیاں دیتی، اور اگر کوئی رعیتی پیشگی لینے سے انکار کرتا، تو اس کے گھر میں رقم پھینکنے کا سادہ طریقہ اختیار کیا جاتا؛ اگر وہ فرار ہونا چاہتا، تو ملازم اسے پکڑ کر، پیشگی اس کے کپڑوں کی گرہ میں باندھ دیتے، اور کوئی چارہ نہ ہونے کے باعث، وہ اپنے معاہدے کی پاسداری کے لیے کمر کس لیتا، جو وہ کر سکتا تھا....'☆ افیون کی کاشت، جو آفت ہندوستان میں ہمارے محکوم رفقاء پر لائی، وہ جزواً پٹنہ اور بنارس کے افیون کے اضلاع کے رعیتیوں کو مجبور کرنے سے شروع ہوئی کہ وہ اپنی زمینوں کا متعین حصہ پوست کی پیداوار کے لیے رکھ چھوڑیں۔

☆ ولیم ہوَوٹ 1838 کا مصنف کہتا ہے، اقتباس کے اندر حوالہ جات فروری 1837 کے چینی مخزن سے 'پوست کی کاشت' پر ایک آرٹیکل سے لیے گئے ہیں۔

چینیوں کے افیون کا جوا اُتار پھینکنے کے بعد یہ بڑی عمدگی سے جاری رہا۔ عوامی غیض و غضب کے رد عمل میں قائم کردہ 1895 کے ایک شاہی کمیشن، نے افیون کی ہولناکیوں کی پردہ پوشی کی اور دعویٰ کیا کہ عوامی اضطراب اور اندیشہ مبالغہ آمیز ہے۔ (قحط سے شہرت پانے والے سر رچرڈ ٹیمپل، جو اب ریٹائرڈ ہو چکے تھے، نے کمیشن کے سامنے افیون کی پالیسی کا دفاع کیا۔) 1930 میں ڈیورانٹ نے ہندوستان میں افیون کی سات ہزار دکانوں کا کھوج لگایا، ان میں سے ہر ایک برطانوی حکومت کی ملکیت تھی، اور ہر ہندوستانی قوم پرست تنظیم اور سماجی خدمت کی جماعت کے احتجاج کے باوجود اپنا کاروبار چلا رہی تھی۔ تقریباً چار لاکھ ایکڑ زرخیز اراضی افیون کی کاشت کے لیے رکھی گئی، یہ کم خوراکی کا شکار ہندوستانیوں کے لیے خوراک پیدا کر سکتی تھی۔ جب خصی مرکزی مقننہ کے ہندوستانی ممبران نے 1921 میں، ہندوستان میں افیون کی کاشت اور فروخت کو ممنوع قرار دینے کے لیے اپنے کولیگز کو ایک بِل پاس کرنے کی ترغیب دی، تو حکومت نے اس پر عمل درآمد سے انکار کی سادہ مصلحت کے ذریعے اسے ویٹو کر دیا، جو بلاشبہ، اس حقیقت سے آگاہ تھی کہ حکومت کے سالانہ محاصل کا نواں حصہ منشیات سے حاصل ہوتا تھا۔ تعجب ہے کہ، جب مہاتما گاندھی نے آسام میں افیون کے خلاف تحریک چلائی اور اس کے استعمال کو نصف کرنے میں کامیاب ہو گئے، تو انگریزوں نے اس کا جواب، انھیں اور ان کے چوالیس ستیاگرہوں کو جیل بھیج کر دیا۔

اس مضر نشے کے انسداد کے مطالبے کے لیے متعدد عالمی افیون کانفرنسوں کا انعقاد کیا گیا، لیکن برطانیہ نے ان ترغیبات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا؛ عالمی غیظ و غضب کو فرو کرنے کے لیے، یہ افیون کی برآمدات میں دس فیصد سالانہ کمی پر تو راضی ہو گیا، لیکن ہندوستان میں اس کی پیداوار اور فروخت کو محدود یا کم کرنے پر نہیں۔ (درحقیقت، ایک حکومتی تخفیفی کمیشن نے معاشی اقدامات کا جائزہ لیتے ہوئے، 'افیون کی فروخت کے تحفظ کی اہمیت کو محاصل کے اہم ذریعے کے طور پر' تاڑ لیا، اور 'مزید کمی نہ کرنے' کی تجویز دی۔) نتیجہ یہ تھا کہ افیون عوام کا پسندیدہ نشہ بن گیا، وہ لوگ لاپرواہی سے استعمال کرتے جنھیں اس سے بہتر کا علم نہیں تھا؛ مائیں جب وہ روزانہ کی حقیر سی کمائی کے لیے مزدوری کرتے ہوئے تعمیراتی جگہوں پر بھاری قدموں سے چلتیں، تو اپنے بچوں کو خاموش رکھنے کے لیے افیون دیتیں۔

کیا افیون پر برطانوی پالیسی سے درگزر کرنا چاہیے کہ وہ اپنے دور کے رویوں کی عکاس تھی؟ کیا آج کے فائق نقطہ نظر کے مطابق اس کی مذمت کرنا غلط ہے؟ نہیں: ان کی افیون پالیسی پر عملدرآمد کے دوران، ہر ہم

عصر ہندوستانی قوم پرست گروہ نے، بین الاقوامی کانفرنسوں میں درجنوں غیر ملکی مندوبین نے، اور صاحب فکر غیر ملکی مبصرین اور رپورٹروں جیسا کہ خشئیس دل ڈیورائٹ نے، واشگاف طور پر انگریزوں کی مذمت کی۔ ستم ظریفی ہے، کہ افیون کے خلاف سب سے مؤثر مذمت کسی اور طرف سے نہیں بلکہ خود لارڈ میکالے کی طرف سے، 1833 میں دارالعوام میں ایک تقریر میں کی گئی:

> یہ ان بدبخت غاصبوں کا چلن تھا جن سے ہمارا واسطہ ہندوستان میں پڑا، [....] جب وہ رعایا کے کسی ممتاز رکن کی قابلیت اور ولولے سے خوفزدہ ہوتے... تو اسے روزانہ [ایک] خوراک دیتے... افیون کی معجون کی، جس کا اثر یہ تھا کہ جسے اس کے نشے پر لگا دیا جاتا، اس بدنصیب کے تمام جسمانی وذہنی قواء کو تباہ کر دیتی، اور اسے بے یار و مددگار مخبوط العقل بنا چھوڑتی۔ فی نفسہ قتل سے زیادہ خوفناک، یہ مکروہ چال، اسے برتنے والوں کے لیے قابلِ قدر تھی... انگریز قوم کے لیے یہ کوئی مثالی نمونہ نہیں۔ ہم پوری ایک کمیونٹی کو [افیون] پر لگا کر، ایک عظیم قوم کو مخبوط الحواس اور مفلوج بنانے کی منظوری کبھی نہیں دیں گے۔

اسے بہت کم احساس ہوا کہ، اس کی تقریر کے بعد ایک صدی سے زائد عرصے تک، اس کی اپنی برطانوی حکومت اس کے الفاظ کو جھوٹا ثابت کرے گی، جس کی ملامت اس نے کی بعینہ وہی اس نے (حکومت نے) کیا۔

یقیناً، ہندوستانی سماج میں اصلاحات کے لیے اقدامات کرنے کی جانب سرکاری بے رغبتی کے ساتھ، برطانوی حکومت کا افیون کی فروخت روکنے سے انکار اسی نوعیت کا تھا، حتیٰ کہ اسی اثناء میں اس کی پالیسیوں نے اسے حد درجہ تبدیل اور مسخ کر دیا تھا۔ اس نے اس بات، کا جواز پیدا کیا کہ مقامی رسوم و رواج، احترام کے دائرے سے باہر ہیں، لیکن یقیناً، اس کا بنیادی اندیشہ یہ تھا کہ اصلاح پر رقم خرچ ہو گی اور اس سے اضطراب پیدا ہو گا، جس کے نتیجے میں نقد مصارف اور تدارک کے لیے وقت درکار ہو گا۔ چنانچہ جات پات کے نظام کے گرد بنتے حصار، مسلمان کمیونٹی پر مولانا اور رجعت پسند مذہبی شخصیات کا غلبہ، بچپن کی شادیوں اور چھوت چھات کا ثبات، اور ہندوستان کے اندر دوسری سماجی برائیوں کے افراط، جنھیں چھیڑنے کا خطرہ مول لینے کی بجائے انگریزوں نے تھوڑے فاصلے پر رکھنے کو ترجیح دی، کی برطانوی حکومت شاہد تھی۔ انگریزوں نے سماجی روایات میں مداخلت صرف تب کی جب یہ ان کے لیے موزوں تھا۔ آفاقیت کے لبرل اصولوں اور انصاف اور حکمرانی کے حقیقی نوآبادیاتی دستور العمل کے درمیان وسیع خلیج حائل تھی۔

اس طرح وقوع پذیر ہونے والی اصلاحات کو ہندوستانی سماجی اصلاح پسندوں نے برانگیختہ کیا، جنھیں انگریزوں نے قبول کر لیا، نا کہ خود انگریزوں نے ان کے آغاز کے لیے پہل کی (ٹھگی کو کچلنے کی استثناء کے ساتھ، جس کا بیڑا انگریزوں نے مذہبی مسئلے کی بجائے، امن و امان کا مسئلہ حل کرنے کے لیے اٹھایا)۔ ستی کی رسم کو کالعدم کرنے کی ابتداء راجہ راج موہن رائے نے کی اور بینٹنک نے قانون وضع کیا، یہ جانتے ہوئے کہ معقول سوچ کے حامل ہندوستانیوں کی اعانت اسے حاصل تھی، نہ کہ یہ برطانوی ضمیر کی تخلیق تھی جس نے غیر مہذب مقامیوں پر حکم کا نفاذ کیا۔ شادی کی عمر میں معقول اضافہ (خواتین کے لیے چودہ سال اور مردوں کے لیے اٹھارہ سال) جو برطانوی راج کے زیر اہتمام وقوع پذیر ہوا، کے لیے ہندوستانیوں نے حزب اختلاف کے خلاف، البتہ بعد میں برطانوی اتھارٹیز کی منظوری سے، قانون ساز اسمبلی میں ووٹ دیا۔ اور بیواؤں کو دق کرنا، چھوت چھات کے بدترین رواج، سماجی برائیاں جیسا کہ قربانی کی رسم، کے خلاف سب سے پہلے ایشور چندر ودیا ساگر، برہمو سماج اور آریا سماج جیسے ہندوستانی اصلاح پسندوں نے آواز اٹھائی اور تحریک چلائی؛ یہ برائیاں لاتعلق برطانوی نظروں تلے، بلا روک ٹوک مکمل طور پر جاری تھیں۔ تین اثر انگیز خواتین نے انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت اس دور میں کی، جب کوئی ایک بھی گورنر، سیکرٹری یا دوسری برطانوی اعلیٰ عہدیدار، عورت نہیں تھی، اور عورت کی مقتدر شخصیت کا تصور بھی نہیں تھا، فقط ایک خاتون وائسرائے کو ہی لیں، جو ایک خیالی تصویر ہوتی۔ انگریزوں کو، اس وقت کی حکومت کے طور پر، قانون میں تبدیلی اور نفاذ کی اجازت دینے کا اختیار تھا، لیکن انھوں نے بذاتِ خود اس کی ابتداء شاذ و نادر ہی کبھی کی۔

لارنس جیمز شیخی بگھارتا ہے، 'سٹالن کے روس کے برعکس، 'برطانوی سلطنت ہمیشہ ایک کھلا ڈلھا معاشرہ تھی'۔ تقابل کرنے والا راج کے عذر خواہ کا دل بہلا رہا ہے، بہر حال ہم اسے جانے دیتے ہیں۔ برطانوی سلطنت کس کے لیے ایک کھلا ڈلھا سماج تھا؟ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، غیر گوروں کے لیے تو نہیں؛ کسی بھی نسل سے تعلق رکھنے والی خواتین کے لیے بھی نہیں؛ در حقیقت ہندوستانیوں کے لیے بھی نہیں۔

میں اس بات کی بار بار نشاندہی کر چکا ہوں، ہر چیز کے پیچھے ایک اٹل حقیقت ہوتی ہے: ہندوستان کے تمام سابقہ فاتحین کے برعکس (اس میں محمود غزنوی، تیمور اور نادر شاہ جیسے عارضی حملہ آوروں کو شمار نہیں کیا)، حکومت قائم کرنے کے لیے رک جانے والے، ہر اس غیر ملکی فرمانروا کے برعکس، انگریزوں کا اس سرزمین پر ایسا (حکمران) بننے کا ارادہ نہیں تھا۔ فرانسیسیوں نے غیر ملکی علاقوں پر حکومت کی، اور فرانسیسیت کے بیانیے

میں جذب کرتے ہوئے، انھیں فرانسیسی بنا دیا؛ پرتگیزی اپنی نو آبادیات میں آباد ہوئے اور مقامیوں کے ساتھ آپسی شادیاں کیں؛ لیکن برطانوی ہمیشہ دور دور اور الگ تھلگ رہے، ایک بدیسی موجودگی کے ساتھ ولایتی مفادات اور غیر ملکی وفاداریاں۔

دہلی کے سلاطین اور مغل چاہے باہر سے آئے تھے، اور ان کے نسب نامے شروع میں ان کے 'وطن' کے تصور کے طور پر شاید وادیٔ فرغانہ کے دور دراز شہروں کی طرف رجوع کرتے تھے، لیکن وہ ہندوستان میں آباد ہوئے اور ملکی حدود سے باہر کوئی وفاداری نہیں رکھی۔ انھوں نے ہندوستانی خواتین سے شادیاں کیں اور اپنے غیر ملکی خون میں اس حد تک آمیزش کی کہ چند نسلوں میں ہی ان کی غیر ملکی نسل کا کوئی نشان نہیں بچا۔ اکبر کا بیٹا جہانگیر نصف راجپوت تھا؛ جہانگیر کا بیٹا شاہجہاں بھی ایک ہندوستانی دلہن سے پیدا ہوا؛ اور نگزیب محض آٹھواں حصہ غیر ہندوستانی تھا۔ یقیناً، تمام مغل شہنشاہ فرغانہ کے ساتھ اپنے تعلق بارے پوری طرح آگاہ تھے؛ انھوں نے وہاں کے ایلچیوں سے اپنے آباواجداد کے چنگیزی مقبروں کی حالت بارے پوچھا ہوگا، اور ان کی دیکھ بھال کے لیے رقم عطیہ کی ہوگی۔ ماضی، مغل شناخت کا حصہ تھا، لیکن حال اور مستقبل کے لیے ان کا اپنے بارے میں تصور ہندوستان میں زیادہ جڑیں پکڑ چکا تھا اور مضبوطی سے قائم تھا۔ اس کے برعکس، برطانوی، نسلی خارجیت پسندی کو قائم رکھتے تھے، ہندوستانیوں کے خلاف امتیاز برتتے تھے اور نسلی اختلاط سے نفرت کرتے تھے۔

ہاں، مغلوں نے ہندوستان کے شہریوں پر ٹیکس لگائے، انھوں نے ماتحت راجاؤں سے خراج طلب کیا، انھوں نے ان کے خزانے لوٹے جنھیں انھوں نے میدان جنگ میں شکست دی ___ سب کچھ انگریزوں کی طرح ___ لیکن انھوں نے ہندوستان میں جو بھی حاصل کیا اسے یہیں خرچ یا پس انداز کیا، نہ کہ 'واپس اپنے وطن' سمرقند یا بخارا بھجوا دیا، جیسا کہ انگریزوں نے ہندوستانی محاصل لندن بھجوا کر کیا۔ صنعتوں اور دستکاریوں کی سرپرستی اور بنیاد قائم کرتے ہوئے، انھوں نے ہندوستان کے وسائل کو، ہندوستان کی ترقی کے لیے استعمال کیا؛ انھوں نے بیرون ملک سے نقاش، مجسمہ ساز اور ماہر تعمیرات بلوائے، لیکن انھیں اپنے دربار میں جذب کر لیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی کہ اپنے نئے وطن کے فنکارانہ اور ثقافتی ورثے کو مزین کریں۔

انگریزوں نے بہت کم، بہت ہی کم ایسا کیا۔ انھوں نے ہندوستان کے سورج میں دھوپ سینکی اور اپنے ٹھنڈے اور دھند زدہ وطن کی آرزو کی؛ ہندوستانی مزدور کی عرق آلود پیشانی سے نکالی ہوئی دولت انھوں نے انگلینڈ بھیجی؛ اور جو تھوڑا بہت انھوں نے ہندوستان کے لیے کیا، اس کا انھوں نے پورا اطمینان کیا کہ ہندوستان

اس کے لیے حد سے زیادہ ادائیگی بھی کرے۔ اور اس سب کے اختتام پر، وہ ہندوستانی ناموں والے چھوٹے مرطوب کاٹیجز میں اپنی ریٹائرمنٹ سے لطف اندوز ہونے کے لیے وطن واپس چلے گئے، ان کی بیگانہ استعداد کو ہندوستانی ٹیکس دہندگان کی طرف سے مہیا کردہ فیاضانہ پنشن نے آرام دہ بنایا۔

وہ سوال جس کا سامنا سلطنت کے عذر خواہوں نے ایمانداری سے کبھی نہیں کیا، وہ بڑا کلاسیکی ہے کہ 'کھوئی بونو cui bono] اس سے نفع کس نے حاصل کیا؟' __ برطانوی استعماری حکمرانی سے فائدہ کس نے اٹھایا؟ اس کا جواب واضح طور پر خود برطانیہ ہے۔☆ اپنی بصارت کو تھوڑا سا وسیع کرتے ہوئے، ایک آخری مرتبہ اعداد و شمار کو دیکھتے ہیں۔ پوری تاریخ میں، ممالک کا عالمی جی ڈی پی میں حصے کا مسحور کن تقابلی چارٹ کارآمد ہے۔ پہلی صدی عیسوی میں، جب عیسائیت واقعی پوتڑوں میں لپٹی ہوئی تھی، ہندوستان عالمی جی ڈی پی کا 33 فیصد شمار کیا جاتا تھا، جبکہ برطانیہ، فرانس اور جرمنی مشترکہ طور پر محض 3 فیصد شمار ہوتے تھے۔ 1700 تک، مساوی اعداد و شمار 25 فیصد اور 11 فیصد تھے؛ 1870 تک، سلطنت کے عروج پر، ہندوستان کے لیے 5.12 فیصد اور تینوں یورپی ممالک کے لیے 22 فیصد؛ 1913 میں، ہندوستان کی مزید غربت کے ساتھ، 9 فیصد بمقابلہ 5.22 فیصد۔ 1950 میں، انگریزوں کے چھوڑنے کے فوری بعد، ہندوستان 4 فیصد پر کھڑا تھا؛ 2008 میں، یہ اعداد و شمار 7 فیصد سے زیادہ تھے اور بڑھ رہے تھے۔ برطانیہ، فرانس اور جرمنی، 1950 میں 16 فیصد تک کمی کے بعد، آج 9 فیصد پر معلق ہیں۔ 1914 کے دوران، برطانیہ، عالمی جی ڈی پی کا 4.2 فیصد شمار کیا گیا، پچیس سال پہلے کی نسبت 6 فیصد کم۔ تاریخ اپنی تصحیح کا انتظام خود کرتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ راج کے عذر خواہ لپ سٹک لگانا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ فرگوسن کے استعماری حمایت کے پرجوش خطبات کا ایک تبصرہ نگار اسے پیش کرتا ہے: 'فرگوسن کی "تاریخ" ہمارے عہد کی پریوں کی داستان ہے، جو گوروں اور ان کی نام نہاد ذمہ داری کو ہیرو آنہ کارروائی کے مرکز میں رکھتی ہے۔ نوآبادیت __ غلامی، لوٹ مار، جنگ، کرپشن، زمین ہتھیانے، قحط، استحصال، معاہداتی مشقت، غربت، قتل و غارت، نسل کشی اور از سرِ نو جبری آبادکاری کی ایک داستان ہے __ جو ایک خیر اندیش ترقیاتی مشن کی صورت میں لکھی گئی، جسے چند بدقسمت حادثات اور زیادتیوں نے مسخ کر ڈالا'۔

☆ جب یہ کتاب پریس میں جا رہی تھی، تو ایک نئی تالیف سامنے آئی جس نے ایسا ہی کیس پیش کیا: جون ولسن کی ہندوستان کی فتح: برطانوی راج اور سلطنت کا خلفشار، لندن: سائمن & شوسٹر، 2016۔

جب کپلنگ نے اپنی نسل پرستانہ نظم 'گورے آدمی کی ذمہ داری (دی وائٹ مینس برڈن / The White Man's Burden)' لکھی، جیسا کہ میں نے مشاہدہ کیا ہے، ایک ہم عصر، ہنری لابوشرے، نے فوری طور پر ایک جواب دعویٰ شائع کیا، 'خاکی آدمی کی ذمہ داری (دی براؤن مینس برڈن / The brown Man's Burden)' جو کافی حد تک استعماریت میں روا رکھی گئی ناانصافی، کا احاطہ کرتی تھی__ چاہے انگریزوں کی ہو، یا کسی اور کی (امریکی تقریباً فلپائن کی فتح شروع کر رہے تھے)۔ گو کہ مکمل طور پر نہیں، البتہ اسے جامع انداز میں از سر نو نقل کرنا کارآمد ہے:

بڑھاؤ خاکی آدمی کا بوجھ،
کہ تمھاری حرص کی تسکین ہو؛
جاؤ، 'حبشیوں' کو نظروں سے دور کرو
جن کی ترقی حائل ہو گی؛
انتہائی درشت رہو، سچے دل سے
حلیم ہونا لاحاصل ہے
نئے پھنسے، آزاد لوگوں کے ساتھ
نصف طفل و نصف شیطاں

بڑھاؤ خاکی آدمی کا بوجھ،
اور، تمھیں جوش دلائے اگر اس کی نفرت،
روبرو ہو جو اس کے دقیانوسی خیالات سے
مروجہ زریں اقوال سے۔
خول اور ڈمڈم گولیوں کے ساتھ
سو گنا ہموار کرو
لازم ہے خاکی آدمی کا نقصان ہمیشہ
گورے آدمی کے نفع پر دلالت کرے گا۔

بڑھاؤ خاکی آدمی کا بوجھ،
آزاد ہونے کے لیے اسے مجبور کرو؛
لائیے اپنے تمام منشور
خدمت خلق کی بساند چھوڑتے۔
اور اگر ملحد کی نادانی کے سنگ
تمھارے فرمان سے حجت کی جسارت کریں
تو، آزادی کے نام پر،
گولی مارنے سے مت ہچکچاؤ

بڑھاؤ خاکی آدمی کا بوجھ،
نہیں، تمھیں یہ مشکل نہ لگے
اگر تم ان کی عداوت کے سزاوار ہونا چاہو
جن کی پاسبانی کی آرزو ہے تمھیں۔
تمھارے شاہین کی چیخ و پکار
شکار کی سسکیوں پر غالب آجائے__
آتش و خونریزی میں سے گزر جاؤ
اس دھندے میں ڈالرز ہیں۔

بڑھاؤ خاکی آدمی کا بوجھ،
اور ساری دنیا میں مشتہر کرو
کہ تم آزادی کے متوالے ہو__
اس سے زیادہ اُجرت والا کوئی کھیل نہیں!

اور چاہیے تمھاری اپنی سابقہ تاریخ
ڈالیں سیدھی تمھارے دانتوں میں،
پلٹ کر جواب دو کہ آزادی
مناسب ہے فقط گوروں کے لیے۔

بڑھاؤ خاکی آدمی کا بوجھ،
عدل کرنے کے ساتھ؛
کمزور، نادر اضطراب
ان کے زود رنج اطوار ہیں مروج
اور، اگرچہ ان کی آزادی کا پرچم
تم گاڑی پر لہرا رہے ہو،
وطن میں صرف کرنے کے لیے پس انداز کرو
مقدس 'حقوق آدمی' کے!

اور گر اتفاقاً تم ڈگمگاؤ،
یا ڈگر پر پیچھے رہو،
اگر، خون یوں آزادی سے ابلے،
ندامت کا جو تم کو احساس ہو،
رڈیارڈ کپلنگ کی جانب عجلت سے چلنا،
شہنشاہیت کا سہارا لینا
اور اس کو قیمت لگانا، اپنی آسودگی کی،
اس کے جنگجو ٹھہراؤ کو آمادہ کرنا'

یہ حقیقت کہ، ان تمام حق تلفیوں اور ناانصافیوں کے باوجود، ہندوستانیوں نے انگریزوں کو، جب وہ چلے

گئے، تو بخوشی معاف کر دیا، اور ان کے ساتھ ایک 'خاص تعلق' برقرار رکھا جس کا اپنا اظہار اکثر گرمجوشی اور الفت کے ساتھ ہوتا، برطانوی راج کے کسی بھی مفروضہ فائدے کی نسبت ہندوستان بارے زیادہ بات چیت کرتے۔

ایک کہانی ہے __ شاید غیر مستند __ جواہر لال نہرو کی، جس نے 1922 اور 1945 کے دوران، آٹھ مرتبہ عرصہ اسیری کے، مجموعی طور پر 3262 دن (تقریباً اپنی زندگی کے دس سال) برطانوی جیلوں میں گزارے، استعماری سرخیل ونسٹن چرچل کے پوچھنے پر کہ یہ کیسے ہوا کہ اس نے اپنے جیلروں اور ستم گروں کے لیے بہت کم کینہ رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ نہرو نے، مہاتما گاندھی کے حالیہ قتل کے حوالے سے، جواب دیا، مجھے ایک عظیم آدمی نے سکھایا، 'کبھی نفرت نہ کرنا __ اور نہ ہی کبھی ڈرنا'۔

ہشتم

نو آبادیت کے بعد کی ابتر زندگی

ہشتم

نو آبادیت کے بعد کی ابتر زندگی

سلطنت کا خمیازہ__ استعماری نسیان__ آج کی دنیا میں صدائے بازگشت__ سلطنت کی بابت فرگوسن کا کیس__ کفارہ__ تاج کے نگینے کی واپسی__ نو آبادیت کی مزاحمت؛ گاندھی ازم کی اپیل__ جدید تشدد کے خلاف گاندھی ازم کی غیر حقیقت پسندی__ منڈلاتی پرچھائیاں: نو آبادیت کے بچے کھچے مسائل

میں آخری دفعہ کہوں گا کہ ہندوستان میں برطانوی نو آبادیت کے خلاف یہ کیس پیش کرتے ہوئے، میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں کہ آج میرے وطن میں جو کچھ بھی غلط ہو رہا ہے اس کے لیے انگریزوں کو موردِ الزام ٹھہراؤں، نہ ہی ان ناکامیوں اور کوتاہیوں کا جواز فراہم کرنا ہے جو ابھی بھی ہندوستان پر حملہ آور ہیں۔ نو آبادیاتی زیادتیوں پر ایک قانون حدِ سماعت (Statute of Limitation) ہے، لیکن انسانی یادداشت پر نہیں، خاص طور پر زندہ حافظے پر، جیسا کہ میں نشاندہی کر چکا ہوں، آج بھی لاکھوں ہندوستانی زندہ ہیں جو ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی ناانصافیوں کو فراموش نہیں کر پائے۔ تاریخ کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے مگر اس کی تفہیم زمانۂ حال کا فرض ہے۔

استعماری نسیان

شکر ہے، زیادہ تر ترقی پذیر دنیا میں اب یہ مروج نہیں کہ ہر قومی بدقسمتی کا الزام عائد کر کے نو آبادیت کی قباحتوں کی عیب جوئی کی جائے۔ بین الاقوامی سطح پر، نو آبادیت کا موضوع کہیں زیادہ قصہ پارینہ ہو چکا ہے، چونکہ نو آبادیت کے خاتمے (ڈی کالونائزیشن) کی ضرورت پر اب مزید مباحثہ نہیں ہوتا، اور نو آبادیت بذات خود مزید مخاصمت کا باعث نہیں بنتی۔ (شاید بالآخر، کوئی سلطنت نہیں رہی، جس کی حفاظت یا دستبرداری لمبی

چوڑی جنگ چھیڑ سکے۔) ابھی تک یہ حیران کن ہے، کہ بذات خود استعماری طاقت کے شہریوں کے درمیان نسیان کتنی سرعت کے ساتھ شروع ہوا۔ برطانیہ میں 1997 کے ایک گیلپ سروے سے مندرجہ ذیل انکشاف ہوا: 65 فیصد یہ نہیں جانتے تھے کہ رابرٹ کلائیو یا جیمز وولف کا تعلق کس ملک سے تھا، 77 فیصد نہیں جانتے تھے کہ سیسل رھوڈس کون تھا، 79 فیصد رد یارڈ کپلنگ کی لکھی ایک مشہور نظم کی پہچان نہیں کر سکتے تھے، اور 47 فیصد سمجھتے تھے کہ آسٹریلیا ابھی تک ایک نو آبادی تھی۔ 50 فیصد سے زیادہ یہ نہیں جانتے تھے کہ امریکہ کبھی برطانوی سلطنت کا حصہ رہ چکا تھا۔

اس کے باوجود عالمی معاملات میں دلچسپی رکھنے والے اتنے کامل دانشمند نہیں ہوئے تھے کہ نو آبادیت کو تاریخ کی ضرب المثل ردی کی ٹوکری کے سپرد کر دیں۔ کافی غور طلب انداز میں، جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اس کے مسائل اور خطرات کی تفہیم کے لیے یہ ایک متعلقہ عنصر رہتا ہے۔ برطانوی سلطنت اور اس کے یورپی شریکِ کار 'معاشی، طبعی اور ثقافتی طاقت کے عالمی نظام مراتب کی تخلیق میں مکمل طور پر بے مثال تھے'؛ اسی لیے ان کا تاثر کافی حد تک قائم رہا۔ جیسا کہ ایک مبصر دلیل پیش کرتا ہے، بالآخر، 'یورپی نو آبادیت کی یاد کاسا بلانکا سے جکارتا تک ہر جگہ ایک زندہ سیاسی عنصر رہی ہے، اور چاہے کوئی تہران کے ساتھ جوہری توانائی کی بات چیت کر رہا ہو یا چین کے ساتھ رینمنبی / renminbi (چینی کرنسی) کے مستقبل کی، اگر وہ اسے مد نظر نہیں رکھتا تو معاصر سفارت کاری ناکام ہو جائے گی'۔

یقیناً، یہی کچھ ہے جو نیل فرگوسن کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، وہ سلطنت میں کثیر مقاصد دیکھتا ہے جس میں دنیا کی بھلائی ہے، خاص طور پر اجناس، سرمایہ اور محنت کی آزادانہ نقل و حرکت، اور قانون، امن اور حکمرانی کی مغربی اقدار کا نفاذ۔ وہ دلیل پیش کرتا ہے کہ، پورے کرہ ارض پر، برطانوی حکمرانی کے فروغ کے بغیر، آج متعدد معیشتوں میں لبرل سرمایہ دارانہ نظام کی کامیابی ممکن نہ ہوئی ہوتی۔

بحث کے طور پر سہی، اگر یہ ایک قابلِ دفاع قضیہ تھا بھی، جیسا کہ فرگوسن اسے پیش کرے گا، تو پھر بھی یہ لازماً کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ آج کی دنیا کا برطانوی سلطنت کی دنیا کے ساتھ تسلسل، جس کا وہ بہت جشن مناتی ہے، انتہائی حیران کن طور پر اس کا اظہار مابعد نو آبادیاتی دنیا کی اکثریت کے سابقہ استعماری ریاستوں پر معاشی انحصار سے ہوتا ہے، ایک ایسی معاصر حقیقت، جس کے حاصلات کا سہرا بمشکل ہی نو آباد کاروں کے سر بندھتا ہے۔ سلطنت ہو سکتا ہے ختم ہو چکی ہو، لیکن ترقی پذیر دنیا میں، اتباع کرنے والی اشرافیہ جو اس نے اپنے پیچھے

چھوڑی، اس میں یہ قائم رہی، نئے پاؤل کے الفاظ میں، 'بہروپیے انسان' وہ کچھ بننے کی سخت جدوجہد کر رہے تھے جس کی استعماری طاقت نے انھیں اجازت نہیں دی تھی، جبکہ اپنی ذات اور اپنی سوسائٹیوں کو بالخصوص بڑے شہروں میں قائم کارپوریشنز کے مستقل غلبے کا محکوم بنا رہے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی تباہ ہو چکی ہے، لیکن گلوبلائزیشن یہ اطمینان کر چکی ہے کہ سابقہ استعماری ریاستوں میں اس کے دورِ حاضر کے جانشین، سرمایہ دارانہ نظام کے بالادست آلۂ کار بنے رہیں۔

ہندوستان کسی حد تک ایک استثناء ہے، کئی دہائیوں پر مشتمل اس کی اقتصادی خود کفالت کو سلام؛ لیکن جیسا کہ پنکھج مشرا تجویز کرتا ہے، لبرل سرمایہ دارانہ 'ایشیا کی اٹھان' جس کی ایک چھوٹی سی معاصر مثال ہندوستان ہے، کا تلخ نتیجہ مغربی جدیدیت کی عالمی فتح' بھی ہے، 'جس نے مشرق کے انتقام کو قدرے تاریک ابہام میں بدل دیا'۔ مشرا اور دوسرے بائیں بازو کے رجحان کے ناقدین کے مطابق، اس سے ایشیائی روحانیت کی بجائے مادہ پرست سرمایہ دارانہ نظام کی فتح کی نشاندہی ہوتی ہے؛ ہندوستانی شیطان بھی پر اڑا پہنتا ہے۔ بائیں بازو کے برطانوی صحافی رچرڈ گوٹ نے اپنے ملک کی استعماریت کی بے دریغ اعلانیہ ملامت کی؛ 'برطانوی سلطنت فی نفسہ بڑے پیمانے پر، ایک ہٹلرین پراجیکٹ تھا، جس میں عسکری فتوحات اور آمریت، فنا اور نسل کشی، مارشل لاء اور "خصوصی عدالتوں" غلامی اور جبری مشقت اور یقیناً نظر بندی کیمپ اور عوام کی سمندر پار نقل مکانی کا امتزاج تھا'۔ اگرچہ وہ غلط نہیں تھا، شاید ایک زیادہ مفصل تجزیہ درکار ہو۔ راج کی وراثت کا مشاہدہ کرنا، اس کے ان معاشروں پر اثرات کا جائزہ لینا بھی ہے، جنھیں اس نے شکستگی سے دوچار کیا اور ان کی ہیت بدل ڈالی، اور انسان جنھیں اس نے بدل ڈالا، جلاوطن کیا، ہیت سازی کی، تباہ کیا اور ایک نیا (فرد) بنا ڈالا؛ کاروبار اور نسلی میل جول کا شاندار اختلاط، چونکہ برطانوی سرمایہ دار منافع کی تلاش میں تھے، چاہے جہاں بھی ملے؛ لوگوں کا ایک دوسرے کے ساتھ اختلاط؛ اور ہندوستانیوں کی دوسرے علاقوں کو نقل مکانی کے ذریعے، ہندوستان کے اندر قدیم بندھن ٹوٹنے اور نئے قائم ہونے کے نتیجے میں، زبان و ثقافت کا دوغلا پن؛ خاندان، ذات برادری، مذہب، وطن اور سلطنت کی باہم متصادم وفاداریوں میں کشمکش؛ اور سب سے بڑھ کر، منافع کی ناقابلِ مدافعت للچاہٹ، نوآبادیاتی پراجیکٹ کا سب سے عمیق حیات بخش ولولہ تھا۔ اس کتاب کے دائرہ عمل سے بہت پرے، یہ ایک وسیع پراجیکٹ تھا۔

یقیناً، فرگوسن کی کتاب کے پیچھے کسی حد تک زیادہ آفت زدہ ایجنڈا تھا؛ برطانوی سلطنت کی تاریخ

کو استعمال میں لاتے ہوئے، نئی امریکی حاکمیت جس کی اسے امید تھی کہ رونما ہو رہی ہے، کے لیے اسٹیج تیار کرنا۔ فرگوسن نے 2003 میں دلیل پیش کی تھی، بالکل اس وقت جب امریکہ مشرق وسطیٰ کو نئی شکل دینے کے ارادے کے ساتھ بنیادی طور پر اپنی بدقسمت عراقی مہم جوئی میں مشغول ہو رہا تھا، 'برطانوی عالمی طاقت کا اگرچہ برگشتہ ہی سہی، لیکن قطعی وارث، کوئی مشرق کی شیطانی سلطنتوں میں سے نہیں تھا، بلکہ برطانیہ کی سب سے کامیاب سابقہ نو آبادی تھا'۔ فرگوسن نے امریکہ کا سامراجی مستقبل برطانیہ کے استعماری ماضی میں دیکھا، اور وہ بڑی صراحت سے سلطنت کی اپنی تاریخ کو اس قضیہ کے جواز کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا کہ جس طرح برطانوی سلطنت کے طویل عہد نے عالمی امن اور خوشحالی کے ایک بے مثال دور کا آغاز کیا تھا، ویسے ہی امریکہ کا طویل عہد اکیسویں صدی کی دنیا کا احیاء کرے گا۔ اس طرح کے رنڈی کے استدلال کے ذریعے تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا گیا، اور ابتری، طوائف الملوکی، ہلاکت اور اداروں کے خاتمے کے کئی سال جو عراق کے ساتھ چمٹ چکے ہیں (اس کے ساتھ ساتھ لیبیا اور شام میں بھی) بہرحال لگتا ہے اس کی کتاب کی اشاعت فرگوسن کے دلائل کو اعترافِ گناہ کی آخری مہلت دے چکی ہے۔

اس میں کم از کم فرگوسن نو آبادیاتی پراجیکٹ کی مجموعی اخلاقی توقعات پر پورا اتر رہا ہے، جس نے بالخصوص یورپی سامراجیوں کو مادی، اخلاقی اور فراستی حوالوں سے فائدہ پہنچایا۔ استعماریت نے انسانیت کے یورپی تصورات کو دنیا میں بالادستی سے سرفراز کیا، گورے مرد کو روشن خیالی کے آدرش میں الوہیت کے درجے پر فائز کر دیا، اور ایسا سرکاری حکام اور عسکری قوت کے ذریعے کیا گیا۔ اس عمل میں سامراج نواز مؤرخین نے اپنی سلطنت کے جواز اور وضاحت کے لیے اپنی رعایا کی جانبدارانہ حوالے سے 'تاریخ' لکھی۔ فرگوسن نے محض اس کے اپنے لوگوں اور ان کے مفادات کو، اول و آخر حوالے کے طور پر، قائم رکھتے ہوئے، دنیا کی تاریخ لکھنے کی، عرصہ دراز سے قائم نو آبادیاتی روایت کو برقرار رکھا۔ ☆

☆ چند ایک ایسے تھے جنھوں نے اس بالادست سامراجی استعارے سے دانشورانہ آزادی کا اعلان کیا، دانشور جنھوں نے زندگی کو اس نقطہ نظر سے دیکھا پرکھا، جو نہ تو جدید تھا اور نہ ہی جدیدیت مخالف، نہ مارکسی تھا نہ ہی انقلابی، نہ نو آبادیاتی تھا نہ ہی درحقیقت نو آبادیت مخالف۔ انیسویں صدی، اور بیسویں صدی کے اوائل میں مغربی غلبے کے خلاف، پنکج مشرا نے (اپنی کتاب) سلطنت کے کھنڈرات سے: مغرب کے خلاف بغاوت اور ایشیا کی تشکیل نو، لندن: ایلن لین، 2012، میں ان کم سراہے گئے دانشورانہ جوابات میں سے چند ایک کا کھوج لگایا ہے۔ مشرا افسوس کے ساتھ تسلیم کرتا ہے کہ 'مشرق کو مغرب کے لوگوں نے محکوم بنایا، جسے وہ عرصہ دراز سے، اگر وحشی نہیں، تو چھچھورا سمجھتے تھے۔' (ص 3)

تاج کے نگینے کی واپسی

پس اسے سمجھنے کے علاوہ، نو آبادیت کے حوالے سے ہم اور کیا کریں؟ جیسا کہ میں نے تعارف میں وضاحت کی تھی، تلافی کے مسئلے کا وقت گزر چکا ہے: کوئی مصدقہ اعداد و شمار نہیں جو واجب الادا ہوں اور کوئی واجب الادا اعداد و شمار نہیں جو معتبر ہوں۔ سالانہ ایک علامتی پونڈ، کی میری اپنی تجویز شاید وزارت خزانہ کے لیے قابلِ عمل نہ ہو، جنھیں اس کی کارروائی عمل میں لانی پڑے گی۔ ایک معافی نامہ ـــ کاما گاٹامارو پر ٹروڈو کی طرح، جلیانوالہ باغ پر حقیقی شرمساری کا ایک عمل، شاید کفارے کی ایک بامعنی علامت کے طور پر بہترین کام کرے۔ اور میٹروپولیٹن ملک میں، سلطنت کے اسباق سے سیکھنے کا ایک عزم ـــ برطانوی سکول کے طلباء کو سکھانے کے لیے کہ ان کے وطن کی تعمیر کس طرح ہوئی، بالکل اسی طرح جس طرح جرمن بچوں کو نظر بندی کیمپ دکھائے جاتے ہیں تاکہ وہ ہولناک حقیقت دیکھیں کہ ان کے آباءواجداد نے کیا کیا۔

دوسرا، یقیناً، نو آبادیت کے عمل کے دوران ہندوستان سے لوٹے گئے خزانوں کے کچھ حصے کی واپسی ہے۔ ٹیکس اور استحصال کے ذریعے وصول کی گئی دولت پہلے ہی خرچ کی جا چکی ہے، اور عملی طور پر دوبارہ وصول نہیں کی جا سکتی۔ لیکن برطانوی عجائب گھروں میں پڑے مجسموں کے انفرادی نمونے کیے جا سکتے تھے، اگر کچھ اور نہیں تو ان کی علامتی قیمت ہی سہی۔ بحر صورت، اگر مختلف ممالک میں نازی دور کے لوٹے ہوئے فن پارے ان کے حقیقی مالکان کو لوٹائے جا سکتے ہیں (اور اب لوٹائے جا رہے ہیں)، تو نو آبادیاتی خزانوں کی لوٹ مار کے لیے اصول مختلف کیوں ہے؟

ناگزیر طور پر، یہ مجھے، ملکہ کے تاج میں کوہ نور کے دلگیر مسئلے کی جانب لے جاتا ہے۔

کوہِ نور کبھی دنیا کا سب سے بڑا ہیرا تھا، جس کا وزن 793 قیراط یا 6.158 گرام تھا، جب اسے سب سے پہلے گنتور، ہندوستان کی موجودہ جنوبی ریاست آندھرا پردیش میں تیرھویں صدی کی کاکاتیا سلطنت نے کان سے نکالا تھا۔ (جو صدیوں تک چھوٹا ہوتے ہوتے 100 قیراط سے تھوڑا زیادہ رہ گیا ہے۔) کاکاتیا بادشاہوں نے اسے ایک مندر میں نصب کروایا تھا، جس پر دہلی کے سلطان علاؤالدین خلجی نے حملہ کیا، جو دوسرے لوٹے ہوئے خزانوں کے ساتھ اسے بھی اپنے دار لحکومت واپس لے گیا۔ یہ مغلیہ سلطنت کے قبضے میں چلا گیا، جو سولہویں صدی میں دہلی میں قائم ہوئی، اور 1739 میں ایرانی حملہ آور نادر شاہ کے ہاتھ لگا، جس کے دہلی کی فتح

(اور اس کے باشندوں کے قتلِ عام) سے حاصل ہونے والے لوٹ کے مال میں انمول تختِ طاؤس اور نفیس کوہِ نور شامل تھے۔

یہ بذاتِ خود نادر شاہ تھا، یا جیسا کہ حکایت ہے، جس نے اس ہیرے کو کوہِ نور، یا 'نور کے پہاڑ' کا نام دیا۔ اٹھارویں صدی کی ایک افغان ملکہ نے یادگار و دلکش انداز میں بیان کیا، 'اگر ایک طاقتور آدمی چار پتھر پھینکے، ایک شمال، ایک جنوب، ایک مشرق، ایک مغرب میں اور ایک پانچواں اوپر فضاء میں، اور اگر ان کے درمیان کا خلا سونے سے بھر دیا جائے، تو یہ کوہِ نور کی مالیت کے برابر نہیں ہو گا'۔ نادر شاہ کی موت پر، ہیرا اس کے جنرلوں میں سے ایک، احمد شاہ درانی کے ہاتھ لگا، جو افغانستان کا امیر بن گیا۔ اس کے بعد 1809 میں، درانی کے اخلاف میں سے ایک، بطور خراج کوہِ نور پنجاب کے طاقتور سکھ مہاراجہ کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن رنجیت سنگھ کے جانشین اس کی مملکت پر گرفت برقرار نہ رکھ سکے، اور سکھ دو جنگوں میں انگریزوں سے شکست کھا گئے، 1849 میں سکھ فرمانروائی اختتام پذیر ہو کر برطانوی سلطنت میں ضم ہو گئی۔ یہی وہ وقت تھا جب کوہِ نور انگریزوں کے ہاتھ لگا'۔

حکومت کے ایک وکیل __ ہندوستان کے سولسٹر جنرل کے 2016 میں تعجب خیز بیان __ کہ کوہِ نور ہیرا برطانیہ کو تحفتاً دیا گیا تھا لہٰذا یہ کہ ہندوستان اس کی واپسی کی خواہش نہیں کرے گا، نے ملک میں ایک پرجوش مباحثہ شروع کرنے میں مدد دی۔ ایک غیر سرکاری تنظیم، آل انڈیا ہیومن رائٹس اینڈ سوشل جسٹس فرنٹ، کی جانب سے دائر کیے گئے دعوے کا جواب دیتے ہوئے، جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ حکومت مشہور ہیرے کی واپسی چاہتی ہے، جو قبل ازیں پنجاب کی سکھ سلطنت نے برطانیہ کو 1840 کی اینگلو سکھ جنگوں کے اخراجات کے 'تاوان' کے طور پر کوہِ نور دیا تھا۔ سولسٹر جنرل نے اعلان کیا؛ انگریزوں نے 'نہ تو زبردستی اسے چرایا اور نہ ہی اٹھا لے گئے' اس لیے حکومتِ ہند کے پاس اس کی واپسی کے مطالبے کی کوئی بنیاد نہیں۔

نتیجتاً پیدا ہونے والی افراتفری کے باعث حکومتی ترجمانوں نے بڑی شدت سے اس رائے سے رجوع کرتے ہوئے، یہ دعویٰ کیا کہ سولیسٹر جنرل کا کوئی حتمی سرکاری نقطہ نظر نہیں اور دعویٰ شاید اب بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی، دنیا کے سب سے زیادہ داستانوی ہیرے پر اپنے اخلاقی دعوے سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ حکومتِ ہند کا یہ خیال کرنا کہ، سکھوں کو شکست دینے میں برطانوی اخراجات کی 'تلافی' کے لیے ہیرا بدلے میں دیا گیا تھا، بالکل نامعقول ہے، کیونکہ ہارنے والے کی جانب سے جیتنے والے کو جنگ میں کسی بھی قسم کی تلافی

کو عام طور پر بطور ہرجانہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ کم سن سکھ جانشین مہاراجہ دلیپ سنگھ نے ہیرا رسمی طور پر ملکہ وکٹوریہ کے حوالے کیا، جس کے پاس بہر حال اس معاملے میں کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ جیسا کہ ہندوستانی سیاسی مباحثے میں، میں نے اس معاملے پر روشنی ڈالی تھی، اگر آپ میرے سر پر بندوق رکھیں، تو شاید میں اپنا بٹوا آپ کو 'تحفتاً' دے دوں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب آپ کی بندوق ہٹ جائے تو مجھے یہ واپس نہیں چاہیے۔

در حقیقت تاوان وہ ہے جو بہت سی سابقہ نو آبادیات سمجھتی ہیں کہ ان کے ممالک پر صدیوں کی لوٹ مار کے لیے، برطانیہ ان کا قرض دار ہے۔ استعماری حکمرانی کے عروج پر سرقہ شدہ انمول زیورات کی واپسی، شاید آغاز کے لیے برمحل ہو۔ لیکن لندن ٹاور میں نمائش پر رکھا گیا کوہِ نور، جو تاج کے جواہرات کا حصہ ہے، کے ساتھ مخصوص مسائل وابستہ ہیں۔ جبکہ ہندوستانی اپنے دعوے کو اظہر من الشمس سمجھتے ہیں ___ بہر صورت، ہیرے کا وجود زیادہ تر ہندوستانی سرزمین پر یا اس کے نیچے رہا ہے ___ دوسروں نے بھی اپنا دعویٰ جتایا ہے۔ ایرانی کہتے ہیں کہ نادر شاہ نے یہ جائز طور پر حاصل کیا تھا؛ افغان دعویٰ کرتے ہیں کہ سکھوں کو سونپنے پر مجبور ہونے تک یہ ان کے قبضے میں تھا۔ کوہِ نور کی بازی کے انعام میں داخل ہونے والا آخری امیدوار پاکستان ہے، جو کسی قدر کمزور بنیادوں پر ہے کہ انگریزوں سے قبل آخری غیر متنازعہ مالک، سکھ سلطنت کا دارالحکومت، لاہور میں تھا، جو اَب پاکستان میں ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ اقلیتوں کی عشروں پر محیط نسل کشی کے بعد بمشکل ہی کوئی سکھ پاکستان میں رہ گئے ہیں، لہٰذا وہ یہ دعوی جتانے سے گریز پر مائل ہیں۔)

باہم متقابل دعوے برطانیہ کے لیے انتہائی طمانیت کا باعث بنے ہیں، کیونکہ یہ دو صدیوں یا اس سے زائد عرصہ، دور دراز ممالک کے، نو آبادیاتی استحصال کی متنوع ناانصافیوں کو سلجھانے کے مطالبات کے طوفان کو ٹالنا چاہتا ہے۔ پارتھینون سنگ مرمر سے لے کر کوہِ نور تک، دوسرے ممالک کے ورثے کے جواہرات کی برطانوی ضبطی، ایک خاص تنازعہ ہے۔ برطانوی خوفزدہ ہیں کہ کسی ایک چیز کے دینے سے بھی ایک پنڈورا باکس کھل سکتا ہے۔ جیسا کہ سابقہ وزیر اعظم ڈیوڈ کیمرون نے جولائی 2010 میں ہندوستان کے دورے پر تسلیم کیا، 'اگر آپ کسی ایک کو ہاں کہتے ہیں، تو آپ دیکھیں گے، اچانک پورا برطانوی عجائب گھر خالی ہو جائے گا۔ میں یہ کہنے سے ڈرتا ہوں یہ (کوہِ نور) جہاں پر ہے وہیں رہنے والا ہے'۔

اور پھر ایک تکنیکی اعتراض ہے۔ سولسٹر جنرل نے وثوق سے دعویٰ کیا، 1972 کا اینٹیک اینڈ آرٹ ٹریژر ایکٹ (خزینۂ آثارِ قدیمہ و فنون کا قانون) کسی بھی صورت میں، حکومت کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ 1947 میں

ہندوستان کی آزادی سے پہلے ملک سے برآمد کردہ نوادرات کی واپسی کا مطالبہ کرے۔ چونکہ کوہِ نور اس تاریخ سے ایک صدی پہلے ہندوستان سے چھن گیا، تو آزاد ہند کی حکومت اس کی واپسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ (یقیناً، قانون بدلا بھی جا سکتا تھا، خصوصاً ایک ایسے پارلیمان کے ذریعے جو ممکنہ طور پر ایسی کسی تبدیلی کے حق میں متفقہ ووٹ دیتا، لیکن لگتا نہیں کہ حکومت کے ساتھ ایسا ہو، جو شاید قابلِ فہم انداز میں دو جانبہ کشتیوں پر جھولنے سے ڈرتی ہے۔ اسی وجہ سے، ایک یو این ادارہ جو اس کی اس معاملے میں مدد کر سکتا تھا، اصل ممالک کو ثقافتی املاک کی واپسی کی ترویج کے لیے بین الحکومتی کمیٹی یا ناجائز تصرف کی صورت میں اس کی بحالی کو تحریک دینے کا قصد نہیں کیا گیا۔) ہندوستانی سولسٹر جنرل کے مؤقف سے یوں لگتا ہے کہ میرے جیسے قوم پرستوں کی ہواؤں کا بادبان اٹھا لیا گیا ہے، جو ہندوستان میں ثقافتی اہمیت کی حامل اشیاء کو، صدیوں کے برطانوی مظالم اور ہندوستان کی لوٹ مار پر اظہارِ افسوس کے ایک ذریعے کے طور پر، واپس آتا دیکھنا چاہیں گے۔

ابھی تک، لندن ٹاور میں مادر ملکہ کے تاج پر پورے آب و تاب سے جلوہ دکھاتا کوہِ نور، سابقہ استعماری قوت کی جانب سے کی گئی ناانصافیوں کی ایک مؤثر یاددہانی ہے۔ جب تک اسے واپس نہیں کیا جاتا ___ کم از کم کفارے کے علامتی اظہار کے طور پر ___ یہ لوٹ مار، غبن اور تصرف بیجا کی شہادت ہی رہے گا، جیسا کہ نوآبادیت حقیقت میں تھی۔ برطانوی ہاتھوں میں ___ کوہِ نور کو وہاں چھوڑنے کے لیے جس جگہ کے ساتھ مسلمہ طور پر اس کا کوئی تعلق نہیں، شاید یہی بہترین دلیل ہے۔ ٥

نوآبادیت کی مزاحمت؛ گاندھی ازم کی اپیل

یقیناً، نوآبادیت کی میراث کا ایک پہلو، اس کی مزاحمت کے لیے استعمال ہونے والے طریقوں کا عالمگیر تاثر ہے۔ انگریزوں کی ہندوستان سے روانگی کے بعد، مہاتما گاندھی کی عالمگیر موزونیت کا معاملہ، بنیادی طور پر ان کے اہنسا کے مرکزی اصول اور اس سے متاثر ہونے والے پیروکاروں پر اپنی بنیاد رکھتا ہے۔ سب سے بڑی مثال مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کی ہے، جس نے گاندھی پر ایک لیکچر میں شرکت کی، ان پر آدھی درجن کتابیں خریدیں اور ستیاگرہ کو بطور ضابطہ عمل اور اسلوب، دونوں طرح اختیار کیا۔ کنگ نے کسی بھی دوسرے سے زیادہ، اہنسا کو ہندوستان سے باہر، امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں نسلی تفریق کی بیخ کنی کے لیے، بڑے مؤثر انداز میں استعمال کیا۔ 'نفرت سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ تشدد سے تشدد جنم لیتا ہے'، گاندھی کی بازگشت میں اس

نے ناقابلِ فراموش انداز میں اعلان کیا: 'ہمیں لازماً روح کی طاقت کے ساتھ نفرت کی قوتوں کے مقابل ہونا ہوگا'۔ بعد میں کنگ نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ 'غیر متشدد مزاحمت کا گاندھیوادطریقہ ___ ہماری تحریک کا رہنما چراغ بن گیا۔ مسیح نے جذبہ و محرک بیدار کیا اور گاندھی نے طریقہ کار کا اہتمام کیا'۔

چنانچہ گاندھی ازم نے قابلِ استدلال طور پر امریکہ کے انتہائی جنوب کو ہمیشہ کے لیے بدل ڈالا۔ لیکن، گوئٹے مالا میں رگوبترا مینچو سے لے کر ارجنٹائن میں ایڈولفو پیریز ایسکیوول تک، خود ساختہ گاندھی وادیوں کے لیے نوبل امن انعام کے چکر دینے کے باوجود، اس کے مؤثر ہونے کی بہت سی دوسری اہم مثالوں کو تلاش کرنا مشکل ہے۔ (یقیناً، گاندھی نے خود کبھی امن انعام حاصل نہیں کیا۔) ہندوستان کی آزادی نوآبادیت کے خاتمے کے عہد کے آغاز سے عبارت تھی، لیکن ابھی بھی بہت سی اقوام فقط خونی اور متشدد جدوجہد کے بعد ہی آزادی حاصل کر رہی تھیں۔ لشکر کشی کرنے والی افواج کے بوٹوں تلے کچلی ہوئی دوسری اقوام، کو ان کی زمینوں سے بے دخل کیا جا چکا تھا یا دہشت کے مارے وہ اپنے گھروں سے بھاگ جانے پر مجبور تھے۔ اہنسا نے انھیں کوئی حل تجویز نہیں کیا تھا۔ یہ محض اخلاقی بالادستی کے چھن جانے کے احتمال میں مبتلا دشمنوں، حکومتوں جو ملکی و بین الاقوامی رائے عامہ کو جواب دہ تھیں اور جو شکست تسلیم کرنے پر شرمندگی محسوس کرنے کے قابل تھیں، کے خلاف کام کر سکتا تھا۔ انگریز، جمہوریت کے ساتھ ساتھ ایک آزاد پریس کی نمائندگی کرتے ہوئے اور اپنے بین الاقوامی امیج کا ادراک رکھتے ہوئے، ایسی شرمندگی کے حوالے سے حساس تھے۔ لیکن مہاتما گاندھی کے اپنے دور میں ہٹلر کے جرمنی میں یہودیوں کے لیے اہنسا کچھ نہیں کر سکی، جو، جنگی جنون میں مبتلا پریس کے فلیش بلب سے بہت دور، بغیر احتجاج کیے گیس چیمبرز میں غائب ہو گئے۔ ستم ظریفی سے اس کا سہرا برطانوی راج کے سر ہے کہ اس نے مہاتما گاندھی جیسے حریف کا سامنا کیا اور اسے کامیابی سے ہمکنار کیا۔

اہنسا کی طاقت کی بنیاد اس بات کے کہنے کی اہلیت میں ہے، 'تمھیں دیکھانے کے لیے کہ تم غلط ہو، میں خود سزا جھیلتا ہوں'۔ لیکن اس کا اثر ان پر نا ہونے کے برابر ہی ہوتا ہے جنھیں اس میں کوئی دلچسپی نہ ہو کہ آیا وہ غلط ہیں اور پہلے سے ہی آپ کو سزا دینا چاہ رہے ہوں، خواہ آپ ان کے ساتھ اختلاف کریں یا نہ کریں۔ سزا پانے کے لیے آپ کی رضامندی ان کی فتح کا سب سے آسان ذریعہ ہے۔ اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ نیلسن مینڈیلا، جس نے لکھا کہ گاندھی 'ہمیشہ تاثیر کا ایک عظیم ذریعہ' رہا ہے، نے بے رحم نسلی امتیاز پر مبنی طرزِ حکومت کے خلاف اہنسا کو اِک حاسّس کے طور پر اپنی جدوجہد میں قبول کرنے سے واضح طور پر انکار کیا۔

اس موضوع پر گاندھی خوفناک انداز میں غیر حقیقت پسندانہ لگتا ہے: 'سرکش استبدادی حکومت کو سب سے طاقتور جواب، بیگناہ کی برضا ور غبت قربانی ہے، جس کا تصور ابھی خدا یا انسان کو کرنا ہے۔" سول" بننے کے لیے نافرمانی،، اخلاص، تکریم، تحمل پر مبنی ہونی چاہیے، نہ کہ سرکشی پر اور یقیناً اس کے پیچھے کوئی بدنیتی یا نفرت نہیں ہونی چاہیے۔ نہ ہی سول نافرمانی میں ہیجان ہونا چاہیے، جو گونگی اذیت جھیلنے کی تیاری ہے'۔

دنیا بھر میں ناانصافیوں کے نیچے دبی ہوئی درد کی لہروں کے لیے، جو کہ درویشی یا ضعف کے لیے نسخے جیسی لگتی ہیں۔ اخلاقی اصول کے طور پر خاموشی سے مصائب جھیلنا بہت اچھا ہے، لیکن شاذ و نادر ہی اس سے کوئی با معنی تبدیلی آئی ہے۔ افسوسناک سچائی یہ ہے کہ منظم تشدد کے نکلنے کی قوت، تقریباً ہمیشہ عدم تشدد کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ زیادہ تر یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ گاندھی انگریزوں کو شرمندہ کر سکتے تھے لیکن انھیں نکال نہیں سکتے تھے۔ یہ تو تب ہوا جب فوجی جنھوں نے برطانوی راج کے ساتھ وفاداری کا حلف اٹھایا تھا، نے دوسری جنگ عظیم کے دوران بغاوت کر دی، اور جب رائل انڈین نیوی کا جہاز راں عملہ 1945 میں حکومت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی ہی توپیں برطانوی بندرگاہ کی تنصیبات پر داغ دیں، تو انگریزوں کو احساس ہوا کہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ وہ ایک بوڑھے آدمی کو جیل بھیج سکتے تھے اور اسے برت رکھنے کی اجازت دے سکتے تھے، لیکن وہ اب مزید مسلح بغاوت نہیں روک سکتے تھے جس کے پیچھے بتیس کروڑ لوگ تھے۔ گاندھی اخلاقی کیس جیت گئے، آج کے اسلوب میں 'سیاسی و ثقافتی طاقت' (سوفٹ پاور) کی جنگ؛ لیکن عسکری فتح کے بغیر بھی، یونیفارم میں ملبوس باغیوں اور حکومت کے سرکشوں نے 'عسکری و معاشی غلبے' (ہارڈ پاور) کی جنگ جیت لی۔

اور جب صحیح اور غلط کم واضح ہوں، تو گاندھی ازم ڈگمگا جاتا ہے۔ مہاتما اپنے اخلاقی رسوخ کے عروج کے باوجود، ہندوستان کے بٹوارے کو روک نہیں پائے، ان کی اصطلاحات میں، وہ اسے اخلاقی طور پر 'غلط' سمجھتے تھے۔ وہ 'صبر، ہمدردی اور اپنی ذات کو ابتلاء میں ڈالنے کے ذریعے مخالف کی خطاکاری کی عادت چھڑوانے' پر یقین رکھتے تھے، لیکن اگر مخالف بھی ان کے مقصد کی صداقت پر اسی طرح یقین رکھتا ہو، یا اپنی غیر اخلاقیت کا شعور رکھتے ہوئے، اسے نظر انداز کر دے، تو وہ بمشکل ہی یہ قبول کرنے پر تیار ہو گا کہ وہ 'غلطی' پر ہے۔ گاندھی ازم، غیر ملکی حکمرانی سے نجات جیسے ماورائی اصول کی بجا آوری میں اپنے سادہ ترین اور عمیق ترین انداز میں قابل عمل ہے۔ لیکن زیادہ پیچیدہ حالات میں یہ کام نہیں کر سکتا، اور زیادہ مناسب طور پر، کرتا بھی نہیں۔

مہاتما کے آدرشوں نے نئے ہندوستان کے بانیوں پر ایک غیر معمولی دانشورانہ تاثر چھوڑا، جنھوں نے ان

کے بہت سے اعتقادات کو ریاستی پالیسی کے رہنما اصولوں میں مجسم کیا۔ پھر بھی، مستقل فرقہ وارانہ (یا گروہی) کشمکش سے لے کر دلتوں کے ساتھ غلط سلوک تک، بہت سی خرابیوں کے لیے گاندھیین حل نہیں ڈھونڈے گئے جس پر وہ کرب میں مبتلا رہے۔ اس کی بجائے، ان کے طریقہ کار (خاص طور پر برت، ہڑتال یا کاروبار کی بندش، اور قصداً عدالتی گرفتاری) کو انتہائی کم رتبہ لوگوں نے معمولی فرقہ وارانہ نتائج کی جستجو میں، غلط استعمال اور بے آبرو کیا۔ ہندوستان سے باہر بھی، ایسے لوگوں نے گاندھیین حکمت عملی کی، دہشت گرد اور بم پھینکنے والوں کے طور پر غلط تاویل کی، جب انھوں نے جرائم کی سزا دیے جانے پر، بھوک ہڑتال کا اعلان کیا۔ اخلاقی بالادستی کے بغیر گاندھی ازم ایسے ہی ہے جیسے کسی پرولتاریہ کے بغیر مارکسزم۔ پھر بھی جو چند ایک ان کے طریق کار کو برتنا چاہتے ہیں، کے لیے ان کی ذاتی راست بازی اور اخلاقی عظمت موجود ہے۔

بین الاقوامی سطح پر، مہاتما کے بیان کردہ آدرشوں کو کم (لوگ) ہی رد کر سکتے ہیں: بلاشبہ طاقت کے استعمال کا اختیار دینے والے، ساتویں باب کی دفعات کے علاوہ، وہ فی الحقیقت اقوام متحدہ کا چارٹر لکھ سکتے تھے۔ لیکن ان کی موت کے بعد کی دہائیوں نے تصدیق کی کہ ریاستوں کے متصادم اقتدار اعلیٰ سے کوئی مفر نہیں۔ ان کے انتقال سے اب تک، تقریباً تین کروڑ جانیں جنگوں اور شورشوں میں ضائع ہو چکی ہیں۔ ان کے اپنے ملک سمیت، متعدد دہشت زدہ ممالک میں، مشترکہ طور پر تعلیم اور صحت کی نسبت حکومتیں عسکری مقاصد کے لیے زیادہ خرچ کرتی ہیں۔ جوہری ہتھیاروں کے موجودہ انبار کی دھماکہ خیز طاقت، اس آئٹم بم سے لاکھوں گنا زیادہ بیان کی جاتی ہے، جس سے (ہونے والی) ہیروشیما کی تباہی نے انھیں انتہائی مغموم کیا تھا۔ عالمی امن، جسے مہاتما سچائی کے لیے انتہائی اہم خیال کرتے تھے، ہمیشہ کی طرح التباس لگتا ہے۔

جیسے حکومتیں مقابلہ کرتی ہیں، ویسے ہی مذاہب بحثتے ہیں۔ مذہبی اتحاد کے حامی، مہاتما گاندھی جنھوں نے اعلان کیا تھا، 'میں ایک ہندو، ایک مسلمان، ایک عیسائی، ایک صیہونی، ایک یہودی ہوں' کو بھی دنیا بھر کے اتنے زیادہ مذاہب و مسالک کے اختصاصی احیاء کو ہضم کرنا مشکل لگے گا۔ لیکن شاید ان کے سوچنے کا انداز باقی ساری دنیا کے لیے ہمیشہ غیر مناسب تھا۔ جیسا کہ ان کے مسلم حریف محمد علی جناح نے ان کے منتخب کردہ اعتقاد کے دعوے کا ترکی بہ ترکی جواب دیا__ 'ایسا صرف ایک ہندو ہی کہہ سکتا ہے'۔

اور بالآخر، آسودہ دیہاتی ریپبلکس میں خود انحصار خاندانوں کی، چرخے کی دنیا، آج زیادہ دور ہے بہ نسبت جب مہاتما نے پہلی مرتبہ انھیں ہند سوراج میں اختیار کیا تھا۔ متوسط ٹیکنالوجی اور 'چھوٹا خوبصورت ہے' کی مختصر

مقبولیت کے باوجود، باہم منحصر دنیا میں ایسے تصورات کے لیے کوئی زیادہ جگہ نظر نہیں آتی۔ خود انحصاری اکثر اوقات ملکی صنعتوں کے تحفظ کے اصول کے لیے ایک آڑ اور ترقی پذیر ممالک میں نااہلی کے لیے ایک پناہ گاہ ہوتی ہے۔ کامیاب اور خوشحال ممالک وہ ہیں جو کاتنے والے چرخے سے پرے سلیکون چپس کو دیکھنے کے اہل ہوتے ہیں ___ اور اپنے عوام کو تکنیکی ترقی کے فوائد بہم پہنچاتے ہیں جو انھیں ادنی قسم کے اور بار بار کے چھوٹے موٹے کاموں سے نجات دلاتے ہیں اور ان کی زندگیوں کے دائرہ نگاہ کو وسیع کرتے ہیں۔ لیکن آج کا شہروں میں بدلتا ہوا ہندوستان، ان کی تصور کردہ، آدرشی، خود انحصار دیہی ریپبلک سے انتہائی دور ہے، اور ٹیکنالوجی کے ساتھ اس کی پرجوش جپھی مہاتما کو اس کی روح بیچنے جیسی لگتی ہوگی۔

لیکن اگر ان کی موت کے بعد کے سالوں میں گاندھی ازم کی حدود بے نقاب ہوگئی ہیں، تو اس سے مہاتما کی عظمت سے انکار نہیں ہوتا۔ جب دنیا فاشزم، تشدد اور جنگ میں پارہ پارہ ہو رہی تھی، تو انھوں نے سچ، اہنسا اور امن کی صفات کی تعلیم دی۔ انھوں نے طاقت کے مخالف اصول کے ذریعے نوآبادیت کی ساکھ کو تباہ کر دیا۔ اور انھوں نے اعتقاد اور جرات کے وہ ذاتی معیارات حاصل اور متعین کیے، جن تک چند ایک ہی کبھی پہنچ پائیں گے۔ وہ اس قسم کے نیم معمولی قائد تھے، جو اپنے پیروکاروں کی کوتاہیوں کے باعث محدود نہیں ہوئے۔

لہٰذا مہاتما گاندھی نوآبادیت دشمنی کی علامت کے طور پر سامنے آئے، ان کے عہد کا ایک ایسا وجود جس نے انھیں ماورائیت عطا کی۔ برطانوی راج کو حتمی خراج تحسین شاید اس 'عظیم روح' کی فضیلت میں پوشیدہ ہے، جس نے اس کی مخالفت کی۔

منڈلاتی پرچھائیاں: نوآبادیت کے بچے کھچے مسائل

نوآبادیاتی دور ختم ہو چکا ہے۔ اور ابھی تک نوآبادیت کے ابتدائی دور کے خاتمے کے بچے کھچے مسائل موجود ہیں جو عموماً نوآبادیاتی طاقت کی بے محل روانگی کا نتیجہ، اور ابھی تک خطرناک تعطل کا شکار ہیں۔ چار خونیں جنگوں سے عبارت، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دائمی مخاصمت کی طویل صورت حال، اور ہندوستان کے خلاف پاکستان کا بطور حکمت عملی، سرحد پار دہشتگردی کا متواتر عذاب، سب سے واضح مثال ہے۔ لیکن کچھ اور بھی ہیں۔ 1999 میں مشرقی تیمور میں ڈرامائی واقعات، جو ایک آزادی کی تحریک کو آخری اہم اقتدار کی منتقلی کی جانب لے گئے۔ یورپی نوآبادیت کی تمام ابتر وراثتوں، مغربی صحارا یا قبرص اور فلسطین کے ان پرانے رکے

ہوئے (فیصلوں) کے برعکس، کم از کم وہاں اختتام تو ہو چکا ہے۔ نوآبادیاتی دور کے آگ لگے فیتے، دوبارہ بھڑک سکتے تھے، جیسا کہ سب کے لیے کافی حد تک تعجب خیز، شمال-مشرقی افریقہ کے جزیرہ نما میں، ایتھوپیا اور اریٹریا کے مابین، ہوا بھی، جہاں ایک نوآبادیاتی سرحد پر جنگ چھڑ گئی، کہ تسلط کے ایک سابقہ دور میں اطالوی جس کا مناسب درستگی کے ساتھ تعین کرنے میں ناکام رہے تھے اور جہاں آج بھی انتہائی بے یقینی کے درمیان امن آہستہ آہستہ کھول رہا ہے۔ 1916 کا سائیکس-پیکوٹ معاہدہ، جس میں برطانوی اور فرانسیسی سابقہ عثمانی علاقوں کو اپنے درمیان بانٹنے پر رضامند ہوئے، اور جس نے آزاد عراق اور شام کے مابین سرحدوں کا تعین کیا، نوآبادیاتی تاریخ کی ایک اور یادگار ہے جس کا سایہ آج بھی ہم پر منڈلا رہا ہے۔ جب آئی ایس آئی ایس (داعش) ان ملکوں میں بے رحمانہ انداز میں در آئی، تو اس نے اسی اینگلو فرانسیسی معاہدے کی ناانصافیوں کو پھٹکارا اور سامراجی دور کو باامر مجبوری ایک مرتبہ پھر زمانہ حال بناتے ہوئے ___ سائیکس-پیکوٹ کے چھوڑے ہوئے ترکے کو کالعدم کرنے کے عزم کا واضح اظہار کیا۔

لیکن یہ محض نوآبادیت کے بلاواسطہ نتائج نہیں ہیں جو اب بھی متعلقہ ہیں: بالواسطہ بھی ہیں۔ نوآبادیت کی فکری تاریخ حالیہ تنازعہ کے کافی سارے خود سر مقاصد کے ساتھ آلودہ ہے۔ بالکل سادہ انداز میں، ایک تو غفلت زدہ علم بشریات ہے: روانڈا اور برونڈی میں ہیوٹس اور تتسیس کی بیلجین تقسیم، جس نے ایک ایسی تفریق کو ٹھوس شکل دے دی، جو اس سے پہلے موجود نہیں تھی، جس کا آسیب افریقہ کے عظیم جھیلوں والے علاقے پر منڈلا رہا ہے۔ اس سے وابستہ ایک مسئلہ ترغیب زدہ عمرانیات ہے: کتنی قتل و غارت کے ہم ذمہ دار ہیں، مثال کے طور پر ہندوستان میں 'جنگجو نسلوں' کی برطانوی اختراع کے، جس نے مسلح افواج میں بھرتی کے لیے ایک جانب جھکاؤ پیدا کیا اور چند کمیونٹیز کو عسکریت کے بھاری بھر کم بوجھ سے لاد دیا؟ اور آپ 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کی پرانی نوآبادیاتی انتظامی روش کو نظر انداز نہیں کر سکتے، برصغیر میں 1857 کے بعد برطانوی پالیسی کو پھر مثال بنایا گیا، ہندو اور مسلمانوں کے مابین سیاسی اختلافات کی منظم طور پر ترویج کی جاتی رہی، جو تقریباً المناک انداز میں بٹوارے کے المیے کی جانب لے گئی۔

نوآبادیاتی عہد کے ایسے امتیازات محض مہلک نہیں تھے؛ اکثر اوقات نوآبادیاتی سماج کے اندر ریاستی وسائل کی ایک غیر مساوی تقسیم بھی اس کے ہم رکاب ہوتی تھی۔ بیلجین/(Belgian) استعمار پسند تتسیس/(Tutsis) کی حمایت کرتے، جس کے نتیجے میں ہوتو/(Hutu) انھیں اجنبی درانداز کے طور پر رد کرتے تھے؛

سری لنکا میں نو آبادیاتی عہد میں تامل لوگوں کے استحقاق سے استفادہ حاصل کرنے پر سنہالیوں کی آزردگی نے آزادی کے بعد امتیازی پالیسیوں کو تحریک دی جس نے بعد میں تامل بغاوت کو ایندھن فراہم کیا۔ ہندوستان ابھی بھی تقسیم کرو اور حکومت کرو کی وراثت پر قائم ہے، ایک ایسی مسلمان آبادی کے ساتھ جو تقریباً پاکستان کی آبادی جتنی بڑی ہے، اور خود کو اقلیت سمجھتے ہوئے، ہندوستانی سورج میں اپنے مقام کی تلاش کے لیے سرگرداں ہے۔

ایک جدید ریاست کے اندر ایک 'گڈمڈ' نو آبادیاتی تاریخ بھی زبردست خطرے کا سرچشمہ ہے۔ جب ایک ریاست کے ایک سے زائد نو آبادیاتی ماضی ہوں، تو اس کا مستقبل مخدوش ہوتا ہے۔ بہرحال، مختلف النوع عناصر، تاریخی، جغرافیائی، اور ثقافتی کے ساتھ ساتھ 'نسلی'، بھی علیحدگی پسندی کی انگیخت کا باعث ہو سکتے ہیں۔ نسلی اوصاف یا زبان بمشکل ہی اریٹریا کے ایتھوپیا سے اور 'ریپبلک آف صومالی لینڈ' کے صومالیہ سے علیحدگی کا ایک عنصر دکھائی دیتا ہے (ایک کو تسلیم کیا جاتا ہے دوسرے کو نہیں)۔ اس کی بجائے، یہ مختلف نو آبادیاتی تجربات تھے (اریٹریا میں اطالوی حکمرانی اور صومالی لینڈ میں برطانوی حکومت) جس کا ردعمل انھوں نے دیا، کم از کم، ان کے باقی نسلی ہم وطنوں کی نسبت، ان کے اپنے شعور ذات کی حد تک۔ اسی سے ملتا جلتا معاملہ سابقہ یوگوسلاویہ کے حوالے سے بھی تیار کیا جا سکتا ہے، جہاں ملک کے وہ علاقے جو 800 سال تک آسٹرو-ہنگرین حکومت کے ماتحت رہے تھے ان علاقوں میں شامل کیے گئے جنھوں نے تقریباً اتنا ہی لمبا عرصہ عثمانی حکمرانوں کے ماتحت گزارا تھا۔ 1991 میں جو جنگ چھڑی وہ کوئی چھوٹے پیمانے کی جنگ نہیں تھی، جس نے یوگوسلاویہ کے ان حصوں، جن پر جرمن بولنے والے فرمانروا حکومت کرتے آئے تھے کو، ان کے خلاف جو (جرمن) نہیں بولتے تھے (یا جنھوں نے ایسی استعماریت کی مزاحمت کی)، سے بھڑا دیا۔

نو آبادیاتی دور میں کھینچی گئی سرحدیں، اگر آزادی کے بعد جوں کی توں برقرار بھی رہتیں، تو بھی آج تک قومی اتحاد کے زبردست مسائل پیدا کرتیں۔ ہمیں عراق میں اسی کی یاد دلائی گئی ہے، عثمانی سلطنت کے کھنڈرات سے ہونے والی جس کی تخلیق نے، متعدد لاینحل تضادات کو ایک ہی ریاست میں اکٹھا کر دیا۔ لیکن افریقہ میں مسئلہ کہیں زیادہ نمایاں ہے، جب نو آبادیاتی انداز میں وضع کی گئی سرحدوں کے درمیان قومی تعمیر و ترقی کا چیلنج ناقابلِ شکست بنتا ہے، تو وہاں نسلی و علاقائی خطوط کے ساتھ ساتھ معاشرتی کشمکش ابھر سکتی ہے۔ جہاں نو آبادیاتی تشکیلات نو آبادیاتی نقشہ ساز کے قلم کی مطلق العنانی کے ذریعے بے جوڑ لوگوں کو اکٹھا ہونے پر مجبور

کرتی ہیں، تو قومیت ایک فریب میں مبتلا کرنے والا تصور بن جاتا ہے۔ برلن جیسے دور دراز شہروں میں وضع کردہ سرحدوں کے باعث افریقہ میں پرانی قبائلی اور برادری کی وفاداریاں مسخ ہو گئیں، آزادی کے بعد جن کے قائدین کو اسی کپڑے کے تھان میں سے نوآبادیاتی تخلیق کردہ ریاستوں کے لیے، نئی روایات اور قومی شناختیں اختراع کرنا پڑیں۔ نتیجہ ناقابلِ اعتبار سیاسی افسانوں کی گھڑت تھا جو اتنے ہی مصنوعی تھے جتنے کہ ان کے تخلیق کردہ ممالک، جو کہ اکثر اوقات شہری طبقہ، جسے متحد کرنے کا انھوں نے ارادہ کیا ہوتا تھا، کو حقیقی، وطن پرستانہ اطاعت کا حکم نہیں دے سکتے تھے۔ خانہ جنگی نے مقامی قائدین کے لیے اس 'قومی' قائد کو چیلنج کرنا زیادہ آسان بنا دیا، جس کی قوم پرستی اس کے پورے ملک میں گونج پیدا کرنے میں ناکام رہی تھی۔ بہر حال ایسے قائد کے خلاف بغاوت، 'اس کی کہانی پر محض تاریخ کی دوبارہ توثیق ہے۔

نوآبادیت کے نتیجے میں ریاستی ناکامی آویزش کا ایک اور نمایاں ماخذ ہے، ایک غیر مستعد نئی آزاد ریاست کی حکومت کرنے کی عدم اہلیت کا ذیلی نتیجہ۔ بہت سے افریقی ممالک میں حکومتی بحران، دور حاضر کے عالمی معاملات میں فکر مند ہونے کی ایک حقیقی اور دائمی وجہ ہے۔ مؤثر مرکزی حکومتوں کی تباہی — جیسا کہ آج دار فر، جنوبی سوڈان اور مشرقی کانگو سے، اور ماضی میں سائیر الیون، لائبیریا اور صومالیہ سے عیاں ہوتا ہے (اور کون جانتا ہے کل کہاں ہو گا؟) — خوفناک امکانات کے سیلابی دھارے کا بند کھل سکتا ہے: تنازعات کے الجھاؤ میں، متعدد 'کمزور ریاستوں' کے تباہ ہونے کا احتمال نظر آتا ہے، خاص طور پر افریقہ میں۔

مابعد نوآبادیاتی معاشروں میں پسماندگی بذات خود تنازعات کی ایک وجہ ہے۔ استعمار پسندوں کے مفادات کی جانب جھکاؤ رکھنے والی ترجیحات کے نتیجے کے طور پر، ایک غریب ملک میں انفراسٹرکچر کی غیر مساوی ترقی، وسائل کی غیر مساوی تقسیم کی طرف لے جاتی ہے، جو نتیجتاً ایک معاشرے میں "نظر انداز شدہ علاقوں" اور سڑکوں، ریلویز، بجلی گھروں، ٹیلی کمیونیکیشنز، پلوں اور نہروں کے ذریعے بہتر بنائے گئے (علاقوں) کے مابین بڑھتی ہوئی خلیج کا باعث بنتی ہے۔ جنوب کے ایسے بہت سے ممالک میں بڑھتی ہوئی پسماندگی، جو عالمی سرمایہ داری کے کھیل میں کھلاڑی کے طور پر رہنے کے لیے اپنی شکستہ جدوجہد میں خستہ حالی سے آگے بڑھ رہے ہیں، لاغر ہوتے ریاستی نظام سے باہر، مایوس کن غربت، ماحولیاتی تباہی اور بے جڑ، بے روزگار آبادی کے حالات پیدا کیے ہیں۔ رابرٹ کپلان نے اپنی کتاب نزدیک آتی طوائف الملوکی میں بڑے واضح انداز میں ایک پورٹریٹ کی نقاشی کی ہے، جو ہمارے گلوبل ویلیج کے مضافات میں دائمی تشدد کے حقیقی خطرے کو بیان کرتا ہے۔

جب ہم اکیسویں صدی کا آغاز کرتے ہیں، تو ستم ظریفی سے یہ واضح نظر آتا ہے کہ ماضی میں امن کی نو آبادیاتی کوششوں کے لیے چھوٹے پیمانے پر نہیں، (بلکہ) مستقبل کی طوائف الملوکی، ابھی شاید باقی ہے۔ میری کوئی خواہش نہیں کہ، مابعد نو آبادیاتی ممالک کے ان سیاستدانوں، جن کی قیادت دور حاضر میں ناپید نظر آتی ہے، کو ان کی ناکامیوں کے لیے، بہانے ڈھونڈنے کی دلیل، ماضی سے مہیا کروں۔ لیکن ہمیں بنانے والی اور قریب قریب ڈھانے والی قوتوں کی تفہیم کے کھوج میں، اور نئے قرن میں تنازعات کے آئندہ ممکنہ ماخذات کو جان لینے کی امید میں، ہمیں احساس کرنا پڑے گا کہ بعض اوقات بہترین مستقبل دکھانے والا آئینہ عقبی نظارہ دکھانے والا شیشہ ہوتا ہے۔

اظہارِ تشکر

میں بہت سے لوگوں کا اس کتاب میں تعاون کرنے پر شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔ سب سے پہلے، میرا دوست اور ناشر ڈیوڈ ڈاویڈار، جس نے اس پراجیکٹ کا بیڑا اٹھانے کے لیے مجھ سے بات چیت کی __ بغیر پوری طرح سوچے سمجھے کہ اس میں کتنا کام درکار ہو گا میں نے جلد بازی میں فیصلہ کیا __ اور مسودے کی شکل کے بارے میں رہنمائی کی، جس طرح کہ یہ اب آپ کے سامنے ہے۔ اس کی رفیق ثمر پونیت، ایڈیٹنگ کے پورے عمل کے دوران اپنی انتھک اور تندہی سے کی گئی اعانت کے لیے، خصوصی توصیف کی مستحق ہے۔

عہدِ ظلمت ہندوستان میں برطانوی راج کے ماخذات پر ایک غیر معمولی تحقیق اور مطالعہ کی متقاضی تھی (بہت سارے معاملات میں از سر نو مطالعہ کی)۔ اس دوڑ دھوپ میں پروفیسر شیبا تھاتھل، اٹھارویں اور انیسویں صدیوں کی اصل دستاویزات، متون اور کتابوں کے ڈیجیٹل نسخے ڈھونڈنے، کے ساتھ ساتھ میری تحقیق کے موضوع سے متعلقہ کتابوں اور جرائد کے مضامین کی شکل میں حالیہ ماخذوں کا علمی مواد ڈھونڈنے میں، بیش قدر رہیں۔ میرے دو بے حد محنتی محققین، ابھیمینیو دادو، جس پر سب سے زیادہ کام کا بوجھ تھا، اور بین لانگلے، نے گراں قدر معنویت دریافت کی اور باریک بینی سے اسے ثابت کیا۔ ابھیمینیو مسودے کی تیاری کے ساتھ ساتھ اس کے بہت سے حوالہ جات اور نظائر کی جانچ میں الجھا رہا، جس کے لیے میں بے حد ممنون ہوں۔

معدودے چند قریبی دوستوں نے مسودہ پڑھا اور مفید آراء سے نوازا: اپنے والد کی نسبت بہتر مؤرخ و مؤلف، میرا بیٹا کانیشک تھرور؛ میرا نائبِ خاص منو پیلائی، اس عہد کی ایک شاندار تاریخ کا بذات خود مصنف؛

میرا دوست اور بعض اوقات شریک کار، مصنف اور علوم پر گہری نگاہ کا حامل کیرتھک سسید ھرن؛ اور میری 'دوسری کوکھ سے بہن' مؤرخ ڈاکٹر نندیتا کرشنا۔ میری ہم مکتب اور اب پارلیمانی کولیگ، ہارورڈ کی نامور تاریخ دان، پروفیسر سُگاتا بوس، نے مسودے کا ایک بچھیتا نسخہ پڑھا اور اپنی فراست کے موتی مجھے عنایت کیے۔ درحالیکہ ان سب کے خیالات و تصورات انتہائی قیمتی تھے، اس کے باوجود اس کتاب کے مواد اور نتائج کے لیے فقط میں ذمہ دار ہوں گا۔

سب سے بڑھ کر، میری مخلصانہ ممنونیت، بھوٹان کے بادشاہ، عالی مرتبت جناب جگمی خیسر نامگیل وانگچک (Jigme Khesar Namgeyel Wangchuck) کے لیے ہے، جن کی فیاضانہ میزبانی و دستگیری کے بغیر میں یہ کتاب لکھنے یا مقررہ وقت پر ختم کرنے کے قابل نہ ہوا ہوتا۔ ان کی شفقت و مدد کا شکریہ، میں ان کے خوبصورت ملک کے پہاڑوں میں فرار ہونے کے قابل ہوا اور خلل، مداخلت، کالز اور ملنے والوں کے بغیر، خاصی تیز رفتاری سے لکھ پایا۔ اور میری دوڑ دھوپ میں ان کی بے چوک شائستگی اور اعانت کے لیے، عالی مرتبت کے افسر اعلیٰ، جناب داشو زمپن عگیین نامگیل، عزت مآب کیپٹن جاتو تشیرنگ اور تسیدون دورجی کے لیے بھی میرا شکریہ۔

اس کتاب کے کلہم لکھنے تک میرے عملے نے سینکڑوں ناگزیر طریقوں سے میری معاونت کی، نارائن سنگھ کے علاوہ کون ہوگا، جس کا میں ابدی طور پر ممنون ہوں۔

اور خاص دوست، جس نے مجھے لکھنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا، لیکن روزانہ میری دستگیری اور حوصلہ افزائی کی، کے لیے نہ کوئی الفاظ ضروری ہیں اور نہ ہی کافی ہوں گے۔

ششی تھرور

پارو، بھوٹان

اگست/2016
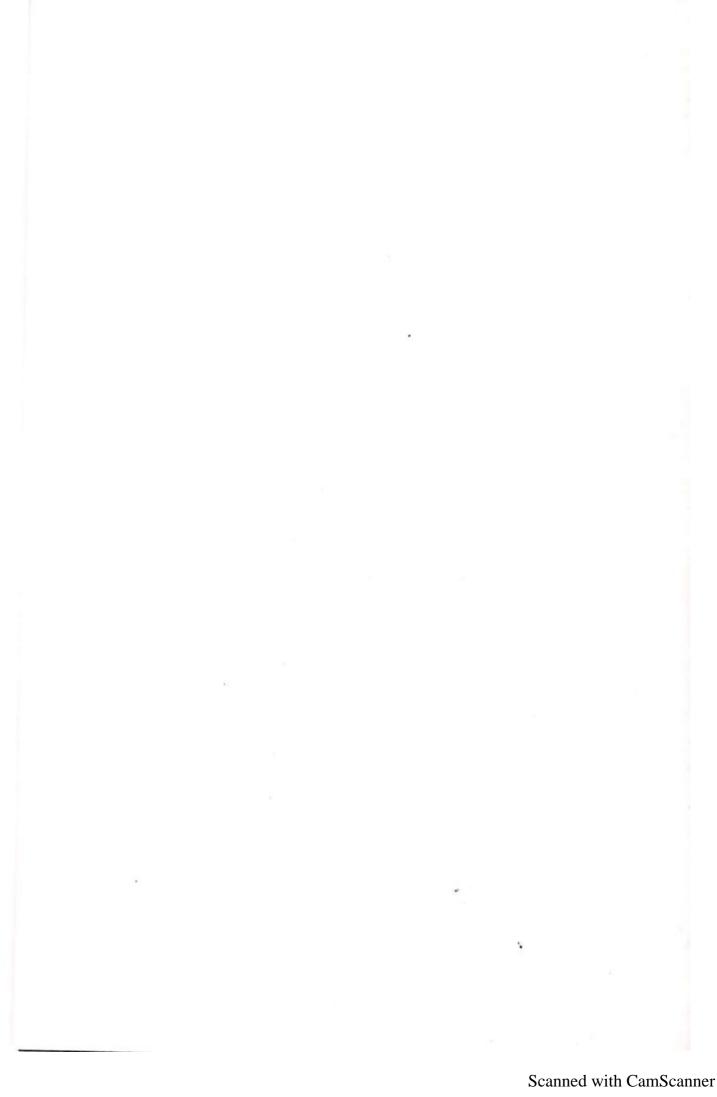
NOTES AND REFERENCES

PREFACE

xix the attempt by one Indian commentator...to compute what a fair sum of reparations would amount to: Minhaz Merchant, 'Why Shashi Tharoor is right on Britain's colonial debt to India', www.dailyo.in, 23 July 2015. www.dailyo.in/politics/minhaz-merchant-shashi-tharoor-oxford-union-address-congress-britain-colonialism-monsoon-session-parliament/ story/1/5168.html.

xx 'Tharoor might have won the debate—but moral victory: Shikha Dalmia,'Perhaps India Shouldn't Get Too Excited About Reparations', *Time*, 3 August 2015.

xx One blogger added, for good measure: Sifar AKS, 'Dear Shashi, Your Accent Could Not Mask the Holes in Your Speech', www.akkarbakkar.com. www.akkarbakkar.com/dear-shashi-tharoor-your-accent-could-not-mask-the-holes-in-your-speech.

xxi Commentator Jonathan Foreman put it most bluntly: Jonathan Foreman, 'Reparations for the Raj? You must be joking!', www.politico.eu, 3 August 2015. www.politico.eu/article/british-reparations-for-india-for-the-raj-oxford.

xxi One Indian commentator argued that the claim for reparation: Gouri Dange, 'For a few claps more...', *Pune Mirror*, 29 July 2015.

xxiii Historian John Keay put it best: John Keay, 'Tell it to the Dreaming Spires', *Outlook*, 15 August 2015.

xxiii According to a recent UN Population Division report: 'World Population Ageing 1950–2050' report, United Nations, www.un.org/esa/population/publications/worldageing19502050/pdf/90chapteriv.pdf.

xxiv to start teaching unromanticized colonial history: Steven Swinford and Christopher Hope, 'Children should be taught about suffering under the British Empire, Jeremy Corbyn says', *The Telegraph*, 27 July 2015.

xxiv what the British-domiciled Dutch writer Ian Buruma saw as an attempt to remind the English: Ian Buruma, *Playing The Game*, New York: Farrar, Straus & Giroux, 1991, p. 258.

xxiv Buruma was, of course, echoing: Salman Rushdie, 'Outside the Whale', *Granta*, 1984, reproduced in *Imaginary Homelands*, New Delhi: Viking, 1993.

xxiv The Indian columnist Aakar Patel suggested: Aakar Patel, 'Dear Shashi,

the fault was not in the Raj, but in ourselves', *Times of India*, 26 July 2015.

xxvi '[W]hen we kill people,' a British sea-captain says: Amitav Ghosh, *Sea of Poppies*, New York: Farrar, Straus & Giroux, 2011, p. 242.

CHAPTER 1: THE LOOTING OF INDIA

2 **The British conquest of India:** Will Durant, *The Case for India*, New York: Simon & Schuster, 1930, p. 7.

3 **'The little court disappears':** John Sullivan, *A Plea for the Princes of India*, London: E. Wilson, 1853, p. 67.

3 **'Nearly every kind of manufacture or product':** Jabez T. Sunderland, *India in Bondage: Her Right to Freedom and a Place Among the Great Nations*, New York: Lewis Copeland, 1929, p. 367.

4 **At the beginning of the eighteenth century, as the British economic historian Angus Maddison:** Angus Maddison, *The World Economy*, Development Centre of the Organisation for Economic Co-operation and Development, 2006.

6 **'What honour is left to us?':** William Dalrymple, 'The East India Company: The Original Corporate Raiders', *The Guardian*, 4 March 2015.

7 **Bengal's textiles were still being exported:** Most of these details are from K. N. Chaudhuri, *The Trading World of Asia and the English East India Company: 1660–1760,* Cambridge: Cambridge University Press, 2006 and Sushil Chaudhury, *The Prelude to Empire: Plassey Revolution of 1757*, New Delhi: Manohar Publishers, 2000.

8 **The soldiers of the East India Company obliged, systematically smashing the looms:** William Bolts, *Considerations on Indian Affairs: Particularly Respecting the Present State of Bengal and its Dependencies*, London: J. Almon, P. Elmsly, and Brotherton and Sewell, 1772, p. vi.

8 **India had enjoyed a 25 per cent share of the global trade in textiles:** P. Bairoch and M. Levy-Leboyer, (eds), from 'The Main Trends in National Economic Disparities since the Industrial Revolution' in *Disparities in Economic Development since the Industrial Revolution*, New York: Macmillan, 1981.

9 **British exports of textiles to India, of course, soared:** Jon Wilson, *India Conquered: Britain's Raj and the Chaos of Empire*, London: Simon & Schuster, 2016, p. 321.

9 **India's weavers were, thus, merely the victims of technological obsolescence:** This argument is made by B. R. Tomlinson in *The Economy of Modern India, 1870–1970, The New Cambridge History of India,* Vol 3, 3, Cambridge: Cambridge University Press, 1996, p. 15.

10 **In 1936, 62 per cent of the cloth sold in India:** Gurcharan Das, *India Unbound: From Independence to the Global Information Age*, New York: Alfred A. Knopf, 2001.

11 at the end of British rule, modern industry employed only 2.5 million people: Ibid, p. 63.

11 'the redemption of a nation... a kind of gift from heaven': Owen Jones, 'William Hague is wrong...we must own up to our brutal colonial past', *The Independent*, 3 September 2012.

11 'There are few kings in Europe': Letter to the Duke of Choiseul, dt. London, 27 Feb. 1768. A.E./C.P., Angleterre, Vol. 477, 1768; quoted in Sudipta Das, 'British Reactions to the French Bugbear in India, 1763–83', *European History Quarterly*, 22 (1), 1992, pp. 39–65.

11 '[tax] defaulters were confined': Durant, *The Case for India*.

13 Nabobs, [Macaulay] wrote: *Historical Essays of Macaulay: William Pitt, Earl of Chatham, Lord Clive, Warren Hastings*, Samuel Thurber (ed.), Boston: Allyn and Bacon, 1894. The five paragraphs that follow draw extensively from Tillman W. Nechtman, 'A Jewel in the Crown? Indian Wealth in Domestic Britain in the Late Eighteenth Century', *Eighteenth-Century Studies*, 2007, Vol. 41 (1), pp. 71–86.

13 'India is a sure path to [prosperity]': James Holzman, *The Nabobs in England: A Study of the Returned Anglo-Indian, 1760–1785*, New York: Columbia University Press, 1926, pp. 27–28, quoted in Nechtman, 2007.

14 'As your conduct and bravery is become the publick': Richard Clive to Robert Clive, 15 December 1752; OIOC Mss Eur G37/3 quoted in Nechtman, 2007.

14 'Here was Lord Clive's diamond house': Walpole to Mann, 9 April 1772, quoted in Henry B. Wheatley, *London Past and Present: Its History, Associations, and Traditions*, London: John Murray, 1891, p. 2.

14 The Cockerell brothers, John and Charles: www.sezincote.co.uk.

16 'the Company providentially brings us home': *The Gentleman's Magazine*, Vol. 56, Part 2, London: A. Dodd and A. Smith, 1786, p 750.

16 'Today the Commons of Great Britain': Dalrymple, 'East India Company'.

17 'combined the meanness of a pedlar with the profligacy of a pirate': R. B. Sheridan, 'Speech on the Begums of Oude, February 7, 1787', quoted in *British Rule in India: Condemned by the British Themselves*, issued by the Indian National Party, London, 1915, p. 15.

17 'in the former capacity, they engross its trade': Minute of 18 June 1789, quoted in '*British Rule in India: Condemned by the British Themselves*', issued by the Indian National Party, London, 1915, p. 17.

18 Hastings duly informed the Council that he had received a 'gift': See the vivid accounts of the trial in Nicholas B. Dirks, *The Scandal of Empire: India and the Creation of Imperial Britain*, Cambridge, MA: Belknap Press/Harvard University Press, 2006; and Peter J. Marshall, *The Impeachment of Warren Hastings*, Oxford: Oxford University Press, 1965.

18 He described in colourfully painful detail the violation of Bengali women: Ibid.

18 'the scene of exaction, rapacity, and plunder': William Howitt, *The English in India*, London: Longman, Orme, Brown, Green, and Longmans, 1839, pp. 42–43.

19 'the misgovernment of the English was carried': Thomas Babington Macaulay, *Essays: Critical and Miscellaneous*, London: Carey and Hart, 1844.

19 It is instructive to see both the extent to which House of Commons debates: See, for instance, substance of Sir Arthur Wellesley's speech delivered in the Committee of the House of Commons on the India Budget on Thursday, 10 July 1806 in *Bristol Selected Pamphlets*, 1806, University of Bristol Library.

19 The prelate Bishop Heber...wrote in 1826: Bishop Heber, writing to Rt. Hon. Charles W. Wynne from the Karnatik, March 1826, quoted in *British Rule Condemned by the British*, p. 24.

19 In an extraordinary confession, a British administrator in Bengal, F. J. Shore: Hon. F. J. Shore's *Notes on Indian Affairs*, Vol. ii, London, 1837, p. 516, quoted in Romesh Chunder Dutt, *The Economic History India Under Early British Rule: From the Rise of the British Power in 1757 to the Accession of Queen Victoria in 1837*, London: K. Paul, Trench, Trubner & Co. Ltd, 1920.

20 rueful voices had coined the catchphrase, 'Poor Nizzy pays for all': See John Zubrzycki, *The Last Nizam*, New Delhi: Picador India, 2007, p. 34.

21 the revenue had to be paid to the colonial state everywhere in cash: See Sugata Bose, *Peasant Labour and Colonial Capital,* Cambridge: Cambridge University Press, 1993.

22 'the ryots in the Districts outside the permanent settlement': H. M. Hyndman, *The Ruin of India by British Rule: Being the Report of the Social Democratic Federation to the Internationalist Congress at Stuttgart*, London: Twentieth Century Press, 1907, cited in *Histoire de la Ile Internationale*, Vol. 16, Geneva: Minkoff Reprint, 1978, pp. 513–33.

22 'the difference was this, that what the Mahomedan rulers claimed': Chunder Dutt, *The Economic History*, pp. xi–xii.

22 A committee of the House of Commons declared: Quoted in Howitt, *English in India*, p. 103.

23 thereby abolishing century-old traditions and ties: Ibid, p 149.

23 'As India is to be bled, the lancet should be directed': *British Rule Condemned*, pp. 6–7.

24 Cecil Rhodes openly avowed that imperialism: Quoted in Zohreh T. Sullivan, *Narratives of Empire: The Fictions of Rudyard Kipling*, Cambridge: Cambridge University Press, 1993, p. 7.

24 Bengali novelist Bankim Chandra Chatterjee wrote of the English: Tapan Raychaudhuri, *Europe Reconsidered: Perceptions of the West in 19th Century Bengal*, Oxford: Oxford University Press, 1988, p. 185.

25 Paul Baran calculated that 8 per cent of India's GNP: Paul Baran, *The Political Economy of Growth*, New York, 1957, p. 148.

25 India was 'depleted', 'exhausted' and 'bled' by this drain of resources: Dadabhai Naoriji, *Poverty and Un-British Rule in India*, London: Swan Sonnenschein, 1901.

25 The extensive and detailed calculations of William Digby: William Digby, *'Prosperous' British India: A Revelation from Official Records*, London: T. Fisher Unwin, 1901.

26 'There can be no denial that there was a substantial outflow': Angus Maddison, *Class Structure and Economic Growth: India and Pakistan Since the Moghuls*, New York: Routledge, 2013, p. 63.

26 In 1901, William Digby calculated the net amount: See William Digby, *Indian Problems for English Consideration*, London: National Liberal Federation, 1881 and *'Prosperous' British India*, 1901.

27 A list of Indian Army deployments overseas by the British: H. S. Bhatia (ed.), *Military History of British India, 1607-1947*, New Delhi: Deep & Deep Publications, 1977.

27 Sikh who named his Hurricane fighter 'Amritsar': Ibid, p. 101.

28 Every British soldier posted to India: Bill Nasson, *Britannia's Empire: Making a British World*, Stroud, Gloucestershire: Tempus, 2004.

28 Biscuits, rice...authorized to the European soldier, came from Indian production: Bhatia, *Military History*, p. 152.

28 'how little human life and human welfare': Howitt, *English in India*, pp. 40–41.

29 in the oft-quoted words of the Cambridge imperial historian John Seeley: John R. Seeley, *The Expansion of England: Two Courses of Lectures*, London: Macmillan, 1883, p. 243.

30 'The mode by which the East India Company': Howitt, *English in India*, p. 9.

30 'The British empire in India was the creation of merchants': Ferdinand Mount, *The Tears of the Rajas: Mutiny, Money and Marriage in India 1805–1905*, London: Simon & Schuster, 2015, p. 773.

30 Mr. Montgomery Martin, after examining: Dadabhai Naoroji, *Poverty and Un-British Rule in India,* London: Swan Sonnenschein, 1901.

33 Indian shipbuilding...offers a more complex but equally instructive story: This section relies heavily on Indrajit Ray, 1995, 'Shipbuilding in Bengal under Colonial Rule: A Case of 'De-Industrialisation', *The Journal of Transport History*, 16 (1), pp. 776–77.

35 India's once-thriving shipbuilding industry collapsed: Ibid

37 The total amount of cash in circulation in the Indian economy fell: Wilson, *India Conquered*, p. 433.

37 Even Miss Prism...could not fail to take note: Oscar Wilde, *The Importance of Being Earnest*, Act II, London: Leonard Smithers and Company, 1899.

38 English troopers in battle would often dismount and swap their own swords: Philip Mason, *A Matter of Honour: An Account of the Indian*

Army, its Officers and Men, London: Penguin, 1974, p. 39.

39 India 'missed the bus' for industrialization, failing to catch up on the technological innovations: See, for instance , Akhilesh Pillalmarri, 'Sorry, the United Kingdom Does Not Owe India Reparations', *The Diplomat*, 24 July 2015; Raheen Kasam, 'Reparations for Colonial India? How about railways, roads, irrigation, and the space programme we still pay for', 22 July 2015, www.breitbart.com; and Foreman, 'Reparations for the Raj?.

41 The humming factories of Dundee, the thriving shipyards, and the remittances home: See *Scotland and the British Empire,* John M. MacKenzie and T. M. Devine (eds.), Oxford: Oxford University Press, 2012. Also see Martha MacLaren, *British India and British Scotland 1780–1830*, Akron, Ohio: Akron University Press, 2012.

CHAPTER 2: DID THE BRITISH GIVE INDIA POLITICAL UNITY?

45 'considering its long history, India has had but a few hours': Diana Eck, *India: A Sacred Geography,* New York: Harmony Books. See also William Dalrymple's review of the book for *The Guardian*, 27 July 2012.

47 having once been a British colony is the variable most highly correlated with democracy: Taken from Seymour Martin Lipset, Kyoung-Ryung Seong and John Charles Torres, 'A Comparative Analysis of the Social Requisites of Democracy', *International Social Science Journal*, 1993, 45, pp. 155–75.

47 'every country with a population of at least 1 million': Myron Weiner, 'Empirical Democratic Theory', in E. Ozbudun and M. Weiner (ed.), *Competitive Elections in Developing Countries*, Durham, NC: Duke University, 1987, pp. 3–34.

49 'In India,' wrote an eminent English civil servant: H. Fielding-Hall, *Passing of the Empire*, London: Hurst & Blackett, 1913, p. 134.

50 'a society of little societies': Wilson, *India Conquered*, p. 14.

51 'Areas in which proprietary rights in land': See, for instance, Abhijit Banerjee and Lakshmi Iyer, 'History, Institutions, and Economic Performance: The Legacy of Colonial Land Tenure Systems in India', *The American Economic Review*, Vol. 95, No. 4, 2005, pp. 1190–1213.

51 'We may be regarded as the spring which': Forrest, 1918, p. 296.

52 William Bolts, a Dutch trader...wrote in 1772: Bolts, 1772, p. vi.

52 Of all human conditions, perhaps the most brilliant': Dalrymple, 'The East India Company'.

54 The British charges against the rulers they overthrew: Hyndman: Report on India, 1907, *Ruin of India by British*, pp. 513–533.

56 'partly to amaze the indigenes, partly to fortify': Jan Morris, *Farewell the Trumpets: An Imperial Retreat*, London: Faber & Faber, 1978.

56 years later, the management theorist C. Northcote Parkinson: C.

Northcote Parkinson, *Parkinson's Law: The Pursuit of Progress*, London: John Murray, 1958.

57 reflected what the British writer David Cannadine dubbed 'Ornamentalism': David Cannadine, *Ornamentalism: How the British Saw Their Empire*, London: Allen Lane, 2001.

59 'frivolous and sometimes vicious spendthrifts and idlers': David Gilmour, *Curzon: Imperial Statesman*, New York: Farrar, Straus & Giroux, 2003.

60 'neither Indian, nor civil, nor a service': Jawaharlal Nehru, *Glimpses of World History: Being Further Letters to his Daughter*, London: Lindsay Drummond Ltd., 1949, p. 94.

60 'a few hundred Englishmen should dominate India': For sympathetic accounts of the lives, careers and points of view of the British in India, see Philip Mason, *The Men Who Ruled India*, New York: W. W. Norton, 1985 and Charles Allen, *Plain Tales from the Raj*, London: Abacus, 1988.

61 The British in India were never more than 0.05 per cent: Figures from Maddison, 'The Economic and Social Impact of Colonial Rule in India', in *Class Structure*.

61 'so easily won, so narrowly based, so absurdly easily ruled': Eric Hobsbawm, *The Age of Empire*, Hachette, 2010, p. 82.

62 In David Gilmour's telling, they had no illusions: From David Gilmour, *The Ruling Caste: Imperial Lives in the Victorian Raj*, New York: Farrar, Straus & Giroux, 2006, pp. 5, 33, 19, 244.

63 'The whole attitude of Government to the people it governs': Fielding-Hall, *Passing of the Empire*, p. 54.

64 'constructed a world of letters, ledgers and account books': Wilson, *India Conquered*, p. 128.

64 he paid a Bengali clerk in the Collector's office to tell him: Ibid, p. 140.

64 'The new system was not designed': Ibid, pp. 128–129.

64 'allowed British officials to imagine': Ibid, p. 225.

65 'Collector of the Land Revenue. Registrar of the landed property': Hyndman, *Ruin of India by British*.

66 In the summer capital of Simla: Gilmour, *The Ruling Caste*, p. 271.

66 'ugly pallid bilious men': Gilmour, *The Ruling caste*, p. 104.

67 'A handful of people from a distant country': Henry W. Nevinson, *The New Spirit in India*, London: Harper & Brothers, 1908, p. 329.

67 'India is...administered by successive relays of English carpet-baggers': H. M. Hyndman, *Ruin of India by British*, pp. 513–33.

68 Insulated from India by their upbringing and new social circumstances: See a detailed account in Anne de Courcy, *The Fishing-Fleet: Husband-Hunting in the Raj*, London: Weidenfeld & Nicolson, 2012.

68 the places named for the British have mostly been renamed: Gilmour, *The Ruling Caste*.

69 'the Government of India is not Indian, it is English': Fielding- Hall, *Passing of Empire*, p. 182.

69 Government must do its work: Ibid, p. 194.
69 'it would be impossible to place Indian civilians': Ibid, p. 188.
69 'Socially he belongs to no world': Ibid, p. 193.
70 'educated Indians whose development the Government encourages': *British Rule Condemned*, p. 13.
72 On the verge of being dismissed, Mahmud...resigned in 1892: Jon Wilson, 'The Temperament of Empire. Law and Conquest in Late Nineteenth Century India', from Gunnel Cederlof and Sanjukta Das Gupta, *Subjects, Citizens and Law: Colonial and Postcolonial India*, Routledge, 2016.
72 'if an Indian in such a position tries to preserve his self-respect': Ibid.
73 In the first decades of the twentieth century, J. T. Sunderland observed: Sunderland, 1929.
73 'With the material wealth go also': Dadabhai Naoroji, 'The Moral Poverty of India and Native Thoughts on the Present British Indian Policy (Memorandum No. 2, 16th Nov, 1880)', 1880, reproduced in Naoroji, *Poverty and Un-British Rule in India*, London: Swan Sonnenschein, 1901.
74 It is instructive to note the initial attitudes of whites in India: Two books that cover this theme especially well are Jonathan Gil Harris, *The First Firangis*, New Delhi: Aleph Book Company, 2015 and William Dalrymple, *White Mughals: Love and Betrayal in Eighteenth-Century India,* London: Harper Perennial, 2002.
74 'it was almost as common for Westerners to take on the customs': Dalrymple, *White Mughals*.
74 'the wills of company officials show that one in three': Ibid.
75 'our Eastern empire...has been acquired': Quoted by Wilson, *India Conquered*, p. 163.
75 'a passive allegiance,' Malcolm added: Dalrymple, *White Mughals*.
75 'Hundreds, if not thousands, on their way from Burma perished': Quoted by Wilson, *India Conquered*, pp. 449–450.
76 This very metaphor pops up in the quarrel: E. M. Forster, *A Passage to India*, London: Allen Lane, 1924, pp. 50–51.
76 'Naboth is gone now, and his hut is ploughed into its native mud': Rudyard Kipling, 'Naboth', in *Life's Handicap* (1891), republished by Echo Books, London, 2007, p. 289.
76 'sometimes with a rare understanding, sometimes with crusty, stereotyped contempt': Philip Mason, *Kipling: The Glass, The Shadow and The Fire*, New York: Holt, Rinehart & Wilson, 1975, p. 27.
77 'part of the defining discourse of colonialism': Zohreh T. Sullivan, *Narratives of Empire: The Fictions of Rudyard Kipling*, Cambridge: Cambridge University Press, 1993, p. 25.
77 'brave island-fortress/of the storm-vexed sea': Sir Lewis Morris, 'Ode', *The Times*, London, 22 June 1897.
77 'be the father and the oppressor of the people': Zohreh T. Sullivan, *Narratives of Empire*, p. 4.

77 'Who hold Zam-Zammah, that "fire-breathing dragon"': Rudyard Kipling, *Kim*, New York: Oxford University Press, 2008, p. 1.

78 the imperial enterprise required men of courage: See the detailed discussion in M. Daphne Kurtzer, *Empire's Children: Empire and Imperialism in Classic British Children's Books*, London: Routledge, 2002, pp. 13–44.

78 'There is something noble in putting the hand of civilization': Quoted in C. J. Wan-ling Wee, *Culture, Empire, and the Question of Being Modern*, New York: Lexington Books, 2003, p. 80.

78 'the ennobling and invigorating stimulus': Ibid, pp. 80–81.

80 'Imperialism,' Robert Kaplan suggests: Robert Kaplan, 'In Defense of Empire' *The Atlantic*, April 2014.

81 '[if] this chapter of reform led directly or necessarily': Morley, *Indian Speeches* London, 1910, 91, in Ishtiaq Husain Qureshi, *The Struggle for Pakistan*, University of Karachi, 1969, p. 28.

81 C. A. Bayly makes an impressive case: Christopher A. Bayly, *Recovering Liberties: Indian Thought in the Age of Liberalism and Empire*, Cambridge: Cambridge University Press, 2011.

81 it [the Congress] was a model of order': Nevinson, *The New Spirit in India*, p. 327.

82 The chairman...summarized the history of the last year: Ibid, pp. 129–30, 132.

86 The British government in India has not only deprived: www.gktoday.in/poorna-swaraj-resolution-declaration-of-independence.

86 Unrest in India was occasioned by...the contemptuous disregard: Nevinson, *The New Spirit in India*, p. 322.

87 In historical texts, it often appears: M. B. L. Bhargava, *India's Services in the War*, Allahabad: Bishambher Nath Bhargava, 1919.

90 Never in the history of the world: Cited in Durant, *The Case for India*.

CHAPTER 3: DEMOCRACY, THE PRESS, THE PARLIAMENTARY SYSTEM AND THE RULE OF LAW

94 'evangelical imperialism': Niall Ferguson, *Empire: The Rise and Demise of the British World Order and the Lessons for Global Power*, New York: Basic Books, 2003, p. 125.

94 'the most distinctive feature of the Empire': Ibid, pp. xxiii, 56, 125.

95 'India, the world's largest democracy': Ibid, pp. 332, 326, 358.

95 'not only underwrites the free': Niall Fergusson, *Colossus: The Price of America's Empire*, New York: Penguin, 2004, p. 2.

101 'have i seen more deliberate attempts': Nevinson, *The New Spirit in India*, p. 206 et seq.

103 This is why I have repeatedly advocated a presidential system for India: See my essay on the subject in *India Shastra: Reflections on the Nation*

in our Times, New Delhi: Aleph Book Company, 2015.

104 **'they rejected it with great emphasis'**: Bernard Weatherill, 'Relations between Commonwealth Parliaments and the House of Commons', *RSA Journal*, Vol. 137 No. 5399, October 1989, pp. 735–741. Published by Royal Society for the Encouragement of Arts, Manufactures and Commerce.

105 **'the crushing of human dignity'**: Jawaharlal Nehru, *A Bunch of Old Letters*, Bombay: Asia Publishing House, 1958, p. 236.

106 **'the law that was erected can hardly be said'**: Diane Kirkby and Catherine Coleborne (eds.), *Law, History and Colonialism: The Reach of Empire*, Manchester: Manchester University Press, 2001, cited in Richard Price, 'One Big Thing: Britain, Its Empire, and Their Imperial Culture' *Journal of British Studies*, Vol. 45, No. 3, July 2006, pp. 602–627. Published by Cambridge University Press on behalf of The North American Conference on British Studies. www.jstor.org/stable/10.1086/503593.

106 **'a body of jurisprudence written'**: Wilson, *India Conquered*, pp. 213–4.

107 **When Lord Ripon...attempted to allow Indian judges**: These details may all be found in Durant, *The Case for India*, pp. 138–139.

107 **When Robert Augustus Fuller fatally assaulted his servant**: Jordanna Bailkin, 'The Boot and the Spleen: When Was Murder Possible in British India?', *Comparative Studies in Society and History*, 48 (2), 2006, pp. 462–93.

107 ***Punch* wrote an entire ode to 'The Stout British Boot'**: 'The British Boot', *Punch* 68, (30 January 1875), p. 50, quoted in Jordanna Bailkin, 'The Boot and the Spleen: When Was Murder Possible in British India?', *Comparative Studies in Society and History*, 48 (2), 2006, pp. 462–93.

108 **Martin Wiener proposed an 'export' model**: Martin Wiener, *Men of Blood: Violence, Manliness and Criminal Justice in Victorian England*, Cambridge: Cambridge University Press, 2004, p. 11.

109 **'I will not be a party to any scandalous hushings up'**: Nayana Goradia, *Lord Curzon: The Last of the British Moguls*, Oxford: Oxford University Press, 1993.

110 **'there is a great and dangerous gap between the people and the Courts'**: Fielding-Hall, *Passing of the Empire*, p. 103.

110 **'compelled to live permanently under a system of official surveillance'**: Nevinson, *The New Spirit in India*, p. 204.

111 **women on the Malabar Coast**: This is described brilliantly in Manu Pillai, *The Ivory Throne*, New Delhi: Harper Collins, 2015.

111 **The Criminal Tribes Legislation, 1911, gave authority**: D. M. Peers and N. Gooptu (eds.), *India and the British Empire*, Oxford: Oxford University Press, 2012.

111 **The scholar Sanjay Nigam's work has shown**: Sanjay Nigam, 1990, 'Disciplining and Policing the 'Criminals by Birth', Part 1: The Making of a Colonial Stereotype The Criminal Tribes and Castes of North India', and 'Part 2: the Development of a Disciplinary System, 1871–1900',

Indian Economic Social History Review, 27, p. 131–164 and 257-287.

112 We declare it Our royal will and pleasure: 'Her Majesty's Proclamation (1858)', India Office Records, Africa, Pacific and Asia collections, British Library, London: L/P&S/6/463 file 36, folios 215-16.

113 'Our religion is sublime, pure, and beneficent': Quoted in Lawrence James, *Raj: The Making and Unmaking of the British Empire in India*, New York: St Martin's Griffin, 1997, p. 223.

113 'The first, and often the only, purpose of British power in India': Wilson, *India Conquered*, p. 6.

113 'there were no major changes in village society, in the caste system': Maddison, *Class Structure*.

113 The fact is that the British interfered with social customs: See, for example, the impassioned appeals by anti-slavery campaigners for the British government to put an end to certain traditional practices of servitude, which were of course completely ignored by Company officialdom: Wilson Anti-Slavery Collection, *A Brief View of Slavery in British India*, 1841, Manchester, England: The University of Manchester, John Rylands University Library. URL: www.jstor.org/stable/60228274

CHAPTER 4: DIVIDE ET IMPERA

121 in the only already-white country the British colonized, Ireland: Caesar Litton Falkiner, *Illustrations of Irish History and Topography, Mainly of the 17th Century*. London: Longmans, Green, & Co. , 1904, p. 117.

122 not only were ideas of community reified, but entire new communities: Norman G. Barrier, *The Census in British India: New Perspectives*, New Delhi: Manohar Publishers, 1981.

122 'Colonialism was made possible, and then sustained': Nicholas B. Dirks, *Castes of Mind: Colonialism and the Making of Modern India*, Princeton: Princeton University Press, 2001.

122 'In the conceptual scheme which the British created': Bernard S. Cohn, *An Anthropologist Among The Historians And Other Essays*, Oxford: Oxford University Press, 1987. See also Ranajit Guha, *Dominance without Hegemony: History and Power in Colonial India*, Cambridge, MA: Harvard University Press, 1998.

123 The path-breaking writer and thinker on nationalism: Benedict Anderson, *Imagined Communities: Reflections on the Origin and Spread of Nationalism, 2nd ed*. London: Verso, 1991.

124 'capable of expressing, organizing, and': Dirks, 2001.

124 caste, he says, 'was just one category among many': Ibid.

124 in Partha Chatterjee's terms, the colonial argument for why civil society: For more details, see Partha Chatterjee, *Lineages of Political Society: Studies in Postcolonial Democracy*, Columbia University Press, 2011 and *The Nation and its Fragments: Colonial and Postcolonial Histories*',

Princeton University Press, 1993.

126 **The pandits...cited doctrinal justifications:** See, for instance, Madhu Kishwar, *Zealous Reformers, Deadly Laws*, New Delhi: Sage Publications, 2008.

126 **'enumerate, categorize and assess':** Christopher Bayly, *The Birth of the Modern World, 1780–1914: Global Connections and Comparisons*, London: Wiley-Blackwell, 2004, p. 275.

127 **The American scholar Thomas Metcalfe has shown how race ideology:** Thomas Metcalfe, *Ideologies of the Raj*, Cambridge: Cambridge University Press, 1995, p. 89.

128 **the census in India was led by British:** This discussion relies heavily on K. W. Jones, 'Religious Identity and Indian Census' in *The Census in British India: New Perspectives*, N. G. Barrier (ed.), New Delhi: Manohar Publishers, 1981, pp. 73–102.

128 **This is underscored by the scholar Sudipta Kaviraj:** Sudipta Kaviraj, 'The Imaginary Institution of India', *Subaltern Studies* VII, Partha Chatterjee and Gyanendra Pandey (eds.), New Delhi: Oxford University Press, 1992, p. 26.

130 **Risley's work helped the British use such classification both to affirm their own convictions:** See E. M. Collingham, *Imperial Bodies: The Physical Experience of the Raj, 1800–1947*, Oxford: Polity Press, 2001; Christopher Pinney, 'Classification and Fantasy in the Photographic Construction of Caste and Tribe', *Visual Anthropology* 3, (1990), pp. 259–284, p. 267; and Peter Gottschalk, *Religion, Science and Empire: Classifying Hinduism and Islam in British India*, London: Oxford University Press, 2012, p. 213.

130 **Such caste competition had been largely unknown in pre-British days:** See M. N. Srinivas, *Social Change in Modern India*, Hyderabad: Orient Longman India, 1972, which describes how social change and caste mobility were practiced before the advent of the British.

130 **'Nothing embraces the whole of India, nothing, nothing':** Forster, *A Passage to India*, p. 160.

130 **Both David Washbrook and David Lelyveld believe that:** David Washbrook, 'To Each a Language of His Own: Language, Culture, and Society in Colonial India', in *Language, History and Class*, Penelope J. Corfield (ed.), London: Blackwell, 1991, pp. 179–203; David Lelyveld, 'The Fate of Hindustani: Colonial Knowledge and the Project of a National Language', in *Orientalism and the Postcolonial Predicament*, Carol A. Breckenridge and Peter van der Veer (eds.), Philadelphia: University of Pennsylvania Press, 1993, pp. 189–214.

131 **the British even subsumed ancient, and not dishonourable, professions:** Ratnabali Chatterjee, 'The Queen's Daughters: Prostitutes as an Outcast Group in Colonial India', Chr. Michelsen Institute Report 1992: 8.

131 **the Hindu-Muslim divide was, as the American scholar of religion:** Peter Gottschalk, *Religion, Science, and Empire*, Oxford: Oxford University

Press, 2012.

133 Gyanendra Pandey suggests that religious communalism: Gyanendra Pandey, *The Construction of Communalism in Colonial North India*, New Delhi: Oxford University Press, 1990.

133 the colonialists' efforts to catalogue, classify and categorize the Indians: Ibid, 204.

134 a temple in South Arcot, Tamil Nadu, hosts a deity: Muttaal Ravuttan can be found in Virapatti, Tirukoyilur Taluk, South Arcot, Tamil Nadu. See Alf Hiltebeitel, 'Draupadi's Two Guardians: Buffalo King & Muslim Devotee' in *Criminal Gods and Demon Devotees: Essays on the Guardians of Popular Hinduism*, Binghamton, NY: SUNY Press, 1989, p. 338 et seq.

134 The Mughal court, she points out: Romila Thapar, *On Nationalism*, New Delhi: Aleph Book Company, 2016, pp. 14–15.

134 Hindu generals in Mughal courts, or of Hindu and Muslim ministers in the Sikh ruler Ranjit Singh's entourage: Gyanendra Pandey, *Construction of Communalism*.

135 the colonial state loosened the bonds that had held them together: Romila Thapar, *On Nationalism*.

135 large-scale conflicts between Hindus and Muslims...only began under colonial rule: See Sandria Freitag, *Collective Action and Community: Public Arenas and the Emergence of Communalism in North India*, Berkeley: University of California Press, 1989.

135 Hindu or Muslim identity existed in any meaningful sense: C. A. Bayly, 'The Pre-History of 'Communalism'? Religious Conflict in India, 1700–1860', *Modern Asian Studies*, Vol. 19(2), 1985, p. 202.

136 The portrayal of Muslims as Islamist idol-breakers...is far from the truth: Richard M. Eaton, 'Temple Desecration and the Image of the Holy Warrior in Indo-Muslim Historiography', (paper presented at the annual meeting of the Association for Asian Studies, Boston, April 1994), cited by Cynthia Talbot, 'Inscribing the Other, Inscribing the Self: Hindu- Muslim Identities in Pre-Colonial India', *Comparative Studies in Society and History*, Vol. 37 (4), 1995, p. 718.

137 Cynthia Talbot observed that since a majority of medieval South India's: Talbot, 'Inscribing the Other', pp. 692–722. Also see H. K. Sherwani, 'Cultural Synthesis in Medieval India,' *Journal of Indian History*, 41, 1963, pp. 239–59; W. H. Siddiqi, 'Religious Tolerance as Gleaned from Medieval Inscriptions', in *Proceedings of Seminar on Medieval Inscriptions*, Aligarh: Centre of Advanced Study, Dept. of History, Aligarh Muslim University, 1974, pp. 50–58.

139 'a new religious feud was established': Nevinson, *The New Spirit in India*, p. 192-193.

139 I have almost invariably found: Ibid, p. 202.

140 it is striking that...the Aga Khan articulated a vision of India: The Aga Khan, *India in Transition: A Study in Political Evolution*, (Philip Lee

Warner for the Medici Society, London, 1918); see particularly Chapter I, pp. 1–15, for his civilizational theories; Chapter XIII, 'India's Claim to East Africa'; pp. 123–132, and Chapter XV on Islam, pp. 156–161.

141 **'to counteract the forces of Hindu agitation':** Dr B. R. Ambedkar, *Thoughts on Pakistan*, Bombay: Popular Prakashan, 1941, p. 89.

142 **'predominant bias in British officialdom':** Durant, *The Case for India*, pp. 137–138.

143 **'By 1905, religious rhetoric between Shias and Sunnis':** Keith Hjortshoj, 'Shi'i Identity and the Significance of Muharram in Lucknow, India', in Martin Kramer (ed.), *Shi'ism, Resistance and Revolution*, Boulder: Westview Press, 1987, p. 234.

144 **Muslims have been together with the Hindus since they moved:** Maulana Husain Ahmad Madani, quoted in Venkat Dhulipala, *Creating a New Medina,* Cambridge: Cambridge University Press, 2016, pp. 449–450.

146 **'The British are not a spiritual people':** Lala Lajpat Rai, 'The Swadeshi Movement', 1905, quoted in Nevinson, p. 301.

148 **'We are different beings,' he declared:** Cited in Nisid Hajari, *Midnight's Furies: The Deadly Legacy of India's Partition,* New York: Houghton Mifflin Harcourt, 2015, p. 9.

154 **Clement Attlee persuaded his colleagues:** The entire section on the events leading to Partition (including the pages that follow) is based on the following books: Phillips Talbot, *An American Witness to India's Partition*, New Delhi: Sage Books, 2007; Leonard Gordon, *Brothers Against the Raj*, New York: Columbia University Press, 1990; Penderel Moon, Mark Tully and Tapan Raychaudhuri, *Divide and Quit*, Oxford: Oxford University Press, 1998; Sugata Bose, *His Majesty's Opponent: Subhas Chandra Bose and India's Struggle Against Empire*, Cambridge, MA: Harvard University Press, 2011; Maulana Abul Azad Khan, *India Wins Freedom,* New Delhi: Orient Blackswan, 2004; Durga Das, *India: From Curzon to Nehru and After*, New Delhi: Rupa Publications, 1967; Bipan Chandra, *India's Struggle for Independence*, New Delhi: Viking, 1988; Jawaharlal Nehru, *The Discovery of India*, New Delhi: Viking, 2013; Sarvepalli Gopal, *Jawaharlal Nehru*, Vols. I & II, New Delhi: Vintage, 2005; Nisid Hajari, *Midnight's Furies*; Tunzelmann, *Indian Summer*; Alan Campbell-Johnson, *Mission with Mountbatten*, London: Macmillan, 1985; Larry Collins and Dominique Lapierre, *Mountbatten and the Partition of India,* New Delhi: Vikas, 1975; Michael Brecher, *Nehru: A Political Biography*, London: Beacon Press, 1962; Stanley Wolpert, *Nehru: A Tryst with Destiny*, New York: Oxford University Press, 1995; M. J. Akbar, *Nehru*, New Delhi: Viking, 1988; H. V. Hodson, *The Great Divide*, Oxford: Oxford University Press, 1997; Yasmin Khan, *The Great Partition*, New Haven: Yale University Press, 2008; Louis Fischer, *The Life of Mahatma Gandhi*, New York: Harper Collins, 1997; Nicholas Mansergh, *The Transfer of Power 1942-47*, London: HM Stationery Office, 1983; and Lord Archibald Wavell, *Viceroy's Journal*

(ed.), Penderel Moon, Oxford: Oxford University Press, 1973. For a short account, see also my own *Nehru: The Invention of India*, New York: Arcade Books, 2003.

155 'It is alarming and nauseating to see Mr Gandhi': Ramachandra Guha, 'Statues in a Square', *The Telegraph*, 21 March 2015.

155 'He put himself at the head of a movement': Boris Johnson, *The Churchill Factor: How One Man Made History*, New York: Riverhead Books, 2014, p. 178.

157 'bound hand and foot at the gates of Delhi': Alex Von Tunzelmann, *Indian Summer: The Secret History Of The End Of An Empire*, New York: Henry Holt & Company, 2007.

157 'he represents a minority': Hajari, *Midnight's* Furies, p. 41.

157 its membership swelled from 112,000 in 1941 to over 2 million: Ibid, p. 42.

159 'are only technically a minority': For the opposite view, marshalling various sources of evidence for the idea that Muslim separatist consciousness had deep roots in society and religion, see Venkat Dhulipala, *Creating a New Medina: State Power, Islam and the Quest for Pakistan in Colonial North India*, Cambridge: Cambridge University Press, 2015.

159 The latter was serious, affecting seventy-eight ships and twenty shore establishments: Srinath Raghavan, *India's War: The Making of Modern South Asia 1939–1945*, London: Penguin, 2016.

161 Wavell's astonishingly candid diaries reveal his distaste for,: Lord Archibald Wavell, *Viceroy's Journal* (ed.), Penderel Moon, p. 283.

166 'I've never met anyone more in need of front-wheel brakes': Hajari, *Midnight's Furies*, p. 102.

172 'The British Empire did not decline, it simply fell': Tunzelmann, *Indian Summer*, 2007.

172 'stands testament to the follies of empire': Yasmin Khan, *The Great Partition*, New Haven: Yale University Press, 2007.

173 Far from introducing democracy to a country mired in despotism: This argument is laid out in convincing detail in Amartya Sen, *The Argumentative Indian,* New York: Farrar, Straus & Giroux, 2005.

CHAPTER 5: THE MYTH OF ENLIGHTENED DESPOTISM

177 there has never been a famine in a democracy with a free press: Amartya Sen, *Poverty and Famines: An Essay on Entitlements and Deprivation*, Oxford: Clarendon Press, 1982.

177 The fatality figures are horrifying: Durant, *The Case for India.*

179 'it was common economic wisdom that government intervention': Dinyar Patel, 'How Britain Let One Million Indians Die in Famine,' BBC News, 11 June 2016. www.bbc.com/news/world-asia-india-36339524.

179 'If I were to attempt to do this, I should consider myself no better': Ibid.

179 'complex economic crises induced by the market': Mike Davis, *Late Victorian Holocausts: El Niño Famines and the Making of the Third World*, London; New York: Verso Books, 2001, p. 19.

180 'We have criticized the Government of Bengal for their failure to control the famine': *Famine Inquiry Commission Final Report,* Famine Inquiry Commission, (John Woodhead, Chairman), India, 1945, pp. 105–106.

180 'Behind all these as the fundamental source of the terrible famines': Durant, *The Case for India*, pp. 36–37.

182 'There is to be no interference of any kind': Davis, 2001, pp. 31, 52.

182 Lytton's pronouncements were noteworthy: Ibid.

183 'it is the duty of the Government': Johann Hari, 'The Truth? Our Empire Killed Millions', *The Independent*, 19 June 2006.

183 'severely reprimanded, threatened with degradation': Ibid.

183 'Scores of corpses were tumbled into old wells': Ibid.

184 'When in August 1877 the leading citizens of Madras': Georgina Brewis, 'Fill full the Mouth of Famine: Voluntary action in famine relief in India 1877–1900', in Robbins, D. et al. (eds), Yearbook II PhD research in progress, London: University of East London, 2007, pp. 32–50.

185 'were humane men and, although hampered by inadequate': Ibid.

186 '[i]n its influence on agriculture, [cattle mortality]: J. C. Geddes, *Administrative Experience Recorded Former Famines*, Calcutta, 1874, p. 350. Another official noted that 'a loss that is likely to fall more heavily on the farmers than even the temporary loss of manual labour, is the loss by death of their plough and well bullocks'. Report of Colonel Baird Smith to Indian Government on Commercial Condition of North West Province of India and recent Famine, Parliamentary Papers, 8 May 1861, p. 29; and Report of the Same Officer to the Indian Government on the Recent Famine in the Same Province, House of Commons, 1862, p. 39.

187 'it falls to us to defend our Empire from the spectral armies: Cited in Chandrika Kaul, *Reporting the Raj: The British Press and India 1880*–1922, Manchester: Manchester University Press, 1922, p. 75.

188 'in the past 12 years the population of India': *Sydney Morning Herald*, 6 November 1943.

188 richly-documented account of the Bengal Famine: Madhusree Mukerjee, *Churchill's Secret War: The British Empire and the Ravaging of India During World War II*, New York: Basic Books, 2010, p. 332.

189 The way in which Britain's wartime financial arrangements: Durant, p. 36. For famines in general and the Bengal Famine of 1943-44 in particular, see also Cormac Ó Gráda, *Eating People is Wrong, and Other Essays on Famine, its Past, and its Future*, Princeton, N.J.: Princeton University Press, 1950.

189 'a providential remedy for overpopulation': William Jennings Bryan, *British Rule in India,* reprinted by the British Committee of the Indian

National Congress, London, 1906, p. 11.

190 which rests largely on the introduction of quinine as an anti-malarial drug: These claims are made in Ferguson, *Empire*, p. 215.

191 From 1787, Indian convicts were transported, initially to the penal colonies: These details are cited in G. S. V. Prasad and N. Kanakarathnam, 'Colonial India and Transportation: Indian Convicts in South East Asia and Elsewhere', *International Journal of Applied Research*, Vol. 1 (13), 2015, pp. 5–8.

191 Between 1825 to 1872, Indian convicts made up the bulk of the labour force: Ibid.

192 'Whether labour were predominantly enslaved, apprenticed or indentured': Clare Anderson, *Convicts in the Indian Ocean*, London: Palgrave Macmillan, 2000, p. 104-106.

193 The 'Brotherhood of the Boat' became the subject of poetry: See this song from the 1970s in the Carribean called 'Jahaji Bhai, Brotherhood of the Boat': www.youtu.be/DOh4fsIaTH8.

193 In the period 1519-1939, an estimated 5,300,000 people whom scholars delicately dub 'unfree migrants': G. S. V. Prasad and Dr N Kanakarathnam, 'Colonial India and transportation: Indian convicts in South East Asia and elsewhere', *International Journal of Applied Research*, 1(13), 2015.

194 'was as if fate had thrust its fist': Ghosh, *Sea of Poppies*, p. 367.

195 'Most of the time, the actions of British imperial administrators': Wilson, *India Conquered*, p. 5.

195 'their sense of vulnerability and inability': Ibid, pp 75–77.

195 'I can only [subdue resistance] by reprisals': Howitt, *English in India*, p. 21.

196 Delhi…was left a desolate ruin: Ferdinand Mount, *Tears of the Rajas*.

196 'I knowed what that meant': Denis Judd, *The Lion and the Tiger: The Rise and Fall of the British Raj, 1600–1947*, Oxford: Oxford University Press, 2005, p. 132.

197 'every mutiny, every danger, every terror, and every crime': John Ruskin, *The Pleasures of England: Lectures Given in Oxford*, London: G. Allen, 1884, p. 111.

201 'Peterloo massacre had claimed about 11 lives': Helen Fein, *Imperial Crime and Punishment*, Honolulu: The University Press of Hawaii, 1977, p. xii.

201 'the calumny...that frail English roses: Salman Rushdie, 'Outside the Whale'.

202 General Dyer issued an order that Hindus using the street: Durant, *The Case for India*, pp. 134–135.

204 'I know it is said in missionary meetings that we conquered India': Quoted in *British Rule Condemned*, p. 36.

CHAPTER 6: THE REMAINING CASE FOR EMPIRE

206 'In the beginning, there were two nations': Tunzelmann, *Indian Summer*, p. 6.

206 'led to the modernisation, development, protection, agrarian advance': Amit Singh, 'Think India should be grateful for colonialism? Here are five reasons why you're unbelievably ignorant', *The Independent*, 10 November 2015.

207 'Wherever they are allowed a free outlet': H. M. Hyndman, *Ruin of India by British*, pp. 513–33.

210 there were fourteen questions on this issue: Breakdown of questions figures based on Amba Prasad, *Indian Railways: A Study in Public Utility Administration*, Bombay: Asia Publishing House, 1960.

214 Indians also pointed out at the time that the argument that the railways: See, for instance, Horace Bell, *Railway Policy in India*, Rivington, Percival & Company, 1894 and Edward Davidson, *The Railways of India: With an Account of Their Rise, Progress, and Construction*, E. & F. N. Spon, 1868.

215 'sordid and selfish...': Bipan Chandra, *The Rise and Growth of Economic Nationalism in India: Economic Policies of Indian National Leadership, 1880–1905*, New Delhi: Har-Anand Publications, 2010.

215 'Britain provided India with the necessary tools': Jonathan Old, 'Why I think Shashi Tharoor's Speech is Populist, Oversimplified and Ignores the Problems', www.youthkiawaaz.com, 28 July 2015.

215 The British left India with a literacy rate of 16 per cent: The Census of India, 1951, New Delhi: Publications Division, 1952.

216 'When the British came, there was, throughout India, a system of communal schools: Durant, *The Case for India*, pp. 31–35.

218 'in pursuing a system, the tendency of which': Sir Thomas Munro, 'His Life', Vol. III, quoted in *British Rule Condemned by British Themselves*, p. 16.

219 philosopher James Mill and his followers urged the promotion of western science: James Mill, *History of British India*, London: Baldwin, Cradock and Joy, 1817, p. 156.

221 'The fact that the Hindoo law is to be learned chiefly': Macaulay's *Minute on Education*, 2 Feb 1835, is published in Henry Sharp, *Selections from the Educational Records*, Bureau of Education, India, I, Calcutta, 1920.

222 'most fully admitted that the great body of the people': Quoted in Zastoupil and Moir, (1999), p 140–141.

222 It is difficult to argue...that such education acquired as much reach: From Margrit Pernau (ed.), *Delhi College: Traditional Elites, the Colonial State and Education before 1857*, New Delhi: Oxford University Press, 2006.

223 'become a sort of hybrid': Fielding-Hall, *Passing of the Empire*, p. 298.

224 All Indian aspirations and development of strong character: *British Rule*

Condemned, p 9.

224 European subordination of Asia was not merely economic: Pankaj Mishra, *From the Ruins of Empire: The Revolt Against the West and the Remaking of Asia*, London: Allen Lane, 2012.

224 To the memory of the British Empire in India: Nirad C. Chaudhuri, *Autobiography of an Unknown Indian*, London: Macmillan, 1951.

224 made Chaudhuri a poster child for scholarly studies of how Empire creates: Ian Almond, *The Thought of Nirad C. Chaudhuri: Islam, Empire and Loss*, Cambridge: Cambridge University Press, 2015.

225 'these two processes of self- othering': Ibid, p. 115.

225 moved to Oxford, there to live out his centenarian life: Ibid, p. 120.

225 seeing even in Clive's rapacity...the 'counterbalancing grandeur' of the grand imperialist: Chaudhuri, *Autobiography*, p. 3; Chaudhuri, *Clive of India*, p. 11.

225 'Nirad Chaudhuri is a fiction created by the Indian writer: David Lelyveld, 'The Notorious Unknown Indian', *New York Times*, 13 November, 1988.

226 'all the squalid history of Indo-British personal relations': Chaudhuri, *Autobiography*, p. 15.

227 'mythological histories...where fable stands in the face of facts': Javed Majeed, *Ungoverned Imaginings: James Mill's The History of British India and Orientalism*, Clarendon Press, 1992.

228 Gauri Vishwanathan has done pioneering work on the role of: Gauri Viswanathan, *Masks of Conquest: Literary Study and British Rule in India*, New York: Columbia University Press, 1989.

228 arguments made for propagating English literature through the English language: Charles E. Trevelyan, *On the Education of the People of India*, London: Longman, Orme, Brown, Green & Longmans, 1838.

230 'the rise of Raj revisionism': Rushdie, 'Outside the Whale'; see also Kathleen Wilson (ed.), *A New Imperial History: Culture, Identity and Modernity in Britain and the Empire 1660–1840* (2004); Antoinette Burton, *Empire in Question: Reading, Writing, and Teaching British Imperialism*, Durham: Duke University Press, 2011.

230 'it is impossible to make the English language the vernacular tongue': Howitt, *English in India*, p. 88.

230 'in our schools pupils imbibe sedition': J. D. Rees, *The Real India*, London: Methuen, 1908, pp. 162–163.

231 the study of which, even in Oxford, induces a regrettable tendency towards vain: Ibid, p. 343.

236 'That was the age when the English loved and treasured': Richard West, 'Wodehouse Sahib', Harpers and Queen, 1988, pp. 114–115.

239 'let the English who read this at home reflect': Quoted in *British Rule Condemned*, p. 19.

241 large numbers of trees were chopped down since the opium poppy: Arupjyoti Saikia, 'State, peasants and land reclamation: The predicament

of forest conservation in Assam, 1850s-1980s', *Indian Economic & Social History Review, 2008*, pp. 81–82.

242 **The term Puliyur has lost its meaning:** For details of India's environmental destruction under the British, see Mahesh Rangarajan, *India's Wildlife History*, New Delhi: Permanent Black, 2001; Madhav Gadgil and Ramachandra Guha, *Ecology and Equity: The Use and Abuse of Nature in Contemporary India*, New Delhi: Routledge, 1995.

243 **cricket is really, in the sociologist Ashis Nandy's phrase:** Ashis Nandy, *The Tao of Cricket: On Games of Destiny and the Destiny of Games,* New Delhi: Oxford University Press, 2000, p. 1.

245 **why cricket acquired such a hold in Bengal society between 1880 and 1947:** Anonymous, 'Cricket in Colonial Bengal (1880–1947): A lost history of nationalism', *The International Journal of the History of Sport*, Vol. 23 (6), 2006.

245 **'saw cricket as an identifier of social status':** Nandy, p. 53.

246 **'an English cricketer and an Indian prince':** Buruma, p. 234.

246 **'attacked the political and economic aspects of British imperialism':** Richard Cashman, *Patrons, Players, and the Crowd: The Phenomenon of Indian Cricket*, London: Orient Longman, 1980, p. 22–3.

247 **sports such as gymnastics and cricket were made compulsory to develop:** Mrinalini Sinha, *Colonial Masculinity: The 'Manly Englishman' and the 'Effeminate Bengali' in the Late Nineteenth Century,* Manchester: Manchester University Press, 1995.

CHAPTER 7: THE (IM)BALANCE SHEET: A CODA

251 **'an exercise in benign autocracy and an experiment in altruism':** See www.andrewlownie.co.uk/authors/lawrence-james/books/raj-the-making-and-unmaking-of-british-empire.

251 **Recent years have seen the rise of what the academic Paul Gilroy:** Paul Gilroy, *Postcolonial Melancholia*, New York: Columbia University Press, 2005.

251 **A 2014 YouGov poll revealed that 59 per cent of respondents:** www.yougov.co.uk/news/2014/07/26/britain-proud-its-empire/

251 **'the optimal allocation of labour, capital and goods':** Ferguson, *Empire*, p. xx.

252 **human beings do not live in the long run; they live, and suffer, in the here and now:** These arguments are cogently substantiated by Linda Colley, 'Into the Belly of the Beast', *The Guardian*, 18 January 2003, and Philip Pomper , 'The History and Theory of Empires', *History and Theory*, Vol. 44 (4), December 2005, Wiley for Wesleyan University, pp. 1–27.

253 **Indian society has no history at all, at least no known history:** Karl Marx, 'The Future Results of British Rule in India', in David McLellan,

ed., *Karl Marx: Selected Writings*, Oxford: Oxford University Press, 1982, p. 362.

253 'whether all this has been for better or worse, is almost impossible to say': Denis Judd, *The Lion and the Tiger: The Rise and Fall of the British Raj, 1600–1947*, Oxford: Oxford University Press, 2005, p. 200.

253 'its operation was driven instead by narrow interests and visceral passions': Wilson, *India Conquered*, p. 500.

254 'between 1757 and 1900 British per capita gross domestic product': Ferguson, *Empire*, p. 216.

255 the Indian government brought electricity to roughly 320 times as many villages: Paul Cotterrill, 'Niall Ferguson's Ignorant Defence of British Rule in India', *New Statesman*, 16 August 2012.

255 India was... an 'extractive colony': Daron Acemoglu and James Robinson, *Why Nations Fail,* New York: Crown Business, 2012.

255 Colonial exploitation happened instead: See Cotterrill, 'Ferguson's Ignorant Defence' and 'The Incomplete State: Charles Tilly and the Defence of Aid to India', www.thoughcowardsflinch.com/2012/02/07/the-incomplete- state-charles-tilly-and-the-defence-of-aid-to-india/, 7 Feb 2012.

255 'When the English came to India': William Jennings Bryan, *British Rule in India*, Westminster: British Committee of the Indian National Congress, 1906, p. 19.

255 'The empire was run on the cheap': Jon Wilson, 'False and dangerous', *The Guardian*, 8 February 2003.

256 'in return for its moment of greatness on the world stage': Lawrence James, *Raj: The Making and Unmaking of British India,* New York: St Martin's Griffin, 1997.

256 'Why, for example, should one assume that eighteenth-century India': Professor Andrew Porter's review of *Empire: How Britain Made the Modern World*, (History review no. 325) www.history.ac.uk/reviews/review/325.

257 He talked admiringly of spices and jewels, precious stones: Sanjay Subrahmanyam, *The Career and Legend of Vasco da Gama,* Cambridge: Cambridge University Press, 1997.

257 The annual revenues of the Mughal Emperor Aurangzeb: John Kautsky, *The Politics of Aristocratic Empires*, Chapel Hill: University of North Carolina Press, 1982, p. 188.

257 The India that succumbed to British rule enjoyed an enormous financial surplus: Chunder Dutt, *Economic History of India*, p. xxv.

257 'In 1750, Indians had a similar standard of living to people in Britain': Wilson, 'False and Dangerous'.

258 'a flabby, pretending, weak-eyed devil of a rapacious and pitiless folly': Joseph Conrad, *Heart of Darkness*, London: Dover Thrift Editions, 1990, originally published in the volume *Youth: A Narrative, and Two Other Stories*, Edinburgh and London: William Blackwood & Sons, 1902.

259 'The question...': Ferguson, *Empire*, p. xxix.

259 'The industrial revolution did not occur because': Das, 'India: How a rich nation'; see also Das, *India Unbound*, pp. 228–243.

262 'Ten per cent of the army expenditure applied to irrigation': William Jennings Bryan, p. 12.

263 'temperate, respectful, patient, subordinate, and faithful': Ibid, p. 187.

263 'Our force does not operate so much by its actual strength': Mason, *A Matter of Honour*.

267 [It was] the practice of the miserable tyrants whom we found in India: Thomas Babington Macaulay, *Miscellaneous Writings and Speeches—Volume 4*, Project Gutenberg, 2008. www.gutenberg. org/files/2170/2170-h/2170-h.htm.

267 British interfered with social customs only when it suited them: See, for example, the impassioned appeals by anti-slavery campaigners for the British government to put an end to certain traditional practices of servitude, which were of course completely ignored by Company officialdom: Wilson Anti-Slavery Collection, *A Brief View of Slavery in British India*, 1841, Manchester: The University of Manchester, John Rylands University Library. URL: www.jstor.org/stable/60228274.

268 'Unlike Stalin's Russia, the British empire': Lawrence James, *The Making and Unmaking of British India*, New York: St. Martin's Press, 2000; also published as *Raj: The Making and Unmaking of British India,* London: Little, Brown &Co., 1997.

268 For whom was the British empire an open society?: See the essays in Philippa Levine, ed., *Gender and Empire*, Oxford History of the British Empire Companion Series, Oxford University Press, 2004.

270 Let's look at the numbers one last time, widening the lens a little: See https:// infogr.am/Share-of-world-GDP-throughout-history.

270 As of 2014 Britain accounted for 2.4 per cent of global GDP: www. quandl. com/collections/economics/gdp-as-share-of-world-gdp-at-pp-by-country.

270 'Ferguson's "history" is a fairy tale for our times': Priyamvada Gopal, 'The story peddled by imperial apologists is a poisonous fairytale',. *The Guardian*, 28 June 2006.

271 Henry Labouchère, published an immediate rejoinder: Henry Labouchère, 'The Brown Man's Burden' was first published in the London magazine, *Truth,* edited by Labouchère, in February 1899.

CHAPTER 8: THE MESSY AFTERLIFE OF COLONIALISM

276 A 1997 Gallup Poll in Britain revealed: Stuart Ward, ed., *British Culture and the End of Empire* (Manchester, 2001), 28, 128, cited in Richard Price , 'One Big Thing: Britain, Its Empire, and Their Imperial Culture'. *Journal of British Studies*, Vol. 45, No. 3, July 2006, pp.

602–627. Published by: Cambridge University Press on behalf of The North American Conference on British Studies www.jstor.org/stable/10.1086/503593.

277 'wholly unprecedented in creating a global hierarchy': Pankaj Mishra, *From the Ruins of Empire. The Revolt against the West and the Remaking of Asia*, London: Allen Lane, 2012, p. 42.

277 'the memory of European imperialism remains a live political factor': Mark Mazower, 'From the Ruins of Empire', *Financial Times*, 27 July 2012.

277 he sees in Empire cause for much that is good: Ferguson, *Empire*, p xxv.

277 Without the spread of British rule around the planet: Ibid, p. 358.

277 The East India Company has collapsed, but globalization: Philip Pomper, 'The History and Theory of Empires', *History and Theory*, Vol. 44, No. 4, December 2005, pp. 1–27, published by Wiley for Wesleyan University. www.jstor.org/stable/3590855.

278 the liberal-capitalist 'rise of Asia' of which India is a contemporary epitome: Mishra, *From the Ruins of Empire*, p 42 et seq.

278 '[T]he British empire was essentially a Hitlerian project on a grand scale': Richard Gott, 'White wash' (book review of *Ornamentalism: How the British saw their Empire* by David Cannadine), *The Guardian*, 5 May 2001.

280 if looted Nazi-era art can be (and now is being) returned to their rightful owners: See the discussion in Erin Johnson, 'If we return Nazi-looted art, the same goes for empire-looted,' Aeon. www.aeon.co/ideas/if-we-return-nazi-looted-art-the-same-goes-for-empire-looted?utm_source=twitter&utm_medium=oupphilosophy&utm_campaign=oupphilosophy.

281 'if a strong man were to throw four stones': 'The Koh-i- noor diamond is in Britain illegally. But it should still stay there', *The Guardian*, 16 February 2016.

283 Part of the legacy of colonialism is...the worldwide impact of the methods: For a searching political analysis of the Empire and its continuing implications, see two books by John Darwin, *The Empire Project*, London: Penguin, 2010; and *Unfinished Empire: The Global Expansion of Britain*, London: Allen Lane, 2013.

BIBLIOGRAPHY

Acemoglu, Daron and Robinson, James, *Why Nations Fail*, New York: Crown Business, 2012.

Akbar, M. J., *Nehru*, New Delhi: Viking, 1988.

Ali, Abeerah, 'The Role of the British Colonial/Imperial Rule in the Introduction of Representative Institutions in India (1857-1947)', *Journal of European Studies*, 29, 2013.

Allen, Charles, *Plain Tales from the Raj*, London: Abacus, 1988.

Almond, Ian, *The Thought of Nirad C. Chaudhuri: Islam, Empire and Loss*, Cambridge: Cambridge University Press, 2015.

Anderson, Benedict, *Imagined Communities: Reflections on the Origin and Spread of Nationalism*, 2nd edn, London: Verso, 1991.

Anderson, Clare, *Convicts in the Indian Ocean*, London: Palgrave Macmillan, 2000.

Azad, Maulana Abul Kalam, *India Wins Freedom*, New Delhi: Orient Blackswan, 2004.

Bailkin, Jordanna, 'The Boot and the Spleen: When Was Murder Possible in British India?', *Comparative Studies in Society and History*, *48 (2)*, 2006.

Barrier, Norman G. (ed.), *The Census in British India: New Perspectives*, New Delhi: Manohar Publishers, 1981.

Bayly, Christopher A., *Recovering Liberties: Indian Thought in the Age of Liberalism and Empire*, Cambridge: Cambridge University Press, 2011.

———, *The Birth of the Modern World, 1780–1914: Global Connections and Comparisons*, London: Wiley-Blackwell, 2004.

Bhargava, M. B. L., *India's Services in the War*, Mukat Bihari Lal Bharagava, 1919.

Bhatia, H. S. (ed.), *Military History of British India, 1607-1947*, New Delhi: Deep & Deep Publications, 1977.

Bolts, William, *Considerations on Indian Affairs: Particularly Respecting the Present State of Bengal and its Dependencies*, London: Printed for J. Almon, 1772.

Bose, Sugata, 'Starvation amidst Plenty: The Making of Famine in Bengal, Honan and Tonkin', 1942–45, *Modern Asian Studies*, *24*, 1990.

———, *His Majesty's Opponent: Subhash Chandra Bose and India's Struggle Against Empire*, Cambridge, MA: Harvard University Press, 2011.

Brecher, Michael, *Nehru: A Political Biography*, London: Beacon Press, 1962.

Breckenridge, Carol A. and van der Veer, Peter (eds.), *Orientalism and the Postcolonial Predicament*, Philadelphia: University of Pennsylvania Press, 1993.

Burton, Antoinette, *Empire in Question: Reading, Writing, and Teaching British Imperialism*, Durham and London: Duke University Press, 2011.
Campbell-Johnson, Alan, *Mission with Mountbatten*, London: Macmillan, 1985.
Cannadine, David, *Ornamentalism: How the British saw their Empire*, London: Allen Lane, 2001.
Cashman, Richard, *Patrons, Players, and the Crowd: The Phenomenon of Indian Cricket*, London: Orient Longman, 1980.
Chandra, Bipan, *India's Struggle for Independence*, New Delhi: Viking, 1988.
———, *The Rise and Growth of Economic Nationalism in India: Economic Policies of Indian National Leadership, 1880–1905*, New Delhi: Har-Anand Publications, 2010.
Chatterjee, Partha, and Pandey, Gyanendra (eds.), *Subaltern Studies VII*, Delhi: Oxford University Press, 1992.
Chatterjee, Partha, *Lineages of Political Society: Studies in Postcolonial Democracy*, New York: Columbia University Press, 2011.
———, *The Nation and its Fragments: Colonial and Postcolonial Histories*, Princeton: Princeton University Press, 1993.
Chaudhuri, K. N., *The Trading World of Asia and the English East India Company, 1660–1760*, Cambridge: Cambridge University Press, 2006.
Chaudhuri, Nirad C., *Autobiography of an Unknown Indian*, London: Macmillan, 1951.
———, *A Passage to England*, London: St. Martin's Press, 1960.
Chaudhury, Sushil, *The Prelude to Empire: Plassey Revolution of 1757*, New Delhi: Manohar Publishers, 2000.
Cohn, Bernard S., *An Anthropologist Among The Historians and Other Essays*, Oxford: Oxford University Press, 1987.
Collingham, E. M., *Imperial Bodies: The Physical Experience of the Raj, 1800–1947*, Oxford: Polity Press, 2001.
Collins, Larry and Lapierre, Dominique, *Mountbatten and the Partition of India*, New Delhi: Vikas, 1975.
Corfield, Penelope J. (ed.), *Language, History and Class*, London: Blackwell, 1991.
Dalrymple, William, *White Mughals*, London: Harper Perennial, 2002.
Darwin, John, *The Empire Project: The Rise and Fall of the British World-System*, 1830–1970, Cambridge: Cambridge University Press, 2009.
Darwin, John, *Unfinished Empire: The Global Expansion of Britain*, London: Allen Lane, 2013.
Das, Durga, *India: From Curzon to Nehru and After*, New Delhi: Rupa Publications, 1967.
Das, Sudipta, 'British Reactions to the French Bugbear in India, 1763-83', *European History Quarterly*, 22 (1), 1992.
Davis, Mike, *Late Victorian Holocausts: El Niño Famines and the Making of the Third World*, London; New York: Verso Books, 2001.
de Courcy, Anne, *The Fishing-Fleet: Husband-Hunting In the Raj*, London:

Weidenfeld & Nicolson, 2012.

Dhulipala, Venkat, *Creating a New Medina*, Cambridge: Cambridge University Press, 2016.

Digby, William, *Indian Problems for English Consideration, published for the National Liberal Federation*, London, 1881.

———, *'Prosperous' British India: A Revelation from Official Records*, London: T Fisher Unwin, 1901.

Dirks, Nicholas B., *Castes of Mind: Colonialism and the Making of Modern India*, Princeton: Princeton University Press, 2001.

Durant, Will, *The Case for India*, New York: Simon & Schuster, 1930, reissued in a limited edition by Strand Book Stall, Mumbai, 2015.

Dutt, Romesh Chunder, *The Economic History of India under Early British Rule: From the Rise of the British Power in 1757 to the Accession of Queen Victoria in 1837*, New Delhi: Routledge, 1950, reprinted by the Government of India, 1963.

Eck, Diana, *India: A Sacred Geography*, New York: Harmony Books, 2012.

Falkiner, Caesar Litton, *Illustrations of Irish history and topography, mainly of the 17th century*, London: Longmans, Green, & Co., 1904.

Ferguson, Niall, *Colossus: The Price of America's Empire*, New York: Penguin, 2004.

———, *Empire: The Rise and Demise of the British World Order and the Lessons for Global Power*, New York: Basic Books, 2003.

Fielding-Hall, H., *Passing of the Empire*, London: Hurst & Blackett, 1913.

Fischer, Louis, *The Life of Mahatma Gandhi*, New York: Harper Collins, 1997.

Forrest, George, *The Life of Lord Clive: Volume 2*, London: Frank Cassell, 1918.

Forster, E. M., *A Passage to India*, London: Penguin/Allen Lane, 1924.

Freitag, Sandria, *Collective Action and Community: Public Arenas and the Emergence of Communalism in North India*, Berkeley: University of California Press, 1989.

Gadgil, Madhav, and Guha, Ramachandra, *Ecology and Equity: The Use and Abuse of Nature in Contemporary India*, New Delhi: Routledge, 1995.

Geddes, J. C., *Administrative Experience Recorded Former Famines*, Calcutta, 1874.

Ghosh, Amitav, *Sea of Poppies*, New York: Farrar, Straus & Giroux, 2011.

Gilmour, David, *Curzon: Imperial Statesman*, New York: Farrar, Straus & Giroux, 2003.

———, *The Ruling Caste: Imperial Lives in the Victorian Raj*, New York: Farrar, Straus & Giroux, 2006.

Gopal, Sarvepalli, *Jawaharlal Nehru, Volumes I & II*, New Delhi: Vintage, 2005.

Goradia, Nayana, *Lord Curzon: The Last of the British Moguls*, Oxford: Oxford University Press, 1993.

Gordon, Leonard, *Brothers Against the Raj*, New York: Columbia University Press, 1990.

Gottschalk, Peter, *Religion, Science and Empire: Classifying Hinduism and Islam in British India*, London: Oxford University Press, 2012.
Guha, Ranajit, *Dominance without Hegemony: History and Power in Colonial India*, Cambridge, MA: Harvard University Press, 1998.
Hajari, Nisid, *Midnight's Furies*, Boston: Houghton Mifflin Harcourt, 2015.
Harris, Jonathan Gil, *The First Firangis*, New Delhi: Aleph Book Company, 2015.
Hiltebeitel, Alf, *Criminal Gods and Demon Devotees: Essays on the Guardians of Popular Hinduism*, Binghamton NY: SUNY Press, 1989.
Hobsbawm, Eric, *The Age of Empire*, London: George Weidenfeld and Nicolson, 1987.
Hobson, J. M., *The Eastern Origins of Western Civilisation,* Cambridge: Cambridge University Press, 2004.
Hodson, H. V., *The Great Divide*, Oxford: Oxford University Press, 1997.
Holzman, James, *The Nabobs in England: A Study of the Returned Anglo-Indian, 1760–1785*, New York: Columbia University Press, 1926.
Howitt, William, *The English in India*, London: Longman, Orme, Brown, Green, and Longmans, 1839.
Indian National Party, *British Rule in India: Condemned by the British Themselves*, issued by the Indian National Party, London, 1915.
James, Lawrence, *Raj: The Making and Unmaking of British India*, New York: St Martin's Griffin, 1997.
Judd, Denis, *The Lion and the Tiger: The Rise and Fall of the British Raj, 1600–1947*, Oxford: Oxford University Press, 2005.
Khan, Yasmin, *The Great Partition*, New Haven: Yale University Press, 2008.
Kipling, Rudyard, 'Naboth' in *Life's Handicap* (1891), republished by Echo Books, London, 2007.
———, *Kim*, New York: Oxford University Press, 2008.
Kishwar, Madhu, *Zealous Reformers, Deadly Laws*, New Delhi: SAGE Publications, 2008.
Kramer, Martin (ed.), *Shi'ism, Resistance, and Revolution,* Boulder, CO: Westview Press, 1987.
Kurtzer, M. Daphne, *Empire's Children: Empire and Imperialism in Classic British Children's Books*, London: Routledge, 2002.
Levine, Philippa (ed.), *Gender and Empire, Oxford History of the British Empire Companion Series*, Oxford: Oxford University Press, 2004.
Lipset, Seymour Martin, Seong, Kyoung-Ryung and Torres, John Charles, 'A Comparative Analysis of the Social Requisites of Democracy', *International Social Science Journal, 45*, 1993.
Macaulay, Thomas Babington, *Historical Essays of Macaulay: William Pitt, Earl of Chatham, Lord Clive, Warren Hastings*, ed. by Samuel Thurber, Boston: Allyn and Bacon, 1894.
MacMillan, Margaret, *Women of the Raj: The Mothers, Wives, and Daughters of the British Empire in India*, New York: Random House, 2007.
Maddison, Angus, *Class Structure and Economic Growth: India & Pakistan*

since the Moghuls, London: Routledge, 2013.
———, *The World Economy*, Development Centre of the Organisation for Economic Co-operation and Development, 2006.
Majeed, Javed, *Ungoverned Imaginings: James Mill's The History of British India and Orientalism*, Oxford: Clarendon Press, 1992.
Majumdar, R. C., *The History and Culture of the Indian People: The Maratha Supremacy*, Bombay: Bharatiya Vidya Bhavan, 1977.
Mansergh, Nicholas, *The Transfer of Power 1942-47*, London: HM Stationery Office, 1983.
Marshall, Peter J., *The Impeachment of Warren Hastings*, Oxford: Oxford University Press, 1965.
Mason, Philip, *A Matter of Honour: An Account of the Indian Army, its Officers and Men*, London: Penguin, 1974.
———, *Kipling: The Glass, the Shadow and the Fire*, New York: Holt, Rinehart & Wilson, 1975.
———, *Men Who Ruled India*, New Delhi: Rupa Publications, 1992.
Metcalfe, Thomas, *Ideologies of the Raj*, Cambridge: Cambridge University Press, 1995.
Mishra, Pankaj, *From the Ruins of Empire: The Revolt against the West and the Remaking of Asia*, London: Allen Lane, 2012.
Moon, Penderel, *The British Conquest and Dominion of India*, India Research Press, 1989.
Moon, Penderel, Tully, Mark and Raychaudhuri, Tapan, *Divide and Quit*, Oxford: Oxford University Press, 1998.
Moorhouse, Geoffrey, *India Brittanica*, New York: Harper & Row, 1983.
Morris, Jan, *Farewell the Trumpets: An Imperial Retreat*, London: Faber & Faber, 1978.
Mount, Ferdinand, *Tears of the Rajas*, London: Simon and Schuster, 2015.
Mukerjee, Madhusree, *Churchill's Secret War: The British Empire and the Ravaging of India During World War II*, New York: Basic Books 2010.
Naipaul, V. S., *An Area of Darkness*, London: André Deutsch, 1964.
———, *India: A Wounded Civilization*, London: André Deutsch, 1976.
Nandy, Ashis, *The Tao of Cricket: On Games of Destiny and the Destiny of Games*, Oxford: Oxford University Press, 2000.
Naoroji, Dadabhai, *Poverty and Un-British Rule in India*, London: Swan Sonnenschein, 1901.
Nasson, Bill, *Britannia's Empire: Making a British World*, Stroud, Gloucestershire: Tempus Publishing, 2004.
Nechtman, Tillman W., 'A Jewel in the Crown? Indian Wealth in Domestic Britain in the Late Eighteenth Century', *Eighteenth-Century Studies, 41 (1)*, 2007.
Nehru, Jawaharlal, *Glimpses of World History*, New Delhi: Oxford University Press, 1989.
———, *Jawaharlal Nehru: An Autobiography*, New Delhi: Oxford University Press, 1989.

———, *The Discovery of India,* New Delhi: Oxford University Press, 1989.

Nevinson, Henry W., *The New Spirit in India,* London: Harper & Brothers, 1908.

Ó Gráda, Cormac, *Eating People is Wrong, and Other Essays on Famine, its Past, and its Future,* Princeton, NJ: Princeton University Press, 2015.

Ozbudun, E. and Weiner, M. (eds.), *Competitive Elections in Developing Countries*, Durham, NC: Duke University, 1987.

Pandey, Gyanendra, *The Construction of Communalism in Colonial North India,* New Delhi: Oxford University Press, 1990.

Parkinson, C. Northcote, *Parkinson's Law: The Pursuit of Progress*, London, John Murray, 1958.

Peers, D. M. and Gooptu, N. (eds.), *India and the British Empire*, Oxford: Oxford University Press, 2012.

Pernau, Margrit (ed.), *Delhi College: Traditional Elites, the Colonial State and Education before 1857*, New Delhi: Oxford University Press, 2006.

Pillai, Manu, *The Ivory Throne,* New Delhi: Harper Collins, 2015.

Prasad, Amba, *Indian Railways: A Study in Public Utility Administration*, Bombay: Asia Publishing House, 1960.

Qureshi, Ishtiaq Husain, *The Struggle for Pakistan*, University of Karachi, 1969.

Rai, Lala Lajpat, *Unhappy India,* Calcutta: Banna Publishing Company, 1928.

Rangarajan, Mahesh, *India's Wildlife History*, New Delhi: Permanent Black, 2001.

Ray, Indrajit, 'Shipbuilding in Bengal under Colonial Rule: A Case of 'De-Industrialisation', *The Journal of Transport History*, 16 (1), 1995.

Raychaudhuri, Tapan, *Europe Reconsidered: Perceptions of the West in 19th Century Bengal,* Oxford: Oxford University Press, 1988.

Rees, J. D., *The Real India*, London: Methuen, 1908.

Scott, Paul, *The Jewel in the Crown*, London: Heinemann, 1966.

———, *The Day of the Scorpion*, London: Heinemann, 1968.

———, *The Towers of Silence*, London: Heinemann, 1971.

———, *A Division of the Spoils*, London: Heinemann, 1975.

Sen, Amartya, *Poverty and Famines: An Essay on Entitlements and Deprivation*, Oxford: Oxford University Press, 1983.

———, *The Argumentative Indian*, New York: Farrar, Straus & Giroux, 2005.

Sinha, Mrinalini, *Colonial Masculinity: The 'Manly Englishman' and the 'Effeminate Bengali' in the Late Nineteenth Century*, Manchester: Manchester University Press, 1995.

Srinivas, M. N., *Social Change in Modern India,* Hyderabad: Orient Longman India, 1972.

Sullivan, Zohreh T., *Narratives of Empire: The Fictions of Rudyard Kipling*, Cambridge: Cambridge University Press, 1993.

Sunderland, J. T., *India in Bondage: Her Right to Freedom And a Place Among the Great Nations*, New York: Lewis Copeland Company, 1929.

Tagore, Rabindranath, *Crisis in Civilization (1941),* in *The Essential Tagore,*

Cambridge, MA: Harvard University Press, 2011.
Talbot, Phillips, *An American Witness to India's Partition*, New Delhi: SAGE Publications, 2007.
Taylor, A. J. P., *English History 1914-45*, Oxford: Oxford University Press, 1965.
Telford, Judith, *British Foreign Policy, 1870–1914*, Glasgow: Blackie, 1978.
Tharoor, Shashi, *Nehru: The Invention of India*, New York: Arcade Books, 2003.
Trevelyan, C. E., *On the Education of the People of India*, London: Longman, Orme, Brown, Green & Longmans, 1838.
Viswanathan, Gauri, *Masks of Conquest: Literary Study and British Rule in India*, New York: Columbia University Press, 1989.
Wan-ling, C. J. Wee, *Culture, Empire, and the Question of Being Modern*, New York: Lexington Books, 2003.
Ward, Stuart (ed.), *British Culture and the End of Empire*, Manchester: Manchester University Press, 2001.
Wavell, Lord Archibald, *Viceroy's Journal* (ed.), Penderel Moon, Oxford: Oxford University Press, 1973.
Weiner, M. and Ozbudun, E. (eds.), *Competitive Elections in Developing Countries*, Durham, NC: Duke University Press, 1987.
Wiener, Martin, *Men of Blood: Violence, Manliness and Criminal Justice in Victorian England*, Cambridge: Cambridge University Press, 2004.
Wilson, Jon, *India Conquered*, London: Simon & Schuster, 2016.
Wilson, Kathleen (ed.), *A New Imperial History: Culture, Identity and Modernity in Britain and the Empire 1660–1840*, Cambridge: Cambridge University Press, 2004.
Wolpert, Stanley, *Nehru: A Tryst with Destiny*, New York: Oxford University Press, 1995.
Zastoupil, L., and Moir, M. (eds.), *The Great Indian Education Debate: Documents Relating to the Orientalist-Anglicist Controversy, 1781–1843*, Richmond: Curzon Press, 1999.
Zubrzycki, John, *The Last Nizam*, New Delhi: Picador India, 2007.

مترجم

عابد محمود کا تعلق گوجرانوالہ کی زرخیز اور حریت پسند مٹی سے ہے جو علمی اور تاریخی حوالے سے ایک مضبوط ورثے کی حامل سرزمین ہے۔ علم نفسیات میں ماسٹرز کرنے کے بعد روزگار کے سلسلے میں فارماسیوٹیکل انڈسٹری کے میدان میں اترے۔ تحقیق اور جستجو کی لگن تو پیدائشی تھی اس پر ملٹی نیشنل کی پیشہ ورانہ مہارت اور تربیت نے تجزیے کی طاقت کو مزید جلا بخشی۔ حلقہ ارباب ذوق اور شہر کی دیگر ادبی اور سماجی محفلوں میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ 2007 میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم نو ع ہوئی تو ملتان کے اجلاس میں شرکت کے بعد گوجرانوالہ میں باقاعدہ ادبی نشستوں کے علاوہ دیگر مباحثوں کا سلسلہ شروع کیا۔ حلقہ ارباب ذوق گوجرانوالہ اور انجمن ترقی پسند مصنفین گوجرانوالہ میں بالترتیب جنرل سیکرٹری اور جوائینٹ سیکرٹری خدمات سرانجام دیں۔ علم و ادب اور نقد و نظر سے ایک طویل رفاقت ہے۔ ادبی نشستوں میں ان کے معروضی اور سائنسی نکتہ نظر کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ گذشتہ تقریباً عرصہ 10 سال سے لاہور میں مقیم ہیں۔ عابد محمود ایک ماہر قانون دان اور قانون کے استاد بھی ہیں۔ قانون، فلسفے، ادب، تاریخ اور بالخصوص عوامی تاریخ سے خصوصی لگاؤ قائم و دائم ہے۔ مختلف جرائد اور ویب سائٹس پر سماج، سیاست، ادب، تاریخ اور قانون سے متعلقہ ان کے مضامین و تاریخی دستاویزات کے تراجم اور افسانے چھپ چکے ہیں۔ استعماری و نوآبادیاتی تاریخ اور موجودہ دور پر اس کے اثرات کا مطالعہ ان کا عشق ہیں۔ کئی عمدہ کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہی ہیں، اب ان کی اردو تراجم کی طرف خصوصی توجہ ہے تا کہ عام قارئین کی حریت پسند اور معروضی نکتہ نظر تک رسائی ممکن ہو کیرالہ سے بھارتی لوک سبھا کے ممبر اور دانشور ششی تھرور کی زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب برطانوی استعمار کی لوٹ مار اور مقامی زبان و ثقافت کی مرحلہ وار بیخ کنی پر سوچ کے نئے در کھولتی ہے۔
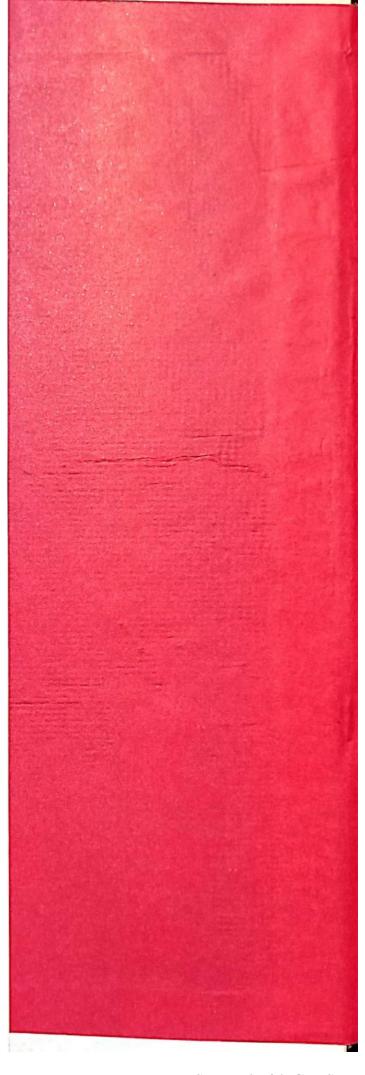
پاکستان کی تاریخ نگاری کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس نے نو آبادیاتی دور کے اقتصادی اور سماجی استحصال کو عموماً اپنا موضوع نہیں بنایا۔ تحریکِ پاکستان کی تاریخ لکھتے ہوئے بنیادی فریق ہندو اور مسلمان ہیں اور انگریزوں کا کردار ثالث کا ہے۔ اس تاریخ نگاری کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ انگریز دشمنی اور نو آبادیاتی مزاحمت کے جذبات پیدا ہی نہیں ہوئے۔ ایک عام پڑھے لکھے شخص سے بات کی جائے تو اس کے نزدیک انگریز برصغیر میں قانون کی حکمرانی، سائنس و ٹیکنالوجی، بہترین انتظامی ڈھانچہ اور جدید تعلیم لے کر آیا۔ اس کے لیے پہلے آنے والے حکمران جیسے ترک سلاطین و مغل بادشاہ اور نو آبادیاتی دور کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان فرق کرنا ممکن نہیں کیونکہ وہ دونوں کو ہی غیر ملکی، جارح اور استحصالی حکومت قرار دیتا ہے۔ وہ یہ فہم نہیں رکھتا کہ یہ بیانیہ خود انگریزوں کا تخلیق کردہ ہے اور گمراہ کن استدلال پر مبنی ہے۔ ترک اور مغل باہر سے ضرور آئے تھے لیکن انہوں نے برصغیر کو اپنا وطن بنایا۔ ان کا مرنا اور جینا یہیں تھا اور ان کی سب اچھی اور بری کاوشوں کا محور بھی صرف اور صرف برصغیر پاک و ہند تھا۔ وہ یہاں کا سرمایہ لوٹ کر کہیں اور نہیں لے گئے۔ اس کے مقابلے میں انگریز نہ صرف سات سمندر پار سے آئے بلکہ ایک صدی سے زائد عرصہ حکومت کرنے کے بعد بھی اصلاً غیر ملکی ہی رہے۔ ان کی حکومت کا بنیادی نکتہ ہی اپنی مادرِ وطن یعنی برطانیہ کے مفادات کا تحفظ تھا۔ ان کے نزدیک برصغیر محض ایک لونڈی تھی جس کا مقصد ان کی مادرِ وطن کی خدمت تھا۔ ششی تھرور کی کتاب کی اصل اہمیت یہی ہے کہ یہ نہ صرف نو آبادیاتی دور کے اقتصادی استحصال کو ہمارے سامنے لاتی ہے بلکہ سماجی اور سیاسی میدان میں کیے گئے اقدامات کے پیچھے انگریزوں کے خفیہ عزائم کو بھی آشکار کرتی ہے۔ مصنف نے جائز طور پر اس عرصہ کو "عہدِ ظلمات" قرار دیا ہے کیونکہ آج بھی جنوبی ایشیا کے اکثر مسائل کی جڑیں نو آبادیاتی ورثہ میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

ڈاکٹر فراز انجم

شعبہ تاریخ، جامعہ پنجاب، لاہور

ششی تھرور نے ۲۰۱۵ میں اپنی آکسفرڈ کی تقریر کے ذریعے اور بعد ازاں اسی کی کتابی تفسیر کے ذریعے جس جاندار و جامع انداز میں ردِ استعماری دلائل پیش کیے اس نے عالمی جنوب میں بالخصوص اور دنیا بھر میں بالعموم ردِ نو آبادیاتی تحریک کو مزید توانا کیا اور انگریزی کے قارئین کے لئے نو آبادیاتی دجل کے پردوں کو چاک کیا۔ ضرورت تھی کہ ایسے موثر بیانیئے کو اردو قارئین کے سامنے بھی لایا جائے کیونکہ بد قسمتی سے ہمارے ملک کے تعلیمی و ادبی کلامیوں میں آج بھی تاریخ و فلسفہ کا نو آبادیاتی بیانیہ حاوی نظر آتا ہے۔ اس تناظر میں ہندوستان کے نو آبادیاتی دور کا بطور 'عہدِ ظلمات' سامنے آنا قومی ذہن کی شعوری آبیاری میں ممد و معاون ہوگا۔ قارئین اس عمدہ ترجمہ کے ذریعے یہ جانیں گے کہ وہ نو آبادیاتی اساطیر جنکو استحصالی مقاصد کے تحت اس خطے کے عوام کے اذہان میں بذریعہ خواص رائج کروایا گیا ان کی تاریخی حقیقت کیا ہے۔ عابد محمود اور عکس پبلیکیشنز کی یہ کاوش ستائشگری کی متقاضی ہے۔

ڈاکٹر شاہ زیب خان

انسٹیٹیوٹ آف انگلش سٹڈیز، پنجاب یونیورسٹی

AKSPUBLICATIONS
Ground Floor Mian Chamber 3-Temple Road, Lahore.
Ph: 042-6294000, Cell # 0304-2224000, 0300-48275000
E-mail: publications.aks@gmail.com